

پن کامبر

ہاشم نیما

بچپن کا دسمبر.....دور حاضر کا مقبول ترین ناول.....نازک جذبوں میں گندمی.....بچپن سے جوانی تک کی محبت کی کہانی

کتاب گھر کی پیشکش

بچپن کا دسمبر

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

40-اردو بازار لاہور <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

فون: 042-7352332-7232336

کتاب گھر کی پیشکش

نوت:

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور چلشرز

(علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس

کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، شکش

جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

(آخری صفحات میں ادارہ علم و عرفان کے شائع کردہ خوبصورت ناولوں کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	بچپن کا دسمبر
مصنف	ہاشم ندیم
ناشر	گل فراز احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور
سن اشاعت	زادہ نوید پرنسپل، لاہور اگست 2010ء
قیمت	-/- 500 روپے

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصود ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصود کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعت دینا میں ایک تنی چدٹ پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری اختیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفات درست نہ ہوں تو از راؤ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

بہترین کتاب چھپانے کے لئے رابطہ کریں: 0300-9450911

ملے کے پتے.....

علم و عرفان پبلشرز

احمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور
7352332-7232336

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمپنی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

اکرمیم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

اسرف بک ایجنٹی

اقبال روڈ، کمپنی چوک، راولپنڈی

ویکلم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

انتساب!

<http://kitaabghar.com>

عالیہ کے نام
کتاب گھر کی پیشکش
جن کی وجہ سے میں آج تک اپنے
<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>
بچپن کے دسمبر کو جی رہا ہوں۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصطفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی ایجنسی ناول/ کتاب کی کپوزنگ (ان بیچ فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے

کتاب گھر کو دیجئے۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سانسز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

☆ کتابی شکل میں ملنے کے پتے ☆

کتاب گھر کی پیشکش

مکتبہ قابل اردو بازار، لاہور

کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فہیم بکڈ پو، راجچوت مارکیٹ اردو بازار، لاہور

اشرف بک انجینی کمپنی چوک راولپنڈی

فضلی سزارو بازار، کراچی

ویکلم بک پورٹ اردو بازار، کراچی

کتب خانہ رشید یار راجچوت بازار اردو پنڈی

سعید بک اسلام آباد

کپیٹش بکڈ پو، اردو بازار، راولپنڈی

سعید بک بک، پشاور

یونیورسٹی بک انجینی خیر بازار، پشاور

حافظ بک انجینی اقبال روڈ، سیالکوٹ

بک سزارو بازار، سیالکوٹ

پنجاب بکڈ پورٹکل روڈ، گجرات

سلطان بک بیلس، گجرات

فاس بک ایمن پور بازار، فیصل آباد

نیو مکتبہ انس ایمن پور بازار، فیصل آباد

متقول بک انجینی چوک پاک گیٹ، ملتان

اکریم نیوز انجینی، اوکاڑہ

چوہدری بکڈ پوٹن بازار، دینہ

عمر بک ستر جی روڈ، سرائے عالمگیر

ٹکلیں بکڈ پو، سمندری

مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد

نیو ہاڑی کتاب گھر، جناح روڈ، ہاڑی

ہلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ، میاں چنوں

نیشنیس بکڈ پوٹن بازار، میاں ٹوں

خالد کتاب محل، سیالکوٹ روڈ، اگوکی

پاکستان بکڈ پوٹن بازار، جلال پور جہاں

جلنم بک کارز، جلم

منور بک ڈپ گجرات

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

خزینہ علم و ادب اکریم ہمار کیٹ اردو بازار، لاہور

مشائق بک کارز اکریم ہمار کیٹ اردو بازار، لاہور

اسلامی کتب خان، فضل الہی ہمار کیٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب گھر کمپنی چوک، راولپنڈی

علی شیخزر، حیدری چوک، لاہل موئی

رجمن بک ہاؤس اردو بازار، کراچی

احمد بک کار پوری شن اقبال روڈ کمپنی چوک راولپنڈی

مسٹر بکس پرمار کیٹ اسلام آباد

مکتبہ ضایا یہ بوجہ بازار، راولپنڈی

گذک بکس شاپ صدر بازار، راولپنڈی

بنخیار سرزقہ خوانی بازار، پشاور

بلگش بکڈ پورڈو بازار، سیالکوٹ

ماڈرن بکڈ پو سیالکوٹ کینٹ

کھوکھر بکشال مسلم بازار، گجرات

بانال بکڈ پو، گجرات

کتاب سرکار ایمن پور بازار، فیصل آباد

کتب خانہ مقبول عام ایمن پور بازار، فیصل آباد

شریف سرز کارخانہ بازار، فیصل آباد

کارواں بک ستر، ملان کیٹ

وار الکتاب کائی خروڈیلیہ

الیس کتاب محل پکھبری بازار، جزاںوالہ

ڈار ہارڈ تھیل بازار، جلم

جاندھر بکڈ پو، ڈسک

یونیورسٹی بک ہاؤس، پکھبری روڈ، منڈی بہاؤ الدین

شامل بک انجینی محل جاندھری پارک، ہلوب بک سگھ

میاں ندیم میں بازار، جلم

اسلامی کتب خان، حافظ آباد

کارواں بک ستر، بہاولپور

گلکیسی بکس، خان آر کید، پکھبری روڈ، سرگودھا

انور بک کارز محمدی پلازہ، میر پور آزاد کشمیر

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

بچپن کا دسمبر

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

ہاں مجھے یاد ہے

بچپن کا وہ دسمبر

بھٹھرتی ڈھلتی شاموں میں

<http://kitaabghar.com>

آنکن کی دیوار سے سر تی دھوپ

جلتے ہوئے کوئلے کی مہک

<http://kitaabghar.com>

لکیریں بناتے

<http://kitaabghar.com>

وہ جمے ہوئے آنسو.....

آسمان پر جنتی، وہ بادلوں کی دھند دیکھ کر

امی کا دروازے میں کھڑے ہو کر پکارنا

اور ہم سب کامٹی بھرے کنچے سنجال کر

<http://kitaabghar.com>

اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا

رات بھر چھپ چھپ کر

آسمان کو دیکھ

<http://kitaabghar.com>

برف گرنے کی دعا میں کرنا

<http://kitaabghar.com>

اور پھر صبح پوچھتے ہی

صحن میں گرتی برف کے ستارے چلتا.....

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

اور برف گرتے آسمان کو دیکھ دیکھ

خود کو بھی برف کے گالوں کے ساتھ

اڑتے ہوئے محسوس کرنا

<http://kitaabghar.com>
پھر تم آگئیں.....

اور بچپن کا دسمبر بیت گیا

تب پھر وہ اس سرکتی ٹھنڈی دھوپ تلے

اور ان ٹھنڈتی ڈھلتی شاموں میں

<http://kitaabghar.com>
میں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے

آسمان سے گرتی برف کی چاندی

اپنے وجود پر سجا تارہا اور

زمین پر بچھی اس سفید چادر پر

<http://kitaabghar.com>
میرے قدموں کا ہر نشان

تمہارے گھر کی دہلیز تک ہی جاتا رہا

پھر وہ دسمبر بھی بیت گیا

<http://kitaabghar.com>
اور دیکھو.....

میں اب بھی لگلی کے اسی نکٹ پر کھڑا ہوں

ٹھنڈتی ڈھلتی شام بھی ہے

پر سہری دھوپ نہیں سرکتی

<http://kitaabghar.com>
وقت جیسے قدم سا گیا ہے پیشکش

<http://kitaabghar.com>
برف کے ستارے میرے بالوں میں

چاندی بکھیر تو رہے ہیں

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

ہاشم ندیم خان

۱۵ جنوری ۲۰۰۸ء

(کوئٹہ)

email: hashimnadeem@gmail.com

<http://kitaabghar.com>

پرانیں بھگونیں پاتے
کیسی برفلی شام ہے پیشکش
جس کی سردی میرے آنسو جانیں پارہی
جنتے کو سکے کا دھواں
آنکھ تو جلاتا ہے

پاس میں وہ مہک نہیں ہے
اور دیکھو میرے گھر کا دروازہ
<http://kitaabghar.com>
پڑھو لے کھڑا تو ہے لیکن
امی کی ڈانٹ نہ جانے کہاں کھو گئی ہے؟
تمہارے گھر کی طرف جاتے سبھی راستے
اس قدر سنان کیوں پڑے ہیں؟
<http://kitaabghar.com>
اس برفلی شام میں اور

میرے بچپن کے دسمبر میں
کتنا فرق ہے کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش فہرست

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پہلا دور

کتاب گھر کی پیشکش

13
17

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

- 1 پہلی سیلی
- 2 پہلا اسکول
- 3 پہلا ساون

26

- 4 پہلا دوست

29

- 5 پہلی برف باری

کتاب گھر کی پیشکش

31
36

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

41

- 6 پہلی اجدهہ
- 7 پہلی چوری
- 8 پہلی مار

45

- 9 پہلاؤ اکہ

50

- 10 پہلابائی سکوپ

کتاب گھر کی پیشکش

58

- 11 پہلی جلن

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

67

- 12 پہلا کش
- 13 پہلا بھرم

73

- 14 پہلا چاند

77

- 15 پہلا جواء

کتاب گھر کی پیشکش

82
88

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

97

- 16 پہلی قربانی
- 17 پہلا الوداع

کتاب گھر کی پیشکش فہرست

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

دوسرے دور

105	جنلیین بسم اللہ	-18
113	رجہ کی کہانی	-19
115	پہلی پریمہ	-20
119	محانظہ	-21
121	پہلا چینج	-22
127	چہرہ	-23
130	پہلا چرچ	-24
137	بوا کی افواہ	-25
140	پہلی ٹوشن	-26
143	پاندی	-27
146	پہلی جعلازی اور جنلیین کیڈٹ عباد	-28
151	معصوم انتقام	-29
155	پہلی جیت	-30
159	پہلی محبت کی جوک	-31
165	پہلی قیامت	-32
178	پہلی بغاوت	-33
185	اپلی	-34
187	پہلا چھاپ	-35
191	رشتہ	-36

کتاب گھر کی پیشکش فہرست

<http://kitaabghar.com>

193

.....

۔۔۔۔۔ 37

196

.....

۔۔۔۔۔ 38

200

.....

۔۔۔۔۔ 39

204

.....

۔۔۔۔۔ 40

<http://kitaabghar.com>

208

.....

<http://kitaabghar.com>

آخري بک "Bunk" ۔۔۔۔۔ 41

211

.....

رشتوں کی سوی ۔۔۔۔۔ 42

217

.....

پہلا انقلاب ۔۔۔۔۔ 43

220

.....

دیر ہوجاتی ہے ۔۔۔۔۔ 44

225

.....

تیسرا اللواع ۔۔۔۔۔ 45

<http://kitaabghar.com>

229

.....

دوسری قیامت ۔۔۔۔۔ 46

242

.....

آخری نشر ۔۔۔۔۔ 47

246

.....

پہلی نظر ۔۔۔۔۔ 48

250

.....

آخری کفارہ ۔۔۔۔۔ 49

<http://kitaabghar.com>

255

.....

پہلی تعبیر ۔۔۔۔۔ 50

260

.....

بچپن کا دسمبر ۔۔۔۔۔ 51

267

.....

آخری میس ۔۔۔۔۔ 52

272

.....

آخری بھرم ۔۔۔۔۔ 53

277

.....

آخری دستک ۔۔۔۔۔ 54

<http://kitaabghar.com>

283

.....

آخری اللواع ۔۔۔۔۔ 55



کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

پہلا دور کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی سیمیلی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

۹۷۴ء کا دور تھا۔ ملک میں مارٹل لاء کو لگے دوسرا سال پورا ہونے کو آیا تھا۔ مجھے اردو کا پہلا قاعدہ لا کر دے دیا گیا تھا تاکہ میں ابھی سے اسے رثا شروع کر دوں۔ میں یعنی عبدالخان عرف آدی، اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور مجھے دوسال بڑی عمارہ اور پھر اس سے دوسال بڑے فاران بھیا تھے، جنہیں سب پیار سے فاری کہتے تھے لیکن میرے لیے وہ بڑے بھیا تھے۔ میرے اباد رجہ سوئم کے سرکاری ملازم تھے اور ہمارا سرکاری کوارٹر بھی اسی سرکاری کالوں کے درجہ سوئم کے کوارٹروں میں واقع تھا، جس کے درجہ اول کے بلکہ نامکانوں میں غیاث چچا کا گھر واقع تھا۔ دراصل ہمارا محلہ کافی وسیع تھا اور اس میں مجھے کی درجہ بندی کے حساب سے مجھے کے اعلیٰ درجے کے افراد سے لے کر درجہ سوئم کے ملازم میں تک مکانات کو بھی تین درجہ بندیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یوں ایک ہتھی کالوں کے وسیع کپاڈنڈ کی چار درجہ بندی کے اندر دراصل تین محلے آتے تھے۔ کالوں میں داخلے کا راستہ ایک واحد اور بڑے چھانک نما گیٹ سے ہو کر گز رتا تھا اور اس راستے پر پہلی تین قطاریں درجہ سوئم کے ملازم میں کی تھیں، پھر درجہ دوئم اور پھر درجہ اول کے افران کی باری آتی تھی۔

بہر حال ہم سارے محلے کے بچے ایسی کسی بھی درجہ بندی سے قطعاً آزاد تھے اور ہم سب بلا کسی روک ٹوک اور دھڑلے سے محلے کے بھی گھروں میں کوڈا چھاندی کرتے پائے جاتے تھے۔ غیاث چچا، جن کا پورا نام غیاث الدین تھا، میرے ابا کے دور پار کے کسی رشتے سے چھاڑا بھی لگتے تھے اور وجہہ ان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی کا نام تھا، جو ہم سب چھوٹے بچوں کی وجہ پر تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن مجھے پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا تھا، اسی دن وجوہ آپی سفید فرماں اور بالوں میں سرخ بن باندھے آٹھویں جماعت میں بیٹھ چکی تھیں۔ غیاث چچا نے ان کا داخلہ شہر کے سب سے اعلیٰ اور مہنگے انگریزی میڈیم اسکول میں کروار کھا تھا اور روز صح صوریے کرم دین (کرمو) کا تانگہ انہیں اسکول لے جانے کے لیے ٹھیک سائز ہے سات بجے بھونپو بھاتا ہوا محلے کے چھانک سے چھانک سے اندر داخل ہوتا تھا۔

حالانکہ ہمارے محلے میں وجوہ آپی کی ہم عمر میان سے ایک آدھ سال بڑی یا چھوٹی اور بھی، بہت سی ”آپیاں“ موجود تھیں لیکن ان سب میں میری سب سے پسندیدہ وجوہ آپی ہی تھیں اور میں صرف انہی کے کام بھاگ بھاگ کر کیا کرتا تھا۔ ہمارے محلے کے بڑے میدان میں جو دوسرے اور پہلے درجے کے مکانوں کے بیچ میں پڑتا تھا، سر شام ہی مختلف پھیری اور ٹھیلے والے جمع ہو جاتے تھے اور جیسے ہی وجوہ آپی کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی یا کچھ بھی مانگوانا ہوتا تو آدی میاں یعنی میں ہی بھاگ کر انہیں وہ چیز مہیا کرنے میں سرفہرست ہوتا تھا۔ کبھی میں فالے والے کی پتوں کی توکری لیے و جو کے صحن میں پہنچا رہا ہوتا کہ وہ توکری میں سے اچھے اور تازہ فالے چھانٹ لیں تو کبھی برف ملائی والے سے قلفیاں یا گولے گندے والے سے برف

کے گولے پر ان کے پسندیدہ رنگ دار شیرت ڈالا کران کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا ہوتا تھا، لیکن یہ سب کچھ بھی گھر پر نہیں ہوتے تھے یا اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر مطالعہ کر رہے ہوتے تھے، کیونکہ ان کی موجودگی میں ان تمام چیزوں کی "رسد" و "جو آپی تک پہنچانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیاث پچا کو یہ تھیلے والی چیزیں بالکل پسند نہیں تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں کو کھانے سے بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ (حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی بچہ آج تک ان چیزوں سے بیمار نہیں پڑا تھا)۔ لہذا وہ مجھے بھی ان تھیلے والوں سے بھیشہ دوڑ رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور میں معصوم ہی صورت ہنانے سر ہلاتا رہتا تھا لیکن جیسے ہی غیاث پچا ناظر سے اوچھل ہوتے، مجھے اور جو آپی کو اپنی منی کا موقع مل جاتا۔ ایسے میں وجود ہوتا اور ہم آپی کی امام، یعنی سیکنڈ خالہ ہم دنوں کو روکتی ہی رہ جاتیں اور ہم تک سارے فالے، جامن، بیریاں بھری کی تو کری کی تو کری چٹ کر چکے ہوتے۔ ویسے بھی سیکنڈ خالہ بہت نرم دل تھیں اور وجہ سے تو آج تک انہوں نے اوچے لجھے میں بھی کبھی کوئی بات نہ کی تھی لہذا ایسے میں اگر غیاث پچا کہیں سر کاری دورے پر دو چار دنوں کے لیے کہیں شہر سے باہر چلے جاتے تو میری اور جو کی تو چاندی ہو جاتی۔ تب وہ جو میرے ذریعے تھیلے والے کو بالکل اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بلوایتیں اور اگر کوئی چھوٹی پھیری یا تو کری والا ہوتا تو وہ تو کری سمیت گھر کے بڑے صحن میں موجود ہوتا اور ہم دنوں اطمینان سے اور بڑے "شہابہ" انداز میں اس کا مال اڑائے جاتے اور سیکنڈ خالہ "ارے، ارے....." کرتی رہ جاتیں۔ وہ جو آپی کے گھر کا ایک کردار فضلو بابا بھی تھے، جن کا اصل نام توفیل دین تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فضلو بابا بن کر رہ گئے تھے۔ وہ غیاث پچا کے کنوار پنے کے دور کی یادگار تھے اور ان کی مجھے میں پہلی تعیناتی کے وقت سے ان کے ساتھ ہی تھے۔ تب غیاث پچا کی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ غیاث پچا پھٹکتے میں سالوں سے جہاں بھی گئے، فضلو بابا اپنے گھر کے کام کا ج کے لیے بھرتی کیا تھا، لیکن تب سے وہ غیاث پچا کی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ غیاث پچا پھٹکتے میں سالوں سے جہاں بھی گئے، فضلو بابا ان کے ساتھ ہی رہے اور اب تو وہ ان کے گھر کا ایک مستقل حصہ بن چکے تھے اور گھر کی کچھلی جانب بنے سرفوش کو اڑا رہیں ہی رہتے تھے۔ وہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھیں اور وہی سب سے زیادہ ان کے لاذبی اٹھاتے تھے، اس لیے اگر کبھی قلطی سے مجھ سے یا وہ جو سے کوئی تھیلے والا چھوٹ بھی جاتا تو وہ آکر چپکے سے کبھی میرے اور بھی و جو کے کان میں بتا دیتے کہ باہر "بھٹے والا گھوم رہا ہے" یا پھر "نمکین چنے اور میٹھے مرمرے والا کچھ ہی دیر میں محلے سے نکل جائے گا" جلدی کرا لو جو بھی کرنا ہے، اور دوسرا ہی لمحے میں محلے کے پھانک کی طرف اڑا جا رہا ہوتا تھا۔

قو آپی جب اسکوں سے واپس آ جاتیں اور وہ پھر کروانیا اسکوں کا کام لے کر بر گد کے پیڑ کے نیچے اپنے صحن میں اپنا بستہ کھول کر اپنی کتابیں نکال لیتیں، تب میرا محبوب مشغل ان کی ڈرائیگ کی کاپی کے صفحے پلٹ کر سینکڑوں مرتبہ پہلے کی دیکھی ہوئی وہ تصاویر دیکھنا ہوتا تھا، جو خود وہ جو آپی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوتی تھیں۔ ان کی ڈرائیگ بہت عمده تھی اور تصویروں میں رنگ بھرنا تو انہیں خوب آتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ ایک رنگ ڈر اسما بھی دوسرے رنگ پر چڑھنے پائے اور جو تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی قاعدے اور سلیقے کی قائل تھیں۔ ان کے بیتے میں رکھی کتابوں کی ترتیب تک ان کی نفاست کی گواہ تھی۔

جب تک میں اسکوں میں داخل نہیں ہوتا تھا، میرا تقریباً سارا دن ہی ان کے اسکوں سے واپس آ جانے کے بعد انہی کے گھر میں گزرتا تھا، پھر شام ڈھلنے والے فاری بھیا مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں آپنچھتے اور گھر والپس لے جاتے وقت سارا راستہ ڈراتے رہتے کہ امی شدید غصے میں اور ہاتھ

میں باور پچی خانے سے بڑا والا چمنا لیے چکن ہی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہیں لیکن جیسے ہی میں چکن کا دروازہ کھولتا اور امی پر میری نظر پڑتی میں بھاگ کر جا کے ان سے پہلے کرامی مجھے کچھ کہیں میں فوراً فاری بھیا کی شکایتیں لگانا شروع کر دیتا کہ وہ مجھے سارے راستے ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے لے کر گھر آئے ہیں۔ امی بھی دوسرے ہی لمحے سب بھول کر بڑے بھیا کوڈا منٹے لگ جاتیں کہ ”لکنی بار کہا ہے کہ چھوٹے بھائی کو یوں نہیں ڈرایا کرتے، اس طرح بچوں کے دل میں ہمیشہ کا ڈر بیندھ جاتا ہے جو پھر کسی نہیں لکتا۔.....“، غیرہ وغیرہ۔ یوں ہر بار میں امی کی ڈاٹ سے فتح جاتا اور ان کا سارا غصہ بڑے بھیا پر نکل جاتا، جو بے چارے پچھلے گھنٹے بھر سے میری تلاش میں پورے محلے میں ہلاکا ہو رہے ہوتے تھے۔

دوآپی جب اپنے اسکول کا کام کر رہی ہوتی تھیں تو اس وقت میرا پسندیدہ مشغله اپنی کچھ کپی بنائی ہوئی تصویریوں میں وجوہ آپی سے ان کے پانی والے رنگ لے کر ان میں رنگ بھرنا ہوتا تھا۔ مجھے ان کے پانی والے رنگوں کی ڈبیا بہت پسند تھی، جس میں بارہ رنگوں کی تکمیل اور اس کے ساتھ ہی صاف اور استعمال شدہ پانی کی چھوٹی چھوٹی سلوکی دوپیالیاں ڈبیا کے اندر ہی گئی ہوتی تھیں۔ وجوہ ساتھ ساتھ مجھے رنگ بھرنا بھی سکھائے جاتیں اور اپنے اسکول کا کام بھی ختم کر لیتیں۔ مجھے رنگوں کا جنون تھا لیکن خود میں اپنے محدود جیب خرچ میں بمشکل پچاس پیسے میں دستیاب مowی رنگوں کی وہ چھوٹی سی ڈبیا خرید پاتا تھا، جس کے اندر تین انچ کی لمبائی کے برابر، بارہ عدد رنگیں مowی پنسلیں ہوتی تھیں لیکن وہ رنگ بے حد نازک ہونے کی وجہ سے بہت جلدیوں جاتے تھے اور استعمال بھی بہت نیزی سے ہو جاتے تھے، لہذا دوآپی کے ان قیمتی پانی والوں رنگوں سے اپنی تصویریوں میں رنگ بھرنا میرے لیے ایک بہت بڑی عیاشی سے کم نہیں تھا۔ وجوہ آپکے لیے غیاث پچاہر ماہ ”ڈسیر بر انڈ“ کی بارہ رنگیں پنسلیں کی ڈبیا بھی لے کر آتے تھے۔ میں کی بنی ہوئی اس ڈبیا پر کالے ہرن کی ایک تصویر بھی ہوئی تھی اور ہر ماہ ہی ڈبیا مٹھے پر وجوہ انپی پرانی آدمی استعمال شدہ پنسلیں میرے حوالے کر دیتی تھیں اور اگلا پورا مہینہ میں ان کی دی ہوئی یہ پنسلیں عمارہ اور بڑے بھیا سے چھپا چھپا کر رکھنے میں صرف کر دیتا تھا کیونکہ وہ دونوں میرے رنگوں کے دشمن تھے، باقی رنگوں کی تو خیر تھی لیکن جو تک دیئے ہوئے یہ رنگ میں کسی بھی قیمت پر کسی اور کو استعمال کرنا نہیں دکھے سکتا تھا لہذا عمارہ اور بھیا سے اس بات پر ہمیشہ میرا جھگڑا ہی ہوتا رہتا کہ ”میرے بزرگ کی پنسل کس نے انھی؟“، ”یہ دھانی رنگ کی پنسل زیادہ حصی ہوئی کیوں ہے؟“، ”سرخ پنسل کی نوک کس نے توڑی، ابھی تو میں نے تازہ گھر کے رکھی تھی۔“

مجھے تو خود دوآپی بھی کسی نازک رنگیں پنسل جیسی ہی دکھتی تھیں۔ تیکھے اور نازک سے نقوش، گلابی رنگت، بڑی بڑی سی کالی آنکھیں، ستواں کی ناک اور گالوں میں پڑنے والے دوچھوٹے چھوٹے سے گلابی گڑھے گویا نقش ایسا جیسے کسی مصور نے برسوں کی محنت کے بعد تیز نوک والی گلابی پنسل سے زندگی کے کورے سفید کاغذ پر کوئی مورت اتاری ہوا اور پھر وہ ذہین بھی اتنی تھیں کہ پانچویں جماعت میں ہی ضلع بھر میں ان کی بھی پوزیشن آئی تھی اور ان کو حکومت کی جانب سے وظیفہ بھی ملا تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز غیاث پچانے و جبوکی اتنی بڑی کامیابی پر پورے محلے کی دعوت کی تھی۔ تمام گھر کو اندر اور باہر قلعی پھیر کر سفیدی سے چکایا گیا تھا۔ ماشکی دوپہر سے کئی مرتبہ گھر کے بیرونی راستوں پر چڑکا کر کچکا تھا، تاکہ گرد مستقل بیٹھ جائے۔ نیلے پیلے، ہرے، سرخ اور ادے رنگوں کی تیوں کی چمکتی لڑیوں سے سارے گھر کو سجا گیا تھا۔ ہم سارے محلے کے بچوں کے لیے ”میری

بیکٹ" کے سرخ چمکتے سن منگوائے گئے تھے، جس پر ایک گھومتی ہوئی بچی کی تصویر یعنی ہوتی تھی۔ غیاث پچا کونٹ نے ریکارڈ جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا اور ان کے پاس ہر نی پرانی اندیں فلم کے بہت سے ریکارڈ جمع تھے اور اس شام کی انہوں نے خصوصی طور پر یہم تا کامشہوں کے جھروکے سے "والا ریکارڈ آتی زور سے لگا رکھا تھا کہ اس کی آواز ہمارے گھر تک بھی آ رہی تھی۔

اسی دن سے وہ آپی میری سیلی کے طور پر مشہور ہو گئی تھیں کیونکہ محلے کے ایک بزرگ نے بھاگتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا تھا کہ "آدمی میاں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" میں نے جلدی سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ وہ جاؤپی کے گھر دعوت پر جا رہا ہوں لیکن وہ بڑے میاں تو مجھے چھیڑنے کے موڑ میں تھے پھر پوچھنے لگے کہ "بھلا یہ وہ جاؤپی تمہاری کون ہیں؟" مجھے جلدی سے اور کچھ رشتہ تو سوچنا نہیں اسی لیے بول پڑا "میری سیلی"..... بس جی پھر کیا تھا وہ بڑے میاں خود تو ہستے ہستے لوٹ پوٹ ہوئی گئے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے فوراً ہی پورے محلے میں منادی کروادی کہ "خواہی کی سیلی ہیں۔" پھر تو جسے بھی دیکھو مجھے روک روک کر بھی پوچھتا کہ "ہاں بھی، آدمی کی سیلی کیسی ہے؟" خدا ہچاۓ ان بڑوں کی شراتوں سے، ایک بار کسی بات کے پیچھے پڑ جائیں تو پھر اس کا بتقلید بنانے میں ان کا بھی جواب نہیں۔

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

جو چلے تو جاں سے گڑا گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جائے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقبات اور نفرت کے آداب نجھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بیانی و عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خیر اپنی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی لکھش غالب ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میرمنہیں انساں ہونا۔ آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کھن اور صبر آزمہ ہوتا ہے۔ لیکن "انسان" درحقیقت وہی ہے جس کا "شہر" اس کے "خیز" کو نکلت نہیں دے پایا، جس کے اندر "خیز" کا الاؤڑ و شن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گڑا گئے** کتاب گھر پر دستیاب جسے **ناول سکشن** میں دیکھا جاستا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا اسکول

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

وہ آپی کو روزانہ سفید فرما کے اور سر پر سرخ رہن سے پونی ٹیل باندھے بڑے کرد弗 سے اسکول جاتے دیکھ کر میرے دل میں بھی اسکول جانے کی خواہش مچنے لگی تھی۔ درمیان میں ایک آدھ مرتبہ و جو خود بھی مجھے اپنے ساتھا پنے اسکول لے کر گئی تھیں۔ اس روزانہ کے اسکول میں ”بینا بازار“ لگا ہوا تھا اور جس پوچھتے تو مجھے ان کا رنگ برلنگی جھنڈی یوں سے سجا ہوا اسکول بے حد پسند بھی آیا تھا۔ سفید بس میں ملبوس بہت سی گوری نیم جیسی عورتیں سارے بچوں کو تجھے تھا ف دے رہی تھیں جن میں چالکیت اور خشک دودھ کے بسک بھی شامل تھے۔ وجوہ مجھے اپنی بیچرے بھی ملوایا، جنہیں سارے بچے سسٹر کیری کے نام سے پکار رہے تھے۔ مجھے تو وہ خود کسی بڑی کلاس کی طالبہ جیسی لگی تھیں۔ پیاری سی سسٹر کیری نے مجھے بہت ساری کھانے کی چیزیں دیں اور میرے گال بھی خوب کھینچے۔ اسی دن سے میرے ذہن میں اسکول کا خاکہ ایک ایسی ہری بھری اور خوب صورت پکھوں اور گلابیوں سے اٹی ہوئی رنگ برلنگی چار دیواری کا بن گیا تھا، جس میں خوب صورت پر جیسی نیمیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، انہیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں دیتی تھیں اور ذرا رازدار اسی بات پر ”اوہ ماں لعل چالمنڈا“ کہہ کر ان کی طرف دوڑی ہوئی چل آتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت انگریزی کے اس جملے کی مجھے ذرا بھی سمجھنہ نہیں تھی لیکن ان کے انداز سے اتنا تو میں سمجھتی ہی سکتا تھا کہ یہ بھی ان کے پیار کا ایک انداز تھا، جیسے وہ آپی کبھی کبھی میری چھوٹی سی ناک کو اپنی انگلی سے زور سے دبا کر کہتیں ”چلو آدمی، بلی بن کر دکھاؤ“ اور میں جلدی سے آنکھیں زور سے میچ کر بلی بن جایا کرتا تھا اور جو آپی زور سے نہ پڑتی تھیں۔

اسی لیے میں نے بھی اپنا کالایا ہوا ردو کا قاعدہ جلدی جلدی عمارہ کی مدد سے پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر آخر کار وہ دن آہی گیا، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروانے کے لیے تمام ”تیاریاں“ مکمل کر لی گئیں۔ اس سے ایک رات پہلے خوشی کے مارے مجھے نیند ہی نیند آئی اور میں ساری رات کر دیں بدل تارہ۔ صبح اٹھتے ہی میں نے بھاگ کر صحن کے دروازے سے باہر جانا کہ کہیں مجھے اسکول لے جانے کے لیے تاگدہ آتونہیں گیا لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ میں جلدی سے بھاگ کر امی کے پاس باورچی خانے میں گیا، جو آج اپنے راجہ بیٹی آدمی کے اسکول جانے کے پہلے دن کی خوشی میں اس کے لیے پرانا بنا رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے لینے کے لیے تاگدہ کب آئے گا؟ امی میری بات سن کر زور سے نہ پڑیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے لینے کے لیے تاگدہ نہیں آئے گا بلکہ ابا مجھے اپنی سائکل پر اسکول داخل کرنے لے جائیں گے۔ یہ سنتے ہی میرا آدھا مزہ تو وہیں کر کر رہ گیا کہ بھلا بچے کب اپنے ابا کی سائکل پر اسکول جاتے ہیں؟ اور سائکل بھی کون سی.....؟ ابا کی وہ پرانی کھنڑا ”سہرا“ سائکل.....؟ میں تو عام حالات میں بھی اس پر ابا کے ساتھ بیٹھنے سے گریز کرتا تھا تو یہ تو پھر بھی اسکول جانے کا معاملہ تھا۔ بھلا میرے اسکول کی میم

استانیاں مجھے ابا کی سائیکل کے ڈنڈے پر لگی اگلی چھوٹی سی گدی پر بیٹھے اسکول آتے دیکھ کر کیا سوچیں گی؟ اور ان کی نظروں میں میری بھلا کیا خاک عزت رہ جائے گی؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میں تانگے کے بناء اسکول نہیں جاؤں گا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ کہیں تانگے کو بہانہ بنانا کریمے گھروالے واقعی میرا اسکول جانا ہی منسوخ نہ کر دیں۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ ایک بار میرا اسکول میں پکا داخلہ ہو جائے، تب میں تانگے کے لیے بھوک ہڑتال ضرور کروں گا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

خدادا کر کے ابا نے اپنی سائیکل گھر سے باہر نکالی اور میں امی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ملیشیا (کھدر) کے کپڑے کا بستہ گلے میں ڈال کر جلدی سے سائیکل پر بیٹھ گیا اور ابا مجھے لیے اسکول کی جانب رووانہ ہو گئے لیکن یہ کیا؟ یہ تو کسی اور جانب ہی مڑ گئے تھے اور محلے کے چنانکے نکل کر دیں ایسے کے بجائے باسیں جانب چند ہی پیڈل مار کر سڑک کی دوسری جانب ایک عجیب سی بھدڑی اور بد نما پیلے رنگ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں سمجھا یہ ابا کا دفتر ہو گا لیکن میرے تو ہوش ہی اڑ گئے، جب انہوں نے سائیکل کو اس کے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور مجھے اتراتے ہوئے بولے ”او بھی..... آ گیا ہمارے آدمی کا اسکول۔“ ابھی میں ان سے یہ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ ابا جی آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسی اتنا میں ایک سخت گیر قسم کے مولانا جن کی شکل و شاباہت ہماری مسجد کے پیش امام سے ملتی جلتی تھی، سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ابا سے ہاتھ ملایا اور مجھے یوں دیکھا، جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ ابا نے ان سے کہا کہ یہ میرا بخوردار عباد ہے اور آج سے یہ آپ کے حوالے ہوا۔ میں جلدی سے ابا کی ناگوں کے پیچے چھپ گیا لیکن ابا تو بالکل ہی انجانان بن گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے کھینچ کر مجھے آگے کر دیا۔ مولانا صاحب (جن کا نام بعد میں حافظ انور معلوم ہوا) نے میرا بات تھتھی سے پکڑ دیا، جیسے ان کو اس قسم کے ”اودائی الحات“ کا پہلے سے ہی کافی تحریک ہو۔ ابا بیگانوں کی طرح اپنی سائیکل پر بیٹھے اور پیڈل مارتے ہوئے یہ جا اور وہ جا۔ میں ان کے پیچے چیختا چلاتا ہی رہ گیا اور میرے موٹے سے آنسو میرا دامن بھگوتے رہے اور ماشر جی مجھے کھینچتے کھانچتے میری جماعت میں لے آئے، جہاں پہلے سے زمین پر ثاث بچھائے تھے میں پیش تیس بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے وجوہ آپ کی کلاس میں خوب صورت ڈیک پڑے ہوئے دیکھے تھے، جب کہ یہاں تو گرد سے اٹے ہوئے ثاث پر مجھے زبردستی بھٹھا دیا گیا تھا۔ باقی بچے بھی کافی سہبے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں نے میم استانیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میرے ساتھ ثاث پر بیٹھے دوسرے بچے نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے دو دن پہلے سے یہاں آ رہا ہے اور اس نے یہاں کوئی میم نہیں دیکھی۔ لبس اسی قسم کے ماشر پاٹے جاتے ہیں، جیسے ہمارے سامنے کری ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بچے کا نام راجہ تھا اور وہ ہمارے محلے میں تیسرے درجے کے کوارٹروں میں چند گھر چھوڑ کر رہتا تھا، پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو آس پاس بہت سے بچے ہمارے ہی محلے کے وہاں بیٹھنے نظر آئے۔ یا اللہ یہ کیا ما جرا تھا؟ یہ کیسا اسکول تھا جو اسکول کم اور کوئی جیل زیادہ لگ رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہوں آنے لگے کہ اس ”فضول جگہ“ اب مجھے روزانہ آنا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ماشر جی نے ہمیں اردو کا پہلا قاعدہ نکالنے کا کہا اور ایک کالے رنگ کے تختے پر پہلے ”آ“ اور پھر ”م“ جوڑ کر آم لکھ دیا اور اگلے ایک گھنٹے تک ہمیں بے قوف سمجھ کر اسی ایک لفظ کی گردان کرواتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اسی ماشر نے اردو سے دیبات کے استاد کا روپ دھار لیا اور ہمیں عربی کی آیتیں پڑھانے لگے، ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے پھر چولا بدلہ اور ریاضی کے ماشر بن کر دو کا پہاڑہ رٹانے لگ گئے۔ بچ پوچھیں تو میں اسی ایک استاد کا چہرہ دیکھ دیکھ کر بے حد بور ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس

طرح کے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں ہر جماعت کا بس ایک ہی ماسٹر ہوتا ہے، جو بیک وقت اردو دان، ریاضی دان، دینیات، معاشرتی علوم، سائنس اور اسلامیت تمام مضامین کا ”ماہر“ ہوتا تھا اور اگلا پورا ایک سال یہی صاحب ہمیں یہ سارے مضامین پڑھائیں گے۔ لاحول ولاقوة..... بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا.....؟ وہاں قواؤپی کی جماعت میں تو میں نے خود یہ کھاتھا کہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد استانی بدلت جاتی تھی۔ چلو یہ بھی شکر ہے کہ پہلی جماعت میں صرف اردو قاعدہ اور دینیات کا سبق ہوتا تھا یا پھر ریاضی کے چند پہاڑے رہاویے جاتے تھے ورنہ ایک ہی ”صورت“ سے اتنے مضامین پڑھنا کم از کم میرے بس کی توبات نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں تختی نکانے کا حکم دیا گیا اور ایک جانب قاعدے سے الف ب دیکھ د کھ کر اور دوسرا جانب ایک سے لے کر دس تک گفتگو کی تھی کہ کھنڈے کا حکم دے دیا گیا۔ آس پاس کے تمام بچے جاہلوں کی طرح اپنی اپنی دوات نکال کر اس میں قلم ڈبوڈ کر کھنٹے سے زیادہ اردو گرد چھیننے اڑانے لگے۔ میرے اجلے کپڑوں پر بھی چھیننے گرے اور مجھے بہت غصہ بھی آیا کیونکہ امی نے آج صبح ہی پورا ایک گھنٹہ لگا کر میرے یوینفارم کو اپنی جیزیروالی کوٹکوں کی بڑی استری سے گڑ رگڑ کر اس کی ٹکنیں دور کی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں میں نے لوہے کی جاں والی کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک بوڑھے سے شخص کو ایک ہاتھ میں لوہے کی ایک بڑی سی راڑ اٹھائے برآمدے میں لگی پتیل کی اس بڑی سے پلیٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا جو ایک تار سے نگلی ہوئی تھی۔ اس نے وہ راڑ زور سے دو مرتبہ پتیل کی تھالی پر ماری۔ ٹنٹن کی آواز گوچی اور بچوں نے خوشی سے نفرہ لگایا۔ میں سمجھا کہ چھٹی ہو گئی ہے اور جلدی سے اپنابستہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا لیکن ماسٹر جی نے مجھے گھوڑتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈٹلے کے اشارے سے بستہ دوبارہ نیچر کھدیئے کا اشارہ کیا۔ پتہ چلا کہ ابھی صرف آدمی چھٹی ہوئی ہے، جسے وجوہ کے اسکول میں بریک کہتے تھے۔ میں انتفار کرنے لگا کہ ابھی شاید کچھ دیر میں یہاں بھی وجوہ کے اسکول کی طرح کوئی میم نہ ہی، کوئی ماسٹر ہی آکر ہمیں کھانے کے پیکٹ دے کر جائے گا، جس میں بسکٹ، چاکلیٹ اور جام لگی ہوئی ڈبل روٹی ہو گی..... لیکن یہ کیا۔ یہاں تو ایسا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ وہی شخص جس نے آدمی چھٹی کے اعلان کے لیے گھنٹی بجائی تھی کچھ ہی دیر میں مختلف خواص پے سجائے برآمدے میں آکر بیٹھ گیا تھا اور پچے اپنی اپنی جیبوں سے سکے نکال کر اس سے بھٹے ہوئے چنے، مرمرے، بتاشے اور جانے کیا کیا الابالے کر کھانے لگ گئے۔ اتنے میں اسکول کے گیٹ سے ایک اور بابا ٹھیک دھکیتے ہوئے برآمدہ ہوا اور زور زور سے آواز لگانے لگا ”آ لو چھو لے..... اٹی والے چھو لے..... چاول چھو لے.....“ کچھ ندیدے قسم کے بچے اس کی آواز سن کر یوں اس کی جانب دوڑ پڑے، جیسے انہیں زندگی میں کبھی چاول چھو لے کھانے کو ملے ہی نہ ہوں۔ کچھ بچے جو صح سے رور ہے تھے اور جن کے ماں باپ نے انہیں اسکول جانے کی ”فیس“ کے طور پر چند بڑے سکے دیے تھے وہ اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی بیہر، فالے، گڑ کے شیرے میں خشک کیے گئے چاولوں کے لٹڑا اور گڑ کی بنی لاٹی کی دعوت میں شریک کر رہے تھے۔ راجنے کوئی ایسی ہی اوث پٹا گک سی چیز بے دھیانی میں میرے ہاتھ میں پکڑا دی، جسے میں نے فوراً ہی نظر پچا کر کیا ری میں پھینک دیا۔

آدمی چھٹی ختم ہوتے ہی ہمیں اپنی تختیاں پھر سے دھونے کا حکم دیا گیا اور ہم سب اسکول کے احاطے میں بننے تا لاب پر اپنی تختیوں پر میٹ ملنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے آس پاس بہت دیکھا لیکن یہاں ”اوه ماںی چالاکڈا“ کہہ کر بچوں کے کام کرنے والی کوئی آیا وکھاں نہیں دی۔ کیا بے ہودہ اسکول تھا یہ بھی۔ تختیوں کو دھوپ میں خشک کرنے کے لیے رکھ کر ہم پھر سے جماعت میں آگئے۔ ماسٹر جی نے ہمیں صبح کے سبق کی دہرائی

کا حکم دے دیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ کر اوٹ گھنٹے لگ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ ہی دیر میں کاس کا ہر بچہ انہی کی طرح لمبی لمبی جمائیاں اور انگڑا ایسا لینے لگ گیا۔ جماعت کی آخری رو میں بیٹھے چند بچوں میں سے ایک آدھ تو اپنی نیند کی جھونک میں زور سے سامنے زمین پر بجھے میں گر پڑا اور پھر جلدی سے اٹھ کر طوٹے کی طرح اپنا سبق دوبارہ رٹنے لگ گیا۔

بالآخر پوری چھٹی کا گھر بھی بیٹھی گیا اور سب بچے شور چاتے ہوئے ایک ریوڑ کی مانند تیزی سے اپنی اپنی کلاسون سے نکل کر باہر کے گیت کی جانب بھاگے۔ گرد کا ایک ایسا طوفان اٹھا کہ پہچانا مشکل ہو گیا کہ ہم میں سے کون محدود ہے اور کون ایا ز.....؟

میں نے سب بچوں کے نکل جانے کا انتفار کیا اور پھر اپنا بستہ گلے میں ڈالے اور اپنی تختی قمام کر گھر کی راہ لی۔ اب انہی کی طرف میتھے راستہ سمجھا دیا تھا اور ہمارا محلہ و سڑک پار ہتی تو واقع تھا لیکن راستے میں پڑتی شہر کی بڑی سڑک پار کرنا میرے لیے ہمیشہ اور پہلے دن ہی کی طرح مشکل اور جان جو حکم میں ڈالنے والا کھنڈن مرحلہ رہا۔ آخر کار میں نے اس خطروناک رش والی سڑک کو پار کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈتے ہی لیا۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں ایک دو، تین کہہ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے تاہم ہی دوڑ کر بند آنکھوں سے ہی سڑک پار کر جاتا تھا۔ اپنے ڈر اور خوف اور سڑک پر دوڑتی بڑی بڑی خوفناک گاڑیوں کے خطرات سے بچنے کا یہ ”تیر بہدف“ نسخہ بھی ناکام نہیں ہوا۔ بعد میں بھی زندگی میں کئی مرتبہ، جب مجھے کسی ایسے خوف اور ان جانے خطرے کا سامنا کرنا پڑا تب بھی میں نے یہی فارمولہ آزمایا اور ہر مرتبہ میں اپنے خوف اور ڈر کی وہ خطرناک سڑک کامیابی سے پار کرتا گیا البتہ جب کبھی میں نے اس خوف سے چونک کر آنکھیں کھولنے کی غلطی کی اور ڈر کر کا یا پلانا تو وہیں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔

گلستانہ اولیاء

کتاب گھر کی بیشکش

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلام اور ہمی کی عالمانہ عرق ریزی کا منیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ صہری، حضرت خوبیہ معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شیر، حضرت مولانا جلال الدین رومی، حضرت شاہ قبول اولیا، حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی، حضرت سلطان باہو، حضرت حافظ محمد عبدالکریم (موہری شریف)، حضرت خوبیہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد مصوص (موہری شریف)، حضرت شاہ کمال بخاری، حضرت مخدوم حسام الدین ملتانی، حضرت حافظ محمد اسحاق قادری نقشبندی، حضرت سید سلطان احمد حنفی سرور، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلستانہ اولیاء کتاب گھر پرستیاب۔ جسے تحقیق و تالیف سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا ساون

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بہر حال اسکول کے پہلے دن مجھ پر جو بھی گزری اس کے بعد میں نے گھر آتے ہی امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اسکول کے نام پر آج مجھے جہاں بھیجا گیا تھا میں دوبارہ اس جگہ ہر گز جانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ وہاں اسکول جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور سارے کے سارے بچے نالائق ہیں، کسی کو کچھ نہیں آتا جاتا اور بچوں کی توبات ہی رہنے دیں وہاں تو ما سڑ بھی پورے دن میں صرف ایک لفظ ”آ.....م“ ہی میں رثا تارہ تھا۔ میں تو سائیکل پر بیٹھ کر جانے کو رہا تھا جبکہ اس اسکول میں تو تانگے پر بیٹھ کر جانا خود تاگے کی تو ہیں تھیں۔

میں نے امی سے کہا کہ مجھے وہ جو آپی کے اسکول جیسے اسکول میں داخل کروادیں پھر چاہے تا نگہ نہ بھی لگا کر دیں تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں پیدل ہی چلا جایا کروں گا۔ امی نے مجھے اپنے پاس بھال لیا اور میرے بالوں میں اپنی انگلی سے لگانگی کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ امی ایسی بات تجویز کرتی تھیں، جب انہوں نے مجھ سے اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تھی۔ امی نے دھیرے دھیرے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی وہ جو آپی جیسے اسکول کی فیس بھرنا اباکے بس کی بات نہیں ہے اور پھر میرے بڑے بھیا اور عمارہ بھی تو اور دو میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے، اس لیے مجھے بھی اب روزانہ اپنے اسی اسکول جانا ہو گا، جس میں پڑھنے کے لیے میں آج گیا تھا۔ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا اور پیر پڑھ کر یہ ناممکن ہے لیکن یہ امیاں بھی نا..... فوراً ہی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لیتی ہیں اور پھر مجبوراً ہم بچوں کو ان کی ”ضد“ کے آگے ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔ سو ایک بار پھر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ امی نے خوش ہو کر انہا مخصوص جملہ دہرا�ا۔

”تم دیکھنا..... میں اپنے راجہ بیٹی کے لیے کتنی اچھی گزیا لے کر آؤں گی۔.....“ پتہ نہیں وہ گزیا کب آنی تھی لیکن مجھے اگلے دن سے اسی اسکول کی یاتر اشروع کرنی پڑی۔ وقت رفتہ رفتہ گزرنے لگا۔ پہلی جماعت خدا خدا کر کے ختم ہوئی اور میں باعزت طور پر دوسری جماعت میں آگیا۔ اب اس پہلی عمارت میں رفتہ رفتہ میرا دل لگانے کا تھا پھر ایک دن میری زندگی کا وہ پہلا ساون برسا، جس نے آگے چل کر میری زندگی میں بہت کچھ بھگدو دیا۔

شاید مجھے وہ پہلی بارش یاد بھی نہ رہتی اگر اس روز و جو اسکول سے گھر واپسی پر اتنی دیرینہ کر دیتیں۔ بلکہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ وہ جو آپی اپنے نویں اور دویں جماعت کے مشترک کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھیں۔ غیاث چچا ان دونوں ہر لمحے وہ جو آپی کو فصیحتیں کرتے دکھائی دیتے کہ میٹرک کا امتحان زندگی کا سب سے اہم تعلیمی موڑ ہوتا ہے اور یہیں سے طالب علم کی مستقبل کی راہ معین ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں

اور وجوہ آپی بظاہر غیاث پچا کی موٹی موٹی باتیں غور سے سن رہے ہوتے لیکن ان سے نظر بچا کر ہم یونہی جھکے سر ایک دوسرے سے اشاروں میں با تین کرتے اور نمک لگا کر کچے بادلوں کی پھلیاں کھانے کے منصوبے بناتے ہوتے۔

اس روز صبح ہی سے آسان پر شری بادلوں کے گورے پھنے اور سانوں سلوںے جوڑے مغرب کی جانب سے اٹھنے لگے تھے۔ بادلوں کی سیکلی ہوا نہیں آسان کی گود میں اڑائے لیے پھر تی رہی، پھر دھیرے دھیرے یہ سارے شری ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے تاکہ زمین والوں پر بر سیں اور پھر ہم زمین والوں کو اس برسی بارش سے بچنے کے لیے یہاں وہاں بھاگتا دیکھ کر ہتھتے رہیں اور خوشی سے تالیاں بجا بجا کر گزگز اہٹ اور بکلی کی چک پیدا کر سکیں۔

میری نافی اماں ہمیشہ مجھ سے کہتی تھیں کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کے ”ڈنے“ ہیں۔ سو مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اللہ میاں ایک بڑا سا گذریا ہوگا، جس کے ہاتھ میں بڑی سی لاٹھی ہوگی اور وہ اس لاٹھی سے اپنی بھیڑوں اور دُنبوں کے اس رویوڑ کو ہاتھ پھرتا ہوگا۔ کبھی کبھی تو میرے ذہن میں خود اللہ میاں کی تصویر ایک بڑے سے بادل کی صورت میں ابھر آتی جو اپنے چہرے پر سکراہٹ سجائے اپنی بڑی سی آنکھیں کھولے آسان سے نیچے زمین پر اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز بھی ہم سب جماعت کے بچوں نے آسان پر تیرتی بدلیاں دیکھ کر گزگز اکراور باقاعدہ ہاتھ آسان کی جانب اٹھا کر دعا کیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ ”یاخدا آج بارش برسا دے۔“ ہماری وقت آمیز دعا کیں بارش کے رومانی موسم سے لطف اندوڑ ہونے کے لیے نہیں تھیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ہماری کلاس کی چھت بارش میں اس نیزی سے بچتی تھی، جیسے کوئی چھلنی پانی سے بھری ہو اور نیچتا ماسٹر جی کو بادل نخواستہ ہمیں چھٹی دینی پڑتی تھی کیونکہ برسات کے دنوں میں ہمیں باقاعدہ چھتری لے کر جماعت میں بیٹھنا پڑتا تھا یا پھر ہم سب بچے اخبار کے کاغذ سے ٹکون چھٹی ٹوپیاں بنا کر سر پر رکھ لیتے اور بارش کی ٹپ ٹپ پڑتی بوندوں کو اپنے سر پر تال دیتا ہو محسوس کرتے تھے۔ یہ کلاسیکی موسیقی سنایاں ہی ہماری مجبوری تھی کیونکہ تقریباً ہم سب بھی بچوں کے گھروں میں ایک عدد چھتری ہی برشکل میسر ہوتی تھی جس پر ہمارے اباوں کا قبضہ رہتا تھا۔ جب کبھی وہوپ کے دنوں میں خوش قسمتی سے وہ چھتری ہماری پہنچ میں آتی تو میرے دوست اسے کھول کر اونچائی سے جھپ لگانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے لیکن ہماری چھتری کی اندر ورنی کڑیاں اکثر ہوا کے دباؤ کے باعث اٹھی ہو کر چھتری کے پیالے کو آسان کی جانب پلٹ دیتی تھیں، یوں چھتری کا رخ اور پر کی جانب ہوتا اور ہم سب زمین پر اوندھے منہ پڑے ہوتے تھے۔

آخر کار اس روز بھی ہماری دعا کیں رنگ لے ہی آئیں اور آدمی چھٹی ہونے سے پہلے ہی موسلا دھار بارش بر سا شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب فوراً ایک تیزی جھر جھری لے کر کھڑے ہو گئے کیونکہ عین ان کے سر کے اوپر سے پانی کا ایک تیز پر نالہ گرنا شروع ہو گیا تھا۔ سب بچے بچوں کے بل بیٹھے انہیں اس طرح امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے کسی ریس کو رس گرا و مذمیں ریس کے انتظار میں گھوڑوں پر بیٹھے ”جوکی“، اس شخص کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں گھوڑوں کو آگے بڑھنے سے روکنے والے بانس کا لیوڑ ہوتا ہے اور پھر جیسے ہی ہمارے ماسٹر جی نے بارش اور بادلوں کی شان میں کچھ بڑا کر بچوں کو اشارہ کیا تو سبھی بچے واقعی کسی ریس کے میدان میں نکلے گھوڑوں کی طرح کو دتے پھاندتے اور

آوازیں نکالنے ہوئے کاس روم سے نکل بھاگے لیکن میں ایسے معاملات میں ہمیشہ سے کافی صابر و شکر اور آخری فرد کے بھی باہر نکل جانے کا قائل رہا ہوں۔ سو آخری بچے کے نکل جانے کے بعد میں بھی برستی بوندوں سے بچتے کے لیے سر پر اپنی تختی رکھے گھر کی جانب چل پڑا۔ تختی پر ابھی کچھ دیر پہلے ہی ماشرجی نے اردو ملاکھوائی تھی لہذا بچی سیاہی کے لفظ بارش کی بوندوں سے دھل کر تختی سے ہوتے ہوئے میرے گالوں پر بننے لگے تھے۔ بڑی سڑک پر حرب معمول بارش کے پانی کا ریلہ آیا ہوا تھا۔ یہ پہاڑوں کی بارش کا پانی تھا، جو ہمارے شہر سے ہوتا ہوا گزرتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب لوگ کھڑے ہو کر اس ندی نما سڑک کو پار کرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ محلے کے دیگر بچے اس شور مچاتے اور اپنے ساتھ سب کچھ بھاٹے پانی کے اندر اخبار اور کاغذی بڑی بڑی سی کشتیاں بنا کر پھینک رہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا، آنکھیں بند کر کے ایک دو تین کھا اور بھاگتے ہوئے سڑک پار کر لی۔

محلے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر غیاث پچا کے گھر سے نکلتے فضلو بابا پر پڑی، جو آسان کی جانب ہاتھ اٹھاٹھا کر جانے کوں سی دعائیں مانگ رہے تھے، میں بھاگ کر جلدی سے بارش سے پناہ لیتا ہوا ان تک جا پہنچا۔ فضلو بابا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ پہتے یہ چلا کہ ان کی چیزیں ”جو بی“، صح گھروں والوں کے منع کرنے کے باوجود شدید بارش میں تانگہ منگوا کر اسکول چل گئی تھیں۔ ان کا ارادہ اسی اسکول والے تانگے میں واپسی کا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تانگے والے نے آکر گھر پر اطلاع دی تھی کہ وجہ بی نے تو انہیں اسکول کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ ان کی سہیلیوں کا اصرار تھا کہ وہ کچھ دیر اسکول میں ان کے ساتھ رہیں۔ اس وقت بلکہ بوندا باندی ہو رہی تھی لہذا طے یہ پایا کرتا تانگے والا دن بارہ بجے کے قریب انہیں اسکول سے واپسی کے لیے لینے آجائے گا لیکن گھنٹہ بھر پہلے شروع ہونے والی موسلا دھار جبڑی نے سارا شہر ہی احتل سچھل کر دیا تھا اور اس وقت شہر کے لڑکیوں کے بڑے اسکول کی جانب جانے والا ہر راست پانی کے بڑے بڑے ریلوں نے ڈھانپ رکھا تھا لہذا تانگہ کسی بھی صورت و خوبی کو لینے ان کے اسکول تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ غیاث پچا بھی دورے پر اور شہر سے باہر تھے۔ ایسے میں اس وقت فضلو بابا کو کوئی راست بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اوپر سے یہ طوفانی بارش جس کا زور لمحہ بلحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو بارش کے ساتھ ساتھ کچھ توفوں سے بھلی کے کڑ کنے کی آواز بھی اس طوفانی شور میں شامل ہوتی جا رہی تھی اور دن کے وقت بھی گھنٹا نوپ اندر ہر اس اچھا یا جاتا تھا۔ وجوہ آپ کی ای یعنی سیکھ خالہ بھی بے حد پریشان تھیں اور بار بار بے چینی سے گھر کے دروازے تک آتیں، اس راستے پر نظر ڈالتیں، جس جانب سے وجوہ آپ کی تانگہ آیا کرتا تھا اور پھر راستہ سنان پا کر بے چینی اور مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے واپس اندر چل جاتیں۔

بارش کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور دھیرے دھیرے محلے کا کپڑا ڈھنگالی ہوتا گیا اور دو پہر تین بجے تک میرے اور فضلو بابا کے علاوہ باقی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ درمیانی و قفقے میں، میں چند لوگوں کے لیے بستہ رکھنے کے لیے گھر بھی گیا لیکن جیسے ہی امی کی نظر چوکی، میں پھر سے باہر بھاگ آیا تھا۔ امی مجھے آوازیں دیتی رہ گئیں پر وہ بھی جانتی تھیں کہ میں بارش کے موسم میں گھر میں یہک کرنہیں بیٹھ سکتا تھا اور پھر اس دن تو بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میرا گھر میں رہنا ممکن تھا۔

سازھے تین نجھے تھے اور اب فضلو بابا نے کسی بھی صورت خود و جوہ آپ کے اسکول تک پہنچنے کی شان لی تھی۔ حالانکہ اس بڑھاپے میں ان

کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس طوفانی بارش کے تھیڑوں اور ان سیالابی ریلوں کی طغیانی کو پار کر سکتے تھے لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس دن خود مجھے اپنے چھوٹے اور کم زور ہونے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے دل میں پکاٹے کر لیا تھا کہ جیسے ہی میں کچھ بڑا ہوا خود اپنے پسے جمع کر کے ایک تانگہ خرید اولں گا تاکہ آئندہ بھی ایسا "موقع" ملے تو میں خود جا کر وجوہ آپی کو گھر واپس لاسکوں اس دن فضلو بابا کے ساتھ کھڑے بارش میں بھیگتے ہوئے خیاول میں جانے کتنی دریں وجوہ آپی کو اپنے تانگے پر بٹھائے سڑکوں پر گھومتا رہا۔

بالآخر فضلو بابا نے اپنی پرانی اور بوسیدہ برساتی کے بٹن کے، سر پر برساتی کی ٹوپی اور ٹھیکار چھتری اٹھا کر اللہ کا نام لیتے ہوئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ محلے کے بڑے اور سال خورده چوبی گیٹ سے طاہر بھائی اپنی نئی "ریلی" سائکل تھا میں اندر داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ بری طرح بھیکی ہوئے تھے اور سائکل پر سوار بھی نہ تھے کیونکہ شاید اتنے تیز پانی میں سائکل کی سواری ہی ناممکن تھی۔ طاہر بھائی ہمارے محلے کے ہونہار تو جوان تھے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے بارہوں نے امتحان نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ان کے ابو بھی میرے ابا کے ساتھ سرکاری ملازم تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بینا ڈاکٹری پڑھ کر شہر کا نامور ڈاکٹر کہلائے۔ یعنی سائکل بھی طاہر بھائی کے ابا نے ان کے بارہوں جماعت کے نتیجے کی خوشی میں انہیں دلوائی تھی۔

فضلو بابا کو یوں برسی بارش میں محلے سے باہر جاتے دیکھ کر انہوں نے وجہ پوچھی تو جواب میں فضلو بابا نے صبح سے لے کر اب تک کی تمام رام کہانی سنا دی کہ وجوہ آپی اب تک اسکوں سے واپس نہیں آئیں اور سارا گھر ان کی وجہ سے کس قدر پریشان ہے۔ طاہر بھائی نے ایک نظر سڑک پر بیٹے پانی کے پھرے ہوئے ریلے پر اور دوسری نظر ابھی چھا جوں برستے آسمان پر ڈالتے ہوئے پوچھا "لیکن آپ اتنی دور کیسے جائیں گے؟ بڑے اسکوں تک تو سارا راستہ پانی سے گھرا ہوا ہے؟"

فضلو بابا نے گھری ہی سانس لی اور بے چارگی سے بولے "جانا تو پڑے گا بینا، وہاں وجوہی بیٹھی ہماری راہ تک رہی ہوں گی۔ اب تو شام بھی سر پر ٹھہر نے کوہے۔ چھوٹی بیگم کا گھر میں پریشانی سے براحال ہے۔"

فضلو بابا جانے کیوں سکینہ خالہ کو چھوٹی بیگم کہا کرتے تھے۔ مجھے تو سکینہ خالہ بالکل بھی چھوٹی نہیں لگتی تھیں۔

فضلو بابا کی بات سن کر طاہر بھائی نے ایک لمبا سانکارا بھرا اور پلٹ کر ریلے کی طغیانی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ناپا۔ "نہیں..... آپ اس طوفان میں اسکوں تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ میں نے آتے ہوئے خود بہت ہی جگہوں پر لوگوں کو رسہ پکڑ کر راستہ پار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ یہیں رہیں۔ وجوہ کوئی میں اسکوں سے جا کر لے آؤں گا۔ آپ بس ذرا میرے گھر میں اطلاع کروادیجیے گا۔ امی میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

فضلو بابا نے فوراً طاہر بھائی کو ساتھ کھڑا کر ڈھیروں دعا کیں دے دیں۔ طاہر بھائی وہیں سے اٹھے پیروں وجوہ آپی کو لینے کے لیے پلٹ گئے۔ میں جلدی سے بھاگ کر طاہر بھائی کے گھر میں اطلاع دے کر پلٹ آیا۔ اب میں اور فضلو بابا پلکیں جھپکائے بناء اسکوں کی طرف سے آنے والی سڑک کو یوں گھوڑا ہے تھے، جیسے کچھ ہی دیر میں وہاں سے قارون کا کوئی خزانہ لٹکنے والا ہو۔ گھنٹہ بھر یونہی بیت گیا اور پھر وہ آخر کار دور سے اپنی سائکل

تحالے خراماں خراماں آتے ہوئے نظر آئے۔ وجوہ آپی ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ڈری سہی سی ٹھیک ہوئی چلی آرہی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ جب طاہر بھائی انہیں لینے کے لیے اسکول پہنچ تو اسکول خالی ہو چکا تھا اور صرف اسکول کا بوڑھا چوکیدار وجوہ آپی کی وجہ سے وہاں رکا ہوا تھا۔ وجوہ آپی کا پریشانی اور خوف کے مارے براحال تھا۔ طاہر بھائی کو آتا دیکھ کر ان کی جان میں جان تو آئی، پران کے ساتھ یوں اسکیلے چل پڑنے میں بھی ان کی حیاء آڑے آرہی تھی، وہ طاہر بھائی سے اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کی شرافت اور لیاقت کے قصے تو سارے محلے میں زبان زد عالم تھے لیکن پھر بھی وہ ان کے لیے تو اجنبی ہی تھے لیکن اس وقت ان دونوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پہلے تو طاہر بھائی اور وجوہ آپی بہت دریک اسکول کے گیٹ پر ہی کسی تانگے یا سائکل رکشہ کا انتظار کرتے رہے تاکہ وجوہ آپی کو اس پر سوار کرو اکر طاہر بھائی خوداپنی سائکل پران کے ساتھ ہی پیچھے پیچھے چل پڑیں لیکن جب آدھا گھنٹہ گزرنے کے باوجود دور تک کسی سواری کا نام و شان تک دکھائی نہ دیا تو مجبوراً ان دونوں کو پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ سائکل پر سواری کا تو یوں بھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اول تو آج تک وجوہ آپی کسی سائکل پر سوار ہوئی ہی نہیں تھیں۔ غیاث پچا کے پاس سرخ رنگ کی اٹلی کی بنی ہوئی ایک ویسا سکوٹر تھی، جس پر بھی بھی وہ شام کو وجوہ آپی کو سیر کے لیے لے کر نکلتے تھے۔ اس وقت اگر میں بھی کہیں محلے میں انہیں دکھائی دیتا تو وہ مجھے بھی اسکوٹر کے اگلے حصے میں جہاں سامان رکھنے کی ایک ٹوکری سی بنی ہوتی ہے وہاں کھڑا کر لیتے تھے اور محلے کے گیٹ پر اتارتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے کیونکہ مجھے گیٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن وجوہ آپی کے ساتھ کی ہوئی اسکوٹر کی یہ چند لمحوں کی سواری بھی ہفتوں مجھے سرشار رکھتی تھی۔ طاہر بھائی کو امید تھی کہ شاید راستے میں سواری مل جائے لیکن اس برسی شام میں تو کوئی تانگہ بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ آخر طے بھی پایا کہ دونوں پیدل ہی مکہنہ راستوں سے اور پانی سے بچتے ہوئے گھر کی راہ پکڑ لیں کیونکہ شام دیسیرے دیسیرے ڈھلتی جا رہی تھی اور اب وہاں کھڑے رہ کر مزید انتظار کرنا صرف اور صرف وقت برپا کرنے کے متادف تھا۔ جب وہ دونوں محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو شام کے پانچ بجے تھے اور دونوں ہی سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور تھے۔ وجوہ آپی کو تو باقاعدہ چھینکیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور طاہر بھائی کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ فضلو بابا نے طاہر بھائی سے بہت کہا کہ سینہ خالہ نے گھر میں ان دونوں کے لیے گرم جوشانہ تیار کر رکھا ہے، وہ پیتے جائیں لیکن طاہر بھائی مسکرا کر ہاں گئے۔

گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وجوہ آپی نے مڑکرا ک لمحے کو پلکیں اٹھائیں اور دیسیرے سے طاہر بھائی سے "شکریہ" کہا۔ جواب میں طاہر بھائی صرف سہلا کر ہی رہ گئے۔

اگلا ایک ہفتہ دونوں ہی اپنے اپنے گھروں میں نزلے زکام اور بخار کی کیفیت میں بتر سے لگے رہے لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ وجوہ آپی اور طاہر بھائی کی یہ پہلی اور بھیگی سی ملاقات اگلے چند ہفتوں میں دونوں کو ایک ایسے جذبے سے بھگو کر شرابور کر دے گی، جس کی سیلن زندگی کی آخری سانس تک ان کے دلوں میں گھلن پیدا کرتی رہے گی۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا دوست

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

رفتہ رفتہ محلے میں میرے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا لیکن میرا سب سے پہلا دوست راجہ ہی میرا سب سے گہرا اور رازدار دوست تھا۔ راجہ بھی میرے ساتھ ہی پر ائمہ اسکوں میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس کا گھر میرے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہماری دوسری جماعت کے سالانہ امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ میرے پاس امتحانی گتہ (ہارڈ بورڈ) نہیں تھا لہذا میں جتنی کے اوپر کھر پر چدیدتا تھا اور جتنی کے سرے پر پرچہ جکڑنے کے لیے لوہے کا چھوٹا سا کلپ (چپٹی) لگالیتا تھا جبکہ راجا پسے ماں باپ کا اکلوتا اور بے حد لاذلہ بچ تھا۔ اس کے ابانے اس کے لیے بہت خوب صورت سا امتحانی گتہ خرید کر دے رکھا تھا جس پر سکس ملین ڈالر میں کی ایک بہت بڑی سی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔

ان دنوں ہمارے گھر میں تو وی نہیں تھا۔ محلے میں صرف ایک ہی گھر میں بلکہ اینڈ وائٹ ٹوی وی تھا اور ہم سب بچے گھر والوں سے چھپ کر غفور چپٹا کے گھر بہت کی رات سوکس ملین ڈالر میں دیکھنے کی نہ کسی طرح پہنچنے ہی جایا کرتے تھے۔ غفور چپٹا اس صاحب کے دفتر میں کلرک تھے اور ان کے ٹھاٹ بات بھی کسی لاٹ صاحب سے کم نہ تھے۔ بہت کی رات غفور چپٹا اپنائی وی گھر میں کسی ایسے مقام پر رکھ دیتے تھے، جہاں سے صحن اور گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے بچوں کی نظر بھی ٹوی پر پڑ سکے۔ میں اپنے ابا کے ڈر سے سب سے آخر میں گھر سے نکلا تھا لہذا راجہ کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ میرے لیے اس منی سینما گھر کے ”اٹال“ یا ”بالکونی“ میں کوئی اچھی سی جگہ تھی رے رکھتا اور میرے دیرے سے آنے پر ہمیشہ غصے سے مجھے گھوڑتا کہ مجھ سے پروگرام کی شروعات یا سکس ملین کی اوپنی سے لگائی گئی ایک بہت عمده جپ چوک گئی ہے۔ اگلی صبح راجہ مجھے وہ تمام کہانی پھر سے باقاعدہ پر فارم کر کے دکھاتا۔ ان دنوں اکثر میرے اور راجہ کے ہاتھوں بیرون یا سر پر پٹیاں بندھی دکھائی دیتی تھیں کیونکہ جب تک تو وی پر سکس ملین ڈالر میں چلتا رہا ہم دنوں نے ہر اونچائی سے اس کی طرح کو دنے کی اور مختلف چیزوں کو ہاتھ پیڑا اور سر سے توڑنے کی قسم کھار کھی تھی۔ ان دنوں ہم دنوں اپنی اپنی امیوں کے ساتھ (جو آپس میں گھری سہیلیاں بھی تھیں) لہذا بازار جا کر خاص طور پر ایسی جیکٹس اور دستائے وغیرہ پختے تھے جیسے کچھلی قطع میں ہم نے سکس ملین صاحب کو پہن دیکھا ہوتا تھا اور پھر میں اور راجہ ویسے کے پہن کر محلے میں دوسرے بچوں کے درمیان اتراتے پھر اکرتے تھے۔

دوسری جماعت کے امتحان شروع ہو چکے تھے۔ میں سچ سویرے چائے کا ایک پیالہ گرم تندور کی آدھی روٹی کے ساتھ حلق سے اتار کر جلدی سے راجہ کے گھر پہنچ جاتا تھا لیکن راجہ ہمیشہ دیر کر دیتا تھا۔ اس کی امی اسے باورچی خانے میں اپنے سامنے چوکی پر بٹھائے گرم پر اٹھے اور انہوں کا ناشتہ کرواری ہوتی تھیں۔ مجھے سر پر کھڑے بڑا باتا دیکھ کر راجہ جلدی جلدی نوالے نگفے کی کوشش کرتا تو اسے ماں کی جھاڑ مننا پڑتی کہ ٹھیک سے ناشتہ ختم کرے، خدا خدا کر کے راجہ کی تیاری ختم ہوتی اور اس کی ماں اس طرح دعا میں دیتے ہوئے میرے ساتھ روانہ کرتی، جیسے وہ اسکوں کا

امتحان دینے نہیں بلکہ کسی جگہ مجاز پر دشمن کے نیکوں کے سامنے لیٹنے جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ نکلنے پر عام طور پر راجہ کو بکشکل اعزازی نمبر دے کر ہی پاس کیا جاتا تھا۔ راجہ کا دھیان کبھی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ سرد یوں کی نرم گلابی دھوپ میں جب ہم دونوں پر چودینے کے لیے اسکوں کی طرف جا رہے ہوتے تو اس وقت بھی راجہ دیواروں اور دکانوں کی چھتوں پر لگے فلموں کے پوسٹروں پر زیادہ دھیان دیتا تھا۔ میں دل میں اپنا رہنا ہوا امتحانی سبق دھرا رہا ہوتا جبکہ وہ ان فلمی پوسٹروں پر رو اور تصریح جاری رکھتا۔ ”یار نا ہے محمد علی کی ”ان داتا“ بڑی زبردست کپھر ہے۔ یار تو نے تباہی ”آئینہ“ میں ندیم شہنم نے غصب کام کیا ہے کل تو اس کی گولڈن جوبی منائی جا رہی ہے۔ کل شاہد کی ”بھروسہ“ ریگل میں لگ رہی ہے۔ وحید مراد کی ”پرکھ“ آرہی ہے۔ تو اس اتوار کو میرے ساتھ رنگیلا کی ”کمز اعاشق“ کا ٹریلر دیکھنے ضرور چلنا۔ ”راجہ کے یہ تصریحے جاری رہتے اور ہم آخونکار اسکوں میں داخل ہو جاتے۔ ہمارے پرائمری اسکوں میں کوئی امتحانی ہاں نہیں تھا لہذا ہم سب بچوں کو میدان میں ایک ایک قطار میں ان کی جماعت کے حساب سے بٹھا دیا جاتا تھا اور تختہ سیاہ پر آٹھ دس سوال لکھے جاتے، جنہیں ہم جلدی جلدی اپنی جھنپتی یا پرچے پر اتنا لیتے اور پھر ان میں سے پانچ سوالوں کے جواب ہمیں پرچے پر اتنا نہ ہوتے تھے۔ راجہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے میرے پیچھے یاد ایسیں کی جگہ پر قبضہ جماليتا تھا اور میرا فرض تھا کہ میں اپنے پرچے کا رخ اس طرح سے رکھوں کہ راجہ کی نظر بر ابر اس پر پڑتی رہے اور وہ آسانی سے نقل کر سکے۔ اگر کسی پرچے میں بدستی سے کسی استاد کی نظر راجہ پر پڑ جاتی تو اس کا وہ پرچہ ہمیشہ ادھورا ہی رہ جاتا۔ ایسی صورت میں امتحان کے نتیجے سے پہلے راجہ کے ابا کو ہمارے اسکوں کا ایک ”خیر سگالی“ کا پھیرہ لگانا ضروری ہو جاتا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

البتہ راجہ کو میرا یوں دن بھر و جو آپی کے گھر کے پھیرے لگانا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے اس بات پر لڑتا تھا کہ میں بھر کے کھیل کے میدان میں سے وجوہ آپی کی ایک آواز پر یوں دوڑ کر ان کی بات سننے چلا جاتا تھا، جیسے مجھ سے کوئی نماز قضا ہو رہی ہو۔ اس دن بھی مغرب سے کچھ پہلے ہم سب محلے کے بچے مل کر ”کھو کھو“ کھیل رہے تھے کہ اچانک دور سے میری نظر و جو آپی پر پڑی، جو اپنے دروازے سے باہر جھاٹکتے ہوئے مجھے بلاں کے لیے اشارے کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں کھیل کے تمام قواعد و ضوابط توڑتا ہوا، بُلح سی و جو آپی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس وقت گلابی لباس اور سفید دوپٹے میں خود بھی کوئی گلابی پرپی سی لگ رہی تھیں۔ دور راجہ کھڑا امیری طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں میری شان میں کچھ پڑیا رہا تھا اور چھرے پر باتھ پھیر کر مجھے خبر دار کر رہا تھا کہ اگر میں کھیل چھوڑ کر ہیں گیا تو میری خیر نہیں لیکن اس وقت میری تمام توجہ و جو آپی کے گلابی چھرے کی طرف تھی، جس پر شام کے ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں کچھ اس طرح اجالا کر رہی تھیں کہ ان کی ناک میں الکا چھوٹا سا سنبھری کوکا خود ایک چھوٹا سا سورج دکھنے لگتا تھا۔

و جو آپی کے ہاتھ میں نیاز کی کھیر کی پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں گیارہوں کے کورس کی اردو کی کتاب تھی، جس کے شاعری والے حصے میں انہوں نے میرا اور غالب کے چند اشعار گوشان زدہ کر رکھا تھا۔ کھیر کی پلیٹ انہوں نے مجھے طاہر بھائی کی امی کے حوالے کرنے کی تائید کی اور کتاب دیتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ طاہر بھائی سے کہوں کہ جو مشکل شعر انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تھے..... ان سب کو انہوں نے سرخ پنسل سے نشان لگا کر واضح کر دیا ہے۔ طاہر بھائی کو جب بھی وقت ملے ان کی تشریح لکھ کر و جو آپی کو بھجوادیں۔

میں فوراً ہی ائے قدموں طاہر بھائی کے گھر کی طرف بجا گا۔ طاہر بھائی کی امی مصحح میں پیشیں اتار دانہ سکھا رہی تھیں۔ میری آواز سن کر طاہر بھائی بھی کمرے سے نکل آئے۔ میں نے وجوہ آپی کی کتاب ان کے حوالے کی اور سارے راستے ان کا دیا ہوا جو پیغام مرثیے ہوئے آیا تھا، وہ میں نے انہیں فرشنا دیا۔ طاہر بھائی بہلے سے مسکراتے اور بولے ”یہ تمہاری وجوہ آپی کو پڑھائی لکھائی کے علاوہ دوسرا کوئی کام بھی ہے یا نہیں۔“ مجھے ان کی اس بات پر شدید غصہ آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ کہتا خود طاہر بھائی کی امی نے انہیں جھٹک دیا۔

”ارے تو کیا ہوا؟ اگر بچی نے ذرا سی مدد مانگ ہی لمی ہے پڑھائی میں تو کون سا آسمان گر گیا۔ تیری لیاقت تو نہ جھڑ جائے گی اسے کچھ بتانے سے؟“

طاہر بھائی جواب میں بنتے ہوئے کتاب لیے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئے اور جاتے جاتے مجھے کہہ گئے کہ وہ رات کو تمام شعروں کی تشریح کر کے کتاب سمیت وجوہ آپی کو بھجوادیں گے۔

میں نے واپسی پر کافی نمک مرچ لگا کر طاہر بھائی کی شکایت و ”جوہ آپی سے لگائی اور ان سے یہ بھی کہا کہ آئندہ وہ طاہر بھائی کو کوئی کام نہ کہا کریں۔ میں جب گیارہویں جماعت میں آجائیں گا تو خود انہیں اردو پڑھادیا کروں گا لیکن میری بات پر غصے میں آنے کی بجائے وہ بہلے سے مکا دیں اور میرے گال پر زور سے چکلی کاٹ کر اندر چلی گئیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ طاہر بھائی کو سخت سوت شنا میں گی کہ ان کی مجال کیسے ہوئی کوئی اسی کام کی جگہ کھیر کی پلیٹ تو کتنی جلدی طاہر بھائی کی اماں نے ہتھیا تھی۔ بد لے میں دو چار شعروں کی تشریح ہی تو کرنا تھی ان کے ہونہا بھیئے کو؟ اس ذرا سے کام کے لیے اتنے خرچے؟ اور پھر یہ ”جوہ آپی بھی نا..... بجائے غصے میں آنے کے، ان کا گلابی چپرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔ میں سخت کشمکش میں ان کے گھر سے واپس اونا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان لڑکیوں کے مزاج کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ گھری میں تو لہ اور گھری میں ماش.....“

دیواریہ اپلپیس

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

عشق کا قاف اور پکار

جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے جیرت انگیز اور پر اسرار واقعات سے بھر پور، سطحی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشانسیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دلکشی دنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھوکی کہانی بھی یاد دلادی ہے کہ گمراہی اور ان دلکشی قباتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔**

کتاب گھر کی پیشکش پہلی برف باری

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بالآخر تیسری جماعت کے امتحانات کا نتیجہ بھی نکل آیا اور میں "امتیازی" اور راجہ "اعزازی" نمبروں سے باعزت پاس ہو گئے۔ اس دن صبح سے ہی آسان پر گلابی پادلوں کی وحدنے چھائی ہوئی تھی۔ ہوارک سی گئی تھی۔ خزاں میں خلک درخنوں کے شہری پتے زمین پر فرش کی صورت میں بچھے ایک دوسرے سے سر گو شیاں کر رہے تھے کہ آج موسم کے تیور کچھ بدلتے بدلتے ہیں۔ صبح جب میں اسکول نتیجہ سننے کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا تو اسی نے اوپر تلے بہت سی سو ٹیکریں مظاہر اور اونی ٹوپی سے مجھے لیس کر کے بھیجا تھا، جب تک راجہ کے نام کا اعلان پاس شدہ لڑکوں میں نہیں ہوا وہ کافیوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھا رہا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے اشاروں میں پوچھتا رہا کہ وہ پاس ہوا ہے یا نہیں؟ بڑی مشکل سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے کافیوں سے ہٹا کر اسے یقین دلایا کہ اتفاق سے وہ بھی پاس ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا اور جیب میں موجود تمام پیسوں سے راستے میں پڑتی پہلی پر چون کی دکان سے ڈھیر سارا گود خرید لیا۔ شدید سردی میں ہم سب بچوں کی ایک پسندیدہ تفریح یہ بھی تھی کہ ہم ایک بڑی سی کڑا ہی میں گود کو خوب کوٹ کر پانی سے بھر کر اسے خوب ابالتے اور پھر جب وہ سارا گود حلوے کی سی شکل اختیار کر لیتا تو ہم اسے شدید سردی میں پڑتی برف میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے کڑا ہی سیست ڈھکن بند کر کے رکھ دیتے۔ گود کا حلوہ سردی میں جنم کر برتن ہی کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ہم اسے چھری سے قاشوں کی صورت میں کاٹ کاٹ کر مزے سے دعوت اڑاتے۔

اس دن بھی ہمارے گھر پہنچتے پہنچتے برف کے گالوں سے ہماری اونی ٹوپیاں بھر چکی تھیں۔ محلے کے مرکزی کمپاؤنڈ میں بچے اور جوان مل کر برف کا پتلا بنانے کے مقابلے میں مشغول تھے۔ کچھ ہی دیر میں غفور چاپا "بیش قیمت" کوڈیک کا کیمرہ گھر سے اٹھا لائے اور ہم سب بچوں اور بڑوں کی ایک ایک کر کے گروپ میں تصویریں اتارنے لگے۔ ہم سب بچے بڑے اہتمام سے تجدیدہ سی شکلیں بنائے تصویریوں کے لیے رخ دینے لگے۔ غفور چاپا ہر سال اپنے اسی کیمرے سے ایسی برف باری کے موسم میں تمام محلوں اور لوں کی تصویریں بناتے تھے لیکن جیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے کبھی ان تصویریوں کو دھل کر آتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دل جلے نوجوانوں کا خیال تھا کہ ان کے کیمرے میں کبھی فلم کی ریل ہوتی تو تصویریں بھی دھل پاتیں.....؟ جب کیمرہ ہی خالی ہو گا تو تصویریں کیا خاک دھل کر باہر نکلیں گی؟

لیکن جیرت اس بات کی تھی کہ ان تمام شکوک و شبہات کے باوجود جب کبھی غفور چاپا کیمرہ لیے برستی برف میں گھر سے باہر نکلتے تو کیا بچے، کیا بوڑھے، کبھی فوراً اپنے بال سنوارتے، کپڑوں کی ٹکنیں دور کرتے فوراً محلے کے احاطے میں جمع ہونے لگ جاتے۔ ہم میں سے کسی میں بھی ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر غفور چاپا کے کیمرے کو جانچ ہی لیں کہ اس کے اندر کچھ ہے بھی یا نہیں؟

لیکن اس برف باری میں قدرت نے میری تصویر کچھوںے کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ غیاث چاپا کہیں سے ایک "پولا رائیز" کیمرہ اٹھا

لائے تھے۔ یا ایک جادوئی ڈبھتا۔ یہاں تصویری ٹھینگی اور وہاں کیسرے کی دوسری جانب سے دھیرے سے چمکتی اور دھلی دھلانی سی تصویر لکھ آتی۔ اس دن بھی میں نے وجوہ آپی کے صحن میں ان کے ساتھیل کر بر ف کا ایک بہت پیارا سا پتلا بنایا اور پھر اس پتلے کے گلے میں بانیہیں ڈال کر، گود میں بیٹھ کر اور اسے گلے لگا کر بہت سی تصویریں بنائیں لیکن کون جانتا تھا کہ میری یہ خوشی بھی پڑنے لمحوں کی اور ہمیشہ کی طرح ادھوری ثابت ہو گی۔ ابھی ہم صحن میں اس بہلے گلے میں مشغول ہی تھے کہ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولنا تو طاہر بھائی ہاتھ میں تھرموں پکڑے کھڑے دکھائی دیئے۔ غیاث پچانے انہیں بھی اندر ہی بلوالیا۔ پتہ یہ چلا کہ طاہر بھائی کی اماں نے وجوہ آپی کے لیے چوزوں کی خاص ٹھینگی بنا کر بھیجی ہے۔ مجھے شدید غصہ آیا۔ راجہ پچھلے کئی دنوں سے مجھے اکسار ہاتھا کہ طاہر بھائی کے گھر کے باہر پھرتے ان چوزوں پر اپنا ہاتھ صاف کر لینا چاہیے پر مجھے مرغی کے ان معصوم بچوں پر ترس آتا تھا۔ کاش اس وقت میں نے راجہ کی بات مان لی ہوتی تو آج طاہر بھائی کی جگہ ٹھینگی کا یہ تھرموں میں وجوہ آپی کے لیے لے کر آیا ہوتا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چک پچھلی تھیں۔

طاہر بھائی زیادہ دیر وہاں نہیں رکے لیکن جتنی دیر بھی وہاں رہے وجوہ آپی اپنے باور پی خانے کی صحن کی جانب والی کھڑکی میں سے جلدی جائے بنتے ہوئے چکے چکے پکیں اٹھا کر طاہر بھائی کو دیکھتی رہیں۔ سینہ خالد کے بے حد اصار پر طاہر بھائی نے چائے کے دو گھونٹ لیے اور وہاں سے چل پڑے۔ اسی دوران انہوں نے غیاث پچانے کے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا نام ڈاکٹری کے کالج کی فہرست میں آچکا ہے اور مارچ سے ان کی کلاسیں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس بات پر غیاث پچانے تو کچھ ایسی خوشی کا اٹھا کر کیا۔ جیسے طاہر بھائی کو نہیں خود ان کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس میں اس قدر رخوب ہونے کی کیا بات ہے؟ بھلا ڈاکٹر بننے میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا اور پھر مجھے تو وہی ڈاکٹروں سے چلتی۔ سارا دن بے چار سے ٹردوں کی چیر پھاڑ کرتے رہتے تھے اور پھر انہی ہاتھوں سے کھانا کھانے بھی بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے تو بڑے ہو کر مصور بننا تھا۔ سارے جہاں کی تصویریں بنانا تھیں یا پھر ایک بڑا سا پیانو خرید کر اس پر ساری دنیا کو پا گل کر دینے والی دھنسیں سنانا تھیں۔ بھلا ڈاکٹری بھی کوئی پیشہ تھا؟..... ہونہے..... ڈاکٹر کہیں کا.....

میں جانے کتنی دیر اپنے انہی خوابوں اور خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ہوش آیا تو طاہر بھائی جانے کب کے جا چکے تھے اور راجہ جانے کب سے گلی میں کھڑا مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ پتہ چلا کہ باہر محلے میں ایک دوسرے پر بر ف کے گولے بر سانے کا مقابلہ شروع ہو چکا ہے اور ہماری ٹیم میری غیر موجودگی کی وجہ سے مسلسل گولے کھاری تھی اور ہماری تھی۔ ہم سب بچوں کا بر ف باری کے دوران یہ سب سے پسندیدہ کھیل تھا۔ ہم چھتوں پر چڑھ کر، درختوں کے پیچھے چھپ کر اور دیواروں کی منڈیوں سے ایک دوسرے کی ٹیم کوتاک تاک کرنشانے مارتے تھے لیکن جانے کیوں اس دن میرا ہر نشانہ خطا ہو رہا تھا۔ شاید اسی دن سے خود میں تقدیر کے نشانے کی تاک پر تھا اور کتنی ستم ظرفی کی بات تھی کہ ہم انسانوں کے نشانے تو چوک بھی جاتے ہیں لیکن اس بے رحم مقدرا کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ اس سفاک تقدیر کا ہر واڑ کاری اور ہر نشانہ اٹل ہوتا ہے، جو ہم بے بس انسانوں کو ذرا ساتر پنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ میرے بچپن کا دسمبر بھی قسمت کے ایک ایسے ہی وار کے نشانے پر تھا لیکن میں اس بے رحم وار سے بے خبر راجہ کے ساتھیل کر دوسری ٹیم کے بچوں پر بر ف کے گولے بر سارہ تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا سجدہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

چوتھی جماعت میں آتے ہی ابا کی طرف سے نماز کی پابندی اور حجت کی تاکید شروع ہو گئی۔ سپارہ تو اس سے بہت پہلے ہی ہم سب محلے کے بنچے محلے کی ایک جگت خالہ کے ہاں پڑھنے جاتے تھے، جو ہم سب بچوں کو نہایت انہاک سے سپارہ پڑھاتی تھیں۔ شام کو ان کے گھر کے برآمدے میں محلے بھر کے بنچے اور بچیاں اپنے سروں پر چھوٹی چھوٹی نوپیاں اور دوپے اور ڈھنے اپنے اپنے سپارے اور بغدادی قاعدے اپنے سینوں سے لگائے جمع ہو جاتے تھے اور اگلے گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ان کا گھر ہم سب بچوں کے سبق یاد کرنے کے شور سے گونجا رہتا۔ سارے بنچے گود میں سپارہ رکھے اور سرہلا کرنا پا سبق انواع و اقسام کی آوازوں میں یاد کرتے رہتے اور جس بنچے کا سر جتنی تیزی سے ہلتا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اتنی ہی "شدت" سے اپنا سبق یاد کر رہا ہے اور جہاں کسی بنچے کے سر بلنے کی رفتار کم ہوتی، وہیں خالہ زور سے ایک ہنکار بھر کر اسے خشکیں نگاہوں سے گھورتیں اور دوسرے ہی لمحے اس بنچے کا سر دوبارہ اسی تیزی سے بلنے لگ جاتا۔

کتاب گھر کی پیشکش

محلے کے تقریباً سبھی نوجوان اپنی جگت خالہ کے ہاں سے اپنے اپنے نظم قرآن سے مستفید ہو جکے تھے کیونکہ خالہ گزشتہ تھیں، پچیس سالوں سے اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو قرآن شریف کا درس دے رہی تھیں۔ ہو آپی بھی ان کی شاگردہ بھی تھیں اور میرے لیے وہ دن عید کا دن ہوتا تھا، جب خالہ اپنے صحن میں لگے سرخ انگوروں کے خوشے پکنے پر ہم سب بچوں کو حکم دیتی تھیں کہ سب بنچل کر احتیاط سے اور ایک ایک کر کے تمام انگوروں کے سچھے ڈالیوں سے توڑ کر اتار لیں پھر اس تمام انگور کے ڈیھر کے حصے بخڑے کرنے کا مرحلہ آتا تھا۔ جگت خالہ پورے محلے میں اپنے گھر سے اترے انگور بھجوایا کرتی تھیں۔ سب بنچے بڑی بڑی پرپاتوں میں انگور لیے محلے کے مختلف گھروں میں بانٹنے کے لیے دوڑتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے موقعے پر خالہ محلے کی اپنی پرانی شاگرد لڑکیوں کی ٹوپی کو بھی بلوایا کرتی تھیں۔ بڑی لڑکیاں انگور توڑ توڑ پرپاتوں میں رکھتی جاتیں اور حساب سے محلے کے ہر گھر کو بھیتھی جاتیں لڑکیوں کی اسی ٹوپی میں و جو آپی بھی شامل ہوتیں اور میں بھاگ بھاگ کر سب سے پہلے صرف انہی کے کام کیا کرتا۔

ایسے موقعوں پر راجہ عموماً یا تو حکم جایا کرتا تھا یا پھر اس کے ہاتھ جس گھر کو انگور بھیجے گئے ہوتے۔ وہاں کبھی بھنپنیں پاتے تھے۔ آخر کار اس کا حل خالہ نے یہ نکالا کہ راجہ کے ہاتھ انگوروں کی پرات دے کر دو مزید بیٹے کئے اور مشنڈے قسم کے بچوں کی گارڈ بطور نگرانی ساتھ بھیجنہا شروع کر دی، جنہیں راجہ نے راستے میں کئی بار رجھانے اور جھانسی دینے کی کئی کوششیں کیں لیکن اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

بھنپے یاد ہے جس دن بانے مجھے پہلی مرتبہ حجت سے ڈانٹ کر نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا وہ بھی ایک ایسا ہی انگور اتارنے کا دن تھا۔ میرا موڑ پہلے ہی کافی خراب تھا کیونکہ اس روز و جو آپی بھی خالہ استانی کے گھر انگور اتارنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میں نہایت انہاک سے انہیں اپنے نازک نازک

ہاتھوں سے انگروں کو ان کے گھوٹوں سے علیحدہ کرتا دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت احتیاط اور نفاست سے بہترین گھوٹوں کا انتخاب کیا اور پھر اپنے گلابی ہاتھوں کی لبی اور مخرب طبلی انگلیوں سے انگروں کو علیحدہ کر کے ایک پرات میں رکھ کر اس کے اوپر ممل کی جانی کا کپڑا ڈال دیا۔ میں جوان کی ہر حرکت کو نہایت غور سے میختاک رہتا تھا ایک دم بڑا سا گیا کیونکہ انہوں نے پلکیں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور دھیرے سے میرا نام لیا..... ”آدمی“.....

پہنچنیں کیوں جب کبھی وہ آپی یوں میرا اگھر کا نام دھیرے سے گلنگانی تھیں تو میرے وجود میں اچا ایک ہی ایک ساتھ تھی بہت سی گھنٹیاں کیوں بجتے لگتی تھیں؟ میں جلدی سے اٹھا اور بھاگ کر ان کے پاس آیا۔ آس پاس دوسری لڑکیاں بھی انگور اتارنے اور آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ میں اور راجہ کا شہبز یاد کرتے ہوئے ان لڑکوں کو دیکھ کر ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ آخر وہ کون ہے جو تین ہوتی ہیں، جنمیں یہ لڑکیاں ایک دوسرے کے کافوں میں گھنٹوں سر گوشیاں کر کے بے تحاشہ کھلکھلا کر رہتی رہتی تھیں؟ لیکن اس سوال کا جواب ہم دونوں کو کبھی نہیں مل پایا۔ اس وقت بھی وہ آپی کے آس پاس موجود لڑکیوں کی ٹولیاں آپس میں گھسرا پھسرا اور کبھی کبھی کرنے میں مشغول تھیں لیکن میں نے وہ جو آپی کو کبھی ان دوسری اور ان کی ہم عمر لڑکیوں کی طرح خونخواہ میں بھی مذاق یا قبیلے لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہوتا تو وہ ایسے موقعوں پر بلکے سے مسکرا دیا کرتی تھیں اور ان کی اس ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کے گاؤں پر پڑنے والے دو بلکے سے گلابی گڑھے مجھے نہال کر جایا کرتے تھے لیکن اس روز ان کے یوں رازدارانہ انداز سے بلا نے کے طریقے نے مجھے کچھ حیرت اور اچھن میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے انگروں کی پرات اٹھائی اور اسے میرے حوالے کرتے ہوئے نہایت دھیرے سے پلکیں جھکا کر بولیں کیش

”آدمی..... یہ ثرے شکور پچا کے ہاں دے آؤ۔“ شکور پچا کا نام سنتے ہی میرا بھی چاہا کہ اسی لمحے وہ ڈرے وہیں چھیک کر کہیں بھاگ جاؤں۔ شکور پچا طاہر بھائی کے ابا کا نام تھا۔ تو گویا نفاست اور سلیقے سے یہ انگروں کی پرات شکور پچا کے گھر بھیجنے کے لیے سجائی جا رہی تھی۔ غصے اور بے بسی سے میری آنکھوں میں اسی لمحے آنسو آگئے، جنمیں میں نے بڑی مشکل سے ٹکنے سے روکے رکھا لیکن کیا کرتا میں نے کبھی پہلے زندگی میں وہ آپی کا کہا تا لاتھا جو اس دن نال پاتا؟ میں خاموشی سے ان کے ہاتھوں سے ٹرے لیے باہر آگیا۔ گھر کے باہر والے چھوٹے میدان میں راجہ محلے کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کچھ کھینے میں مشغول تھا۔ اس نے اپنا انگوٹھا ز میں پر رکھا اور لمبی واٹی انگلی سے اپنا ہر ابوروی کینچ پور پڑے مخالف کے کچھ کی طرف اچھاں دیا۔ تھی سے کہیجہ نکرانے کی آواز ہو ایں گونجی اور دوسری لڑکا اپنی ہار پر منہ بستہ رہا اور مہاں سے چل پڑا۔ راجہ کا نشانہ جسے کہنپوں کے کھیل میں ”آئینٹ“ کے نام سے پکارا جاتا تھا، ہمیشہ سے بے حد پکا تھا۔ وہ درجنوں گز دور پڑے ہوئے کسی بھی کہیجہ کو اپنا کہیجہ ہوا میں اچھاں کرنشانہ بنا سکتا تھا اور اس معاملے میں پورے محلے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے استانی خالد کے ہاں سے نکلتے دیکھ کر اس نے وہیں سے چلا کر کہا ”اوے آدمی..... استانی خالد سے مار کھا کر آیا ہے کیا.....؟ اور یہ ہاتھ میں کیا پکڑ کھا ہے۔“ میں نے راجہ کو بتایا کہ یہ انگور شکور پچا کے ہاں دینے جا رہا ہوں۔ راجہ نے کپڑا اٹھا کر انگروں کو اس لو مرٹی کی طرح لپچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، جس کے بارے میں ماشر بھی ہمیں اسکوں میں سبق پڑھایا کرتے تھے۔

”واہ پیارے..... انگرو تو بڑے عمدہ دکھائی پڑتے ہیں۔ ضرور تھہاری وہ آپی نے بیلوں سے اتارے ہوں گے..... ہے نا؟“

میں راجج کی بات سن کر مزید پوچھ گیا۔

”ہاں..... انہی نے اتارے ہیں..... تم کہو تو اپس بیلوں پر چڑھا آؤں؟“ راجج میری بات سن کر زور سے نہ پڑا۔

”دوسروں کا غصہ مجھ پر کیوں اتارا ہے ہو یار۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ سارے محلے کے گھروں میں انگور پہنچانے کا شیکھ تو نہیں

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجج نے حسب معمول اردو کے محاورے کی ناگ توزتے ہوئے میری جانب دادطلب نظروں سے دیکھا۔ راجج نے محاورہ تو غلط بولا تھا

لیکن اس کی بات بالکل صحیح تھی۔ بھلاقوآپی کے ہاتھوں سے توڑے ان انگوروں پر کسی اور کا حق کیسے ہو سکتا تھا.....؟

چند لمحوں بعد میں اور راجج محلے میں اپنی سب سے پسندیدہ جگہ یعنی محلے کی چار دیواری کی منڈیر پر بیٹھے انگوروں کی پرات اپنی گود میں رکھے

ان انگوروں سے انصاف کر رہے تھے، یہ وہ دیوار تھی، جو ہمارے محلے کے گرد چاروں طرف چار دیواری کے طور پر کھڑی کی گئی تھی۔ بڑے بوڑھے

ہتھاتے تھے کہ یہ دیوار انگریز نے ۱۹۳۵ء کے زمانے سے بھی پہلے سرکاری کوارٹرز کی چار دیواری کے طور پر بنوائی تھی۔ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ہم پچے

آرام سے چوڑی مار کر بھی اس پر جا بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں انگور کھاتے جاتے اور پرلی جانب سڑک سے گزرتی گاڑیوں کو بھی گنتے جا رہے تھے۔ اس

دیوار پر بیٹھ کر پرلی جانب کی سڑک پر گزرتی گاڑیاں لگنا میرا اور راجج کا محبوب مشغله تھا۔ جب کوئی گم سُڑائیوں کی نیز ”فیٹ کار“ میں یا پھر کسی پرانی

شیور لیٹ میں اپنے خیالوں میں کھویا سڑک سے گزر رہا ہوتا تو راجج اچانک ہی زور سے ”اوے“ کی آواز کالتا اور جب ڈرائیور گھبرا کر یا چونک کرا اور

ہڑپڑا کر آواز کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا تو میں اور راجج نہیں کر دہرے ہو جاتے لیکن اس دن میں اس قدر اس تھا کہ میرا من اپنے اس محبوب

مشغله میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وجد آپی کے دیے ہوئے انگور ہم دونوں نے ”انتقاما“ آدھا گھنٹہ پہلے ہی ختم کر دیئے تھے۔ دھوپ بھی تیزی سے ڈھل

رہی تھی اور شام کو چلنے والی بر قلمی ہواں نے میرے پاؤں سُن کر ناشروع کر دیئے تھے لہذا میں نے خالی پرات راجج کے حوالے کی اور حتی سے تاکید کی

کہ اسے محلے میں آنے والے شین، بوری، بوتل خریدنے والے کبازیے کے ہاتھ فروخت کرنے کے بجائے سیدھے سجاو فوراً استانی خالہ کے ہاں

واپس دے آئے۔ راجج نے جلدی سے دل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ راجج جب کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا تھا، تب وہ صرف اور صرف

جس ہی بولتا تھا لہذا مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ اب یہ ٹرے حفاظت سے استانی خالہ کے ہاں واپس پہنچ جائے گی۔

<http://kitaabghar.com>

راجج سے رخصت ہو کر جب میں نے گھر کے دروازے سے اندر قدم رکھے ہی تھے کہ ابا کی گرجدار آواز نے میرے پاؤں پکڑ لے۔

”کہاں سے آر ہے ہواں وقت.....؟“ دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہو..... کتنی مرتب کہا ہے کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس آ جایا کرو۔“

میں نے گھبرا کر ای کی طرف دیکھا کیونکہ ایسے کڑے وقت میں عموماً وہ ہی میری مدد کے لیے کوئی عمدہ سا بہانہ تراش کر ابا کا پارہ نیچو لانے

کی کوئی ترکیب کرتی تھیں لیکن آج تو اسی بھی آنکھیں چڑھائیں۔ پتہ یہ چلا کہ بھیا آج مغرب کی نماز پر مسجد سے غیر حاضر پائے گئے تھے اور

ابھی تک ہوش میں دوستوں کے ساتھ پڑھائی کے بہانے سے گھر سے باہر تھے لہذا ان کے حصے کا سارا نزلہ مجھ پر آن گرا تھا۔ ابھی میں ابا کے پہلے

سوال کا ہی کوئی خاطرخواہ جواب نہیں دے پایا تھا کہ فوراً ہی گرج چمک کے ساتھ ان کا دوسرا حکم بھی نازل ہو گیا۔

”چلو..... اپنی امی سے کہو کہ تمہیں ٹھیک سے وضو کرنے کے خدا دیں، وضو کرو..... آج سے تم بھی اپنے بڑے بھائی سمیت میرے ساتھ نماز کے لیے مسجد جایا کرو گے.....“

کوئی اور وقت ہوتا تو میں تھوڑا بہت احتیاج تو ضرور درج کروتا، چاہے اسکے سامنے ہی ہی۔ کہ جلا ساڑھے آٹھ سال کی عمر بھی کوئی مسجد جانے کی ہوتی ہے لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ ذرا سی بھی ”آئیں ہائیں“ کافی ”نتصان دہ“ ثابت ہو سکتی تھی۔ امی نے بھی اشاروں اشاروں میں مجھے سعادت مندی سے سر جھکانے کا مشورہ دیا۔ عمرہ باجی، جو ایسے موقعوں پر میری گستاخت دیکھ کر ہمیشہ خوشی سے چھوٹے نہیں سماں تھیں انہوں نے ابا کو دکھانے کے لیے جلدی سے وضو کا بڑا سا چاندی کا لونا پانی سے بھر کر امی کے حوالے کر دیا اور امی نے مجھے ہاتھوں پر میرے اور چہرے پر پانی ڈالنے کا طریقہ سکھلا دیا۔ باجی برآمدے کے ستون کے پیچھے کھڑی دانت نکلتی رہیں اور امی نے لگھی کر کے اور میرے گال پر سرے کا بڑا سایکل لگا کر مجھے عشاء کی نماز کے لیے تیار کر دیا۔ شاید دنیا کی ہر ماں اپنے راج دلارے بنیے کو ”اظہر بندی“ کا ایسا یہ کہ ضرور لگاتی ہوگی۔

لیکن میرا دھیان اس وقت کی اور جانب ہی تھا۔ وہ جمعرات کی شام تھی اور آج رات اُنی وہی پر میرے پسندیدہ ڈرامے ”انکل عربی“ کی چوتھی قسط نظر ہونا تھی۔ راجہ کو میں پہلے ہی پابند کر چکا تھا کہ وہ غفور پچا کے صحیح میں عین بر گل کے پیڑ کے نیچے بننے ہوئے چبوترے پر اپنے اور میرے لیے جگہ سننا ہے اور پکڑے رکھے۔ عشاء کی باجماعت نماز کا وقت عین وہی آٹھ بجے کا تھا، جس وقت ”انکل عربی“ شروع ہوا کرتا تھا۔ جانے آج یہ ابا کو کہاں سے مجھے اپنے ساتھ مسجد لے جانے کا جنون سر پر سوار ہو گیا تھا۔ جبکہ فی الحال تو میرے کھینچنے کو نہ کے دن تھے۔ میں نے فوری طور پر ذہن میں ان تمام بیماریوں کو یاد کرنے کی کوشش کی، جو ایسے موقع پر اچاک کہنیں سے بھی پیدا ہو کر مجھے اس ”مسجد یاترا“ سے بچا سکتی تھیں لیکن بدقتی سے اس ضرورت کے وقت میں اپنے چہرے پر بیماری سے پیدا ہونے والے ”چھتاثرات“ بھی ٹھیک طرح سے نہیں ابھار سکا اور اسی شش و پیٹھ میں عشاء کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ عین اسی لمحے راجہ کی مخصوص سیشی باہر گلی میں گوچی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ غفور پچا کے ہاں جا رہا ہے اور کچھ دیر کے اندر میں بھی وہاں پہنچنے کی کروں، پر آج تو یہاں معاملہ ہتی دوسرا تھا۔ میں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ جانے آج بینا کی انکل عربی سے ملاقات ہو پائے گی یا نہیں.....؟ بینا اس ڈرامے کی ہیر و کن کا نام تھا، جو ہو آپ سے مماثلت کی وجہ سے مجھے اچھی لگتی تھی اور آج کی قسط میں تو بہت اہم فیصلے ہونے تھے لیکن یہاں گھر میں تو اب اسے پہلے ہی میری قسم کا فصلہ سنا دیا تھا اور آج سے باجماعت نماز کی پابندی مجھ پر فرض کرو گئی تھی۔

کچھ دیر میں ابا گھر سے مسجد کے لیے نکل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ایسی مجبوری کے عالم میں چل رہا تھا جیسے کوئی بکرا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں اسے قربان گاہ کی طرف لے کر جائے گی، اپنے مالک کے پیچھے دقاداری سے سر ہلاتے ہوئے چلتا رہتا ہے۔

میں اس سے پہلے بھی مولوی صاحب کو نیاز و نذر دینے کے لیے مسجد آتا رہتا تھا۔ ابھی تین مینے پہلے ہی راجہ کی ممانی کے ہاں بیٹا ہوا تھا تو ہم لوگ اس کے کان میں اذان دلوانے کے لیے اسے یہاں مسجد میں لائے تھے۔ اس وقت یہ مسجد مجھے کافی مناسبی جگہ محسوس ہوئی تھی لیکن آج تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابا مجھے کسی قید خانے میں لے کر آگئے ہوں۔

مجھے دیگر بچوں کے ساتھ سب سے پچھلی صفت میں بخادا گیا اور کچھ ہی دیر میں مولوی صاحب بڑے رعب اور بد بے کے ساتھ جماعت

کروانے کے لیے تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی سب لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ہڑبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پتہ چلا کہ ان کے آتے ہی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور نمازیوں میں یہ کھلبی اسی وجہ سے مجھی تھی۔ تھیک آٹھ بجے مولوی صاحب نے زور سے تکبیر پڑھی اور اسی لمحے میرے ذہن میں ”انگل عرفی“ کی تعاریفی موسیقی بجا شروع ہو گئی۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے رکوع میں جانا تب یاد آیا جب ساری جماعت رکوع سے سراٹھا پچکی تھی اور میری زندگی کا پہلا سجدہ الٰہی ڈیڑھ رامے کے خیالات کی نذر ہو گیا۔ کیا کچا پکا سما ساجدہ تھا، ما تھا زار میں پر، آنکھیں ارگرد اور ذہن ساتویں آسمان سے بھی کہیں دور نہ کا ہوا۔ جب پہلے سجدے میں مولوی صاحب نے میری بساط سے کچھ زیادہ ہی دیرگاہی تو میں الحسن اور جلدی میں خود ہی اٹھ بیٹھا۔ تب ساتھ ہی نماز پڑھنے والے سنتا بڑی عمر کے لڑکے نے جلدی سے مجھے کھینچ کر دوبارہ سجدے میں ”پہنچا“ دیا۔

تب سے لے کر اب تک میری زندگی کا ہر سجدہ اتنا ہی نامکمل، اتنا ہی جلد بازی میں کیا گیا اور دوسرے اور بے دلی سے سرچشتے کے برابر ہے جتنا ہے فائدہ، جھوٹا اور منافقت بھرا میرا پہلا سجدہ تھا۔ میں لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایک سجدہ تو اس ریا کاری، اس جھوٹ، دکھاوے اور منافقت سے پاک ہو پائے۔ کبھی تو میرا ما تھا زار میں پر لکھنے کے بعد اس کی رضاپا کرہی واپس اٹھے..... لیکن افسوس میری یہ ادھوری خواہش آج تک ادھوری ہی رہی ہے۔

سی ٹاپ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

سی ٹاپ۔ مظہر کلیم کی عمر ان سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انجامی اہم سائنسی فارمولائیوب کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرا میں سمیت تقریباً تمام پرپا اور زنے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گویہ مجرم تنظیم عام بدمعاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام پرپا اور زاں تنظیم سے فارمولائی حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمر ان اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولائی حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید رقمومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمر ان اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل ہے اس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنادیا ہے۔ **سی ٹاپ**

کتاب گھر پرستیاب ہے **ناول سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی چوری

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس رات پہلی بار جماعت نماز کے بعد تو اب انے اپنا وظیرہ ہی بیان اذان ہوئی اور وہاں ان کا نماز کے لیے تیار ہو جانے کا حکم نامہ صادر ہوا۔ اس رات جب میں ابا کے ساتھ نماز ختم کر کے شتم پاشتم کی ند کسی طرح بھاگ بھاگ غفور پچا کے ہاں پہنچا تو آدھاڑ رامہ گزر چکا تھا اور میری جگہ پر بھی سلوکی تائی اماں قبضہ بھاچکی تھیں۔ راجہ نے غصے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے کندھے اچکا کر اپنی بیسی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد بینا کا بس ایک ہی مظرا آیا۔ وہ بھی بس پنڈجوں کا ساری رات میں بے چینی اور افسوس سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح میں نے راجہ سے اس نئی ”افتاد“ کا ذکر کیا تو وہ بھی پریشانی سے سوچ میں پڑ گیا۔ باقی نمازوں کا اتنا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ فی الحال فجر کی نماز کی تو مجھے ابا کی طرف سے چھوٹ تھی البتہ باقی سب گھروں کو ان کی ایک ہی گرجدار آواز فجر کی پہلی اذان سے بھی کہیں پہلے جگا دیتی تھی۔ ظہر کا وقت تو اسکوں سے آنے اور پکڑنے وغیرہ تبدیل کر کے کھانا کھانے میں نکل جاتا تھا۔ لہذا ظہر کی نماز گھر پر پڑھنے کی رعایت بھی حاصل تھی۔ اصل مسئلہ عصر، مغرب اور عشاء کا تھا۔ عصر کے وقت ہم لوگ کھیل کے میدان میں ہوتے تھے جو کہ مسجد سے اتنا دور تو نہ تھا کیونکہ محلے سے نکلتے ہی ایک سڑک پار کر کے ہم اس میدان تک پہنچ جاتے تھے لیکن پیچ کھیل میں نماز کا وقفہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ مغرب ہماری کھیل سے واپسی کا وقت تھا اور سب سے کٹھن وقت تو عشاء کا تھا۔ اس وقت تو ہمیں سکس ملین ڈالر میں، پلانیٹ آف ایپس (Planet of Apes)، شہر زوری اور اپنے پسندیدہ ”جیدی انگل“ کا کھیل ”انتفار فرمائیے“ دیکھنے کے لیے غفور پچا کے ہاں جمع ہونا لازمی ہوتا تھا۔ تھج تو یہ ہے کہ بہت عرصے سے تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ٹی وی پر شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ”اصل“ بچوں والے پروگرام جیسے کارلوں شو، الف لیلی، نک نک کمپنی، سارے دوست ہمارے اور کلیاں بھی آتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے تو غفور پچا کا منی سینما گھر کھلا ہی صرف آٹھ سے نوبجے کے لیے تھا۔ یوں ہم سب محلے کے بچوں کی ٹی وی بیسی کی ابتداء ہی بڑوں کے پروگرام سے ہوئی۔ بہت عرصہ بعد جب راجہ کے ابا نے اس کی ضد پر ”تو شیا“ کا بڑا سا بیک اینڈ واسٹ ٹی وی خریدا تو ہمیں پتہ چلا کہ اب سے پہلے تک ہم جو بھی دیکھتے رہے وہ بڑوں کے پروگرام تھے۔

میں اور راجہ کافی دن سر جوڑے بیٹھے سوچتے رہے کہ عشاء کی نماز سے چھکارے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ راجہ کا ذہن ایسے موقعوں پر خوب چلتا تھا لیکن یہ ایسا گھمیز مسئلہ تھا، جس کا توڑا اس کے ذہن میں بھی نہیں آپرہا تھا۔ مغرب کے وقت سے ہی ہمیں بخار چڑھنا شروع ہو جاتا تھا، خاص طور پر جب میرے دیر سے آنے پر راجہ مجھے بتاتا تھا کہ ”آخری چنان“ کے چلگیز خان نے اپنے بیٹے جو جواور قبلی خان کے ساتھ میں کرا میر

خوارزم کے لئے جان باز سپاہیوں کو شہید کر دیا ہے اور یہ سب کیا دھرا ہمارے ہی مسلمانوں کے امیر کے وزیر اعظم کا ہے تو میں غصے اور بے بھی سے یوں ہاتھ ملتا، جیسے اگر میں آٹھ بجے وقت پر آ جاتا تو ان سب کو بچا ہی تولیتا۔.....

ہمارے محلے کے اندر ہی پرلی طرف چوتھے درجے کے ملازمین کی عیسائیوں کی ایک بستی بھی تھی، جن دونوں الی وی پر ”آخری چنان“، آتا تھا ان عیسائیوں کے چھوٹے بچوں کی شامت آئی رہتی تھی کیونکہ جیسے ہی آخری چنان ختم ہوتا ہم سب مسلمان بچے اپنی لکڑی کی تلواریں لے کر ”یلغار ہو“ کے نعرے لگاتے ہوئے ان عیسائی بچوں پر پل پڑتے۔ چنگیز خان کے بغداد کے مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کا حساب لینے کا کوئی اور طریقہ جو نہ تھا ہمارے پاس۔ یوں ہر ہفتہ کسی نہ کسی عیسائی بچے کی آنکھ سوچی ملتی یا سر پھٹا ہوتا..... بالآخر عیسائی بستی کے بڑے بوڑھے ہاتھ باندھے ہمارے بزرگوں کے پاس ہماری شکایت لیے آن پنچے کہ یہ یوں تھک کے واسطے ہمیں ان چھوٹے ”مسلموں“ کی روزانہ بلکہ ہفتہ وار یلغار سے بچایا جائے اور پھر ہمارے بڑوں کے ہاتھوں کے ہاتھوں ہم سب کی جودگت بنی وہ سب تقریباً ناقابلِ اشاعت ہے۔ مجھے اور راجہ کو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ہمارے بڑوں کو خود تو اسلام کی خدمت کی ” توفیق“ نہیں ہو پاتی اگر ہم بچل کر مسلمانوں کی ”بھلانی“ کے لیے کچھ کرہی رہے تھے تو بجائے اس کے کوہہ ہماری کچھ حوصلہ افزائی کرتے، وہ تو بھوتا لے کر اتنا ہمارے ہی پچھے پڑ گئے تھے۔

بہر حال ان دونوں اپنے بڑوں کی یہ ”قدرت ناشای“ اور ”عیسائیت“ کے لیے ان کے دلوں میں موجود درہمیں اتنا نہیں کھلتا تھا جتنا عشاء کی نماز کا وقت اور میرے ابا کی نظر کی تھی۔ راجہ کا مسئلہ تو مجھ سے بھی ہاتھا۔ اسے میرے بناٹی وی دیکھنے میں بالکل بھی مزہ نہیں آتا تھا کیونکہ اسے کوئی بھی پروگرام دیکھتے ہوئے رواں تبصرہ کرنے کی عادت تھی اور اس کی اس فضول بکواس کو میرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جھیل پاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خاص جذباتی مناظر پر خوب موئے موئے آنسوؤں سے رونے کا بھی ماہر تھا اور اس کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ آدی یعنی میرے علاوہ دوسرا کوئی اس کے یہ آنسو دیکھ پائے۔ لہذا مجھ سے زیادہ ان دونوں وہ مشکل کا شکار تھا۔

اس رات ”Chips“ چیپس سیریز، جس میں ہمارے بے اختیار سندیدہ موٹر سائیکل سوار سار جنٹ اپنے کمالات دکھاتے تھے، کی دوسری قط آتا تھی۔ راجہ شام ہی سے میرے ساتھ ہی تھا اور ہم میرے ہی گھر کے صحن میں بیٹھے مختلف تباہل منصوبوں (Contingency Plans) پر گور کر رہے تھے کہ آج کی عشاء کی نماز سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی ہر سر پر خوبی میں اس قدر غرق تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میرے ابا ہم دونوں کے سر پر آن پنچے ہیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....؟“

میں اور راجہ یوں اچھے جیسے ہمارے سروں پر کوئی بم آ کر پھوٹا ہو۔ راجہ گھٹھیا یا۔

”وہ پچا..... دراصل میں آدی سے کہہ رہا تھا کہ کل سے مجھے بھی اپنے ساتھ نماز کے لیے جاتے ہوئے آواز دے جایا کرے.....“

ابا کے چہرے پر تھی کچھ کم ہوتی۔

”ہوں..... اچھی بات ہے..... لیکن کل سے کیوں..... آج سے کیوں نہیں.....؟ ابھی کچھ وقت ہے..... تم بھی بیٹیں آدی کے ساتھ ہی

وضو کرو۔ آج سے تم بھی ہمارے ساتھ ہی نماز کے لیے جایا کرو گے۔ خدا نے تمہارے ابا کو تو توفیق نہیں دی کہ زندگی میں کبھی عید کی نماز ہی پڑھ جائیں۔ چلو اچھا ہے اسی بہانے کم از کم ان کا بیٹا ہی نمازی بن جائے گا۔“

میرے ابا کو جانے کیوں ہمیشہ ہی سے راجہ کے ابا سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی تھی۔ آج وہ ان کی نماز نہ پڑھنے کی عادت کا روتا لے کر بینھ گئے تھے۔ ابا راجہ کے ابا کی شان میں کچھ بڑا تھے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ان کے جاتے ہی میں نے ایک زور دار چپت راجہ کے سر پر رسید کی اور غصے سے سرگوشی میں کہا۔

”یہ کیا حماقت کی تم نے۔ تم یہاں میری جان بچانے کے لیے آئے تھے یا خود کو پھنسانے؟“

”کیا کرتا یا ر..... تمہارے ابا یوں اچانک سر پر آن پہنچے تھے کہ جلدی میں اور کچھ بھی نہیں آیا..... آدی یا ر..... اب کیا ہو گا..... مجھ تھے تو نماز کی سورتیں بھی پوری طرح سے یاد نہیں ہیں۔۔۔“

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

اسنے میں عمارہ ہمارے سر پر پہنچ گئی اور ہمیں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر مغلوک سے لبھ جیں ہوئی۔

”یہ کیا تم دونوں سر جوڑے بیٹھے ہو.....؟ چلو جلدی سے ضوکرو۔۔۔ ابا انتفار کرتے ہوں گے۔“

ہم دونوں نے دانت پیس کر عمارہ کی جانب دیکھا لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے اسے کچھ کہا تو وہ وہیں سے آواز لگا کر ابا کو سب بتا دے گی۔ پوری تھاں کی بیٹگن تھی وہ اور اس نازک مرحلے پر ہم دونوں ہی مزید کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لہذا چپ چاپ عمارہ کی ہدایات پر عمل کرتے رہے۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

تحوڑی ہی دیر میں ابا اپنی تبعیغ گھماتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور میں اور راجہ کی معمول کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے چل دیئے۔ راستے میں ابا کو چند اور محلے کے نمازی بھی مل گئے، جو محلے کے ساتھ ملکی مسجد کے مستقل نمازی تھے۔ ابا ان کے ساتھ با توں میں مشغول آگے آگے روانہ تھے اور میں اور راجہ سب سے آخر میں ان کے پیچھے۔ ابا کا معمول کچھ یوں تھا کہ پونے آٹھ بجے ہم مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور آٹھ بجے عشاء کی جماعت کے بعد سوا آٹھ بجے تک باقی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل آتے۔

میں اپنی قسم اور راجہ کی عقل کو ستا ہوا جیسے ہی ”ابا پارٹی“ کے پیچھے مسجد میں داخل ہونے لگا تو یا کیک راجہ نے مجھے بازو سے کپڑا کر پیچھے کھینچ لیا۔ تب تک ابا اور ان کے دو دوست مسجد کا صحن پار کر چکے تھے۔ میں نے جرأت سے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ روک کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں ابا مسجد کے اندر ورنی حصے میں واقع ہال میں داخل ہو گئے۔ میں نے راجہ سے اپنا بازو چھڑایا۔

”اب اندر بھی چلو گے یا یہیں باہر کھڑے رہ کر پوری نماز پڑھنے کا ارادہ ہے؟“
راجہ نے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”یہاں سے اب نمازی کلتے بجے پھر میں گے۔۔۔“

میں نے راجہ کو ڈالنا۔

”کیا مطلب..... یہ مسجد ہے کوئی سینما گھر نہیں، جہاں سے لوگ شو یکھنے کے بعد چھوٹتے ہیں۔“

راجہ نے اپنا سر بلایا۔ ”ارے یا کیا فرق پڑتا ہے..... ایک ہی بات ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اب تمہارے ابا یہاں سے کتنے بجے باہر نکلیں گے.....؟“

<http://kitaabghar.com>

”سو آٹھ بجے تک..... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی ہمارے پاس آدھا گھنٹہ موجود ہے؟ ہم ٹھیک سوا آٹھ بجے یہاں پر موجود ہوں گے۔ مسجد کے اندر تمہارے ابا کو اتنے نمازیوں کی موجودگی میں بھلا کیا پڑتے چلے گا کہ ہم اندر ہیں یا باہر چھوٹا ہیں۔ کہیں موڑ سائکلوں کے کرتے نچھوٹ جائیں ہم سے۔“

کتاب گھر کی پیشکش

راجہ مجھے ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھیٹتا ہوا ہاں سے غفور چچا کے گھر کی طرف لے دوڑا۔ ول تو میرا بھی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا لیکن مذہ دکھاوے کے لیے میں کچھ جھیں پیش کرتا گیا لیکن راجہ بھی مجھے خوب جانتا تھا کہ یہ تمام تاویلیں میں خود اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے گھر رہا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں ہم دونوں ٹوی کے سامنے اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھتے ”چپس“ کی شروعات دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی آٹھ بج کر دوس منٹ پر پہلا وقفہ آیا راجہ نے مجھے کہنی ماری اور ہم دونوں غیر محضوں طریقے سے غفور چچا کے ہاں سے یوں نکلے، جیسے عام طور پر پانی وغیرہ پینے کے لیے دیگر ”ناظرین“ اٹھ کر باہر جاتے تھے۔ یہ طریقہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا بچہ ہماری جگہ پر قبضہ نہ کر لے۔ غفور چچا کے گھر سے نکلتے ہی میں نے اور راجہ نے سرپت دوڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں ہم مسجد کے بیرونی دروازے پر موجود تھے۔ راجہ نے جلدی سے اندر جماعت کراطیمان کر لیا کہ میرے ابا کے جو تے اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کچھ ہی دیر میں جب ابا اندر سے نکلے تو میں نے اور راجہ نے نہایت ”سعادت مندی“ سے ان کے جو تے سیدھے کیے۔ ابا نے ہمیں دعا دیتے ہوئے جو تے پہنچنے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے اسی سعادت مندی سے چل پڑے، جس طرح ہم یہاں تک آئے تھے اور جیسے ہی ابا ہمارے گھر کے دروازے سے اندر واپس ہوئے ویسے ہی ہم اٹھ پاؤں کسی گولی کی رفتار کے ساتھ بھاگتے ہوئے دوبارہ غفور چچا کے گھر میں آن موجود ہوئے۔ وقفہ ختم ہوئے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے اور ہماری جگہ ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ میں اور راجہ اپک کراپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور چند لمحے تو ہم دونوں سے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لی گئی کیونکہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد ہمارا دبڑی طرح سے پھول چکا تھا۔

بہر حال راجہ کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا اور ہم دونوں کا خوشی کے مارے برحال تھا۔ ابا کوڈرا بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ ہم دونوں نماز کے دوران مسجد میں موجود ہی نہ تھے۔ فلم ختم ہوئی تو میں اور راجہ باہر نکل آئے۔ راجہ نے زور سے میرے کانہ ہے پر با تھہ مارا اور فخر یا انداز میں ہستے ہوئے بولا۔

کتاب گھر کی پیشکش

”کیوں آدمی پیارے..... مانتے ہو راجہ کے دماغ کو یانیں؟“

میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر راجہ کے سر کی بلا میں لے لیں کیونکہ اس کا شیطانی دماغ اسی سر کے اندر موجود تھا۔

نماز کی یہ چوری میری زندگی کی پہلی چوری تھی۔ میں نے اس کے بعد بھی بہت سی چوریاں کیں، بڑے بھیاکے گلک میں سے چار آنے اور دس پیسے نکلنے کی چوری، عمارہ کے لئے میں سے اس کی پسندیدہ خوشبودار مٹانے والی رہڑکی چوری، باورچی خانے میں اسی کے مختلف ڈبوں میں

چھپائے ہوئے گڑ کی چوری، ابال کر کے گئے شہدے ہوتے ہوئے دودھ کے اوپر سے بالائی کی چوری اور جانے ایسی کتنی چوریاں لیکن ہر چوری کسی نہ کسی ایک مقام پر آ کر مجھے چھوڑتی ہی پڑی یا پھر مجھ سے خود ہی چھوٹ گئی لیکن اپنی پہلی چوری کو میں آج تک نہیں چھوڑ پایا۔ یہ لت مجھے کچھ اس طرح سے چھٹی کر میں آج تک اپنی نماز اور اپنے مذہب میں چوریاں کرتا پھر تھا ہوں۔

جانے نماز اور مذہب میں چوری کرنے کی یہ لت میرا پچھا کب چھوڑے گی۔ جانے خدا اپنے ہی اندر کی جانے والی اس نقاب زنی کی شرمندگی اور اس عذاب سے میری جان کب چھوٹے گی..... جانے کب.....؟

کتاب کفر کی پیشکش

کاغذی قیامت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہماری دنیا میں ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ محصول بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنی نوٹ..... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہو گا؟! اس کاغذ کی اہمیت یا لخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت.....

اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنالیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفاک مشن میں کامیاب ہو گئے..... یا.....؟

اس کہانی کی ہر ہر طریق میں خوفاک ایکش اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سنسس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروں نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروز خوف وہشت سے کاپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیاں جبڑوں نے دنیا میں بننے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروں کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لا قافی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو خفر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا.....

کاغذی قیامت کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلی مار

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجہ کا فارمولہ انتہائی کامیابی سے جاری تھا اور ہم عشاء کی نماز سے یونہی جان چھڑا کر بچتے رہے حالانکہ ان دونوں میں کئی مرتبہ نماز پر وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑے بھی کمیکھٹاک پناہی ہو چکی تھی۔ ہم ٹھیک وقت پر ابا کے مسجد سے نکلنے سے پہلے مسجد کے دروازے پر پہنچ جایا کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ ہم سے وقت کے اندازے میں کچھ پوک ہو ہی گئی۔ ہم جیسے ہی مسجد کی طرف جانے والی سڑک کا موڑ مرنے لگے تو ہماری اوپر کی سانس اور اور پیچے کی نیچے رہ گئی۔ اباد گیر نمازوں کے ساتھ دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

دراصل یہ سب راجہ کی حفاہت کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ”پابندی وقت“ کو مزید سخت کرنے کے لیے کلوکبازیے کے ٹھیلے سے ملی ایک پرانی سی ہاتھ پر باندھنے والی گھڑی بھی پانچ روپے میں اس کی میتیں ترے کر کے خرید لی تھیں اور راجہ نے خاص طور پر عصر کے وقت مسجد جا کر میرے سامنے مسجد کی گھڑی سے اپنی اس ہاتھ والی گھڑی کا وقت ملا لیا تھا لیکن ہمیں کیا پتہ تھا کہ اس کلوکبازیے کی طرح اس کی دی ہوئی یہ بو سیدہ گھڑی بھی یوں لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہو گی۔ اس رات میں اور راجہ ”شارٹریک“ جسے ہم ستاروں والی فلم کہتے تھے، دیکھنے میں مگن تھے۔ میں نے دو مرتبہ راجہ سے وقت پوچھا اور دونوں مرتبہ بے دھیانی میں آٹھنچھ کر پانچ منٹ بتایا۔ جب تیسری مرتبہ بھی میرے پوچھنے پر راجہ کے مند سے آٹھنچھ کر پانچ منٹ لکھا تو ہم دونوں ہی زور سے چوکے۔ راجہ نے کلائی پر بندھی گھڑی کو غور سے دیکھا اور زور سے چلایا۔

”ابے..... یار مارے گئے.....“

سب لوگ چونکہ کرہاری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جلدی سے راجہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر بندھ گھڑی کی رکی ہوئی سو نیاں مجھے دکھائیں اور ہم دونوں اصطبل سے بھاگے ہوئے گھوڑوں کی طرح قلانچپیں بھرتے ہوئے غفور چچا کے گھر سے نکل کر مسجد کی جانب بھاگے۔ راستے میں راجہ اپنی بیٹی کے گھر سے واپس لوٹی ہوئی تھیں بوا سے زور سے گمراہی گیا۔ دراصل اس میں میرا اور راجہ کا اتنا قصور نہیں تھا جتنا تھیں بوا کے بڑے سے شش کا کبر قعے کا تھا، جس کا گھیرا اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ مشرق سے مغرب تک ہرست صرف ان کا برقدبی بکھرا نظر آتا تھا۔ ہم بجا گئے ہوئے کالوں سے نکل رہے تھے اور تھیں بوا سائیکل رکشہ والے کو صلوٰتیں ساتھیں محلے میں داخل ہو رہی تھیں۔ موڑ مرتے ہی وہ ہم دونوں کے سامنے آگئیں۔ میں تو پھر بھی کسی کی طرح جھکائی دے کر ان کے خیسہ نما بر قعے سے نکلنے میں کامیاب ہوئی گیا لیکن راجہ پوری کوشش کے باوجود ان کے بر قعے کی زد میں آہنی گیا۔ تھیں بوا کے مند سے زور سے ایک لمبی اور اونچی ”ہائے“ کی آوازنگی۔ پہلے ان کی چٹائی کی بنی ہوئی تو کری فضا میں بلند ہوئی، اس کے بعد ان کا سال خورده پلاسٹک والے فریم کا مونا سا چشمہ اور پھر مجھے صرف اتنا ہی نظر آیا کہ راجہ ان کے بر قعے میں کچھ اس طرح

سے گذشتہ ہوا کہ کچھ دیر تک پتہ ہی نہیں چل پایا کہ ان میں سے بھجن بواؤں کی ہے اور راجہ کدھر ہے؟ ایسا لگتا تھا، جیسے کسی بہت بڑے خیمے میں کوئی جنگلی بھینسا آن گھسا ہو۔ اگلے ہی لمحے بھجن بواسیت سڑک پر الٹا ”وھرا“ ہوا تھا۔ بھجن بواؤ کے منہ سے مغلاظات کا ایک ریلہ تھا، جو لئے جا رہا تھا لیکن چونکہ ان کا چشمہ بھی اتر کر سڑک کے درمیان کہیں پڑا ہوا تھا لہذا انہیں میں اور راجہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دے پائے۔ وہ ہائے ہائے کرتے ہوئے ہمیں صلوٰتیں سنائی جا رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کے بر قعے کے اندر سے راجہ کو کسی طرح ڈھونڈ کر نکلا جو بھی تک بددھوی سے یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔ اسے کھڑا کر کے میں نے جلدی سے بواؤ کا چشمہ اٹھا کر انہیں پکڑا یا اور اس سے پہلے کہ وہ چشمہ اپنی آنکھوں پر لگا کر ٹھیک سے ہمیں دیکھ پاتیں، ہم دونوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔

لیکن اسی تمام کش کاش میں الجھتے اور گرتے جب ہم نے مسجد کا موڑ کا نا تو ابا کو مسجد کے دیگر نمازوں سمیت باہر نکلتے دیکھ کر میری تو شی ہی گم ہو گئی۔ ابا کی نظر ابھی تک ہم پر نہیں پڑی تھی۔ ان کے پیچھے بڑے بھیا بھی سر پر اوپنی ٹوپی پہنے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ میں اور راجہ اپنی جگہ پر جیسے جم کر رہے گئے اور پھر اچانک ہی راجہ نے جلدی سے اپنا رخ اسی طرف پلٹ لیا اور میرے گلے میں بھی بانہیں ڈال کر مجھے بھی اسی جانب موڑ لیا جس طرف سے ہم بھاگتے ہوئے مسجد کی جانب آرہے تھے۔ اب دور سے ابا کی نظر پڑی تو انہیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ان سے کچھ دیر پہلے ہی مسجد سے نکل کر الجھے دوستوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈالے واپس گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور چند لمحوں کے وقٹے میں ہوا کہ خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ بھی ہم نے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے ہم دونوں کا خون خشک کر دیا۔

”تم دونوں کہاں بھاگے جا رہے ہو، کوئی ٹرین چھوٹ رہی ہے کیا۔ یہاں آؤ اور اپنے بھیا کے ساتھ ساتھ چلو۔۔۔۔۔۔“

میری اور راجہ کی سانس آگئی۔ مطلب ابا کو پر نہیں چلا تھا کہ ہم مسجد میں موجود نہیں تھے۔ جانے خدا کو ہماری گونی نیکی یاد آگئی تھی۔ بہر حال ہم دونوں بھاگتے ہوئے ابا کے پیچھے چلتے ہوئے بھیا سے قدم ملا کر چلنے لگے لیکن ایک دوسری مصیبت ہماری تاک میں پہنچی تھی۔ فاری بھیانے غور سے مجھے اور راجہ کو دیکھا اور مٹکوں لجھے میں پوچھا۔

”تم دونوں نے کب نماز پڑھی.....؟ میں نے تو تم لوگوں کو مسجد میں کہیں نہیں دیکھا.....؟“

میں نے گھبرا کر راجہ کی طرف دیکھا، یہ تو شکر تھا کہ ابا کسی اور نمازی سے ہاتھیں کرتے ہوئے جا رہے تھے ورنہ بھیا کی آوازان کے کانوں تک ضرور پہنچ جاتی۔

راجہ نے فرا بھیا سے پوچھا۔

”آپ کہاں کھڑے تھے جماعت کے وقت؟“

بھیا راجہ کے جھانے میں آگئے اور بول پڑے ”تیری صف میں، اندر۔“

”ہاں تو بھلا آپ ہمیں کیسے دیکھ پاتے۔ میں اور آدمی تو باہر برآمدے میں کھڑے تھے۔“

اس وقت تو راجہ نے بھیا کو لا جواب کر دیا لیکن کاش ہم دونوں اسی لمحے یہ بھی جان پاتے کہ یہ مصیبت ابھی ٹلی نہیں ہے تو کتنا اچھا ہوتا۔

ابا کے گلی کا موزہ مرنے سے پہلے ہی میں اور راجہ بھاگ کر غفور چچا کے ہاں پہنچ پکے تھے۔ بھیا کے دل میں شک جڑ پکڑ کا تھا اور اگلے چند دن تک ہماری باقاعدہ نگرانی کرنے کے بعد وہ میرے اور راجہ کے ”بے داع“ منصوبے سے واقف ہو پکے تھے۔ انہوں نے عمار کو بھی بتا دیا تھا کہ عشاء کی نماز کے وقت میں اور راجہ کہاں پائے جاتے ہیں لیکن ابھی تک ان دونوں کو کوئی مناسب موقع نہیں مل پایا تھا کہ وہ ابا کے سامنے نمبر بنانے کے لیے میری شکایت لگا سکیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی.....؟ ایک رات ابا کچھ پہلے ہی نماز کے لیے نکل پڑے۔ اتنے عرصے میں اب انہیں اس بات کا اطمینان ہو چکا تھا کہ میں راجہ کے ساتھ خود مسجد بٹھنے کا ذہن گا۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے اور راجہ کو جو گلی میں میرے ساتھ کھڑا کسی عیسائی پچے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہر سے گزرے تو ہم اس کی خبر لے سکیں، کچھ کہا لیکن ہم دونوں ابا کی بات پر دھیان نہیں دے سکے، صرف اتنا ہی سمجھ میں آیا کہ نماز کے لیے آ جانا۔

راجہ نے گھر میں وقت دیکھا تو ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ میں اور راجہ ابا کے جانے کے بعد سیدھے غفور چچا کے ہاں پہنچ گئے۔ نیرہ نور کی مدھر آواز ”جلے تو جلا و گوری“ پر ہم کافی دیر تک سرد ہفتہ رہے لیکن ہم دونوں کو خیر نہ تھی کہ آج خود ہمارے پر سکون آشیانے کے پروں کے جلنے کا وقت آچکا ہے۔ سوا آٹھ بجے سے ایک منٹ پہلے میں اور راجہ بھاگتے ہوئے مسجد کے دروازے پر جا پہنچ لیکن یہ کیا؟ مسجد تو بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔ ایک نمازی بھی اندر موجود نہیں تھا۔ میرے اور راجہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اتنے میں مولوی صاحب اپنے مجرے سے کھنکارتے ہوئے باہر نکلے اور ہمیں یوں دروازے میں گم سم کھڑا دیکھ کر وہیں سے بولے۔ ”بچو..... تم لوگ دیر سے آئے ہو، نمازو تو کب کی ہو جکی.....“

پتہ یہ چلا کہ بڑھتی سردیوں کے ساتھ ہی نماز کے اوقات میں پیچھے کی جانب تبدیلی ہوتی ہے اور آج نماز پونے آٹھ بجے ہی ہو گئی تھی۔ مطلب یہ کہ ابا آٹھ بجے گھر واپس جا پکے تھے۔ مجھے مولوی صاحب پر شدید غصہ آیا۔ اگر نماز کے اوقات تبدیل کرنا ہی تھے تو پہلے ہی کسی اوپھی جگہ پر لکھ کر لگانا چاہیے تھا۔ ضرور انہوں نے کل رات جماعت ہونے کے بعد نماز کے اوقات تبدیل ہونے کا اعلان کیا ہوگا۔ اب ایسی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے کل ہونے والا اعلان سن لیا ہوگا اور شاید جاتے ہوئے گلی میں انہوں نے مجھ سے اور راجہ سے یہی کہا تھا کہ جلدی مسجد بٹھ جائیں۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ راجہ نے رقت بھری آواز میں مولوی صاحب سے درخواست کی کہ آئندہ جب کبھی نظام الادوات پر لئے ہوں تو ہرا وہر یانی مسجد کی بیرونی دیوار پر بھی لکھ کر لگوادیا کریں تاکہ ہم جیسے ”گناہ گار“ نماز یوں کو بھی وقت کی اس تبدیلی کا پتہ چل سکے۔ جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مولوی صاحب سے کہوں کہ ہماری آج کی رات خیریت سے گزرنے کی دعا سب سے پہلے کریں کیونکہ میں جانتا تھا کہ آج کی رات کم از کم مجھ پر بے حد بھاری گزرنے والی تھی۔ سارے راستے راجہ مجھے تسلیاں دیتا رہا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی گلی کے گذر پر میں نے اسے گلے گا کر اپنی آہوں اور سکیوں میں رخصت کیا۔ آپس راجہ کی تھیں اور سکیاں میری، جو میرے منہ سے نہیں ہوتے ہوئے ابا کی مارکا سوچ کر ہی پہلے سے نکل رہی تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے برآمدے میں غصے سے ٹھلتے ہوئے ابا پر میری نظر پڑی۔ انہوں نے غصے سے ہنکا راجرہ۔

”آگئے جتاب..... بڑی لمبی نماز پڑھی آج تو میرے لعل نے۔“ میں منہ ہی منہ میں بد بدلایا۔

”جی..... وہ میں جی“

اباً گر جے۔ یہ کیا جی جی لگارکی ہے۔ اور وہ دوسرا لوفر کھا ہے، جو تمہارے ساتھ روزانہ گھر سے نماز کا کہہ کر لکھتا ہے۔“

مطلوب یہ کہ اگر ابا نے راجہ کو دوسرا لوفر کھا تھا تو یقیناً انہوں نے پہلے لوفر کے درجے پر مجھے ہی فائز کر کھا ہو گا۔ میں ابھی اپنے ذہن میں اس درجہ بندی میں مصروف ہی تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”میں پوچھتا ہوں کہاں تھے نماز کے وقت۔ ذرا شرم نہیں آتی یوں اللہ کے گھر سے بھاگتے ہوئے تمہیں، کب سے دھول جھوٹ کر رہے ہو ہماری آنکھوں میں؟“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ عماراً اور بھیا برآمدے کے ستونوں کے پیچھے نے نکل آئے اور عمارہ نے الف سے لے کری تک تمام داستان امیر حمزہ ابا کے گوش گزار کر دی۔ بھیا کے چہرے پر فتحانہ مکراہٹ تھی، جیسے کہہ رہے ہوں ”دیکھ لیا نا۔ تھ۔ یہ انجام ہوتا ہے میرے گلک سے پوچھتے بناء پیسے نکالنے کا۔ اب بھجو۔“

عمارہ بلوچی گئی اور ابا کا پارہ آسمان کی آخری حدود کو چھوٹنے کے درجے کو پہنچا گیا۔ ایسے موقعوں کے لیے خاص ”چھڑی“ بھیا نے پہلے ہی برآمدے میں لا کر رکھ دی تھی تاکہ بعد میں ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں ابا کی وہ چھڑی ٹوٹ کر مجھ پر بر سر رہی تھی۔ اس رات تو امی کی مداخلت بھی کام نہ آتی۔ بالآخر جب امی نے ابا کی چھڑی کی ضریب خودا پنے ہاتھ پر سہنا شروع کر دیں اور اپنے ہاتھوں کو میرے جسم کی مستقل ڈھال بھایا تب ابا کو رکنا ہی پڑا۔

یہ پہلی مارچی جو ابا کے ہاتھوں اس رات مجھے پڑی تھی۔ اس کے بعد بھی مجھے بہت بار مار پڑی۔ کبھی ابا کے ہاتھوں، کبھی اپنے درس دینے والے مولوی کے ہاتھوں، کبھی اسکوں میں ہید ماشر کے ہاتھوں لیکن ان میں سے سب سے بڑی مار وہ تھی، جو اس زمانے اور وقت نے مجھے ماری۔ شاید اس دنیا میں سب سے بڑی مار اس زندگی کی مار ہوتی ہے۔ آگے چل کر زندگی نے مجھے بہت مارا۔ ہر موڑ پر آٹھا اٹھا کر پھنا۔ میرا جسم میری روح جانے کتنی بار بھولہاں ہوئی اس کی میں گفتگی بھی بھولتا گیا۔ کاش زندگی، زمانے اور وقت کی مار بھی اس رات ابا کی مار جیسی ہوا کرتی، جس سے بچانے کے لیے امی کے محافظ ہاتھ ہمیشہ میری ڈھال بن جایا کرتے تھے لیکن وقت کے ان بے حرم تھیزوں سے بچانے کے لیے امی کے مہربان ہاتھ ہمیشہ اور ہر جگہ میری ڈھال نہیں بن پائے۔ زخم پر زخم لگتا رہا اور میں اپنے مقدر کی مار سہتا چلا گیا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا ڈاکہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس رات کی ابا کی مارا دران کی چھڑی کے نشانات بہت دنوں تک میرے جسم کی زینت بنے رہے۔ راجہ نے جب میری پیٹھ پر یہ نشانات دیکھنے تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ میں ابا کا سگا بینا نہیں ہوں اور ضرور انہیں کسی میلے وغیرہ سے ملا ہوں گا، جہاں اپنے اصل ماں باپ سے چھڑ کر میں کسی جھولے میں ٹنگا رورہا ہوں گا اور ابا کو مجھ پر حرم آگیا ہو گا اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے ہوں گے۔ راجہ کے اس ”یقین کامل“ کی وجہ حال ہی میں ریگل سینما میں الگی محمد علی اور شاہد کی شی قلم ”جوش، تھی، جس میں ہیرا پنے گھروالوں سے ٹھیک یوں ہی چھڑ جاتا ہے اور پھر جوان ہونے کے بعد اسے اپنے اصلی ماں باپ واپس مل جاتے ہیں۔ راجہ نے کئی فقطلوں میں چھپ کر یہ فلم دیکھی تھی اور اسے محمد علی کے تمام مکالے زبانی یاد بھی تھے۔ راجہ کے بقول اسے تو میرے نازک انداز اطاورد کچھ کر پہلے دن سے ہی پکا یقین تھا کہ میں کسی نہایت امیر و کبیر گھرانے کا جسم و جانش ہوں جو نہ جانے کیے اس غریب محلے میں آپنچا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

گھر کی پیشکش

میں ابھی حرمت سے منکھو لے راجہ کی یقینوں کی رہا تھا کہ اپا تک ہی راجہ نے زور سے میرے دنوں ہاتھ پکڑ لیے اور انتباہ جذباتی لجھ میں اس نے مجھ سے یہ وعدہ کرنے کو کہا کہ جب کبھی میرے اصل ماں باپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آپنچیں اور میں ان کی لمبی سی مرشدی زیگاڑی میں اس محلے سے خصت ہونے لگوں تو جاتے جاتے راجہ کو مجھی اپنے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر لیتا چلوں کیونکہ میرے بغیر اس کا دل بھلا اس جگہ پھر کیوں کر گے؟ میں نے بھی فوراً اسی قدر جذباتی لجھ میں راجہ سے وعدہ کیا کہ میں ہرگز اسے لیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بھلا امی کے بناء میرا دل وہاں کیسے لگ پائے گا۔ لہذا میں نے اسی کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عمارہ اور بڑے بھیا کو میرے ساتھ وہاں نہ ہوئے تو میں اپنی امارت کا رعب کس پڑاں والوں گا اور روزانہ میری لڑائی کس سے ہوگی؟ لہذا طے ہے پایا کہ عمارہ اور بڑے بھیا کو بھی شدید دشمنی کے باوجود ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یہ خیال تانے لگا کہ اگر ہم سب ہی یہاں سے چلے گئے تو پھر ابا کیلے یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ ان کی سائیکل روزانہ کون صاف کرے گا؟ شام کو انہیں حق کون بھر کر دے گا؟ مانا کر آج کل ان کا سلوک مجھے جیسے ”امیر گھرانے“ کے بچے کے کچھ شایان شان نہیں ہے لیکن کبھی کبھی شام کو وہ مجھے اپنی سائیکل کے ڈنڈے پر لگائی ہوئی چھوٹی والی گدی پر بٹھا کر سخنہندی سڑک کی سیر کو بھی تو لے جایا کرتے تھے اور ابھی پچھلے ہی مینے انہوں نے مجھے سرخ اور پیلے رنگ کا بنا بردا سیستہ جہاز کا کھلونا بھی تو خرید کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کے مقابلے میں اس ذرا سی مارکی حیثیت اب مجھے ثانوی سی لگنے لگی تھی لہذا طے یہ پایا کہ میں، راجہ اور ابا سمیت اپنے تمام گھر والوں کو اپنے ”ہونے والے بیٹے“ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے اصل اور امیر ماں باپ میری یہ ”معصوم سی خواہش“

بھی روئیں کریں گے بلکہ میں نے اور راجہ نے تو پکا طے ہی کر لیا کہ اگر انہوں نے اب ایسا رجہ کو ساتھ لے جانے میں ذرا بھی آنا کافی کی تو میں بھی ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گا۔

لیکن فی الحال مجھے اپنے اصلی ماں باپ کی تلاش سے بھی بڑی ایک اور فکر لاحق تھی اور وہ فکر تھی وہ جو آپی کا سامنا کرنے کی، جانے کب عمارہ نے میری مارکا تمام قصہ قواؤپی کے گوش گزار کر دیا تھا۔ دراصل عمارہ بھی میرے ساتھ ہی استانی خالد کے ہاں سبق پڑھنے جایا کرتی تھی اور مجھ سے چار سپارے آگے بھی تھی۔ ابا کی مارکے بعد میں ایک آدھ دن ”انتقاماً“ استانی خالد کے ہاں سبق پڑھنے نہیں گیا۔ تبھی ان دونوں میں بد قسمی سے قواؤپی کسی کام سے استانی خالد کے ہاں آئیں اور مجھے نہ پا کر عمارہ سے میرے بارے میں پوچھنے پڑیں۔ بس پھر کیا تھا عمارہ کو تو وہ ویسے بھی بھیشہ میری ”عزت نفس“ دوسروں کے سامنے محروم کرنے میں بے حد مزا آتا تھا اور اس دن تو وہ ویسے بھی مجھ سے لڑکنی تھی کیونکہ میں نے اس کی کاپی پر ”بے دھیانی“ میں سیاہی الٹ دی تھی۔ عمارہ نے خوب نمک مرچ لگا کر قواؤپی کو اس رات کا سارا قصہ سنادیا اور پھر واپس آ کر مجھے بھی بتانے لگی کہ قواؤپی مجھے اپنے گھر بارہی ہیں۔ میرا ما تھا تو اسی وقت ہی ٹھنک گیا تھا کہ ضرور داں میں کچھ کالا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو پوری داں ہی کالی ہے۔ دوچار دن تو میں قواؤپی سے نظر پچا گیا لیکن پھر ایک دن جب ہم محلے کے بڑے میدان میں اسٹاپ کھیل رہے تھے اور کھیل میں اس قدر مگن تھے کہ ہمیں قواؤپی کے تانگے کے آنے نتک کا پتہ نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا، جب مجھے فضلو بابا کی آواز سنائی دی، جوتا تانگے والے سے کرائے پر بحث کر رہے تھے۔ گھبرا کر دوسرا جانب دیکھا تو قواؤپی بڑی سی چادر لپیٹنے تانگے سے اتر رہی تھیں۔ میں فوراً وہاں سے روپچکر ہونے کی نیت سے بھاگا لیکن دوسرے ہی لمحے میری کالائی قواؤپی کی نازک گرفت میں تھی۔

”آدمی..... کہاں بھاگے جا رہے ہو..... میرے ساتھ گھر چلو..... اماں نہ جانے کتنے دن سے تمہارے لیے ماش کی داں کا حلوجہ بناۓ بیٹھی ہیں۔ روز تھا راپوچھتی ہیں۔“

لیکن خالد ماش کی داں کا حلوجہ واقعی بہت لذیذ بناتی تھیں لیکن اس وقت مجھے یہ ترغیب بھی لجھا نہیں سکتی تھی لیکن اب کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا تھا۔ قواؤپی اسی طرح میرا با تھا میے مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے اپنی اماں کو آواز لگا کر مطلع کر دیا کہ میں یعنی جناب آدمی صاب ان کے ساتھ ہی تشریف لے آیا ہوں لہذا میرے لیے بھی شام کی چائے بنائی جائے۔

لیکن خالد کو ہدایات دینے کے بعد قواؤپی نے مجھے اپنے سامنے پڑی چوکی پر بٹھا لیا اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے اچانک ہی پوچھ بیٹھیں۔

”آدمی..... یہ میں تمہارے بارے میں کیا سن رہی ہوں؟ جو کہوں تو تم سے ایسی امید مجھے ہرگز نہ تھی۔“

میں ان کے اس اچانک حملے سے گھبرا گیا اور پھر میرے دل کے دوسرا چورنے بھی اسی لمحے سر اٹھایا، لیکن انہیں طاہر بھائی نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ اس روز ان کے گھر انگوروں کی پرات نہیں پہنچی تھی۔ اتنے دونوں سے وہ انگوروں والا ماجرہ تو میں بھلائے ہی بیٹھا تھا بجوجو تو قواؤپی سامنے آئیں تو اچانک ہی میری نظروں کے سامنے انگور کے گچھے لہرانے لگے تھے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ”جی..... کیا.....؟“

تب وجوہ آپی نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”مجھے تمہاری نماز چوری والے راز کے بارے میں سب پتہ ہے۔ کتنی بڑی بات ہے آدمی۔ بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟ میں جانتی ہوں یہ ساری شرارتوں اس راجد کی ہوگی۔ میری مانو تو اس راجد سے دور ہی رہا کرو۔ وہ تو ہے ہی سدا کا شرارتی۔ تمہیں بھی اپنی طرح کا بناڑا لے گا جب کہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارا آدمی بہت اچھا چچے ہے۔“

لکھن عجیب بات تھی کہ دنیا میں ہر کسی کو اپنا بچہ ہی سب سے زیادہ شریف مخصوص اور اللہ میاں کی گائے نظر آتا ہے۔ راجد اکثر مجھے بتاتا تھا کہ اس کی اماں اسے پوپ کے ساتھ کھینے سے منع کرتی تھیں۔ پوپ کی امی کو گذو سے شکایت تھی اور گذو کے ابا اسے راجد سے دور رہنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ان بڑوں کی آپس میں تو بھی بنتی نہیں تھیں تھی اثاثیں سب مل کر ہم بچوں کے اتحاد و اتفاق کو تباہ کرنے کے درپے رہتے تھے لیکن شکر ہے کہ ہم سب بچوں کو ان ”خرافات“ میں پڑنے کی بالکل بھی عادت نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے گھروالوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرا کان سے نکال دیتے تھے لیکن آج بات ہمارے گھروالوں میں سے کسی بڑے کی نہ تھی۔ آج تو وجوہ آپی نے خود مجھ سے یہ بات کہی تھی اور جو تو یہ ہے کہ مجھے انہوں نے بہت بڑے ”دھرم سناھٹ“ میں ڈال دیا تھا۔ راجد ویسے ہی میری وجوہ آپی کی جانب بے تحاشہ توجہ سے بہت چوتا تھا۔ اگر اسے یہ بات پڑے چل جاتی کہ وجوہ آپی نے مجھے اس کے ساتھ کھینے سے منع بھی کر دیا ہے تو پھر تو وہ نچال ہی آ جاتا۔ بہر حال اس وقت تو میں چپ ہی رہا کیونکہ میں فی الحال بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ سوچا کسی وقت فرست میں وجوہ آپی کو تفصیل سے پوری بات اور راجد کی خوبیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس وقت ان کے پوچھنے پر میں نے ان سے صرف اتنا ہی کہا کہ ”میرا دل نہیں لگتا نماز میں۔“ اتنے میں سکینہ خالہ چائے لے کر آگئیں اور بات مل گئی۔

وجوہ آپی کے گھر سے باہر نکلا تو راجد کو وہیں ٹھہنٹے پا کر میں کچھ گھبرا سا گیا۔ راجد نے چپ معمول چڑے ہوئے لجھے میں کہا۔

”یا را یک توجہ تمہیں تمہاری یہ وجوہ آپی بلا لیتی ہیں تو تمہیں دنیا کی کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

”کچھ نہیں..... عمارہ کی بیچی نے نماز کی ماروا لاسارا قصہ انہیں بتا دیا ہے۔ اسی وجہ سے بلا یا تھا۔ بڑی بے عزتی ہو گئی یا را چی۔“

راجد نے بھی یہ سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم دونوں نے اسی وقت عہد کیا کہ موقع ملنے ہی عمارہ سے ایسا بدل لیں گے کہ وہ بھی ساری زندگی یاد رکھے گی۔ عمارہ کو رینگنے والے کیڑوں مثلاً لال بیگ، چھپکی وغیرہ سے بے حد ڈال گتا تھا۔ میں نے راجد کو کہیں سے بھی ایک عدموئی تازی چھپکی کا انتظام کرنے کو کہا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھتے ہوئے راجد انگور کی قیل کے اوپر سے کسی طرح اس چھپکی کو عمارہ کے اوپر گرانے گا۔ اس کے بعد عمارہ کا خوف کے مارے جو حشر ہوتا اس سے میں اور راجد خوب واقف تھے۔ ہم کافی دیر تک وہیں کھڑے اس منسوبے کی جزئیات طے کرتے رہے اور ہمارے انتقامی جذبے اور خیالات کو کافی حد تک وہیں کھڑے کھڑے سوچ کر ہی کافی تسلیکیں مل گئی۔ اتنے میں مغرب کی اذان سنائی دی تو ہم دونوں مسجد کی جانب دوڑ پڑے، کیونکہ آج کل ایک نئی اوقات ہم پر پڑی ہوئی تھی۔ اپانے باقاعدہ ہماری مسجد میں حاضری لگانا شروع کر دی تھی۔ ان کے حاضری لگانے کا نماز بھی عجیب تھا۔ نماز ثتم ہونے کے بعد گھر میں گھستے ہی ان کا پہلا سوال ہوتا۔

”ہاں میاں..... نماز کے لیے آئے تھے یا نہیں.....؟“

”میں منمنتا تا“ بھی آیا تھا۔“

ابا گھور کر پوچھتے ”کون سی صفائی میں کھڑے تھے۔“

”بھی چوتھی صفائی میں۔“ <http://kitaabghar.com>

”ہوں..... اور میں کہاں کھڑا تھا۔“

”جی آپ پہلی صفائی میں..... مولوی صاحب کے باہمیں جانب۔“

”اچھا تو بتاؤ مولوی صاحب نے پہلی اور دوسرا رکعت میں کون سی سورۃ پڑھائی تھی.....؟“

”بھی پہلی رکعت میں سورۃ قیل اور دوسرا میں قل ہو اللہ۔“

یوں ابا مطمین ہو کر ایک لمبا سا ”ہوں“ کرتے اور اس دن کے لیے میں اس پل صراط کو پار کر جاتا لیکن روز روز یہ مقابلے کے امتحان سے بھی بڑا امتحان پاس کرنا اب میرے لیے کافی نکھن کام ثابت ہونے لگا تھا کیونکہ میرے اور راجہ کے دل کا چورا ب بھی ہمیں نماز کی چوری پر اکساتا رہتا تھا۔ خاص طور پر جس دن اُنٹی پر ”بائیونک و مسن“ یا غائب ہو جانے والے ”بیشمنی میں“ Gmni Man کا کھیل چلتا ہوتا اس دن تو ہمارے پیٹ میں گویا مستقل درودی رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ راجہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری تو مجبوری ہے کیونکہ میں رہتا ہی ابا کے گھر میں ہوں لہذا ان کا سامنا ہونا لازمی ہے لیکن اسے تو اس پیشی سے بچنے کے لیے صرف ابا کے سامنے آنے سے گزیر کرنا ہو گا پھر وہ کیوں اپنی ساری تفریح کا پیڑہ غرق کر کے اپنا مزہ کر کر اکرتا ہے۔ چپ چاپ جا کر غفور پچاکے ہاں مزے سے بیٹھ کر ٹیکی دیکھ لیا کرے لیکن راجہ میری اس بات پر باقاعدہ مجھ سے روٹھ گیا کہ کیا وہ ”اس قدر گر گیا ہے کہ اب اکیلے ٹوی دیکھنے جایا کرے گا؟“ بڑی مشکل سے میں نے راجہ کو منایا کہ میرا مطلب وہ نہیں تھا، جو وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ بہر حال ہمارا مسئلہ اپنی جگہ قائم تھا۔

اس شام بھی ہم دونوں سر جوڑے بیٹھے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی حل سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے سامنے سے مولوی سعید سائیکل پر اپنے بیٹے اختر کو بھائے گزرے۔ اختر کو بھی ہم بچے مولوی اختر کے نام سے ہی پکارتے تھے کیونکہ وہ ہربات میں اپنے ابا کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولوی سعید صاحب نکاح خواں تھے اور باقاعدہ کسی مسجد کے مولوی نہ ہونے کے باوجود سب انہیں مولوی ہی کہتے تھے۔ میں نے اور راجہ نے اپا کس سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاید ہم دونوں کے ذہن میں یہی وقت ایک ہی بات کسی بھلکی کی طرح کوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنا جیب الثانی، میرے پاس آٹھ آنے اور راجہ کی جیب سے کوئی ایک روپے کے قریب سکے نکلنے۔ ہم دونوں وہ ڈیڑھ روپیہ لیے کچھ ہی دیر میں مولوی سعید کے دروازے پر کھڑے تھے اور اختر ہمارے سامنے جریان پر یہاں سا کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

”میں سمجھا نہیں..... مجھے کرنا کیا ہوگا.....؟“ <http://kitaabghar.com>

راجہ نے سکے اپنی مٹھی سے اس کی ہیچلی میں منتقل کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”کوئی مشکل کام نہیں ہے پیارے، صرف مسجد میں اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ آدمی کے ابا کون سی صفت میں اور کس نمبر پر کھڑے ہوتے ہیں اور یہ کہ مولوی صاحب نماز کے دوران کون سی سورتیں پڑھاتے ہیں۔ نماز ختم ہوتے ہیں، ہم مسجد کے باہر تمہارا انتظار کرتے ملیں گے۔ تم یہ ساری معلومات ہمیں دینے کے بعد ہمیں گھرو اپس آؤ گے..... کیا سمجھے.....؟“

مولوی اختر نے پیسے گرتے کی جیب میں ڈالے اور دانت نکالتے ہوئے سر ہلا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے قدرت نے پھر ہماری اس نماز چوری کا بندوبست کروادیا تھا۔ اب اختر مسجد سے باہر نکتا تو میں اور راجہ کاغذ، پسل لیے اس کا انتظار کر رہے ہو تے۔ اختر جلدی جلدی جلدی ہمیں ابا کی پوزیشن اور باقی معلومات فراہم کرتا اور میں اور راجہ سے رٹا گاتے ہوئے گھر کی جانب بھاگتے۔ کبھی کبھی وہ کم بخت اختر سورتوں کی ترتیب بھول جاتا اور ہماری جان تک اٹکی رہتی، جب تک ہم ابا کے وایواک (Zبانی امتحان) سے گزرنہ جاتے۔ بھیانے بیچ میں ایک آدھ بارہ میں پکڑوانے کی ناکام کوشش کی لیکن ہمیں یہ سب کیسے پتہ چلتا تھا یہ بات وہ بھی کبھی نہ جان پائے کیونکہ ہماری معلومات سو فیصد پکی ہوا کرتی تھیں۔ راجہ نے اس معاملے میں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا لیکن جیرت کی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں ہم دونوں کو یہ بات بھی سمجھنیں آسکی کہ ہم اس تمام عمل میں جس مشقت سے گزر رہے ہیں اور تو اپنا جیب خرچ بھی اس لاچی اختر کی جیبوں میں بھر رہے ہیں۔ اوپر سے ہر لمحہ ابا کا ڈر اور پکڑے جانے کا خوف الگ۔ اس تمام عذاب سے تو کہیں آسان تھا کہ ہم سیدھے سجاو مسجد میں جا کر خود ہمیں نماز پڑھ لیتے کیونکہ اختر کو درمیان میں ”ملوٹ“ کرنے کے بعد کبھی کبھی تو ہمارا اس سے بھی کہیں زیادہ وقت ضائع ہو جاتا تھا جتنا اس صورت میں ہوتا، جب ہم سیدھے مسجد جا کر خود نماز پڑھ کر نکل آتے لیکن ہمارے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آتی کہ یہ چوری تو ہمیں کچھ دینے کے بجائے خود ہم سے ہمارا بہت کچھ چھیں رہتی تھی، ہماری اپنی جیبوں پر ہماری پڑھتی تھی۔ دنیا میں کس چور نے ایس چوری کی ہوگی جس کے بعد ہر بار وہ خود ہی لٹا ہو۔ شاید میں اب تک بھی یہ بات نہیں سمجھ پایا کہ بہت سی چوریاں اسکی ہوتی ہیں جو خود اپنے اندر ہی ڈاکہ مارنے کے متادف ہوتی ہیں۔ میرا اپنے اندر کا یہ ڈاکہ، یہ فریب، یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ کبھی ایک صورت میں، تو کبھی کسی دوسری صورت میں..... چاہے کچھ ہو جائے پر میرے اندر کا ڈاکو، ڈاکہ مارنے سے باز نہیں آتا۔

اپالو

اپالو کہانی ہے حسن و عشق کے دیوتا اور بتاہی و بر بادی کی علامت اپالوکی..... ایک عالم اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا..... قدم پر موت اس کی راہ میں جال بچھائے بیٹھی تھی..... اپالو..... جسے خود اپنی تلاش تھی اور خود آگہی کی جدوجہد میں وہ ساری دنیا گھوم گیا..... پر اس راحات میں غیر معمولی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک **اپالو** کیا اپنی تلاش میں کامیاب ہوا؟

اپالو کتاب گھر کے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا بائی سکوپ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

جس دن سے راجنے یہ اکٹھا کہ میرے امی باپ نہیں ہو سکتے اس دن سے محلے میں کوئی بھی کھل کھیلتے ہوئے ہماری نظر جب بھی محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوتی ہوئی کسی لمبی چوڑی امپالا، شیور لے یا فیاٹ کار پر پڑتی تو میں اور راجہ کھل چھوڑ چھاڑ کر اس گاڑی کا طواف کرنے لگ جاتے۔ ہم دونوں کواب بھی پورا یقین تھا کہ ایسی ہی کسی بڑی گاڑی میں کسی دن ہماری قسمت کے سیجا بھی نہیں لینے آجائیں گے۔ راجہ، صاحب لوگ اور میم صاحب کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی جلدی سے مجھے گاڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا اور میں انتہائی معصومی شکل بنا کر اس وقت تک ان کے سامنے پلکیں پٹ پٹا رہتا جب تک ان لوگوں کی مجھ پر نظر نہیں پڑ جاتی تھی۔ دراصل میں اور راجہ چاہتے تھے کہ اگر وہ بڑی گاڑی والے صاحب اور میم میری ہی تلاش میں ہمارے محلے میں آئے ہیں تو پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پہچان جائیں لیکن درجنوں جوڑوں کے دیکھنے کے باوجود میں کسی کا "مطلوبہ کھویا ہوا پچھہ" ثابت نہ ہوا۔ کبھی کسی میم یا صاحب کی نظر مجھ پر پڑ بھی جاتی تو "ہاؤ سویٹ" کہہ کر میرے گال کھینچ کر آگے بڑھ جاتے، ایک آدھ نے چالکیٹ بھی تھا دی اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں اور راجہ دیے تو محلے کے سب سے فیشن اسپل بچ تھے اور ہماری امیاں ہمیں خوب چکا کر اور لگکھی پڑی کر کے گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ میری امی کو تو ہمیشہ مجھے کسی کی نظر لگ جانے کا ذرورت تھا لہذا وہ میرے ماتھے، ناک یا گال پر ایک آدھ کا لایڈک لگا کر گھر سے باہر بھیتھی تھیں لیکن اس دن میں اور راجہ استانی خالہ کے ہاں سے سبق پڑھ کر سیدھے محلے کے بڑے میدان میں پٹخونگ کھلینے کے لیے آگئے تھے لہذا ہمارے سروں پر ابھی تک گھر سے نکلتے وقت رکھی گئی سفید دوپلی ٹوپیاں بھی موجود تھیں۔ ابھی ہم نے کھل شروع ہی کیا تھا کہ محلے میں سفید رنگ کی ایک بڑی کیڈلک داخل ہوئی۔ میں اور راجہ گاڑی دیکھتے ہی فوراً اس کے رکنے سے پہلے ہی عین اس کے اگلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے سوٹ پینے ایک صاحب اور فیروزی رنگ کے نیل یا شم میں ملبوس ایک خوب صورت سی خاتون اتریں۔ راجہ نے فوراً مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک قدم آگے کھڑا کر دیا۔ میرے چہرے پر اس وقت وہی معصومیت کا سمندر رخا ٹھیس مارہا تھا اور راجہ بھی اس طرح مودب کھڑا تھا، جیسے اس جوڑے سے کہنا چاہ رہا ہو کہ "لیں جی..... سنبھالیں اپنی امانت..... بہت عرصہ حفاظت کر لیں نے آپ کے بچھے کی۔ اب ہم سے مزید نہیں ہوتا....." عورت ہم دونوں کو دیکھ کر راس مسکراتی اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک ہلکی سی لہرا بھری۔ اس نے اپنے مرد سے ہلکے سے کچھ کہا۔ میرا اور راجہ کا دل زور سے دھڑکا۔ مرد نے بھی مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ راجہ نے پیچھے سے سرسراتی سی آواز میں ہلکے سے کہا۔

"اوے آدی کے بچے..... گلتا ہے یہی تیرے اصلی امی ابا ہیں۔ تیار ہو جا۔ یہ لوگ تجھے ہی لینے آئے ہیں۔"

میں نے اپنے ذہن میں فوراً اپنی چیزوں کی فہرست ترتیب دے ڈالی کہ اپنے "ترک" میں سے کیا کچھ مجھے ساتھ لے جانا تھا اور کون سی ایسی چیزیں تھیں، جنہیں میں جاتے ہوئے محلے کے ان غریب بچوں میں بانٹ جاؤں گا۔

عورت اور مرد دنوں ہی مسکراتے ہوئے میری اور راجہ کی جانب بڑھے، ہم دنوں نے اپنے دم سادھ لیے۔ دنوں ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میم صاحب نے میرے گال چھو لیے اور مرد نے راجہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دنوں کے ہاتھ آگے بڑھے اور کوئی کاغذ نما چیزان کے ہاتھوں سے ہمارے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی اور جوڑ آگے بڑھ گیا۔ کچھ دریک تو میں اور راجہ سمجھنی نہیں پائے کہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب ہم دنوں نے اپنی اپنی ہتھیلیاں کھولیں تو اس میں دس دس روپے کے دنوں میں اور راجہ کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میم صاحب اور بڑے صاحب میرے اور راجہ کے حیے اور ہمارے سر پر بھی سفید ٹوپیاں دیکھ کر نہ جانے کیا تھے کہ ہمارے ہاتھوں میں پیسے تھا گئے تھے۔ بقول راجہ وہ ہمیں مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے والے بچے سمجھے تھے۔ اس قدر بے عزتی.....؟ غصے کے مارے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ میں وہیں پیسے پھینک کر اور پیر پتھنے ہوئے وہاں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ راجہ مجھے پیچھے سے آوازیں دیتا رہا گیا لیکن میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور بھاگتا ہوا گھر چلا گیا۔ مغرب کے وقت راجہ نے مجھے گھر کے باہر دھرہ ہی لیا لیکن میں اب بھی اس سے روٹھا رٹھا ساتھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ نہ وہ مجھے یہ قیمتی مشورے دیتا اور نہ آج یوں لوگ ہمیں مدرسے کے بچے سمجھ کر ہمارے ہاتھوں میں چندے کے پیسے تھما تے۔ میں نے تو راجہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اب مجھے اس کی کسی بات کا یقین ہی نہیں رہا۔ یہ سن کر راجہ غصے میں آگیا اور اس نے تیسری جماعت کی اردو کی کتاب کے سبق میں موجود بابا قادر جیلانی کی قسم کھائی کہ اس نے خود سینما کے بائیکسکوپ میں یہ سارا قصہ دیکھا ہے اور اگر مجھا بھی یقین نہیں آ رہا تو پھر اس اتوار کو میں بھی اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلا چلوں۔

چ تو یہ ہے کہ راجہ کے منہ سے فلم کی کہانیاں اور سینما کے ماحول کے بارے میں سن کر خود مجھے بھی سینما جانے کا بے حد شوق ہونے لگا تھا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ آج تک میں نے اکیلے بھی محلے سے باہر والی سڑک پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ سینما تو بہت دور کی بات ہے، مجھے بھی سڑک کے پار پر چون کی دکان سے اپنے لیے پہنچ، شاپنگ یا رہو گیرہ لینے ہوتی تھی تو میں بڑے بھیا کے ساتھ سڑک پار دکان تک جاتا تھا۔ فلم کے نام پر میں نے آج تک صرف محلے میں ہر ہفت آنے والے ایک بابا کاٹیں کا بڑا سا ٹبہ دیکھا تھا۔ اس ٹبے میں چاروں جانب اندر جھانکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گول روشن دان سے بننے ہوتے تھے، جن کے منہ پر مٹن کے ڈھکن لگا کر انہیں بند کیا ہوا ہوتا تھا۔ ہم نے اس بابے کا نام ہی منڈ وابا بر کھچھوڑا تھا اور جب بھی وہ بابا ہمارے محلے میں اپنی سائیکل پر منڈوے کا بڑا سا ٹبہ کا بکس اٹھائے داخل ہوتا تو ہم سب بچے اپنی اپنی جیبیوں سے ریز گاری کاکل کر اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، جو چتنا بڑا اسکا سے پیش کرتا اس بچے کو اتنی ہی زیادہ دری کے لیے اس بکس میں جھانکنے کی اجازت ہوتی۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ اس چھوٹے سے بکس میں نہیں، شبنم، رانی، شاہد اور بارہ شریف وغیرہ بھی کیسے ایک ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم سب کو یوں نادیدوں کی طرح اس بکس کے گرد طواف کرتے دیکھ کر راجہ ہم سب بچوں کا بہت مذاق اڑایا کرتا کہ بھلا یہ بھی کوئی فلم ہے؟ فلم دیکھنی ہے تو سینما کی فلم دیکھو، جس کے چہاری سائز کے پر دے پر جب سد باد بحری قفر اقوال سے لڑتا ہے یا نارازن جب شیر کی سواری کرتا ہے تو کیا جگہ مدد کو آنے لگتا ہے۔ یہ ذہبہ بھلا کیا فلم دکھائے گا؟ یہ تو فلم کے نام پر دھبہ ہے۔ اسے تو بائیکسکوپ کہنا بھی اصل بائیکسکوپ کی توہین ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر جس دن سے میں نے راجہ کی لے پا لک بچے والی تھیوری Theory پر شک کا اٹھا کر کیا تھا اس دن سے تو وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ کچھ بھی ہوا ایک بار تو مجھے اس کے ساتھ ریگل میں لگی ندیم شہنم کی ”دل لگی“ کا میٹنی شوت و یکھنے جانا ہی ہو گا تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کروں کہ وہ تھا ہے یا جھوٹا۔

آخر کار ”راجہ کے اصرار“ کے سامنے مجھے تھیارہ لانا ہی پڑے۔ راجہ نے خوشی سے ایک لبا ”اوے ہوئے“ کا انفرہ لگایا۔ پتہ یہ چلا کہ محلے میں راجہ کے علاوہ تین اور بچے یعنی گدو، مُشی اور تھو بھی فلم میں کے شو قین تھے اور راجہ ہی کی قیادت میں اس سے پہلے چند مرتبہ گھریا اسکول سے بھاگ کر مارنگ یا میٹنی شود کیجے چکے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر قسطلوں میں فلم دیکھتے تھے مثلاً ہمارے شہر میں ایک فلم عموماً دو ہفتے تو نکال ہی جاتی تھی۔ یہ لوگ کبھی فلم کا شروع کا آدھ گھنٹے کا حصہ، کبھی انتزول کے بعد کا کچھ حصہ اور کبھی اختتام ہی پہلے دن دیکھاتے تھے۔ اس طرح سے انہوں نے آج تک کوئی فلم پوری ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں یہ سب بچے مل بیٹھ کر آگے پیچھے کی کہانی جوڑ کر اپنے طور پر پوری فلم کی کہانی ”بھٹھے کی کوشش“ کرتے جو کہ عام طور پر اتنی گھمگی بھر ہوتی کہ کوئی ہدایت کا رسن لیتا تو شاید اسی فلم میں سے چار پانچ مرید فلمیں اور کہانیاں نکال دالت۔

سب سے پہلا مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میں نے راجہ سے کہا کہ میرے پاس لکٹ کے میں نہیں ہیں۔ راجہ نے دانت نکالے اور جیب سے میں روپے نکال کر مجھے دکھائے ان میں سے ایک نوٹ وہ تھا، جو میں اس دن کار کے پاس پھیک کر بھاگ آیا تھا۔ راجہ نے تب مجھے سمجھایا کہ ”مایا“، یعنی پیسے روپے کی یوں ناقد رہی نہیں کرنی چاہیے ورنہ مایا دیوی روٹھ جاتی ہے۔ اسی خیال سے راجہ نے اس دن میرا پھینکا ہوا نوٹ بھی اٹھایا تھا کہ میرے کسی ”مرے وقت“ میں کام آئے گا۔ میں نے گھور کر راجہ کو دیکھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت ہم پانچوں ہی برے حال میں تھے۔ فلم کا سب سے اگلی لائن کا لکٹ تین روپے کا ملتا تھا۔ مطلب ہم پانچ کے ہوئے چند رہ روپے، باقی پانچ روپے میں راجہ نے ہمیں انتزول کے دوران عیاشی کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب ہمیں بے چینی سے اتوار کے دن کا انتظار تھا کیونکہ عام اسکول کے دنوں میں ہمارا گھر سے نکلنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر مجھ پر تو اتنے زیادہ پہرے لگے ہوئے تھے کہ اگر میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ گھر سے باہر رہ جاتا تو ای فوراً بھیایا عمارہ کو باہر محلے میں مجھے دیکھنے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔ لہذا مجھے اس بات کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اتنی دیر یتک میں گھروں کی نظر میں آئے بغیر گھر سے باہر کیسے رہ پاؤں گا؟

پہلے میں نے سوچا کہ ہو آپی کے گھر کا کہہ کر گھر سے اجازت لے لوں اور ہو آپی کو کسی بہانے مناؤں گا کہ اگر گھر سے کوئی پوچھنے آئے تو اسے کہہ دیں کہ وہیں کہیں ہوں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے ذہن کا بنا یا یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ ہو آپی میرے گھروں کو تو سنجاں لیں گی لیکن ان کو کون سنجا لے گا؟ وہ تو سوال پوچھ پوچھ کر مجھے ہی مٹھا کر دیں گی اور پھر اگر انہیں اس بات کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی کہ میں راجہ کے ساتھ اتنی دیر کے لیے کہیں جا رہا ہوں تو پھر تو سمجھو قیامت ہی برپا کر دیں گی۔ کچھ سمجھنیں آرہا تھا کہ یہ معتمد کیسے حل ہو گا؟

آخر کار اسی شش و پنج میں اتوار کا دن بھی آگیا۔ اس دن میری کچھ ایسی حالت تھی کہ میں ہر آہٹ پر چونکہ ہی تو پڑتا تھا، جیسے میرے ماتھے پر لکھا ہوا ہو کر آج میں فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ دو مرتبہ تو آتے جاتے تھن میں اب اسے نکلا گیا۔ ایک مرتبہ ٹھوکر سے ان کا حقدالٹ گیا۔ اب ازور سے گر جے ”کیا ہو گیا ہے لڑکے؟“ وہاں سے گھبرا کر پلانا تو برآمدے میں اسکول کا کام کرتے آڑھے تر پچھے لیٹے بھیا کی کمر پر چڑھ گیا۔ ان کی ایک زور

داریج گوئی اور اس سے پہلے کہ میں ان کے لئے چڑھتا میں بھاگ کر امی کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسے جیسے میٹنی شوکا وقت قریب آتا جا رہا تھا میری دل کی دھڑکنیں یوں بے ترتیب ہوئی جاتی تھیں، جیسے دل ابھی سینے کے سنبھے سے باہر نکل جائے گا۔ آخر کار قست کو مجھ پر کچھ رحم آئی گیا۔ میرے سب سے بڑے پہرے داریجی بڑے بھیا دو پہر دو بجے امی سے اجازت لے کر ہا کی کامیکھی بڑے ہا کی گراڈ نہ چلے گئے۔ ان کے ٹلنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عمارہ کو ہمسائی شاہدہ اپنے گھر بلالے گئی وہ عمارہ کے ساتھ مل کر پھر کسی بد مرہ ٹھاٹ کی چشمی بنانے کا کوئی نیا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا اور عمارہ کا محبوب مشغله تھا۔ ان دونوں کی بنای ہوئی چشمیاں اور مربے عام طور پر محلے کی بیویوں اور مرغیوں کے آگے ڈالنے کے کام آتے تھے۔

ڈھائی نئے بچے تھے اور تمیں بچے میٹنی شوکا وقت تھا۔ باہر سے راجہ کی مخصوص سیٹوں کی آواز لگتا تارا نا شروع ہو گئی تھی۔ ابا اتوار کے دن دادی سے ملنے جایا کرتے تھے، ان کی واپسی عصر سے پہلے ناممکن تھی۔ امی دو پہر کو ذرا رادیر کے لیے کرنا تھی تھیں۔ بس مجھے اسی موقعے کا انتظار تھا۔ کچھ ہی دیر میں امی باورچی خانے سے برلن وغیرہ سنجال کر باہر نکلیں اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے بولیں۔

”آدمی، وہاں صحن میں بیٹھنے کیا کر رہے ہو جاؤ کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔ دیکھو دو پہر میں کہیں کھسک نہ جانا ورنہ بہت پٹائی کروں گی۔“

امی اندر چل گئیں۔ ہم بچے عام طور پر اپنی اماؤں کی ایسی ڈھمکیوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ماؤں کی پٹائی کیسی ہوتی ہے۔ مارتے ہوئے بھی ان کی کوشش بھی ہوتی ہے کہ خود ان کا ہاتھ دکھتا ہے تو دکھ جائے پران کے جگر گوشے کو کوئی کاری ضرب نہ لگنے پائے اور پھر میری امی کے لیے تو میرے منہ سے نکلی ایک زور کی ”ہائے“ ہی کافی تھی۔ ساری مار پٹائی بھول کر درد والی جگہ پر پھونکیں مارنے لگتی تھیں۔ امی کے کمرے میں جاتے ہی میں دبے پاؤں اٹھا اور گلی میں نکتھے ہی میں نے محلے کی چار دیواری کی طرف دوڑ لگا دی جہاں راجہ دسرے فلم بین بچوں سمیت میرا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ نے مجھے دیکھتے ہی جھاڑا کہ ”اتنی دیر کہاں لگا دی؟“

میں نے حیرت سے ان چاروں کے جیلیے کو دیکھا۔ وہ سب کے سب بڑے چیک والی بوشریں پہنے، آنکھوں پر بڑے بڑے کالے چشمے لگائے، بالوں میں تیل ڈالے اور بڑے بڑے خانوں والی کھلے پاچھوں والے فلپپر پہنے ہوئے تھے۔ صرف ان کے کپڑوں کے رنگ ہی مختلف تھے ورنہ وہ چاروں اس وقت ایک ہی گھر کے چار جو کر لگ رہے تھے۔ خواکا چشمہ تو اس کے چہرے سے بھی کافی برا تھا لہذا اب اب را پھسل کر اس کی گردان تک آ جاتا تھا، جسے وہ جلدی سے پھر سے اپنی ناک پر ڈکانے کی کوشش میں اسے مزید لکا دیتا۔ پتہ چلا کہ راجہ نے ان سب کو ”بڑوں والے جیلے“ میں آنے کے لیے دکھائی دیں۔ اسی ٹینیش میں گذروں، خنوں اور مشی کو جو چیز بھی گھر سے ہاتھ گلی وہ پہن کر اوڑوں ”ڈال“ کر آگے تھے۔ خواپنے تباہا کا چشمہ پہن آیا تھا، گذرا پانے با کی واسک اور مشی نے تو حد ہی کر دی تھی وہ اپنی بڑی بہن کا جانی رنگ کا فلپپر میچنگ شرٹ کے ساتھ پہن آیا تھا۔ خود راجہ بھی کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے بال اپنے پسندیدہ ولن اسلام پر ویز کے انداز میں اور بنا کر ماتھے پر ایک اٹ چاند کی صورت میں چپکا کر گئی تھی۔ گلے میں رومال خاص لفڑوں کے انداز میں باندھ رکھا تھا اور اپنی بشرٹ کے بہن بھی آگے سے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ چند بچوں تک میں انہیں اور وہ مجھے حیرت سے دیکھتے رہے اور پھر اس سے پہلے کہ میں ان کا مذاق اڑاتا وہ چاروں مجھے دیکھ کر کھلکھلا کر پہن پڑے۔ راجہ نے دور ہی سے نظر لگایا۔

”اوے آدی..... استانی خالد کے ہاں سبق لینے کے لیے آیا ہے کیا.....؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ میں حسپ معمول گھر کے عام شلوار گرتے میں ملبوس تھا۔ سینے پر اپی کا بنا ہوا سامنے سے کھلا سویٹر تھا اور سر پر گرم اونی ٹوپی جس کے سامنے کا بنن ہمیشہ کس کر باندھ دیتی تھیں تاکہ کان ٹھنڈے نہ ہوں۔ مجھے تو اپنے حلیے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، جسے دیکھ کر کسی کو بھی کوئی خاص اعتراض ہو سکتا ہو۔ بہرحال اب ان باتوں پر دھیان دینے کا وقت بھی کہاں بچا تھا۔ شو شروع ہونے میں چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔ ریگل سینما ہمارے محلے سے اتنا دور نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم سینما کے یہ ورنی گیٹ کے باہر موجود تھے لیکن یہ کیا؟ نکٹ والی کھڑکی پر تو اس قدر بھیڑ تھی کہ لوگ باقاعدہ ایک دوسرے سے بھگزدہ ہے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی، جسے جالی لگا کر مزید چھوٹا کر دیا گیا تھا اس کے اندر بننے ایک چھوٹے سے روشن داں میں بیک وقت درجنوں ہاتھ گھے ہوئے تھے۔ لوگ لڑ رہے تھے، پیخ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ میں جلدی سے ڈر کر راجہ کے پیچھے چھپ گیا۔ راجہ اغفارش دیکھتے ہوئے دھیرے سے بڑا ہیا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com> ”فُضْبٌ ہو گیا..... آج تو گلتا ہے کھڑکی تو زدن ہے پکپک کا۔“

میں راجہ کی بات سمجھنے سے پایا۔ اگر کھڑکی ہی تو زنی تھی تو پہلے ہی سے تو زکر رکھتے.....؟ خوانخواہ اتنے بہت سے لوگوں کو عذاب میں ڈال رکھا تھا۔

اتھے میں ایک اور عجیب بات ہوئی۔ کھڑکی کے گرد درجنوں لوگ شہد کے چھتے سے چھٹی مکھیوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان جو بہت دیر سے پیچھے والی قطار میں کھڑے تھے اور ان میں بے چینی اپنی انتبا کا پہنچتی جا رہی تھی، ان میں سے ایک نوجوان نے اچاک ایک زوردار نعرہ لگایا اور اپنی قیص اتار کر ہوا میں اچھال دی، جسے اسی کے ایک ساتھی نے دیوچ لیا۔ اس نوجوان کے دوستوں نے اسے کمر اور پیروں سے پکڑ کر ہوا میں اونچا اچھال دیا، وہ نوجوان سیدھا جا کر کھڑکی کے گرد بھیڑ کے سروں پر جا گرا، بھیڑ میں سے کسی نے اس نوجوان کی ماں بہن کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ کہے لیکن وہ نوجوان کسی بات کی پرواہ کرتے ہوئے اور باقاعدہ تیرتے ہوئے لوگوں کے سروں کے دریا کو کسی ماہر پیراک کی طرح ہاتھ پر چڑھاتے ہوئے نکٹ والی کھڑکی تک جا پہنچا اور وہیں لوگوں کے سروں پر لیٹئے لیٹئے اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے اندر ڈال دیا اور کچھ دیر میں چہرے اور ہاتھوں پر چند خراشیں، پیچھی ہوئی بنیاں اور بکھرے ہوئے بالوں سمیت ہاتھوں میں نکٹ تھامے اپنے دوستوں کے پاس فخر سے اکڑتا ہوا اپس آن پہنچا۔ اس کے دوستوں نے خوشی میں زوردار نعرے لگائے اور اسے اسی طرح اپنے کانہ صوں پر اٹھائے ہوئے اندر ورنی ہاں کی جانب بڑھ گئے۔

میں نے مایوسی سے راجہ کی جانب دیکھا۔ اس طرح تو ہمیں ساری زندگی بھی اگر وہاں کھڑے رہتا پڑتا تو نکٹ ملنے کی امید نہیں تھی۔ راجہ نے ہم سب کو تسلی دی اور ہمیں سینما کی بالکلونی کے باہر لگے فلم کے پوسٹر اور تصویریں دیکھنے کا مشورہ دیا اور خود کسی جانب چلا گیا۔ میں، مشی، گڈ و اور نھو بھیڑ بھاڑ سے دور ہٹ کر بالکلونی میں گھوم پھر کر تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ تو خاصا بڑا سینما ہاں لگ رہا تھا۔ بلکہ ہمارے پرائمری اسکول سے بھی بڑا تھا۔ دیواریں پر ہمارے قد سے بھی بڑی ندیم اور شبکم کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ایک بہت بڑے سے تختے پر اندر چلنے والی پکڑ کی کہانی کی تصویریں بھی لگائی گئی تھیں۔ ہمارے لیے یہ سب بہت عجیب، خوب صورت اور خواب ناک تھا۔ کچھ ہی دیر میں شہر کی وہ ”بھیڑی“ بھی آنا شروع ہو گئی جس کا ذکر

راجہ نے ہم سے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی سے لکٹ بک کروار کہتے تھے یا پھر شہر کے اہم عہدوں پر فائز لوگوں کی فیملیز تھیں، جیسے کمشٹ صاحب، ڈپٹی صاب، بڑے لاث صاب، ایس پی صاحب وغیرہ۔ جنہیں ہر ہی فلم کے رعایتی پاس پہلے ہی سے مہیا کر دیئے جاتے تھے۔ یہ سب لوگ بنا کسی بھی میں بنی قطار میں لگے اور بنا اپنے کپڑے اور سورے ہوئے بال خراب کیے ہاتھوں میں بیگم صاحبات کے ہاتھ تھے اور نوکروں کو لین اور Limca کا یاقالے کی مشندی بتلوں کی توکریاں تھائے، چیس اور چیوگن چباتے ہوئے ہنستے مسکراتے سینما کے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ سب ان بچوں کو پیار کر رہے تھے اور ان کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اور خیال نے اسی لمحے جنم لیا کہ آئندہ میں تب ہی پچھرد کھینچتے آؤں گا، جب میں خود لاث صاب بن جاؤں گا، بھلا یوں بھیڑ بھاڑ میں اور گرد میں لڑتے ہوئے لکٹ حاصل کر کے بائیکسکوپ دیکھنے میں بھی کوئی مزہ ہے۔ مجھے تو باہر موجود بھی لوگ لا کامرنگوں کا ایک بچرہ ہوا غول لگ رہے تھے۔

اب اندر سے زور دار اور گھن گرج کے ساتھ کچھ آوازیں بھی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ نحو جو پہلے بھی راجہ کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ پچھرد کھینچنے آپ کا تھا اس نے بتایا کہ اندر پاکستان کا تصویری خبر نامہ ”شروع ہو چکا ہے اور اب کچھ ہی دیر میں جنمدا لکھا کر ترانہ جایا جائے گا اور پھر اصل فلم شروع ہو جائے گی۔

راجہ کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اب تو ہم سب کواس کی فلم شروع ہو گئی تھی۔ اچانک گیلری کے اختتام سے راجہ ایک عمر سیدہ شخص کے ساتھ دکھائی دیا۔ اس شخص نے موٹا سا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہم سب کو اپنے چشمے کے پیچھے گھوڑی دوچھوٹی چھوٹی آنکھوں سے غور سے دیکھا اور راجہ سے پوچھا۔

راجہ نے جلدی سے دانت لکالے۔

”جی جی..... ہم پانچوں کو ہی شاہ جی نے بھیجا ہے۔“

عمر سیدہ شخص نے اپنے آپ سے بڑا اہمٹ کی۔

”کمال کرتے ہیں شاہ جی بھی۔ اتنے کم عمر بچوں کو اکیلا بھیج دیا سینما ہاں.....“ پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

”اچھا چلاؤ میں تم لوگوں کو ہاں میں بھاڑوں۔ جب لکٹ چیکر آئے تو صرف اس سے اتنا کہہ دیتا کہ تم شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہو۔ مجھے گئے تا۔“ راجہ نے جلدی سے سر ہلا�ا۔ ہماری بھی میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس شاہ جی کی بات ہو رہی ہے، جس نے ہمیں بھیجا ہے اور خود ہمی کو بخیر نہیں۔ میں نے سوالیں نگاہوں سے راجہ کی طرف دیکھا لیکن اس نے چھپ کے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

وہ شخص ہمیں لیے ہوئے ایک بہت بڑے سے اندر ہی رہے ہاں میں داخل ہو گیا، جہاں ایک بہت بڑے پرڈے پر تصویریں چل رہی تھیں۔ اندر ہم اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مشی کسی عورت کے پاؤں پر چڑھ گیا۔ وہ زور سے چلانی ہم سب کم گئے۔ عورت کے

ساتھ بیٹھے ہوئے کمزور سے شخص نے کڑک کر کہا۔

”ابھی دیکھ کر چلیے۔ ہماری بیگم کے پاؤں کا قیمہ کر دیا۔“

ہم سب جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ بعد میں راجہ سے پتہ چلا کہ اس جگہ کو اشال کہتے ہیں۔ یہ ہاں کے سب سے آخر میں بنی ہوئی بہت سی بالکلونیوں میں سے ایک بالکلوں تھی۔ میں نے راجہ کو کہنی مار کر کہا کہ اتنی دور بیٹھ کر پکڑ دیکھنے میں بھلا کیا خاک مزہ آئے گا۔ راجہ نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں سب سے اگلی قطار میں بھاکر فلم دکھائے گا۔ راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”ابے جاہاں، میں تم لوگوں کو دس روپے والے اشال میں بھوارہا ہوں اور تم لوگ بارہ آنے والے شیخ پر بیٹھنے کی ضد کر رہے ہو۔ چپ

چاپ میرے پیچھے چلے آؤ۔“

اس دن پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ سینما کی جو سیٹ پر دے سے جتنی دور ہوتی ہے اس کا کراہی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ عجیب بے وقوف لوگ تھے یہ سینما والے بھی۔ غفور پچاکے ہاں توئی وی کے قریب بیٹھنے کے لیے ہم بچوں میں باقاعدہ جنگ ہوا کرتی تھی اور یہاں یہ لوگ دور بیٹھنے کے لیے باقاعدہ زیادہ پیڈے دینے کو تیار تھے۔

وہ عمر رسیدہ شخص ہمیں ہماری سینوں پر بھاکر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ازراہ مرود راجہ سے پوچھا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ چاہیے ہو تو بتا دیں۔ راجہ نے فوراً اس سے گرم موگ پھیلایا، آنس کریم، بھنے ہوئے پاپ کارن اور یہاں سوڑے کی یوتیں سب کے لیے بھجوانے کا کہہ دیا۔ میں شدید حیرت زده تھا کہ میں روپے میں ہمیں شال میں سیٹ بھی مل گئی تھی اور اس کے باوجود بھی اتنے پیٹے نیچے گئے تھے کہ راجہ نے اتنا بہت کچھ آرڈر بھی کر دیا تھا۔

ہم ابھی اسی شش و پیٹھ میں تھے کہ فلم شروع ہو گئی۔ ہیرو کے پردے پر آنے پر لوگوں نے زور دار سیٹیاں بجا کیں اور پکھے لوگوں نے اسکرین پر سکے نچھا درکیے۔ نخواہر گذو نے سکے اٹھانے کے لیے اٹھ کر پکنا چاہا تو راجہ نے انہیں جھڑک کر منع کر دیا۔ واقعی اتنے بڑے پردے پر پکڑ دیکھنے کا تو اپنا ہی کچھ الگ مزہ تھا۔ فلم میں گانے بھی تھے لیکن میوزک بجانے والے مجھے ڈھونڈنے پر بھی دکھائی نہ دیئے۔ پتہ نہیں جب ہیر و یا ہیر و ڈن گانا گانے لگتے تو اچانک میوزک کہاں سے بچتا شروع ہو جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے بجانے والے ان درختوں با پہاڑوں کے پیچھے پیچھے بیٹھے ہوں، جہاں ہیر و اور ہیر و ڈن بانہوں میں بانہیں ڈالے سر میلے گیت گنگا رہے تھے۔ انڑوں میں ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں بھی آگئیں۔

میں نے نوٹ کیا کہ چیزیں لانے والے شخص بھی ہم سب سے بہت عزت اور پیار سے پیش آئے۔ راجہ ٹاگ پر ٹاگ رکھے ایک کے بعد دوسرا آرڈر دیتا ہا اور کہیوں اور پھیلوں اور ڈرائی فروٹ سے بھری انوکریاں آتی رہیں۔

درمیان میں ایک مرتبہ ایک شخص تارچ لیے لکٹ چیک کرنے کے لیے بھی آیا تھا لیکن راجہ نے چھمانہ لجھ میں اسے بتایا کہ سیٹ نمبر ایک سے لے کر پانچ تک سارے پیچ شاہ بھی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ لکٹ چیکر جلدی سے سرہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فلم کا ہیر و ندیم اس میں موڑ ملکینک کا کردار ادا کر رہا تھا۔ گذو اور نخونے وہیں پر عہد کر لیا کہ وہ دونوں بھی بڑے ہو کر موڑ ملکینک بنیں گے اور شبنم جیسی میم سے ہی شادی کریں گے۔

آخر کارتین گھنٹے کے بعد فلم ختم ہو گئی۔ فلم کے اختتام پر راجہ کچھ جلدی میں دکھائی دیا۔ اس نے ہم سب کو بھی جلد از جلد سینما سے نکل کر باہر جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی بھیڑ میں کوتا پچاند تاغائب ہو گیا۔

سینما سے نکلتے ہی مجھے گھر کی فردا من گیر ہوئی۔ مجھے جتنی سورتیں اور آیات یاد تھیں وہ سب پڑھتے ہوئے میں دل ہی دل میں خدا کے سامنے گزر گڑا تارہا کہ خدا کرے میری اتنی بی بیغیر حاضری کا گھر والوں نے نوٹ نہ لیا ہو۔ ورنہ میری تو خیر ہی نہیں تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے ٹھیک شام چھنچ کر پندرہ منٹ پر گھر کا دروازہ کھولا صحن میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں جھانکا تو ای پر نظر پڑی جو استانی خالہ کے ساتھ بیٹھی اور ادھر کی باتوں میں مشغول تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی غصے سے بولیں۔

”آدمی..... کہاں آوارہ گردی کرتے رہے ہو دن بھر۔ ابھی تمہارے بھیا کو میں نے سینہ کے ہاں بھیجا ہے تمہیں بلاں کے لیے۔ کہاں غائب تھے دن بھر.....؟“ مطلب امی کو خاص پڑھنیں تھا کہ میں کب سے غائب ہوں۔ میں کچھ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ بڑے بھی اندر واخیل ہوئے اور وہیں سے بولے۔

”اے او..... یہ جناب یہاں موجود ہیں اور میں ان کی تلاش میں سارے کاسار اخలہ چھان کر آ رہا ہوں۔ اس کے اوفر دوستوں میں سے بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کہاں تھے تم سارے۔“

”یہیں تو تھے ہم سارے۔ راجہ کے ساتھ اسکوں کا کام کر رہے تھے۔“ راجہ کے نام پر بھیا کچھ چونکے لیکن استانی خالہ کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھی اور امی نے بلکی سی ڈائٹ پلانے کے بعد مجھے منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ ابا کہاں تھے، یہ میں نے پوچھنے کی جسارت ہی نہیں کی۔

میں نے دل ہی دل میں خدالاکھ شکر ادا کیا کہ کسی کو بھی میری اتنی بڑی واردات کی کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔ لگتا تھا اس دن قسمت واقعی مجھ پر مہربان تھی کیونکہ ابا بھی داوی کی طرف سے آنے کے بعد عمارہ کو لے کر بازار چلے گئے تھے۔ شام کو بھی میں جلد ہی بستر میں گھس گیا اور وہ شام میری ایسے سپنے دیکھتی گزری، جس میں سب کچھ ”دل گلی“ جیسا تھا سوائے ہیرو کے جس کی جگہ آدمی نے لے لی تھی۔

داستانِ مجاہد

عقلیم اسلامی ناول نگاریم جازی کا ایک ایمان افروزناؤں۔ مجاہدوں کی زندگی کی ایک منحصری جملک۔ نیم جازی کے اسلامی ناولوں کی پہلی کڑی۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سینیشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی جلن

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن ہم سب جیسے ہی اکٹھے ہوئے تو میرے من میں اٹھتے سوال مجھ سے پہلے گزدہ و اور مشی نے کرڈا لے کر آخر یہ شاہ جی تھا کون، جس کے صدقے ہمیں سینماہال میں اس قدر عزت اور اہم شخصیات جیسا استقبال ملا تھا لیکن راجہ ہمیں ٹال تارہا آخہ ہم سب نے بیک زبان چلا کر اس سے پوچھا۔

”بنا تے کیوں نہیں..... یہ شاہ جی آخر ہے کون.....؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”مجھے کیا پتہ.....؟ میں تو آج تک بھی شاہ جی سے ملا ہوں نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔“

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے منہ سے نکلا۔

”کیا.....؟ تو پھر کل وہ سب کیا ڈرامہ تھا.....؟“

کتاب گھر کی پیشکش

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے پیروں کے نیچے سے جیسے کسی نے زمین ہی تھنچ لی ہو۔ پتہ یہ چلا کر راجہ نے اپنے طور پر نکٹ نکالنے کی تمام تر کیمیں آزمادیکھیں لیکن سینما پر فلم اتنا شدید ریش لے رہی تھی کہ سب سے چھوٹا نکٹ بھی بلیک میں پانچ روپے سے اوپر کا ہی مل رہا تھا۔ قطار میں نکٹ لینے کے لیے راجہ نے تین مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار جب بھی کھڑکی کے قریب پہنچنے لگتا تو کوئی نہ کوئی مشنڈوں کا نولہ اسے اٹھا کر پھرو ہیں کھڑا کر دیتا، جہاں سے قطار میں راجہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوتا تھا۔

آخر راجہ ماپوس ہو کر ہمیں یہ اطلاع دینے کے لیے اوپر بالکوئی کی طرف آنے لگا کہ ہم آج فلم دیکھنے کا خیال دل سے نکال دیں لیکن جیسے ہی وہ سیرھیاں چڑھ کر بالکوئی کی طرف آنے ہی لگا تھا کہ اسے نیچے یہ عمر سیدہ شخص اور ایک دوسرا شخص با تین کرتے سنائی دیجے۔ راجہ کے کان ان کے پہلے جملے پر ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ آپس میں کسی شاہ جی کا ذکر کر رہے تھے کہ جانے ان کے گھروالے اور پچھے اب تک فلم شو پر کیوں نہیں پہنچے؟ راجہ وہیں کھڑے ہو کر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

پہلا شخص کہنے لگا۔

”اب تک شاہ جی کے گھروالوں کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ عمر سیدہ شخص نے بھی اپنی ہاتھ کی گھڑی کی جانب دیکھا۔

”وقتی شتو سمجھو شروع ہوا ہی چاہتا ہے اور پھر آج مجھے بھی گھر جلدی واپس جانا ہو گا۔ تمہاری بھابی میکے گئی ہوئی ہے۔ نہ جانے بچوں نے پہنچے کیا اور حتم مچایا ہو گا۔ میں تو شو شروع ہوتے ہی گھر کے لیے نکل جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آج کا پروگرام منسون کر دیا ہو۔ بہر حال اگر وہ لوگ آ جاتے ہیں تو انہیں عزت کے ساتھ لے جا کر ہاں میں بھاولیجے گا اور سخنداً اگر بھی پوچھ لیجیے گا۔ شاہ صاحب ہمارے بہت پرانے مہربان ہیں اور ان کے گھر سے بھی بھاری کوئی فلم دیکھنے کے لیے سینما ہاں آتا ہے۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھی چاہے۔“

پہلا شخص عمر سیدہ شخص کو یہ ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ راجہ کے ذہن میں آندھیاں ہی چلنے لگ گئیں۔ لگتا تھا قدرت نے یہ موقع خود راجہ کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ راجہ اس ادھیز مرچشے والے شخص کی غیر محبوس طور پر مگر انی کرتار ہا اور جب اس نے دیکھا کہ اب وہ شخص ماہیوں ہو کر سینما سے نکلے ہی والا ہے تو راجہ اس شخص کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ اسے شاہ جی نے بھیجا ہے۔ باقی گھروالے تو کسی وجہ سے نہیں آپاے صرف بچوں کو بھجوادیا ہے۔ تبھی وہ شخص ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ تھا اور بڑا تارہ کہ شاہ جی نے اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اکیلا سینما کیسے بھیج دیا تھا.....؟

ہم سب نے راجہ کی بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ سینما کا سب کھایا پیا اثاثا اپس منڈ کو آنے لگا تھا۔ اگر اس دوران شاہ جی خود یا پھر اس کے گھروالے سینما پاکتی جاتے تو ہمارا جو شر ہوتا تھا سے سوچ کر ہی ہمیں پسینے آنے لگے تھے۔

ہم سب نے راجہ کو خنت سست سنائیں کہ آخر سے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے تو ہماری ”عزت اور جان“ دونوں کو ہی داؤ پر لگا دیا تھا لیکن راجہ بے فکری سے ہماری ساری کڑوی کیلیں با تین سنتار ہا اور ڈھنائی سے مسکراتا رہا۔ جب ہم سب اپنے اپنے دل کی بھیڑ اس کاں پکھے تو اس نے آخر میں ایک ہی جملہ کہا۔

کتاب گھر کی پیشکش

”ابے یار..... تم لوگ یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ کیا ہو سکتا تھا..... یہ سوچو کر ہوا کیا ہے۔ ہم سب نے ہرے سے فلم بھی دیکھی اور وہ تھے میں خوب عیاشی بھی کی..... کی یا نہیں.....؟ اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو تم سب کبھی فلم نہ دیکھ پاتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگلے اتوار پھر چلتے ہیں ریگل۔ انہیں کیا پتہ کہ شاہ جی کے گھر میں یا اس کے خاندان میں مزید کتنے بچے ہیں۔ نہ ہی انہیں شاہ جی کے خاندان کے ہر بچے کی ٹکل زبانی یا دہو گی۔ اگلے ہفتہ ہم اپنا حلیہ مزید بدلتے ہیں۔“

راجہ کی یہ بات سن کر ہم سب اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر ہاں سے سرپٹ بھاگے کیونکہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ راجہ کے ساتھ مزید کھڑے رہنا اپنی زندگی مزید خطرے میں ڈالنے ہی کے متراوف تھا۔

لیکن راجہ نے اپنی یہ رث بعد میں بھی جاری رکھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے موقعوں سے منہ پھیرنا ”گفران نعمت“ کے زمرے میں آتا تھا۔ جس دن ہم فلم دیکھنے ریگل گئے تھے اس کے چوتھے دن وہ آپی کی بارھوں جماعت کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ انہوں نے پورے ضلع میں دوسرا پوزیشن حاصل کی تھی۔ غیاث پچھا اور سکینہ خالہ کا سرخوشی اور فخر سے یوں اونچا ہوا کہ انہوں نے پورے محلے میں خاص ملتان کے دیسی گھنی سے بننے لئے اور مٹھائی بائی۔ سارے محلے میں وہ آپی کی کامیابی کی دعوم تھی۔ سناء ہے اگلے دن کے اخبار میں وہ آپی کی تصویر بھی آئی تھی۔ افسوس مجھے اس وقت پڑتا نہیں چل سکا کیونکہ اس وقت ہمارے گھر میں باقاعدگی سے اخبار نہیں آتا تھا۔ ورنہ میں ان کی تصویری کاٹ کر اپنی کاپی میں ضرور لگاتا۔

اس شام جب ان کی کامیابی کا چرچا پورے محلے میں پھیلا ہوا تھا میں بھی اپنی امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر

گیا تھا لیکن ان کے گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر طاہر بھائی اور ان کی امی پر پڑی، جو ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈب تھا میں صحن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ طاہر بھائی کی اماں نے اپنے ہاتھوں سے قوآپی کو مٹھائی کھلانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سینکند خالد نے جلدی سے سرہا کر انہیں حواب دیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... وجہہ کی کامیابی میں اپنے طاہر کی محنت اور وقت کا بھی تو سب سے زیادہ عمل دخل ہے اگر طاہر میاں اسے اپنا وقت دے کرتی دل جھی سے نہ پڑھاتے تو بھلاہماری قوآج آتی کامیاب ہو پاتی.....؟ ابھی بلاتی ہوں اسے۔“

سینکند خالد نے جلدی سے قوآپی کو آواز دی جو اندر کمرے میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ان سے مبارک بادوصول کر رہی تھیں۔ وہ جو آپی کمرے سے نکلیں تو میری اور طاہر بھائی کی بیک وقت ان پر نظر پڑی۔ مجھے ایسا لگا کہ آسمان سے کوئی پری اتر کر غیاث پچا کے صحن میں آ کھڑی ہوئی ہو۔ قوآپی نے مکمل سفید جوڑ اپنے رکھا تھا، جس کے کناروں پر ہلاکا سافیروزی دھاگے کا کام کڑھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ غیاث پچا کا پورا صحن کی نور کی بارات سے بھر گیا ہو۔ پچھلیں کیوں اس وقت میرے دل نے شدت سے یہ خواہش کی کہ صحن میں موجود باقی سب لوگ وہاں سے ایک پل کے لیے کہیں اوجھل ہو جائیں اور قوآپی کی پوری توجہ صرف میری جانب رہے۔ خاص طور پر طاہر بھائی کی اس وقت وہاں موجود گی مجھے بہت بڑی طرح کھل رہی تھی کیونکہ جس وقت سے قوآپی کمرے سے باہر آئی تھیں تب سے مستقل طاہر بھائی کی نظر کسی نہ کسی بہانے ان کے سراپے ہی کا طواف کر رہی تھی اور قوآپی بھی مستقل شرماۓ جارہی تھیں اور دبی دبی تی مسکراہٹ ان کے ہوننوں سے پھوٹی جا رہی تھی۔

اوپر سے غیاث پچا اور سینکند خالد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح سے طاہر بھائی کو اپنے سرائکنگوں پر بھالیں کیونکہ یقول ان کے قوآپی کی کامیابی میں طاہر بھائی کی محنت اور ان کا وقت بے وقت اپنی پڑھائی کے اوقات میں بھی اکر قوآپی کو سبق دینے اور سکھانے کا بھی بہت دخل تھا۔ حق پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ ایک آنکھ بھی نہیں بھارتا تھا۔ اگر طاہر بھائی نے قوآپی کو دوچار لفظ بتاہی دیئے تھے تو اس میں ایسی کونسی خاص بات تھی؟ پڑھ نہیں قوآپی کے گھروں کو کب عقل آئے گی؟ اور میں جو ہمیشہ بھاگ بھاگ کر ان کے سارے کام کرتا تھا ان کی پسلیں گھڑتا تھا، ان کے ۲۶ اور ۲۷ نب والے ہولڈر اور ”ایگل“ پین بھر کر ان کے لیے تیار کر کے رکھتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرا کوئی ذکر بھی نہیں کر رہا تھا اور یہ جو طاہر بھائی آج شان سے غیاث پچا کے برابر اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں ان کے گھر سے بھی کتابیں اور پرانے حل شدہ پرچے کوں قوآپی کو لا کر دیتا تھا لیکن جمال ہے کہ کسی نے بھی میری ان ”خدمات“ کا ذرا سا بھی ذکر کیا ہو۔ سب کے سب اپنی دھمن میں مگن تھے۔ باتوں کی تو چلو خیر ہے نہ ہی مجھے ان سب کی ایسی کوئی خاص پرواہ بھی تھی لیکن کم از کم قوآپی کو تو دو لفظ میری تعریف میں ان سب کے سامنے بولنے چاہئیں تھے لیکن آج تو انہوں نے بھی حد ہی کر دی تھی۔ اپنی سہیلیوں اور دیگر مہمانوں کے ساتھ وہ اس قدر مگن تھیں کہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح ہاتھ ملانا اور شرارتو سے میرے بال سکھیرنا بھی بھول گئیں۔ میں ان کے اس ”بیگانگی“ کے رویے سے شدید دل برداشتہ ہو گیا، کچھ دریتک تو میں نے انتفار کیا کہ وہ مجھ پر بھی توجہ دیں گی اور میں خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے رنگ بھر کر ان کے لیے مبارک باد کا جو کارڈ بنا کر لے گیا تھا، خود اپنے ہاتھوں سے انہیں دوں گا اور انہیں یہ بھی

بناوں گا کہ میں نے کتنی محنت سے پورا ایک ہفتہ لگا کر اس کا رڈ میں ہوا آپی کے پسند کے رنگ بھرے تھے، بلکہ جو تو یہ ہے کہ میرے اپنے رنگ تو تیسرے دن ہی ختم ہو گئے تھے، اس لیے مجبوراً مجھے عمارہ کے بیتے سے اس کے رنگ پر اکارا اور راتوں کو جاگ جاگ کر ان کے لیے یہ کارڈ مکمل کرنا پڑا تھا۔ راتوں کو جا گناہ اس لیے ضروری تھا کیونکہ عمارہ کے بیتے سے کوئی چیز دن میں نکالنا تو گویا ناممکن ہی تھا اس لیے یہ ناخوشگوار فریضہ مجھے رات کے وقت ہی سرانجام دینا پڑا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

لیکن یوں لگتا تھا جیسے میری ساری محنت ہی رائیگاں چلی گئی ہو۔ میں اپنے ہاتھوں میں کارڈ تھا میں ہوا آپی کی توجہ کا منتظر ہی رہ گیا اور ان کے گرد مبارک باد دینے والوں کا اور انہیں اور ان کی کامیابی کو سراہنے والوں کا تجویز بڑھتا ہی چلا گیا۔ جن میں سرفہرست طاہر بھائی اور ان کی اماں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شخص سے جلن اور حسد محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے طاہر بھائی میرے حق پر ڈاکمار رہے ہوں۔ اگر آج اس وقت وہاں موجود نہ ہوتے تو یقیناً ہوا آپی کی ساری توجہ کا حق دار صرف اور صرف میں ہی ہوتا۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بھی مجھے اپنے ساتھ بٹھایا کرتی تھیں پھر چاہے وہ گھنٹوں دوسروں کے ساتھ گھنٹوں میں گلن رہتیں لیکن میرے لیے ان کا ساتھ ہی بہت ہوتا تھا لیکن آج تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا یا تک نہیں تھا۔ آخر کار میرے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا اور میں اپنے ہاتھوں میں پکڑا کارڈ وہیں ہوا آپی کے چھن میں پھینک کر وہاں سے پیر پختا ہوا نکل آیا۔ ای، استانی خالہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں، اس لیے انہیں میرے باہر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا، بلکہ صرف ایک میری ایسی پیام خصر تھا وہاں تو پوری کی پوری محفل ہی اپنی دھن میں مست تھی، لہذا مجھے جیسے غیر اہم ”شخص“ کے محفل چھوڑ دینے سے کسی کو کیا فرق پڑتا تھا۔ بے بی اور غصے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ ہوا آپی کے گھر کبھی نہیں آؤں گا۔

باہر لکھا تو محلے کے بڑے نیم کے پیڑ کے نیچے راجہ نخو، مشی اور گڈو کو پھر سے قائل کرنے میں مصروف تھا کہ شاہ جی کے نام کا سہارا لے کر ایک آدھ شواور دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں چپ چاپ آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ راجہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

”لگتا ہے تمہاری ہوا آپی سے ملاقات نہیں ہو پائی۔“

جانے راجہ کو میرے اندر کی باتوں کی خبراتی جلدی کیسے ہو جاتی تھی۔ میں نے بر اسمانہ بنا کر جواب دیا۔

”نه ہوا کرے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آئندہ ان کے گھر کبھی قدم بھی نہیں دھروں گا۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے وعدے اور ارادے تو تم تقریباً ہر ہفتہ ہی کرتے ہو لیکن جیسے ہی تمہاری ہوا آپی تمہیں بلاںے کے لیے صرف ایک آواز لگاتی ہیں تم سب کچھ بھول بھال کر پھر سے ان کے پاس دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہو۔“ راجہ کی بات پر ان سب نے بھی دانت نکالے۔ مجھے مزید غصہ آگیا۔

”تم لوگ دیکھ لینا..... اب ایسا نہیں ہو گا۔“

راجہ نے بات پلٹ دی۔

”اچھا چلواب رہنے بھی دو۔ یہ بتاؤ چلو گے اس اتوار کو ریگل سینما؟ شاہد اور نشوکی ”بھروسہ“ لگ رہی ہے۔ تھوڑی سی بہت کرو تو ایک بار پھر عیاشی کرو سکتا ہوں تم سب کو۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو میں راجہ کو صاف منع کر دیتا لیکن اس وقت میں وجوہ آپی کی وجہ سے اس قدر اداس اور صدمے..... بلکہ غصے کے زیر اثر تھا کہ میں نے بنا سوچے سمجھے ہی ہاں کر دو۔ راجہ نے تو یہ سن کر خوشی کے مارے ”یاہو“ کا ایک لمبا انعروالگا یا جگہ باقی تینوں حیرت کے جھکٹے سے بے ہوش ہوتے ہوتے پنج، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر میں دوبارہ اس طرح سینما جانے کی بے وقوفی نہیں کروں گا۔ گذونے مجھے کامنہ ہے پکڑ کر زور سے ہلا�ا اور تھوڑے میرے گالوں پر ہلکے ہلکے کمی طلبائی پھی مارے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس اتوار کو دوبارہ ”شاہ جی“ کے مہماں، بن کر فلم دیکھنے ضرور جائیں گے بلکہ ایک فلم دیکھنے کے لیے جانے پر ہی کیا متصھر تھا، میں اس وقت ہر وہ کام کرنا چاہتا تھا، جس سے مجھے ہوا آپی نے منع کیا ہو۔ مشی کا خیال تھا کہ مجھے سردی لگ گئی ہے جس کی وجہ سے میرے دماغ پراٹھ ہو گیا ہے جبکہ گذو اور تھوڑو مجھے مکمل دیوانہ ہی سمجھ رہے تھے۔
<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

بہر حال فیصلہ ہو چکا تھا اور اب ہمیں صرف اتوار کا انتظار تھا۔
 شام کو میں دیر سے گھر گیا تو ای ہوا آپی کے گھر سے واپس آچکی تھیں۔ انہوں نے سرسری طور پر مجھ سے دریافت بھی کیا کہ میں وہاں سے اٹھ کر کیوں چلا آیا تھا؟ بعد میں سب میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے اسی کو کریدنے کی کوشش بھی کی کہ ”سب“ سے ان کی مراد کون کوں ہے لیکن اسی رات کا کھانا بنانے میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہیں میرا سوال ٹھیک سے سمجھا ہی نہیں آیا اور انہوں نے مجھے ٹال کر باور پھی خانے سے باہر بھیج دیا۔ بہر حال مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اب وجوہ آپی کی جانب سے کوئی آس لگاتا اور پھر انہیں بھلا فرستہ ہی کہاں میں ہو گی میرے بارے میں پوچھنے کیا پھر میری غیر حاضری کو محضو کرنے کی؟ راجہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا ”ان لڑکیوں کی طبیعت کا کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

انہی خیالات میں غلط اور پیچاں رات کو جانے کب میں نیند کی حسین وادیوں میں جاتا تا۔ اگلے دن بارش کی وجہ سے ہمارے اسکول میں صبح سے ہی چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ میں، راجہ اور گذو اپنے بستے گلے میں اٹکائے سڑک کے کنارے بہتے ہوئے نالے میں اپنی اپنی کاغذ کی کشیوں کے ساتھ چلتے چلتے جب محلے کے گھٹ تک پہنچنے تو ہیں ہماری فضلوبابا سے مدد بھیز ہو گئی جو سیکنڈ خالہ کی پرانی سیکنڈ سلامی مشین کو مستری کے ہاں سے تیل ڈالو کروالپس لارہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے وہیں سے باکن لگائی۔
<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

”آدمی میاں..... جاتے کہاں ہو..... وجوہ بی کل شام سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں، چلو میرے ساتھ ہی گھر چلو۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ آدمی جہاں کہیں بھی دکھائی پڑے اسے ساتھ ہی لیتا آؤں۔“

راجہ اور گذو نوں نے میری طرف یوں چونک کر دیکھا، جیسے کوئی جج کسی عادی مجرم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ راجہ نے دیہرے سے میرے کان کے قریب سر گوشی کی۔
<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

”اوے آدمی کے پنج..... آج اگر تو نے ہمت نہیں دکھائی تو پھر آسندہ ہمارے سامنے خواخواہ کی بڑھکیں مارنے کی کوشش نہ کرنا۔“
 چ تو یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے خود میرا ایمان بھی ڈگ کا سا گیا تھا لیکن پھر میں نے ہمت کر کے فضلوبابا سے آخر کہہ دیا۔

"فُوآ پی سے کہیے گا کہ آج کل میں کچھ مصروف ہوں۔ فرست ملی تو میں خود آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اور فضلو بابا کو حیرت زدہ کھڑا چھوڑ کر میں راجہ اور گذو کے ساتھ پہنچتا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں گذو اور راجہ نے میری خوب پیشہ تھوکی کہ آج میں نے واقعی مردوں والا حباب دیا ہے لیکن جانے کیوں خود میرا اول اندر سے بجھ سا گیا تھا۔ راجہ اور گذو اگلے دن سینما جانے کا پروجس منصوبہ بناتے رہے اور میں بے خیالی میں ہوں ہاں کر کے ان کے ساتھ شریک ہونے کا تاثر دیتا رہا۔ کبھی کبھی یہ دل کچھ فیصلے کرتے وقت کتنا خوش ہوتا ہے لیکن جانے کیوں چند لمحوں بعد ہی وہی دل اس فیصلے کا سوچ کر ہی ڈوبنے کیوں لگتا ہے؟ میری وہ رات میری زندگی کی چند ان راتوں میں تھی، جو میں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزاری تھیں اور فُوآ پی سے آئندہ بات نہ کرنے کا فیصلہ میرے دل میں ٹھکلتا رہا۔

اگلی صبح ابھی میں ناشتہ ہی کر رہا تھا کہ باہر گلی میں راجہ کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اتنی سوریے.....؟ یہ اچانک کیا افادا آن پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے چائے کا پورا پیال غراب سے طلق کے اندر اٹھایا اور امی سے نظریں بچا کر باہر گلی میں نکل آیا۔ راجہ اور مشی باہر گلی میں کھڑے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ پوچھنے پر پہلے چلا کہ آج کے میٹنی شوکے وقت یعنی دوپہر تین بجے استانی خالہ نے محلے کے تمام بچوں کو اپنے گھر گھلیاں پڑھنے کے لیے بلا یا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچوں کے ساتھ ان کی امامیں بھی ثواب حاصل کرنے کی خاطر گھلیاں پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ آج دوپہر اپنے گھروں والوں سے نظر بچا کر سینما گھر تک پہنچانا ممکن تھا لہذا راجہ نے میٹنی شوکے بجاے مارنگ شوپ جانے کا پروگرام بنایا تھا، جو صبح گیارہ بجے شروع ہوتا تھا۔ مطلب ہمارے پاس اب بھی دوڑھائی گئنے تھے تیاری کرنے کے لیے۔ میں نے راجہ کو ایک آخری مرتبہ سوچ لینے کا کہا لیکن بقول راجہ "جب اوکھی میں سردے ہی دیا تو پھر موسلاوں سے کیا ڈرنا؟"

اگلے دو گھنٹے میں ہم پانچوں کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر سینما کے باہر کھڑے اندر ونی گیٹ پر شچٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ راجہ کو اس عمر سیدہ شخص کی تلاش تھی، جس نے بچپن بارہ میں ہاں میں بھایا تھا۔ یہاں پر سب لوگ اسے غفار صاحب کے نام سے جانتے تھے اور وہ سینما کی انتظامیہ کا حصہ تھا لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار راجہ نے سینما کی کیٹھین کے پیچھے بنے اسٹنٹ میجنر نام کی تختی لگ کرے میں سے ایک شخص کو نکلتے دیکھا تو بھاگ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں آپس میں جانے کیا تاں کرتے رہے اور ہم چاروں کا یہاں بے چینی اور گھبراہٹ سے براحال ہو رہا تھا۔ نہونے تو باقاعدہ پیشیں گوئی بھی کر دی کہ آج صبح سے ہی اس کی باکیں آنکھ پھر ک رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی بری خبر ملے والی ہے۔ گذو نے اسی لمحے سے جھڑک کر چپ کر دیا کیونکہ اصل میں خود اس کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی وسو سے پل رہے تھے۔ صبح تو یہ ہے کہ ہم چاروں یہاں تک راجہ کے ہمت دلانے پر آتے گئے تھے لیکن اندر سے ہم سب کے دل کی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے راجہ واپس پلٹا، اس کے ہاتھ میں کوئی پرچی پکڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ راجہ کے آتے ہی ہم سب نے اس پر سوالوں کی بوجھاڑ کر دی۔ "کیا ہوا.....؟ کون تھا وہ شخص.....؟ بات بنی یا نہیں.....؟ اسے شک تو نہیں ہوا.....؟"

راجہ نے ہاتھ اٹھا کر ہم سب کو خاموش کروایا۔ "ارے یار سب ٹھیک ہے..... دراصل آج غفار صاحب آئے نہیں ہیں..... یہ شخص جس سے میں بات کر رہا تھا یہ یہاں کا اسٹنٹ مینیجر ہے۔ میں نے اسے شاہ صاحب کا حوالہ دیا تو بے چارہ کافی مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے ہم سب کے لیے امثال کی یہ پرچی دے دی ہے، جو ہم گیٹ

والے کے حوالے کر دیں گے۔ اندر جب لکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ہم سب کو صرف ایک جملہ کہنا ہے کہ ”ہم شاہ جی کے بندے ہیں اور بس..... چلواب دیرنہ کرو۔ شو شروع ہو چکا ہے۔“

راجہ اپنی بات ختم کرتے ہی اشال کی جانب بجا کا اور ہم سب بھی راجہ کی تقیید کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے سینما ہال میں داخل ہو گئے۔ گیٹ کیپر نے اسٹرنٹ فیجر کی پرچی دیکھ کر ہمیں اشال کی سب سے پچھلی قطار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور ہال میں ہیر و ٹن کی پردے پر آمد پر زوردار سیٹیاں بخ رہی تھیں۔

ہم پانچوں بھی اندر ہیرے میں نکراتے اور ٹھوکریں کھاتے اپنی سیٹوں تک پہنچتی ہی گئے۔ راجہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک اسٹرنٹ فیجر نے ہمارا آرڈر لینے کے لیے کسی بیمرے کو کیوں نہیں بھیجا؟ البتہ ہم چاروں کی توجہ کامل پردے کی جانب تھی۔ مجھے فلم کی ہیر و ٹن نشو بھی بہت اچھی لگی کیونکہ جب وہ بہتی تھی تو اس کے گالوں میں بھی بالکل ڈھاؤ آپی کی طرح دو گابنی گڑھے پڑ جاتے تھے۔ ہمارے بیٹھنے کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ میں بالکل درمیان میں تھا اور میری بائیں جانب دروازے کی طرف گذہ اور مشی بیٹھنے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب راجہ اور نخواہ جمان تھے۔ وقفے سے کچھ درپہلے لکٹ چکر اندر آیا اور ہمیشہ کی طرح سینما کے بوائے لمکا Limca کی بوتلیں، چائے کے بہت سے گلاں جو ایک گول اسٹینڈ میں پھنسنے ہوتے تھے اور سوڈے کی بہت سی بوتلیں اٹھائے اندر داخل ہو گئے۔ ہال میں ذرا دریکو پہلی سی ٹھیک اور لوگوں کی آوازیں ابھریں ”آس کریم بوائے..... ذرا اوپکا ادھر بھی..... سوڈا بوائے..... ایک یمن سوڈا ایگم صاحب کے لیے..... اور میرے لیے دو پیکٹ گرم پینٹس (Peanuts).....“ یہ تو پیچھے کی جانب بیٹھی ہوئی جیائزی کی آوازیں تھیں جبکہ بہت دور ہال کی اگلی جانب سے مزدور اور چوتھے درجے کے ملازمین کی آوازیں اور راجہ ان اشال کی آوازوں سے بالکل مختلف تھا۔

”ابے اوپنے والے، آٹھ آنے کے گرم پنے دے ذرا سالہ ڈال کر..... او گنڈیری والے بھائی، آدھ کلو گنڈیری لیکن میٹھی ایسی ہوں کہ شیرا ہاتھوں سے ٹپکے..... او سیون اپ کے شہزادے، دو سوڈا ادھر بھی..... اور خالی بوتل آخر میں لے جائیو، ہمارے سروں پر منکر کیر بن کر نہ لک جائیو.....“

غرض بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس وقت ہال میں گونج رہی تھیں لیکن مجھے ان سب آوازوں سے شدیداً بھجن ہو رہی تھی کیونکہ فلم کا باقاعدہ وقفا بھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہیر و ٹن کے بات اور ہیر و ٹن میں ایک بے حد جذباتی قدم کام کالمہ اپنے اختتام کے قریب تھا۔ جانے یہ سینما والے درمیانی وقفے سے پہلے ہی ان چھا بڑی والوں اور سینما باؤائز کو اندر کیوں آنے دیتے تھے؟

انتہی میں نکٹ چکر دروازے کی جانب سے ہماری قطار میں سب سے پہلے بیٹھنے ہوئے گذوکے پاس ٹارچ لے کر پہنچ گیا۔ گذو ڈیکھنے میں اس قدر گن تھا کہ وہ شاہ جی کا نام بھول گیا اور اس نے جلدی سے نخو سے پوچھا۔ **کتاب گھر کی پیشکش** ”یا رہم کس کے بندے ہیں.....؟“

نخو جلدی سے بولا ”اللہ جی کے۔“ میں نے زور سے اسے کہنی ماری، نخو ہکلا یا ”مطلوب ہے شاہ جی کے۔“ نکٹ چکر نے سر ہلا یا اور نخو کے چہرے پر ٹارچ ماری۔ نخو نے بھی دھرا یا۔

”ہم شاہ جی کے آدمی ہیں۔“

ملکت چیکر نے میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔ میں نے بھی مخصوص کوڈورڈ ہرایا۔ میرے بعد گذونے بھی اسی اسم اعظم کا ورد کیا۔ لکٹ چیکر نے راجہ کا رخ کیا راجنے بھی انتہائی معبر لجھے میں رعب سے کہا ”ہم پانچوں شاہ جی کے بندے ہیں۔“

ملکت چیکر نے آخری مرتبہ تسلی کے لیے ایک بار پھر ہم پانچوں پر ثارچ لہرائی اور راجنے سے پوچھا ”بس یہ پانچ کی نفری ہی ہے یا پھر ہاں میں کوئی اور بھی شاہ جی کا بندہ بیٹھا ہے۔“

راجنے اکساری سے جواب دیا ”نہیں جی.....بس ہمی پانچ ہیں شاہ جی کے خاص بندے۔“

راجنے کی بات ثتم ہوتے ہی راجنے کے پیچھے سے ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی ”بہت خوب..... تم سب شاہ جی کے بندے ہو اور میں شاہ جی ہوں..... بلقلم خود..... راجہ فیاض شاہ۔“

چند لمحوں تک تو ہمیں سمجھی ہی نہیں آیا کہ اس شخص نے یہ کون سا انکشاف کیا ہے اور ہم پانچوں ہوتقوں کی طرح اس شخص کو اور وہ ہمیں دیکھتا رہا۔ پھر اچاکن ہی وہ غصے میں زور سے چلایا۔

”پکڑ لوان پانچوں فراڈیوں کو۔“

راجنے ہم سب میں سے سب سے پہلے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ اچھل کر سیٹ سے اتر اور باہر کے دروازے کی جانب سر پرٹ دوڑتے ہوئے زور سے چلایا۔

”بے دوقوف کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، سارے اٹھ کر بھاگو۔“

راجنے کی چیخ کے ساتھ ہی جیسے ہم سب بھی کسی گھرے خواب سے چونکر جاگے اور اپنی اپنی سیٹوں سے یوں اچھلے جیسے ہمیں کسی بچھوئے کاٹ لیا ہو۔ امثال میں ایک بھگڑڑی مچ گئی اور نازک بیگمات تو باقاعدہ چینچنے چلانے لگ گئیں شاید وہ سمجھی تھیں کہ سینما میں کوئی بڑی ”واردات“ ہو گئی ہے۔

شاہ جی سے غلطی یہ ہوتی کہ انہوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر پہلے ہی سے امثال کے بیرونی دروازے پر کوئی پھرے دار کھڑائیں کیا تھا اور صرف لکٹ چیکر کے بھروسے ہم پر چھاپے مارنے آگئے تھے۔ لکٹ چیکر کو بھی ہم سے ایسی پھرتی کی امید ہرگز نہ تھی ورنہ کم از کم وہ دروازے ہی بند کر آتا۔ ہم پانچوں کریسان پھلاٹتے، بیگمات کے بیتل بامن اور شراوون غراوون میں الجھتے، گرتے پڑتے، امثال کے دروازے سے باہر نکلے۔ امثال میں کسی کو کچھ سمجھنیں آرہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ ہمیں یوں دیوانہ دار باہر بھاگتے دیکھ کر کچھ جلد باز قسم کے ”پیر و کاروں“ نے بھی بنا کچھ جانے یا بنا کسی سے کچھ پوچھتے باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور ہمارے اور لکٹ چیکر اور شاہ جی کے درمیان میں دراصل یہی جلوں تھا جس کی وجہ سے ہم لکٹ چیکر کی گرفت سے بچ نکلتے میں کامیاب ہو گئے ورنہ گذوکی نئی بشرت کا کاررواس کے ہاتھ میں آہنی گیا تھا لیکن افسوس کہ اس کے ہاتھ میں وہ کارلی دیباڑہ گیا اور گذوکو آئندہ وہ قیصہ ہیشہ بنا کارکے پہننا پڑی۔ ہمارے پیچھے امثال میں عورتوں کی چینخوں اور مردوں کی ”پکڑ، لپک، جانے نہ پائے“ کی آوازوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ امثال سے نکلتے ہی ہم سینما کی لمبی سے راہداری میں یوں دوڑتے جیسے اسکوں میں ہزار گز کی ریس میں دوڑتے ہیں۔ راہداری سے گزرتے ہی ہم اس حصے میں آپنچے جہاں سے پہلے ٹھن اور پھر بیر و فی گیٹ کا جنگل دوڑتی سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے پیچھے ہماری تلقید میں دوڑتے

ہوئے پیر دکاروں کا بجوم، اس کے پیچھے چینا چلاتا تک لٹک پچکلہ اور اس کے آخر میں ہانپتے کا نپتے ہوئے شاہ جی سر پت بھاگتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سینما کا بیر و فنی جنگلہ ابھی تک تالے سے بند تھا کیونکہ شاید فلم کے درمیانی و قتلے میں بیر و فنی لوگوں کی آمد کروائے کے لیے اسے بند ہی رکھا جاتا تھا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا لہذا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم پانچوں ایک قطار میں دوڑتے ہوئے لو ہے کے جنگلہ نما گیٹ کے پاس پہنچے اور اگلے ہی لمحے سب پہلے گذرا اور پھر اس کے پیچھے باقی چار بھی کسی ”اسپائیدر مین“ کی طرح بنا ایک پل ضائع کیے جنگلہ پار کر گئے لیکن اس کوشش میں نھوکے لمبے کارلوں والی قیص نے دھوکہ دیا اور اس کی قیص کا آواح حصہ نشانی کے طور پر جنگلے میں ہی انکارہ گیا۔ مشی کا فیشن اسپل چشمہ اور میرا مفلوج بھی اسی بھاگ دوڑ کی نذر ہو چکا تھا لیکن اس وقت ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی، جنگلے سے دوسرا جانب اترتے ہی ہم نے بناڑ کے سرک پار کی اور اپنے پیچھے بھاگتے اور چیختنے چلاتے ”دیوانہ وار“ بجوم کو دور چھوڑ آئے۔ چند ہی لمحوں میں ہم ہانپتے کا نپتے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ کچکتے اور راستہ بھر دوڑتے ہوئے ہم اپنے پیچھے بھی نظر ڈالتے آئے کہ کہیں کوئی جو شیلا تماش میں ہمارے پیچھے ہمارے گھروں تک نہ پہنچ جائے لیکن یہ دیکھ کر ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس ریس میں ہم پانچوں نے ان سب کو پچھاڑ دیا تھا۔

اس کے بعد ہم سب نے مل کر راجہ کی جو گت بنائی اور ہمارے ہیلوں کو دیکھ کر ہمارے گھروں والوں کے ہاتھوں خود ہم سب کی جو درگت بنی..... وہ داستان ”ناقابل اشاعت“ ہے۔ بہت دن بعد راجہ نے سینما کے کسی چھوٹے اہل کار سے معلومات کروائیں تو پتہ چلا کہ شاہ جی کے گھر والے تو پچھلے ہفتے بھی سینما آئے تھے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ان کے نام کے پاسز پر تو چند نہ صرف فلم دیکھ گئے ہیں بلکہ اپنی طرف سے خوب عیاشی بھی کر گئے ہیں۔ بات شاہ جی تک پہنچی تو انہوں نے سینما انتظامی کو چوکس کر دیا کہ اب اگر وہ ”گروہ“ فلم دیکھنے آئے تو انہیں اطلاع کر دی جائے اور سینما والوں نے وہی کیا۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم اس دن ان کے ہتھیں چڑھے، ورنہ وہ ہماری بڑی پسلی ایک کر دیتے۔

لیکن زندگی کی اس پہلی بے ایمانی سے سبق لینے کے بجائے یہ بے ایمانی ہمارے دلوں کے کسی کو نے میں بھیش کے لیے چھپ کر بیٹھ گئی۔ ہم سب کے دلوں نے کہیں نہ کہیں اپنے اندر اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ بے ایمانی جو پکڑی نہ جاسکے، جائز ہوتی ہے۔ لیکن ذرا سی ہمت ہی کی توبات ہے اور جب کبھی بھی میں نے وہ ایک ذرا سی ہمت کر دکھائی تھی میرے اندر کار بچ فوراً بابہر نکل کر میرے سامنے آبیٹھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے پوچھتا۔

”ہاں پیارے... عیاشی کرنی ہے تو بولو...؟ لیکن یاد رکھو عیاشی کرنے کے لیے خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ تو کہو...؟ ہے ہمت خطرے میں کوئی کی.....؟“

میں سہم کرنی میں سر بلاتا ”نمیں نہیں..... اگر پکڑے گئے تو.....؟“

میرے اندر کی بے ایمانی مجھے بچپن کے دوست راجہ کی طرح پچکارتی ہے ”ارے یار..... اوکھلی میں سرد ہے ہی دیا تو اب موسلوں کا کیا ڈر.....؟“

میں کچھ دیر سوچتا ہوں اور پھر چپ چاپ اپنارا اوکھلی میں ڈال دیتا ہوں۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلا گش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس دن سینما والے واقعے کے بعد ہم سب نے بہت دن تک ڈر کے مارے محلے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ میں وجوہ آپی سے بھی کہتا یا کترایا سا پھر تارہ حالانکہ ان کے درجنوں پیغامات آتے رہے کہ آکر مل جاؤ لیکن میں نے بھی جیسے کافیوں میں سیسہ ہی بھر لیا تھا لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب تک عمارہ، فضلو بابا، بڑے بھیسا ایمی میں سے کوئی بھی مجھے ان کے پیغامات پہنچا تھا، میرے دل کو ایک اطمینان سارہ تھا اور جس دن ان کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملتا میرے دل کو ایک عجیب سی بے چینی لاحظ ہو جاتی۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دل کے پتوں نجکی نے کوئی سوئی سی گاڑھدی ہوا اور میری یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی، جب تک کسی جانب سے وجوہ آپی کا پھر سے بلا واندآ جاتا۔

اور پھر یہ کش مش بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ وجوہ آپی کو میرے سبھی ٹھکانوں اور نظام الاوقات کا اچھی طرح پڑھتا۔ اس روز استانی خالہ نے جانے کیوں مجھے سب سے آخر میں سبق سنانے کا کہہ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ آج کل میں کچھ دیرے سبق لینے کے لیے جا رہا تھا۔ معمول کے مطابق پہلے سب بچے اپنا سبق یاد کر لیتے اور پھر جس ترتیب سے بچے سبق لینے کے لیے آئے ہوتے تھے، اسی ترتیب سے ایک ایک گر کے وہ استانی خالہ کو سبق سناتے جاتے اور ان کو جھٹی ملتی جاتی۔

تقریباً سبھی بچے اپنا سبق سنائے کر جاچکے تھے۔ صرف میں اور محلے کی دو لڑکیاں رہ گئی تھیں جن کا سبق سنانا بھی باقی تھا۔ ان میں سے ایک آمن تھی، جسے ہم سب لا کے بھروسی چڑیل کہہ کر چڑھاتے تھے۔ دراصل اس کے بھورے بال ہمیشہ مٹی سے بھرے ہوتے اور کچھ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے تھے جیسے کوئی ان میں ہوا بھر گیا ہو یا پھر کسی شریر بچے نے اس کے بالوں کے نیچے میں پاٹا خد پھوڑ دیا ہو۔ دوسری پڑپڑ بولنے والی پروین تھی جس کے بال اس کی امام اس قدر کس کے باندھتی تھی کہ اس کی بھویں تک کچھ جاتی تھیں اور ما تھے تک جا پہنچتی تھیں۔ ہم سب اسے ”چالا کوماں“ کہہ کر پکارتے تھے۔

استانی خالہ جانے کن کاموں میں بھی ہوئی تھیں کہ انہیں ہم سے سبق سننے کا وقت ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ دراصل اندر کمرے میں ان کے چند مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان کی مہمان داری میں معروف ہو گئی تھیں۔ ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آواز کے منتظر تھے کہ کب وہ ہمیں چھٹی کرنے کی نوید سناتی ہیں۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی نازک سی آہٹ ہوئی۔ میں نے چونکہ کرس اٹھایا تو میرا سانس اور میری دھر کنیں جیسی رک سی گئیں۔ وجوہ آپی اب باقاعدہ بڑی چادر لے کر گھر سے نکلتی تھیں اور اس وقت وہ اسی بڑی سی کالی چادر کو اوڑھے ہوئے تھیں جس کے کناروں پر سفید لیس دار پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس کا لے قاب میں ان کا پچھہ نور سے یوں دمک رہا تھا جیسے کسی نے ماہتاب کا کوئی گلہ اس کالی عبار کے اندر چھپا رکھا ہو۔ اس پوچھئے تو میں واقعی اپنی سُدھ بُدھی کھوبیٹھا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے اور دبے پاؤں ہمارے سر پر آپنی تھیں کہ آمنہ اور

پروین کو بھی ان کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ وہیں میرے پاس ہی زمیں پر پڑی استانی خالہ کی چوکی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے سر جھکا لیا اور یوں ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا، جیسے میں سبق یاد کرنے میں بے حد مگن ہوں۔ ڈاؤ آپی کچھ دیر تک یونہی میری جانب دیکھتی رہیں اور پھر ہولے سے بولیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے مزید سر جھکایا۔ دراصل میرے اندر ہمیشہ سے ایک کم زوری تھی اگر کوئی مجھے منانے کی کوشش کرتا یا جس کسی سے مجھے بہت شکایت ہوتی اور وہ مجھے منانے کی کوشش کرتا تو فوراً میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور مجھے ان دمومٹے موٹے آنسوؤں کو چھانے کے لیے ہمیشہ لوگوں سے اپنا چہرہ چھپانا پڑتا تھا کیونکہ مجھے کسی کے سامنے رو نے سے بھی بہت شرم آتی تھی۔ اس وقت بھی میری جان کے دشمن، وہی دو آنسو، ایک ہی لمحے میں میری آنکھوں میں چھک آئے اور وجہ آپی سے اپنی حالت چھپانے کے لیے مجھے مستقل سر جھکائے رکھنا پڑتا تھا۔ انہوں نے پھر دھیرے سے پوچھا۔

”مجھ سے بات نہیں کرو گے آدمی؟“

جانے کیسے بے حد ضبط کے باوجود میری ہلکی سی مدھم سکی نکل ہی گئی اور ڈاؤ آپی نے جلدی سے اپنی ہتھیلی سے میرا چہرہ اوپر کر دیا۔ وہ میرے آنسو دیکھ کر خود بھی پریشان ہو کر روانی کی ہو گئیں اور جلدی سے اپنے دوپٹے سے میری آنکھیں پوچھ کر بولیں۔

”ارے ارے..... یہ کیا.....؟ ایسے نہیں رو تے..... آدمی تو بہت بہادر ہے تا۔“

میں نے جلدی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ پروین اور آمنہ کے سامنے میں روانہ نہیں چاہتا تھا لیکن ڈاؤ آپی سے میں نے ابھی تک بھی نظر نہیں ملا تھی۔ ڈاؤ آپی نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور دھیرے سے پوچھا۔

”اپنی دوست کو معاف نہیں کرو گے آدمی۔“

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اتنی مخصوص اور اپنی الماری پر رکھی اس گڑیا کی طرح ٹکل بنا کر اپنی آنکھیں پٹ پٹاتی تھیں، جسے دیکھ کر ہمیشہ میری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ ڈاؤ آپی کو اچھی طرح سے پڑتا تھا کہ چاہے میں کتنا ہی اداں کیوں نہ ہوا کروں، مجھے ہنسانے کا یہی سب سے کارآمد اور آزمودہ نہ ہے ہوتا تھا۔ سواس وقت بھی یہی ہوا اور وہ اپنے حرربے میں کامیاب رہیں۔ میں بھیگی پکوں کے ساتھ ہی پس پڑا اور ڈاؤ آپی کے چہرے پر چھایا غبار بھی چھٹ گیا۔ وہ بھی پس دیں۔ وہ جب بھی ہنسی تھیں مجھے لگتا تھا جیسے سارا جہاں پس پڑا ہو۔

”یہ ہوئی نبات۔ دیکھو میرے پاس کیا ہے اپنے آدمی کے لیے۔“

انہوں نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا، جو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس میں رنگ بھرے تھے۔ میں نے خوشی اور حیرت سے ”شکریہ“ کے اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر چاروں جانب سے دیکھا۔ وجہ آپی کے ہاتھوں میں اب ایک اور کارڈ بھی نظر آ رہا تھا، انہوں نے کارڈ میری نظر وہی کے سامنے لہرا دیا۔ یہ وہی کارڈ تھا، جو میں ان کے نتیجے والے دن ان کے لیے بنا کر لے گیا تھا لیکن پھر ان کی بے توہینی کے باعث غصے میں وہیں پھینک آیا تھا۔ میں اپنا کارڈ ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر اپنی ساری ناراضگی اور شکایات بھول کر حیرت سے چلا یا۔

"ارے..... یا آپ کو کہاں سے ملا.....؟"

و جو آپ اپنی مسکرائیں۔ "وہیں سے..... جہاں تم اسے پھینک آئے تھے۔"

فُوآپی نے مجھے بتایا کہ اس شام جب میں ناراض ہو کر ان کے گھر سے نکل آیا تھا تب کچھ ہی دیر بعد انہیں وہاں پر میری غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے میری امی سے بھی میرے بارے میں پوچھا اور فضلو بابا کو بھی میرے پیچھے دوڑا یا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں خاص انہی کی خاطر اس شام امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے وہاں آیا تھا لیکن سب ہی میری تلاش میں ناکام ہو گئے۔ تبھی ان کی نظر اس کرسی کے نیچے پڑی، جہاں میں پہلے بیٹھا ہوا تھا وہاں پر انہیں یہ مژا تر اس کا رڑ پڑا لوکھائی دیا۔ فُوآپی نے آگے بڑھ کر یہ کارڈ اٹھا لیا اور بقول ان کے اس شام انہیں ملنے والا یہ سب سے پیارا کارڈ اور سب سے پیارا تھا تھا۔ وہ تبھی سمجھ گئی تھیں کہ میں ان سے ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا ہوں۔ پروہ بے چاری بھی کیا کرتیں؟ اتنے بہت سے مہماں جو گھر میں جمع تھے اور پھر ان سب کی خاطر داری اور ہزار دوسرے کام جوان کی جان کو آئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ نہ ہی میرے پاس بیٹھے کیں اور نہ ہی انہیں اتنا ہی موقع ملا کر وہ خود مجھے ہی اپنے پاس بلایتیں۔ فُوآپی نے اتنی تفصیل سے اور اتنی اچھی طرح مجھے اپنی اس شام کی مجبوری بتائی کہ خود مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں نے کارڈ وہاں پھینک کر ان کا کتنا دل دکھایا ہے؟ اور فُوآپی کا دل کتنا بڑا ہے کہ اس کے باوجود خود مجھے منانے چلی آئیں۔ فُوآپی تو تھیں ہی ایسی..... وہ کسی کو خود سے ناراض ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ چاہے غلطی خود دوسرے کی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ خود پھل کر اسے منانے، اس کے پاس پہنچ جاتیں اور پھر اسے منا کر ہی دم لیتیں۔ ان کے دل اور روح کی بھی پاکیزگی تو تھی جوان کے چہرے اور آنکھوں سے نور بن کر پیکتی تھی۔ وہ شام میری زندگی کی حسین ترین شاموں میں سے ایک تھی۔ وہ جو آپی بہت دیر تک میرے ساتھ وہیں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔ پروہن اور آمنہ کو انہوں نے سبق سن کر چھٹی دے دی تھی۔ وہ استانی خالہ کے ساتھ مہماں داری میں بھی ہاتھ بٹاتی رہیں اور خود میرے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے چاہے بھی پی۔

راجہ کو میں نے دوسرے روز یہ سارا ماجرا بتایا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "تبھی میں کہوں..... یا اپنے آدمی پیارے کا چہرا اتنا روش اور کھلا سا کیوں ہے۔ چلو یار..... ہم تو یاروں کی خوشی میں خوش رہنے والے ہیں۔ جاؤ تھیں معاف کیا۔"

راجہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میری جان فُوآپی میں انکی رہتی ہے اور میں زیادہ عرصے تک اپنے اس کچھ وعدے پر قائم نہیں رہ سکوں گا، جو میں نے اپنے سارے دوستوں کے سامنے فُوآپی سے نہ ملتے کے بارے میں کیا تھا لیکن راجہ کی سب سے اچھی عادت بھی تھی کہ وہ مجھے میرے ٹوٹے ہوئے ارادے اور توڑے ہوئے وعدے یاد دلا کر کبھی شرمندہ نہیں کرتا تھا۔

فُوآپی بارھویں پاس کر کے تیرھویں میں لڑکوں کے بڑے کالج میں بہنچ گئیں اور ہم سب چوچی سے پانچویں میں آگئے۔ فُوآپی کو اب سکینہ خالہ نے باقاعدہ ایک کالے رنگ کا برقہ سلا کر دے دیا تھا، جسے اوڑھ کر وہ بڑے کالج جایا کرتی تھیں۔ فضلو بابا اب مزید جھک کر چلنے لگے تھے لیکن اپنی فتویٰ کی خدمت میں وہ اب بھی اسی پرانی پھرتی سے کام لیتے تھے۔ انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نیا خاندان تازہ تازہ آ کر بسا تھا۔ اسی میں ہماری عمر کا ایک لڑکا بھی شامل تھا جس کا نام تو اقبال تھا لیکن سب اسے پیارے بالا کہتے تھے۔ بالے کے بابا کا پنجاب سے یہاں تبادلہ ہوا تھا اور ان کی ڈیوٹی بھی میرے اور راجہ کے بابا کے لئے تھے میں انہی کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ بالے کے بابا کریم نے بالے کو بھی ہمارے

ہی اسکول میں پانچویں میں داخلہ دلا دیا تھا۔ بالا دیکھتے میں ہم سب سے بہت بڑا لگتا تھا بعد میں پتہ چلا کہ اسے ایک کلاس میں دوسال لگانے کی عادت ہے لہذا وہ اب تک آٹھویں کے بجائے پانچویں میں ہی انکا ہوا ہے۔ بالے کا ایک بڑا بھائی اکرم اور ایک بڑی بہن گذی بھی تھی جسے ہوآپی کے ساتھ لڑکیوں کے بڑے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اکرم جسے گھر میں سب اگو کہتے تھے، بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور انکما ہونے کے باعث بمشکل دسویں ہی کچی پکی پاس کر پایا تھا۔ بقول میرے ابا کے اس کے انداز ہی خاص لفڑوں والے تھے۔ اگو سارا دن محلے میں کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا تھا اور آتی جاتی لڑکیوں کو غور غور سے دیکھتا اور زیریں مکاٹے جاتا۔ پنجاب سے تادلے سے پہلے اس کے ابا نے اسے کسی فرنچیروں والے کی دکان پر کام کیکھنے کے لیے بھٹا دیا تھا اور اب تو اسے فرنچیروں کا کام کرتے اور رندہ چلاتے ہوئے بھی پانچ سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا۔ چھوٹی عمر سے آری اور رندے چلا چلا کر اس کے ہاتھ بھی کسی بڑی اور بھدی قسم کی سخت لکڑی کے بننے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ آج کل یہاں ہمارے شہر میں بھی اپنے لکڑی کا کام بڑھانے کے لیے کسی دکان کی تلاش میں تھا لیکن فی الحال اسے کامیاب نصیب نہیں ہوئی تھی۔

طاہر بھائی کی ڈاکٹری کی پڑھائی اپنے تیرے سال میں تھی اور اب انہیں مکمل ڈاکٹر بننے کے لیے صرف دوسال مزید درکار تھے جب ہم صبح سویرے اپنے بنتے اپنے گلوں میں لٹکائے گھر سے اسکول کے لیے نکل رہے ہوتے تھے تب اکثر طاہر بھائی پر میری نظر پڑتی تھی۔ وہ اپنے گلے میں ڈاکٹروں والا آلہ لٹکائے اور بازو پر اپنا سفید کوٹ ڈالے بابووں والی پینٹ شرٹ پہننے اپنے میڈی یکل کالج کے بس کے انتظار میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کچھ ٹھیک ہیں وہ صبح کا وقت تھا جب ہوآپی فضلو بابا کے ساتھ اپنے گھر سے تالگے کا ہارن سن کر لٹکا کرتی تھیں۔ فضلو بابا ہوآپی کوتائگے میں سوار کرو کر اور ان کا خوب صورت سا بیگ جوانہوں نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا، ان کے حوالے کر کے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے تالگے کو گیٹ تک رخصت کرنے آتے تھے۔ ایسے میں عام طور پر ان کی طاہر بھائی سے بھی ملاقات ہو جاتی، جنہیں اب فضلو بابا احترام سے ”ڈاکٹر صاب“ کے نام سے بلاتے تھے۔ یہاں ہوآپی کا تالگہ محلے کے گیٹ سے لکھتا وہاں طاہر بھائی کی بس بڑی سڑک کا موز کاٹ کر ہمارے گیٹ کے پاس رکتی اور یہاں سے بچے شور چھاتے اور کوڈتے پھاندتے محلے کے گیٹ سے اپنے اسکول کے لیے باہر نکلتے۔ میرا وہ دن انہی کی بے چین اور افرادہ گزرتا، جب کبھی میں گیٹ سے نکلتے ہوئے ہوآپی کی چہرے کے آدھے نقاب سے جھانکتی بڑی کالی اور جھکی لگا ہوں کو طاہر بھائی کی اٹھتی ہوئی آنکھوں سے ملتے پاتا۔ ساری رات میری یہی دعا ملتگئے گزر جاتی کہ خدا کرے کہل طاہر بھائی کی بس جلدی آجائے یا چھر ہوآپی کا تالگہ طاہر بھائی کے گیٹ پر آنے سے پہلے ہی وہاں سے گزر جائے لیکن طاہر ہے کہ ہر روز میری دعا قبولیت کا شرف بھی نہیں پا سکتی تھی اور ہر تیرے چوتھے روز ہوآپی اور طاہر بھائی کی نظریوں کے ملاپ کا یہ ”اتفاق“ سرزد ہوئی جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ طاہر بھائی کی بس کے اوقات بھی ہوآپی کے تالگے کی روائی سے متصل ہیں۔ بہت عرصے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کر میڈی یکل کالج والوں کی ایک ہی رنگ اور ایک ہی جلیسی کی تین چار سیسیں ہوتی ہیں جو مختلف اوقات میں چلا کرتی ہیں۔ بہر حال اس وقت مجھے بس کے اوقات کا رسے زیادہ اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ صبح سویرے میرے دل پر بھل گرانے والا نظریوں کا یہ تصادم کسی نہ کسی طور پر جائے۔

وہ بھی میرے لیے ایک ایسا ہی جو جصل اور بے حد اوس دن تھا کیونکہ صبح اسکول کے لیے آتے ہوئے محلے کے گیٹ پر میں نے یہ تصادم ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہوآپی کی لگاہ جیسے ہی طاہر بھائی سے لکھا تھا جس کا نظریں جھکا لی تھیں لیکن طاہر بھائی کی لگا ہوں نے ہوآپی کی

نظر وں کا تاحد نگاہ تعاقب کیا۔ میں نے طاہر بھائی کو اپنا کارٹھیک کرنے کے بہانے دھیرے سے اپنا ہاتھ اٹھاتے بھی دیکھا اور اگر میں نے راجہ سے ان ”معاملات“ کے بارے میں مکمل تفصیلات نہ لے رکھی ہوتیں تو مجھے کبھی پتہ نہ چلتا کہ یہ سلام پیش کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ طاہر بھائی کے ہاتھ کا لرنک لے جاتے ہی تو آپی نے فوراً اپنی پلکیں جھکا لی تھیں لیکن ان کے جسم کا سارا خون گلبی رنگ میں تبدیل ہو کر ان کے چہرے پر سوٹ آیا تھا۔ جبکہ یہ سارا ماجرہ دیکھنے کے بعد خود میرے اپنے چہرے کا ہر رنگ صرف اسی ایک لمحے کے وقفے میں ہی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔

”ہوں..... تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے..... اب تو اس کے بارے میں سمجھدی گی سے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔“

اس دن میرا من کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اسکوں میں بھی سارا دن دل بوجھل سارا ہا۔ راجہ نے کئی بار مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن میں اسے بھی ٹال گیا۔ شام کو ہم دونوں استانی خالہ کے گھر سے باہر نکلے تو بالے سے ہمارا نکلنا اور ہو گیا۔ وہ کچھ جلدی میں لگ رہا تھا۔ راجہ نے اسے آواز لگائی تو اس نے ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے محلے کے چھوٹے میدان کے پچھوڑے بنے کو اڑڑ کی پچھلی جانب بڑھ گیا۔ دور محلے کے کچھ پہنچ شام کی سردی سے بچنے کے لیے ٹین کے ایک لنتر میں جس کے اطراف اور کناروں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے سوراخ کیے گئے تھے، سلگتے ہوئے انگارے ڈال کر اس ڈبے کو ایک مضبوط بندھی تار سے پکڑ کر ہوا میں خوب زور زور سے گول چکر دے رہے تھے۔ ان سوراخوں سے ہوا ٹین کے لنتر میں داخل ہوتی تو انگارے گلگ کر آگ پکڑ لیتے تھے اور پہنچ جلدی سے ٹین کے لنتر کے گرد جمع ہو کر اس آگ سے اپنے ہاتھ سینکنے لگتے تھے۔

بالا ان بچوں کے جھوم سے ذرا ایک طرف ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور راجہ کو بھی اس نے وہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بالے کے اس مشکوک انداز نے ہمیں بھی تحسیں میں ڈال دیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سرگوشی میں ہم سے پوچھا۔

”کبھی کش لگایا ہے.....؟“

میں نے اور راجہ نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر حریرت سے پوچھا۔

”کیا کش.....؟“

بالے نے اپنی جیب سے ایک مراڑا سا سگریٹ نکال کر ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”اس کا کش.....؟“

میں اور راجہ سگریٹ دیکھ کر یوں اچھلے ہیسے بالے کے ہاتھ میں سگریٹ نہ ہو کوئی سپنولیا ہو، جسے وہ اچانک ہمارے سامنے اہر ایٹھا ہو۔

ہم دونوں بے اختیار چلائے۔

”سگریٹ.....؟“

بالے نے جلدی سے اپنے ہونوں پر انگلی رکھ کر ہمیں غصے سے گھورا اور آہستہ سے ڈائٹھے ہوئے بولا۔

”چپ..... مر واوے گے کیا..... کیا اس سے پہلے بھی سگریٹ نہیں دیکھا.....؟“

راجہ نے حیرت سے بالے کی جانب ایسے دیکھا، جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی خلوق ہو۔

”تم سگریٹ پینے ہو.....؟“

کتاب گھر کی پیشکش

بالے نے حضرت سے ایک آہ بھری۔

”روز ایسی عیاشی کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے یار۔ کبھی کبھار اُتو بھائی کی ڈیبا میں سے اڑ لیتا ہوں۔ آج بھی ان کی ڈیما میں آخری یہی پچھی۔ وہ صبح گھر پہ بھول گئے تھے۔ مجھے موقع ملا تو میں اڑ لایا۔“

بالے نے جیب سے کمبل سگریٹ کی ایک ڈیپانکالی جو سگریٹ کے ادھ جلنے والوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سگریٹ ماچس نکال کے سلاگایا اور خاص ”لوفروں“ کے انداز میں اس نے ایک لمبا سا کش لیا اور دھواں ہمارے چہروں پر بکھیر دیا۔ میری تو آنکھیں جلنے لگ گئیں۔ بالے نے ایک دوارکش لیے۔ میں اور راجہ اس کے سامنے بیٹھا اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے جیل میں عادی اور چھوٹے موٹے مجرم اپنے گرو اور بڑے استاد کو دیکھتے ہیں۔ بالے نے سگریٹ ہماری طرف بڑھایا۔

”کش لگاؤ گے.....؟“

میں نے اور راجہ نے پچھا تے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ بالے نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔

”لگا لو یار..... ایک کش سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ مردوں کے پینے کی چیز ہے۔“

پہلے راجہ نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہاتھ میں اس طرح پکڑا جیسے وہ سگریٹ نہیں بلکہ پورے کا پورا ایک جلتا انگارہ ہو۔ بالے نے ایک دوسرا اٹھا کر میرے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ میں نے اور راجہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر ایک، دو تین کہا اور سگریٹ ہاتھوں سے لگائی۔ جیسے ہی دھواں میرے حلق سے نیچے گیا مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے حلق میں کاتنوں سے بھرا تھا اور شدید چھبتا ہوا کوئی گول آن پھنسا ہو۔ میرے اور بجدوں کے گلے میں دھویں کا پھنڈا اٹک گیا اور ہم دونوں کا کھانس کھانس کر براحال ہو گیا۔ میری آنکھوں سے تو یوں پانی بہرہ رہا تھا، جیسے کسی دریا کا بندٹوٹ گیا ہو۔ راجہ کا حال بھی بہت بر احتفا۔ بالا ہم دونوں کی حالت دیکھ کر فس پس کرلوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ میری اور راجہ کی زندگی کا پہلا کاش تھا۔ مجھے اسی دن سے سگریٹ سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ میں جیران تھا کہ یہ وہ چیز ہے، جسے یہ سارے بڑے مزے لے لے کر پینے تھے۔ اس کش کی کڑواہٹ، تلچی اور عجیب سی جلتی ہوئی بوئے میری روح تک دھویں سے بھر دی تھی لیکن راجہ پر اس کش کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے شاید اپنے حلق سے اترتے اور خون میں شامل ہوتے ٹکوٹیں کے نئے اور اس مزے کو محوس کر لیا تھا جس کا ہر سگریٹ پینے والا دیوان ہوتا ہے۔ سگریٹ کچھ سالوں میں ہی راجہ کی انگلیوں کا مستقل حصہ بن گیا جس کے بغیر کبھی کبھی راجہ کی اپنی خصیت ادھوری لگنے لگتی تھی۔ میں نے بہت بعد میں کہیں پڑھا تھا کہ ”سگریٹ کے ایک کونے پر ایک سلگتا ہوا انگرہ اور دوسرے کونے پر ایک احمق ہوتا ہے.....“ سو میرا دوست راجہ بھی اسی دن سے ان احمقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا، افسوس میں یہ حماقت دوبارہ بھی نہ کرسکا۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا بھرم

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس دن کیمبل سگریٹ کے ایک ہی کش نے میری حالت ابتر کر دی تھی۔ بالے نے سگریٹ ختم کرنے کے بعد جیب سے ہرے پو دینے کی خوبصوری اگلیاں نکال کر خود بھی زبان کے نیچے رکھ لیں اور راجہ کو بھی ایک میٹھی گولی چونے کے لیے دے دی۔ راجہ سے ہی ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ منہ سے سگریٹ کی مہک کو ختم کرنے کا یہ سب سے تیر بہد فخر ہے۔

اگلے چند دن میں رمضان شروع ہو گیا اور میری آدمی مزید بڑھ گئی۔ پتہ نہیں بھوک سے ان دونوں میری آدمی کا کیسا عجیب ساتھ تھا۔ جتنی زیادہ بھوک لگتی اتنا زیادہ میں اُداس ہوتا جاتا۔ ابا کی طرف سے مجھے باقاعدہ روزے رکھنے کا حکم نامہ مل چکا تھا۔ الہذا اگری کو باقی لوگوں کے ساتھ مجھے بھی جگادی تھیں۔ شروع کے چند روزے تو میں نے سحری بھی بند آنکھوں سے ہی کی۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روزہ اتنی صبح سے بلکہ منہ اندر ہرے ہی کیوں شروع ہو جاتا ہے۔ ہم صبح کے ناشتے کے بعد سے لے کر رات تک بھی تروزہ رکھ سکتے تھے؟

بہر حال دو چار روزوں کے بعد ایک سحری کو جب میں ذرا جلدی نیند سے جاگ گیا تھا اور امی کے ساتھ باور چی خانے میں بیٹھا انہیں پڑا شے بناتے ہوئے اپنے لیے عمارہ اور بڑے بھیا سے بڑا پڑاٹھا بنا نے کے لیے بٹک کر رہا تھا تب اچانک ہی باہر گلی سے راجہ کی مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں حیرت اور خوشی کے عالم میں جلدی سے باہر بھاگا، گلی میں راجہ، گذرا اور بالے یمپ پوسٹ کی روشنی سے ذرا ہٹ کر بڑی بڑی کالی چادریں اوڑھے کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ آج سے ان سب نے محلے میں اُن سب گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے جو دن میں ہمیں اپنے گھر کے سامنے کھیلنے سے ڈانتھ تھے۔ تھوڑا پنے گھر سے چکنے والی سفید ٹیپ لینے کے لیے گیا ہوا تھا کیونکہ کچھ دروازوں کی گھنٹیوں پر مستقل بجانے کے لیے یہ ٹیپ بھی جوڑی جانی تھی۔

راجہ نے مجھے کہا کہ میں جلدی سے سحری کر کے نماز کے بہانے اپنے ابا سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آؤں کیونکہ ہمیں آدھے گھنٹے کے وقفے میں پورے محلے کی ”خدمت“ کرنا تھی۔

کچھ ہی دیر میں میں اٹھے سیدھے نوائے نگل کر، گھر والوں کو دکھانے کے لیے سرپ سفید ٹوپی اوڑھ کر، کچھ نمازوں کی طرح سنجیدہ سی صورت بنا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر پوری تولی تیار کر دی تھی۔ کچھ گھر جن میں گھنٹی کی سہولت موجود نہیں تھی ان کے بیرونی دروازوں کی بڑی بڑی کنڈیوں سے کالا دھاگا باندھ کر، کسی دور جگہ پر چھپ کر اسے ہلانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا جن گھروں کے صحن اور دلان ابھت لے چوڑے تھے جہاں تک کمرے سے نکل کر آنے میں مکنیوں کو کچھ وقت لگتا تھا ان کے دروازے کی گھنٹی پر ہم مضبوط ٹیپ اس طرح چپا دیتے کہ گھنٹی مستقل بھتی ہی

رہے جبکہ کچھ گھروں کے دروازوں پر گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی نہیں تیزی سے بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑتی تھی۔ اس کھیل کے اصول کچھ یوں تھے کہ ہر بچے کو اپنی باری ملتی تھی اور باقی بچے اس کی مدد کچھ فاصلے سے کرتے تھے، سب ہی کو ایک ایک بار کسی نہ کسی دروازے پر جانا ہی ہوتا تھا۔ مجھے، راجہ، بائی، گدھوار خونکو ملا کر ہم سب پانچ بنتے تھے، لہذا ہر پانچوں گھر کے بعد پہلے بچے کی باری دوبارہ آ جاتی تھی۔ اگلے دو تین دن میں مشی اور پہنچنے بھی ہمارا ”گروہ“ جوان کر لیا اور یوں ہم سات ہو گئے اور سارا محلہ ہجری کے وقت گھنٹیوں اور کنٹیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سے گوئے گا۔ روزہ دار گھرانوں کی تو خیر تھی کیونکہ وہاں تو عموماً بھی جاگ ہی رہے ہوتے تھے لیکن سب سے زیادہ پریشانی ان گھرانوں کے لیے تھی جہاں روزہ رکھنے والا کوئی ایک آدھ یا بالکل ہی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں چند ہندو گھرانے کی گھنٹی والے گھروں میں شامل تھے۔ ان سب کی تو جان پر ہی ہن آئی تھی۔ ہم گھنٹی بجا کر یوں سر پٹ بھاگتے کہ دروازہ کھولنے والے کو ہمارا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ دن کو ہم سب مخصوص صورت بنائے جب انہی گھروں کے سامنے کھیل رہے ہوتے اور آس پاس کے محلے داروں کو آپس میں ان سحری کی وارداتوں کے بارے میں بات کرتے سنتے تو ہمیں بے حد مزہ آتا۔

<http://kitaabghar.com>

مددیقی صاحب غصے سے تملماً کر مرزا صاحب سے کہتے۔

”ارے جناب..... یہ زمانہ تو شرافت کا ہے ہی نہیں..... آسمان سر پر اٹھا کر ہے ان لوگوں نے..... جانے کوں آہی رات کو گھنٹی پر سیپ چپا جاتا ہے۔ میرے ہاتھ لگے تو اسی خبر لوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے..... وہاں سے دبليے پتلے قدوس صاحب اپنی باریک آواز میں منماتے۔

”ابھی شرافت کی کیا بات کرتے ہیں آپ..... یہ تو محلہ ہی غنڈوں کا گڑھ بتا جا رہا ہے۔ چھپلی سحری تو اس قدر زور سے میری کنڈی کھڑکائی کم بختوں نے کہ میرے ہاتھ سے تو دو دھنچیں کا پیالہ پھسل کر منے کی اماں کے سر پہ جا گرا۔ مجبوراً آج کا روزہ قضا کرنا پڑ گیا نہیں۔“

کچھ ”کم زور دل حضرات“ جو پہلے ہی سے صحیح کی نماز مسجد سے قضا کرنے کے بھانے ڈھونڈ رہے ہوتے تھے، اپنے وسو سے یوں بیان کرتے۔

”مجھیں یار مرزا..... مجھے تو یہ کوئی آسیب کا چکر لگاتا ہے۔ جس لمحے میری کنڈی کھڑکی تھی، تبھی میں چھلانگ لگا کر دروازے کے باہر آموجود ہوا پر دور دور تک ایسا ناتھا کہ میرا تو دل ہی ہوں کھانے لگا..... جلدی سے چار قل پڑھ کر میں دوبارہ بستر میں جا گھسا۔ بڑے بوڑھوں نے ہمیں تو یہی سکھایا ہے کہ میاں ایسی مغلوقات سے ما تھا بھڑانا خودا پنی موت کو دعوت دینا ہے۔“

غرض کوئی اسے میں الاؤ امی چوروں کے کسی گروہ کی سازش قرار دیتا اور کوئی اپنے ہمارے کی نیت پر شک کرتے ہوئے اس سے اڑ بیٹتا اور ہم ساتوں دور کھڑے مخصوصیت سے یہ تماشہ دیکھتے اور تھاہی ملتے ہی ہنس بنس کر دوہرے ہو جاتے۔

انہی متاثرین میں سیٹھ گردھاری مل کا گھرانہ بھی شامل تھا جو پہلے ہی اپنے موٹاپے کے ہاتھوں بے حد پریشان تھے اور پر سے روزانہ صحیح چار ساڑھے چار بجے کی اس دوڑ پر یہ نے ان کا بلڈ پریشرا تباہی کر دیا تھا کہ ان کا جینا حرام ہو گیا تھا۔ گردھاری مل کی چار نازک اور خوب صورت سی بیٹیاں بھی تھیں جنہیں جب ان کی ”ماتا“ محلے سے کسی کام کے لیے باہر جانے کے لیے لے کر نکلی تھیں تو ان کی زبان پر زیریں صرف ”رام رام“ کا

وردو ہوتا تھا تاکہ یہ مشینڈے "مُسلئے" ان کی بیٹیوں پر نظر نہ ڈال سکیں۔

وہ غالباً تیرھواں روزہ تھا۔ ہم حسب معمول سحری کو کامیابی سے محلے والوں کی نیند حرام کرنے میں مشغول تھے، گردھاری مل کا دروازہ آنے پر راجہ کی باری آگئی۔ ہم سب اصول کے مطابق دروازے سے دس بارہ گز دور ہی رک گئے اور ہم نے راجہ کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ کر گھنٹی بجائے جبکہ ہم سب نے گھنٹی بجتے ہی واپسی کے لیے سرپٹ بھاگنے کے لیے پرتوں لیے۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بچے کے لیے ہوتا تھا جو گھنٹی بجانے کے لیے دروازے کے پاس جاتا تھا کیونکہ باقی لوگ تو اتنی دور کھڑے ہوتے تھے کہ انہیں بھاگنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ راجہ دبے پاؤں گردھاری مل کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم سب دم سادھے بھاگنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ راجہ نے آخری بار پلٹ کر ہماری جانب دیکھا اور بالے نے دھیرے سے گنتی پر ھتی شروع کی۔

"ایک... دو... تین..." کہتے ہی راجہ نے گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا اور ہم دیوانہ بھار بھاگے لیکن یہ کیا.....؟ راجہ کے گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک موٹا اور کالا سا آدمی زور دار آواز میں "جے بجر گل بی..... توڑ دشمن کی تلی....." کاغزہ لگاتے ہوئے باہر آ کوڈا اور سیدھے اپنا ہاتھ راجہ کی کالائی پر ڈال دیا۔ راجہ بدھواں میں چالایا "بھاگو....." لیکن اس وقت اس کی ہدایت پر عمل کرنے والے ہم سب کی تو پہلے ہی خوف زدہ جانوروں کی طرح سرپٹ بھاگ ہی رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اس "کالی بلا" کا ہاتھ ٹھیک طرح سے راجہ کی کالائی پر نہیں پڑا تھا اور راجہ کا بازاں واس کی گرفت سے پھسل کر نکل گیا۔ راجہ بھی کسی رلیں کے بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح اس شخص کی گرفت سے نکل کر وہاں سے ایسا بھاگا کہ کچھ ہی دیر میں ہمیں بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بھاگتے ہوئے راجہ نے زور سے نفرہ لگایا۔ "مسجد کی طرف..... مسجد کی طرف....." شاید راجہ کے ذہن میں یہ بات ہو گئی کہ گردھاری مل کے گھر سے برآمد ہونے والی یہ مصیبت مسجد کی طرف آنے کی جرأت نہ کرے۔ اس شخص کے پیچھے دونوں جوان مزید سیٹھے کے گھر سے نکلے اور وہ بھی ہمارے پیچھے بھاگے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہم میں سب سے آگے راجہ، اس کے پیچھے ہم، ہمارے پیچھے وہ کالی بلا اور سب سے پیچھے دونوں جوان ہمارے تعاقب میں بکٹ دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ہم ساتوں ان کی پیٹھی سے کافی دور نکل گئے اور بھاگتے ہوئے سڑک کراس کر کے مسجد میں جا گئے، جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ ہم بھی جلدی سے باقی نمازیوں کے ساتھ صفوں میں رل مل گئے۔ راجہ کے کہنے میں مطابق ان لوگوں نے ہمیں مسجد میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا لہذا نمازِ ختم ہونے کے بعد ہمیں اپنی نمازیوں کی ٹوپیوں کے ساتھ ہی محلے میں واپس داخل ہونا لازمی تھا تاکہ سیٹھوں گردھاری مل اینڈ کمپنی ہمیں پکڑنے سکے۔

لیکن جیسے ہی ہم مسجد سے باہر نکلتے تو یہ دیکھ کر ہمارے پیروں تلتے سے زمین نکل گئی کہ وہ تینوں بیچ سیٹھوں گردھاری مل، مسجد کے باہر موجود ہیں اور مسجد سے نکلنے والے نمازوں سے بچ میرے ابا کے، ہماری شکایت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور تھا لیکن سوائے راجہ کے وہ اور کسی کو نہیں پیچا نہتے تھے کیونکہ ہم سب ان سے دور تھے، مسجد سے اور بھی کافی بچے جو ہماری ہی عمر اور سائز کے تھے، برآمد ہو رہے تھے۔ لہذا بڑوں نے وہیں مسجد کے سامنے والے میدان میں ہماری "شاخت پر یہ" کا بندوبست کرتے ہوئے سمجھی پیچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سیٹھوں گردھاری مل کو اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ملزم پیچانے کا کہا گیا۔

گردوہاری مل ایندھنی نے راجہ کو تو دور ہی سے پہچان لیا اور اسے "ملزمان" سے نکال کر مجرموں کی لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ راجہ کے بعد انہوں نے بالے کو اس کے نمایاں قد کاٹھ کی وجہ سے شناخت کر لیا گیا۔ بالے کے ساتھ ہی میں کھڑا تھا۔ گردوہاری مل نے ہانپتے ہوئے بغور میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنے چہرے پر نہ صرف اپنی بلکہ آس پاس کی بھی تمام مخصوصیت کو یوں سمجھا کیا ہوا تھا کہ خود گردوہاری مل کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ بہر حال انہیں سات ملزمان کی تھی تو پوری کرنی ہی تھی لہذا میرے ساتھ کھڑے "پڑھا کو" رفاقت پر گرا اور اس کے لاکھ چینچنے چلانے کے باوجود اسے گھیث کر راجہ اور بالے کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پھر، تھوڑی اور مُشی بھی پکڑے گئے جبکہ گذوں کی جگہ انہوں نے غلطی سے مولوی سعید کے بیٹے نیم کو دھر لیا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ مجرمان کی قطار میں رفاقت "پڑھا کو" اور "چھوٹا مولوی" نیم زارو قطار رور ہے تھے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنے گلے کا پورا ذریغہ کر جیخ چلا کر قسمیں کھار ہے تھے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فرد جرم نالی جا چکی تھی اور اب صرف ان کی سزا کا فصلہ باقی تھا اور یہ فیصلہ ہمارے بڑوں نے ایمان دار اور عظیم مسلمان حکمرانوں کی طرح سینہ گردوہاری مل پر چھوڑ دیا کہ "بول ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے....؟"

<http://kitaabghar.com>

سینہ گردوہاری مل کی خواہش پر ان سمجھی کو دو ہیں آدھے گھنٹے کے لیے مرغا بنا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان ساتوں کے گھروں والوں سے یہ درخواست بھی کی کہ گھر جا کر بھی ان سب کی "قد مر" کے طور پر تھیک ٹھاک خبری جائے یوں ہمارا اچھا خاصہ اور مزے سے گزرتا ہوا رمضان اس سینہ گردوہاری مل کی وجہ سے بر باد ہو گیا۔ آئندہ کے ہم سب بچوں پر محرومی کے دوران پہرہ بہت سخت کر دیا گیا۔ سواب ہم بچوں کا رمضان میں صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، جا گتے سوتے گھڑی کی طرف دیکھتے رہتے کہ وقت کب گزرے گا۔ افطار کے وقت جب ہم سب محلے کے بڑے میدان میں جمع ہوتے اور کسی بھی کھیل میں مشغول ہوتے تو زور دار آوازیں جنگی سازن جیسا ایک بھونپو پورے ایک منٹ کے لیے بجتا تھا جو اس بات کا اشارہ ہوتا کہ روزہ بس کھلنے کو ہے۔ ہم سب بچے اس سازن کی آواز پر اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ جاتے۔

تو آپ تک سمجھی یہ گھنٹی بجائے کی واردات کی شہرت اور تذکرہ کسی طور پر تھی گیا تھا اور پہلے تو وہ بہت دیر تک ہنسی رہیں پھر انہوں نے مجھے

قریب بیٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔ "آدمی..... تم تو ان شرارتی بچوں کے ساتھ اس شرارت میں شامل نہیں تھے نا؟"

ند چاہنے کے باوجود مجھے اپنی گردن فوراً نافی میں ہلانا پڑ گئی۔ جانے کیوں میں تو آپ کو چاہ کر بھی یہ بتا نہیں پایا کہ اس روز میری جگہ کسی اور کوسرہ بھگتی پڑی تھی۔ حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس دن میں بھی ان بچوں میں شامل تھا جو اس گھنٹی بجائے کی واردات میں ملوث تھے لیکن مجھ سے سوال کرتے وقت تو آپ کی آنکھوں میں ایک ایسا ایقین اور میرے اوپر ایک ایسا اعتماد اور بھرم تھا کہ میں ان سے سچ بولنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کا بھرم توڑنیں پایا۔ یہ میری زندگی میں مجھ پر کسی کا پہلا مان تھا جو میں نے اپنے جھوٹ کے ذریعے قائم رکھا۔ جب سے اب تک میں صرف لوگوں کے بھرم ان کامان ہی قائم رکھتا آ رہا ہوں۔ سچ یا جھوٹ، غلط یا صحیح بس کسی نہ کسی طور میں لوگوں کی امیدوں پر پورا ترنے کی کوشش کرتا ہی رہا ہوں لیکن میں یہ بات شاید آج تک نہیں سمجھ پایا کہ یہ جھوٹ بھرم جب لوٹیں گے تو میری حیثیت میرے اپنوں کے سامنے شاید کاغذ کے پر زے جھنی بھی باقی نہ رہے۔ کاش میں اسی روز تو آپ کا وہ پہلا بھرم سچ بول کر توڑ دیتا۔ کاش میں اسی روز پورا سچ بولنا یکھ جاتا۔

<http://www.kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چاند

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

یوں روتے پیٹتے دن بھر بھوک اور بیاس سے مٹھاں اور سارا دن اپنے لیے افطاری کے وقت کے لیے کھانے کی چیزیں جمع کرتے میرا وہ پہلا رمضان بھی بیت گیا جس میں میں نے اپنی زندگی کے پہلے تیس (۳۰) روزے پورے کیے۔ میں ہر دو پھر اپنے آپ سے پکا وعدہ کرتا کہ کل کا روزہ تو کسی صورت نہیں رکھوں گا اور اگر اب اپنے زبردستی رکھوا بھی دیا تو اسکوں جا کر یا پھر بالے اور راجہ کے ساتھ مل کر توڑ دوں گا لیکن ہر صبح، محرومی کے وقت امی مچھے کوئی نہ کوئی نیالاچ دے کر مچھے اپنا روزہ افطار تک "کھینچنے" کی ترغیب مہیا کر دیتی تھیں۔ سیسھ گردھاری مل والے واقعے کے بعد ہم سب بچوں کی ساکھ کا لوئی میں کافی خراب ہو چکی تھی اور ہمیں کوئی نیا گل کھلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ پچھویں روزے کے بعد ابا مجھے عمارہ اور بڑے بھائی کو بازار لے جا کر ہمیں نئے جوتے بھی دلایا۔ کپڑے تو پہلے ہی محلے کے درزی سے سل کر آجکے تھے اور کپڑے خریدنے سے پہلے میں خاص طور پر تو آپی کے گھر جا کر ہمیشہ کی طرح ان سے پوچھ آیا تھا کہ اس بار میں عید پر کون سے رنگ کے کپڑے بخواں۔ اس طرح کے معاملوں میں میں ہمیشہ خواہ آپی کے مشورے کو ہی ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

رمضان میں دن کے وقت بالے کا بڑا بھائی اٹو گھر سے کم ہی باہر لکھتا تھا کیونکہ بالے کی طرح وہ بھی روزے نہیں رکھتا تھا اور ایک بار محلے کے بزرگوں نے اسے سرعام سگریٹ پینے پخت ست نائیں تو وہ ان سے الجھ پڑا۔ جس پر اس کے باپ نے اٹو کا دن میں گھر سے نکلا کم کرا دیا۔ حق تو یہ ہے کہ اٹو خود اپنے گھروالوں کے قابو میں بھی نہیں تھا اور یہ بھی اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ اپنے باپ کے کہنے میں آکر جھوٹے منہ ہی سکی لیکن لوگوں کے سامنے روزے میں سرعام سگریٹ پینے سے با آگیا تھا۔ میں جب بالے سے اس کے بڑے بھائی اٹو کے کارنا میں سنتا تو میرے دل میں اٹو کا خوف مزید گہرا ہوتا جاتا۔ بالے نے جب مجھے اور راجہ کو یہ بتایا کہ اٹو کے نیفے میں جو بیس گھنٹے گاری والا چاقو اڑ سارہتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ کئی مرتبہ جھگڑے کے دوران یا آٹھ گھر اری والا چاقو استعمال بھی کر چکا ہے تو ہم دونوں کی آنکھیں خوف اور اٹو کی مرعوبیت سے پھیلیں چل گئیں۔ میں نے خود ایک آدھ مرتبہ اٹو کو ہٹھی کردا (کلپ) اپنے نیچے پر چڑھائے اور دیوار پر مکہ بازاڑی کی مشق کرتے دیکھا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے تیس (۳۰) روزے بیتتے اور چاندرات آگئی۔ پورے محلے کے بزرگ، جوان اور نیچے بڑے میدان میں عید کا چاند دیکھنے کے لیے سر شام ہی جمع ہو گئے تھے اور ہر بزرگ کو کسی الگ ہی ٹھنڈی کے پیچھے سے عید کا چاند ابھرتا دکھائی دے رہا تھا جو بعد میں باقی سب کچھ ثابت ہو جاتا سوائے چاند کے۔ غفور چچا تو اپنے آباؤ اجداد کی پرانی کاربین کی بنو قنمادر بین بھی اٹھالائے تھے جس کا شیشہ وقت کی دھول سے اس قدر وہندلا گیا تھا کہ اس سے سامنے بیٹھی چیز بھی بمشکل دکھائی دیتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنیں آ رہا تھا کہ جب تیس روزے پورے ہو ہی چکے ہیں تو پھر

اس چاند دیکھنے کے چھبوٹ میں پڑنے کا فائدہ کیا تھا؟ ابھی کل شام ہی تو یہ سارے عید کا چاند دیکھنے جمع ہوئے تھے لیکن بسیار کوشش کے بعد بھی جب چاند نظر نہیں آیا تو پتہ چلا کہ کل بھی روزہ رکھنا ہو گا۔ یہ سنتے ہی کل شام ہم سب بچوں کے منہ لٹک گئے تھے۔ حالانکر راجہ نے فرمائیں کھا کھا کر سب کو یقین دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ خود اس نے اپنی ”گناہ گار“ آنکھوں سے انصاری صاحب کے چھپت کی چمنی کی اوٹ سے جھلتی، چاند کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی ایکن حسب معمول راجہ کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا اور آج ہمیں یہ تیسوں روزہ بھی رکھنا پڑا تھا اور جب آج بھی ان بزرگوں کو چاند دکھائی نہیں دے رہا تھا تو ہم سب بچوں کے دلوں میں یہ خوف کہیں جڑ پکڑ رہا تھا کہ کہیں اب کل اکتسیواں (۳۱) روزہ بھی نہ رکھنا پڑ جائے۔ باقی بچوں کا تو مجھ پہنچنے نہیں لیکن خود میرے دل سے اس اکتسیواں روزے کا خوف ساری زندگی نہیں نکل پایا۔ میں نے باقی ساری عمر جتنی بھی نیکی کی صرف فرض کی حد تک ہی کی، کبھی مجھے خود اپنے آپ کوئی نیکی کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ جہاں فرض کی حد پوری ہوئی وہیں میں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی اس حد سے بڑھنے کی چاہ نہیں کی۔ ساری زندگی بس تیس (۳۰) روزوں پر ہی انکار ہا۔ کبھی اکتسیواں (۳۱) روزے کی سیر گھی خود سے پار نہیں کر پایا۔ یوں میری جھوپی خود میری مرضی کی کی ہوئی نیکی سے سدا خالی ہی رہی۔

<http://kitaabghar.com>

آخر خدا کر کے کسی ایک کونے سے ایک بزرگ کی لرزتی کا نیچی ہی جھنگاہ بھری ”وہ رہا..... وہ رہا چاند.....“ ہم سب نے فوراً ان کی شہادت کی اٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑا کیں اور پھر کسی نہ کسی طرح سب ہی کی وہ دھرات کی پتلی سی تار جیسا پہلی کا چاند نظر آئی گیا۔ سب نے گلے مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ چند ہی لمحوں بعد شہر کی میونسلی سے دور فوجی میدان میں تو پیش وانعے جانے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حکومت کی طرف سے بھی با قاعدہ عید کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہم سب بچوں نے خلوص دل سے اللہ میاں کا شکر ادا کیا کیونکہ اندر سے ہم سب ہی کی جان نکلی ہوئی تھی کہ چاند نظر نہ آیا تو کیا ہو گا؟

یہاں میدان میں سارے ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دے رہے تھے اور میں ہوا آپی کو مبارک دینے کے لیے ان کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا آپی گھر کے برا آمدے میں بیٹھیں لیکنہ خالہ کے ساتھ مہنڈی گیلی کرواری تھیں۔ غیاث پچا فضلہ بابا کے ساتھ مل کر چند مزدوروں سے گھر کے خراب شدہ حصوں پر دوبارہ سے قلعی کے چھینٹے پڑوار ہے تھے۔ ہجو آپی نے مجھ دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ میں نے انہیں چھپت پر چلنے کا اشارہ کیا تاکہ میں انہیں چاند دکھا سکوں۔

<http://kitaabghar.com>

عید کا چاند دیکھنے کا ہی ہوتا ہے لہذا ہم دونوں تیزی سے چھن کی سیر ہیاں چڑھ کر چھپت پر جا پہنچ۔ میں نے چاند نکلنے کی جگہ اچھی طرح یاد کر کر کھنچتی لہذا مجھے ہوا آپی کو اسے ڈھونڈ کر دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ہوا آپی نے چاند دیکھتے ہی جلدی سے سر پر دوپٹہ درست کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ پتہ نہیں وہ آنکھیں بند کیے اتنے جذب کے عالم میں کون سی دعا مانگ رہی ہوں گی؟ میں ہوا آپی کے چاند چہرے کو دیکھتے ہوئے بھی سوچتا رہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں اللہ میاں ہوتا تو ہوا آپی کی ہر دعا بن مانگے ہی قبول کر لیتا لیکن مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ ”اصلی“ اللہ میاں بھی ان کی ہر دعا سب سے پہلے سنا ہو گا۔ ہوا آپی نے دعا ختم کر کے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنی جانب یوں پٹ پٹ گھورتے دیکھ کر ہلکا ہلکا رہن پڑیں۔ ”کیا دیکھ رہے ہو آؤی.....؟“ ہوا آپی میرے بالکل مقابل یوں کھڑی تھیں کہ ان کے چہرے کے پیچے ہی عید کا وہ باریک

سماں چاند بھی جھلک رہا تھا۔ میں ابھی انہیں کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ یک قواؤپی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یوں لگا جیسے چاند کو اچاک ہی پر بیٹھا اور غصے کے بدل نے ڈھانپ لیا ہوا۔ میں نے چونکہ کران کی نظروں کے تعاقب میں نیچے میدان کی طرف چھانا کا۔ میدان اب تقریباً سنسان ہو چکا تھا کیونکہ کچھ دیر پہلے چاند دیکھنے کے لیے جمع ہوا جوامِ عید کی تیاریاں کرنے کے لیے اپنے گھروں کی جانب چھٹ چکا تھا البتہ میری سیدھی نظر میدان میں تباہ کھڑے اٹو پر جا پڑی جس کا قواؤپی کی جانب سلام کرنے والا رہا تھا ابھی تک اس کے ماتھے سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ لگاتا اور بناء کی خوف کے نیچے کھڑا مسلسل جانے کب سے قواؤپی کو گھورے جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم کا تمام خون ایک دم ہی میری کن پیسوں کی جانب بہنا شروع ہو گیا ہوا۔ قواؤپی نے پر بیٹھا میں جلدی سے میرا باتھ تھا اور مجھے لیے ہوئے نیچے اتر آئیں۔ راستے میں بیڑھیوں پر انہوں نے مجھے منع کیا کہ میں غیاث چچا کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں کیونکہ غیاث چچا کو یوں تو غصہ کچھ کم ہی آتا تھا لیکن اگر کبھی آجاتا تو پھر پورا مخلہ اس سے پناہ مانگتا تھا اور قواؤپی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کی بھی عید بد مرہ ہو۔

لیکن آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اسی وقت اگر غیاث چچا کو نہیں تو کم سینہ خالہ کو تو اٹو کی وہ بے ہودہ حرکت چکے سے بتا دیتا تو شاید آگے چل کر وہ سب نہ ہوتا جس نے ہم سب کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔ بہر حال اس وقت میں قواؤپی کی وجہ سے چپ ہی رہا۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ پہلی بار نہیں تھی جب اٹو نے قواؤپی کو تھک کرنے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ وہ پہلے بھی آتے جاتے کئی بار کا لوئی میں ان کا راستہ کاٹ چکا تھا۔ بلکہ اب تو اس کی وجہ سے قواؤپی نے بلا ضرورت گھر سے باہر قدم نکالنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اٹو ہر لمحے قواؤپی کے گھر کے آس پاس ہی منڈل لاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب غیاث چچا گھر پر نہیں ہوتے تھے اور جیسے ہی قواؤپی کو نہیں باہر آتے جاتے دیکھتا فوراً ان سے بات کرنے کے بھانے ڈھونڈنے لگتا۔ ویسے تو قواؤپی فضلو بابا کے ساتھ ہی گھر سے باہر کھیں آتی جاتی تھیں لیکن فضلو بابا اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ انہیں اٹو جیسوں کی آوارہ نظر کی خوبی نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ بے چارے تو اپنی لاٹھی لیکتے آگے آگے چلے جاتے اور قواؤپی کی نظریں جھکائے ان کے پیچے پیچے، لیکن اٹو کی مجال کی حد تک لیکھتے کہ وہ ایک آدھ بار موقع پا کر فضلو بابا کی موجودگی میں بھی ان کے اور قواؤپی کی راہ کے درمیان آکھڑا ہوا اور قواؤپی اس سے نکلا تے نکلا تے بھیں۔ آگے چلتے فضلو بابا کو اس لمحے کے ہزاروں میں ہوئی واردات کی خبر لیکر نہ ہوئی۔

پھر تو اٹو نے اپنا وطیہ ہی بنا لیا کہ جب بھی قواؤپی کہیں بھی نظر آتیں وہ ان کے پیچے ہی پڑ جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے راستے میں انہیں رکھ دیئے کی بھی کوشش کی جو ہمیشہ گھبرا کر تیز تیر چلتی ہوئی قواؤپی کے قدموں میں ہی پڑا رہ گیا۔ ان سب باتوں سے تھک آ کر قواؤپی نے گھر سے نکلا ہی چھوڑ دیا۔ تھی وہ اتنے دنوں سے ہمارے گھر بھی نہیں آئیں تھیں اور جب استانی خالد نے ستائیسوں رمضان کو اپنے گھر میں ختم قرآن پر پورے محلے کو دعوت دی تھی تب بھی صرف سینہ خالد ہی تھا وہاں آئیں تھیں۔ اب مجھے دھیرے دھیرے ہر بات کی سمجھ آنے لگی تھی لیکن پھر بھی انہیں دن میں دو مرتبہ کالج آنے اور جانے کے وقت تو محلے کے میدان سے گزرنا ہی پڑتا تھا جہاں وہ لفڑیاں اٹو ان کی راہ میں ہمیشہ کاشنا بنے کھڑا ملتا۔ کالج جاتے ہوئے تو پھر بھی فضلو بابا ان کے ساتھ گیٹ تک جاتے تھے لیکن واپسی پر تو وہ محلے کے چھوٹے چھاٹک پرتا نگے سے اتنے کے بعد اپنے گھر لیکر انہیں تھا ہی یہ پل صراط پار کرنا ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قواؤپی پڑھائی کے لیے اتنی دیوانی نہ ہوتیں تو وہ اس کم بخت اٹو کے ہاتھوں بے زار ہو کر کب

کی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ گئیں ہوتیں۔ اور پر سے وہ خواب جو غیاث پچانے ان کے مستقبل کے بارے میں ان کے بچپن سے ہی دیکھ رکھے تھے؟ ان خوابوں کو تجیر دینے کے لیے بھی تو جو آپی کو اس کڑوے زہر کا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔ جانے وہ معموم اور نازک سی لڑکی کب سے یہ افہمت سہہ رہی تھی اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا بھی نہیں تھا۔ غصے میں میرا تن من کھول اٹھا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر اٹھو کے نینے میں اڑسا چاقو ٹکال کر خود اسی کے پیٹ میں گھونپ دوں۔ یوں چاند رات کو میرا موڑ بہت خراب تھا۔ میں نے دیگر بچوں کے ساتھ مل کر رات کو آتش بازی میں بھی حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ راجہ میرے لیے بھی بہت سی شر شریاں اور انارواں پٹاخے لے کر آیا تھا لیکن میں نے سبھی عمارہ کو دے دیئے۔ امی عید کی رات ہی شیر خرماء اور کھیر تیار کر دیتی تھیں اور میں باور پرچی خانے میں رات کو دریتک اور پھر صبح تازہ پوریاں تلتے وقت ان کی مدد کیا کرتا تھا حالانکہ عمارہ اس بات سے بے حد چڑتی بھی تھی کہ امی مجھے اس سے زیادہ دریتک چولٹے کے پاس کیوں بیٹھنے دیتی تھیں اور میں اس سے زیادہ نشک میوہ چھیل کر امی کو کیوں دیتا تھا جسے امی کھیر اور شیر خرماء کے اور پرتوتی جاتی تھیں، لیکن اس رات میرا دل اپنے اس محظوظ مشفقے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اٹھو کا مگروہ چہرہ اور اس کا ماتھے تک اٹھا ہوا ہاتھ آ جاتا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

چاند رات کو یہی ماجرا مجھے خواب میں بھی نظر آتا رہا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ دخو آپی اور میں کہیں جا رہے ہیں کہ اچانک انکو کہیں سے ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور جو آپی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں انکو کا ہاتھ پکڑ کر اسی جھنکا دیتا ہوں کہ وہ دور جا گرتا ہے اور اس کا چاقو بھی میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ ابھی میں چاقو کی چار گر اریاں ہی کھول پایا ہوتا ہوں کہ انکو ڈر کر بھاگ جاتا ہے اور جو آپی خوشی کے مارے حسب عادت میرے گال زور سے کھینچ کر مجھے خوب پیار کرتی ہیں۔

<http://kitaabghar.com>

اگلی صبح عید کی نماز پڑھ کر حسب معمول ابا مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا کو لے کر دادی امام اور نانی امام کے گھر سلام کے لیے لے گئے۔ دادی اور نانی امام ہمیشہ مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا سے زیادہ عیدی دیا کرتی تھیں۔ دادی امام کے کمرے میں دیوار کے اندر بنی دو بڑی بڑی کھڑی نما الماریاں بھی تھیں جن کے اندر دادی امام اپنی جوانی کے برتن اب تک سنبھال کر رکھتی تھیں۔ انہی بزرگ سے پینٹ شدہ الماریوں کے کچھ برتوں میں وہ ہمیشہ میرے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ چھپا کر رکھتی تھیں جو ایسے کسی موقع پر سب سے چھپ کر میرے حوالے کر دیتیں۔ ہم سب خاندان کے بچوں کی عید ہمیشہ دادی امام کے صحن میں کھلیتے ہی گزرتی تھی۔ میری پچاڑ ادوں میں عالیہ بھی تھی جو تھی تو بہت نخر لی لیکن جانے کیوں وہی مجھے سب کرزنز میں سب سے زیادہ اچھی بھی لگتی تھی۔ ہم دونوں میں ہمیشہ اس بات کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا کہ دادی امام ہم دونوں میں سے سب سے زیادہ پیار کس سے کرتی ہیں۔ کھلیں کے دوران بھی میں ہمیشہ اسی کا پنی ساتھی بنا کر رہتا تھا۔ اس عید کے روز بھی حسب معمول عابد، ساجد، روبی، فوزیہ اور باقی بھی پچاڑ ادا دادی کے صحن میں اچھل کو دیں مصروف تھے اور دادی اور نانی امام اندر کمرے میں مل کر عید کا دسترخوان سجارتی کیوں کیونکہ عید کے روز ہمارا پورا خاندان ایک ہی دسترخوان پا کھٹھے ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ عالیہ نے مجھے یوں گم میٹھے دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آئی وہ بھی میرے پاس عیدی کم جمع ہوئی ہے اس لیے میں اس بیٹھا ہوں۔ میں نے اسے وجہ آپی کی پریشانی کے بارے میں بتایا کہ انہیں کوئی غنڈہ نشک کرتا ہے جس کے پاس گر اری اور اچاقو بھی ہے۔ وہ جو آپی کے بارے میں پہلے ہی سے جانتی تھی کیونکہ جب وہ ہمارے گھر آتی تھی تو کئی باراں کی وجہ آپی سے ملاقات ہوئی تھی بلکہ وجہ آپی نے کئی باراں

کی گڑیا کے لیے کپڑے اور گلڈے کے لیے گھر بھی بنا کر دیا تھا۔ میری سمجھی پچاڑوں میں وہی وجوہ آپی کی بھی پسندیدہ تھی۔ عالیہ میری بات سن کر گھر سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے یوں چٹکی بجائی جیسے مسلسلے کا حل اسے سمجھا گیا ہو۔ وہ بھاگ کروادی کے کمرے میں گئی اور کچھ ہی دیر میں واپس آئی تو با تھی میں ایک تعویز تھامے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کی گلی میں ایک بہت ”پکنی ہوئی بُرگنی“، آئینیں تھیں جنہوں نے اسے یہ تعویز دوروپے میں دیا تھا۔ اس تعویز کی خاصیت یہ تھی کہ جس کسی نے اسے گلے میں پہن رکھا ہوتا تھا اس پر کسی قسم کا ”لوہا“، اٹھنیں کرتا تھا اور چاقو بھی ظاہر ہے ہو لے سے ہی بنا ہوتا ہے لہذا اگر وجوہ آپی اس تعویز کو گلے میں ڈالے رکھتیں تو ان پر اگو کا چاقو بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ شام کو واپس کالوںی پہنچ کر کر کشے سے اترتے ہی میں امی کے ساتھ گھر جانے کی، جائے وجوہ آپی کے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر ہی اپنی عبید ملنے کے لیے آنے والی سہیلوں کو رخصت کرتی مل گئیں اور مجھے اس دن ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ لڑکیاں بھی آرام سے کمرے میں بیٹھ کر اتنی دیر بات نہیں کر سکتیں۔ حقیقی دیر وہ دروازے پر رخصت ہوتے وقت پڑ پڑ بولتی رہتی ہیں۔ خدا غدا کر کے ایک وجوہ آپی کے گلے لگتی کہ لکھتے وقت دوسرا کوکوئی یات یاد آ جاتی۔ دوسری کی رام کھانی ختم ہوتی تو تیسری کو مزتے مزتے کوئی چٹکہ یاد آ جاتا۔ میں بے چینی سے ان کے صحن میں ٹھیٹا رہا اور پورے آدھے گھنٹے بعد ان کی وہ تینوں سہیلویاں ”وقت کی کمی“ کا روناروٹے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

وہ وجوہ آپی میری جانب پلٹیں تو میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تعویز ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ارے..... یہ تعویز کیسا ہے آدی..... اور تم صح سے کہاں غائب ہو۔ میں نے تمہاری پسند کی میٹھی پوریاں اور سویاں ہنا کر رکھی ہیں۔ چلو جلدی سے اندر چلو۔“

میں نے جھنچھلا کر کہا۔ ”وہ وجوہ آپی..... پہلے یہ تعویز تو گلے میں ڈالیں..... میں اتنی دور سے آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔“

وہ وجوہ آپی میری بے تابی پہن دیں۔ ”اچھا بابا..... یا لو..... پہن لیا..... اب ٹھیک ہے..... اب تو تباود یہ تعویز کس لیے پہنایا ہے مجھے؟“

میں نے عالیہ کے دیے ہوئے تعویز کو وہ کھلکھلا کر پہن دیں۔ انہوں نے پیارے میرے بال سنوارے اور مجھے سے کہا کہ میں ان کے لیے اتنا فکر مند نہ ہوا کروں کیونکہ جس لڑکی کا مجھے جیسا پیارا اور خیال رکھنے والا دوست موجود ہوا سے دنیا کا کوئی بھی غنڈہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بہر حال میں نے پوریوں اور سویوں کا ایک نوالہ بھی اس وقت منہ میں نہیں رکھا جب تک وہ وجوہ آپی نے مجھ سے ”پکا والا“، ”عدہ نہیں کر لیا کہ وہ اس تعویز کو اپنے گلے سے تب تک جدا نہیں کر سکی جب تک اس کم بخت اگو کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہو جاتا۔

اس وقت میں کتنا معمصہ تھا کہ اتنی سی بات بھی نہیں جانتا تھا کہ بے رحم تقدیر کے لکھے ایے تعویزوں سے نہیں منا کرتے ورنہ دنیا کا ہر شخص اپنے گلے میں ایسے سینکڑوں تعویز ڈالے پھر تاکھائی دیتا لیکن یہ بے خبری بھی لکھنی بڑی نعمت دی ہے خدا نے اپنے بندوں کو۔ ہمیں آخری لمحے تک یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارے مقدار کا کون ساوارا گلے ہی لمحے ہماری زندگیاں تلپٹ کرنے والا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اس وقت مجھے اور وہ وجوہ آپی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ تقدیر ہماری قسمت کی تختی پر کون سی سیاہی پھیرنے والی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا جواب

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

عیدِ گزر گئی۔ ابا نے جانے کہاں سے کسی بورڈ گنگ اسکول کے فارم لے آئے تھے اور سارا دن انہیں پڑھتے رہتے اور اپنے رجسٹر میں کچھ نوٹ کرتے رہتے۔ شاید ان کا ارادہ ہڈے بھیا کو بورڈ گنگ اسکول میں بھجوانے کا تھا۔ ہماری پانچ بھیں کے سالانہ امتحانات کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں اور راجہ چھٹی جماعت میں ہائی اسکول پہنچ گئے۔ یہ اسکول ہمارے پرانے پر ائمہ اسکول سے بہت بڑا تھا اور اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس اسکول میں بچوں کے بیٹھنے کے لیے ڈیک بھی تھے اور اس کی چھت بھی نہیں بچتی تھی اور اس کے تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) بھی کمی دیواروں میں نصب تھے، ورنہ ہمارے پچھلے پر ائمہ اسکول میں تو ہر کلاس میں بلیک بورڈ و بانسوں کے اسٹینڈ پر کھڑے رہتے اور جماعت کی جگہ اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کبھی باہر گھن میں، کبھی شہتوت کے پیڑ کے نیچے اور کبھی برآمدے میں پڑے ملتے تھے۔ سرد یوں کی چھٹیوں میں ابا نے مجھے انگریزی کا پہلا قاعدہ بھی دلوادیا تھا جس میں میں اے فارا پیل اور بی فار بیٹ پڑھتا رہتا تھا۔ چھٹی جماعت سے ہمیں یہ انگریزی کا قاعدہ بھی شروع کرنا تھا جبکہ راجہ نے تو ابھی سے "انگلش" بولنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ بالا بھی "کسی نہ کسی طرح" چھٹی جماعت میں بچت گیا تھا اور ہم ٹینوں کی جماعت بھی ایک ہی تھی یعنی ششم الف (A) جبکہ گدود، نہخواہ پوشم ب اور ج (B & C) میں تھے۔

جی تو یہ ہے کہ ہم سب بچے ڈیک پر بیٹھ کر خود کو کافی باعزت محسوس کرنے لگے تھے حالانکہ سب جماعتوں میں ڈیسکاؤنٹ کی کے باعث دو ڈیک جوڑ کر تین تین بچوں کی ٹولیاں بٹھائی گئی تھیں لیکن ہمارے لیے یہ بھی کم غنیمت نہ تھا۔ کم از کم نجٹھندی یا گرم پتی زمین پر بیٹھنے سے تو بدر جہا بہتر تھا۔ میں بالا اور راجہ ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ راجہ سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف بیٹھتا تھا البتہ اس کی نظریں سارا دن بالا سڑک پر رہتی تھیں اور وہ ہمیں روایا کنٹرول کے ذریعے باہر کی خبریں سناتا رہتا تھا۔ بالا درمیان میں بیٹھتا تھا بلکہ ڈیک کے درمیان میں سر کھکھ سوتا تھا کیونکہ اس کا محبوب مشغله کلاس میں سونا ہی تو تھا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ ٹھپر کے آتے ہی اسے کہنی مار کر جگا دیتا۔ بالا چند لمحوں تک آنکھیں کھلی رکھنے کی سر توڑ کو شش کرتا اور پھر کتاب نکالتے ہی کچھ بھی دیر میں اس کا سر دوبارہ آہستہ آہستہ روکوں میں جھکتا چلا جاتا۔ میں اپنی کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے صفحے بھی پلٹتا جاتا اور جیسے ہی اس کی سبق پڑھنے کی باری آتی میں اس خاص سطر پر انگلی رکھ کر فوراً اسے جگا دیتا اور بالا تیزی سے ہنا رکے وہیں سے پڑھائی جا ری رکھتا جہاں سے پچھلے بچے نے چھوڑی ہوتی۔ مجھے بالے کی اس مہارت پر ہمیشہ رشک آتا تھا کیونکہ جیسے ہی بالا سبق ختم کرتا فوراً بیٹھ کر نیند کا سلسلہ بھی دوبارہ وہیں سے جوڑ دیتا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں نے بالے سے اس کے ہڈے بھائی اٹو کی اس چاندراٹ والی حرکت کا ذکر بھی کیا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ خود بالا بھی اس

معاملے میں کچھ بھی کرنے سے محفوظ ہے کیونکہ اس کی اپنی جان اگو کے ذریعے نکلی تھی۔ البتا اس نے مجھ سے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اگو کا گراری دار چاقو کہیں غائب کر دے گا۔ تو آپی اس شام کے بعد مزید محتاط ہو گئی تھیں اور انہوں نے چھت پر جانا بھی ختم کر دیا تھا۔ طاہر بھائی اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب ان کی پڑھائی اتنی کٹھن ہو گئی تھی کہ انہیں تو آپی کو پڑھانے یا ان کی مدد کرنے کا وقت بھی ذرا کم ہی ملتا تھا۔ البتا اس بات سے خود تو آپی کچھ بھی ابھی سر ہتھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے کسی کتاب پر سرخ پنسل سے نشان لگا کر مجھے بھی طاہر بھائی کے ہاں بھیجا کہ ان سے کہوں کہ ذرا ان سطروں کا مطلب سمجھا دیں یا انتہائی لکھدیں لیکن میں یونہی باہر سے ایک چکر لگا کر واپس آگیا کہ طاہر بھائی تو جانے کی موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپائے بیٹھے ہیں اور میری طرف تو دیکھتے بھی نہیں۔ یہ سنتے ہی تو آپی کے گلاب چہرے کا رنگ کچھ بدلتا جاتا اور ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نبی بھی آجائی ہے اس وقت صرف میں ہی محسوس کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہی بے حد غصہ آ جاتا کہ آخر میں نے ان سے جھوٹ کیوں بولا..... کیا تھا اگر میں واقعی طاہر بھائی کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر ان سے دو لائنوں کی انتہائی لکھوا ہی لاتا لیکن اسی لمحے میراڑ ہن میرے دل کو زور دار جھاڑ پلاتا کہ ”زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں ہے، بھول گئے وہ دن جب اسی طاہر بھائی کی وجہ سے تم اپنا کارڈ تو آپی تک نہیں پہنچا پائے تھے۔ خبردار..... ان دونوں کے دور رہنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔“

لیکن اگر ایسے فضیلے ہمارے ذہن یا دل کی مرضی کے تابع ہوتے تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ابھی میرے چند دن ہی سکون سے گزرے ہوتے کہ پھر ان دونوں کا کہیں نہ کہیں نکراڑ ہو ہی جاتا اور پھر سے چند گلے شکوؤں کے بعد وہ دونوں نہیں کر سکھی رجیشن میں بھلا دیتے اور میں پھر سے کائنوں پر لوٹنے لگ جاتا۔

اس دن بھی ایسا ہی کچھ واقعہ ہوا۔ ہم بچے بڑے میدان میں جمع تھے۔ راجہ ہمیں پتے کھینا سکھا رہا تھا۔ یتاش کے پتوں والا کھیل نہیں تھا بلکہ اس کھیل میں سگریٹ کی خالی ڈبیاں پتوں کا کام دیتی تھیں۔ ہر سگریٹ کے برائذ کا ایک مختلف نمبر ہوتا تھا مثلاً کے۔ ٹو سگریٹ کا پتہ ایک نمبر کا تھا۔ ”بگامارک“ سگریٹ و نمبر کا تھا۔ ”ولزاور یہ اینڈ وائٹ“ پانچ نمبر کے پتے تھے۔ ”کیپشن“ کے دس نمبر تھے۔ اسی طرح پچاس نمبر والی ڈبیا بھی ہوتی تھی۔ ”ایسپیسی“ کے سونبڑ تھے اور ”کیمل“ کے پانچ سو۔

یہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں ان دونوں ہمارے لیے جیسے باقاعدہ کرنی کی حیثیت ہی تو رکھتی تھیں۔ ہم سارا دن اپنے محلے اور اس کے آس پاس سے یہ پتے جمع کر کے اپنے ذمہ میں اضافہ کرتے رہتے۔ جس بچے کے پاس جتنے زیادہ اور بڑے پتے ہوتے وہ اتنا ہی امیر کہلاتا۔ ہم بچے بڑے لوگوں کی طرح ان پتوں کو کرنی کوئی نہیں کی طرح بھنا تھے بھی تھے مثلاً راجہ سونبڑ کی ایسپیسی سگریٹ کی ڈبیا بالے کی طرف پھینکتا اور کہتا ”بالے یار میں ذرا جلدی میں ہوں۔ داؤ لگا ہوا ہے، ذرا الپک کے کسی سے کیپشن کی دس پتیاں پکڑ لا۔“ بالا فوراً ”مارکیٹ“ سے سوکا پتہ بھنا لاتا۔ غریب قسم کے بچے ہاتھوں میں کے ٹو اور بگلا سگریٹ کی ڈبیوں کی ”ریز گاری“ لیے اوہ راہ چھوٹے داؤ لگاتے نظر آتے اور اگر خوش قسمتی سے کسی بچے کے ہاتھ پانچ سو والی کیمل کی پتی یا ایک ہزاری والی ڈائمنڈ سگریٹ کی ڈبیا لگ جاتی تو وہ تو گویا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ان پتوں کی ”بازار“ میں ایسی قلت پڑ جاتی کہ پانچ سو یا ہزاری پتی رکھنے والے ریز گاری کے لیے ہی ترس جاتے اور انہیں مجبوراً کھلے بازار میں اپنا بڑا اپتہ اونے پونے بیچنا پڑتا۔ ان دونوں ہم سب بچوں کی

جیسیں سگریٹ کی ایسی درجنوں خالی ڈبیوں سے بھری رہتی تھیں اور کچھ بچوں نے تو بڑوں کی دیکھا بھی یہ پتے پھیشا بھی کیے لیے تھے۔ وہ بڑی مہارت سے گلی میں آتے جاتے یا بڑے میدان سے گزرتے ہوئے ان پتوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کا کرتب دکھاتے جاتے۔

کھیل کا طریقہ یہ تھا کہ سب بچے دو یا تین کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور ایک بچا اپنی جیب سے پانچ یا دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اسے ہوا میں اچھا لاتا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنی ہتھیلی میں دبوچ کر اسے یوں زمین پر رکھتا کہ باقی کسی کی نظر سے کے اس رخ پر نہ پڑ سکے جو ہتھیلی کے نیچے لکن اور پر کی جانب ہوتا تھا۔ اب باقی بچوں میں سے کوئی ایک اپنی پتوں کی رقم ملا نہیں، پچھا سی یا کوئی چھوٹا پتہ اٹھا کر دوسرے بچے کے اس ہاتھ کی پشت پر رکھ کر داؤ لگاتا جس کے نیچے سکہ چھپا ہوتا تھا۔ داؤ لگانے والا بچہ دوسرے بچے کو اس کی ہتھیلی کے نیچے چھپے سکے کارخ بناتا مثلاً چاند تارہ یا مینار پاکستان، مسجد یا اکاہندس (Head or Tails) اور اگر نیچے چھپے سکے کارخ ہی ہوتا جو پتے لگانے والے بچے نے بتایا ہوتا تو سکہ چھپا نے والے بچے کو اتنی ہی مالیت کے پتے داؤ لگانے والے بچے کو دینے پڑتے تھے اور اگر بوجھنے والا سکے کارخ غلط بوجھتا تو اس کے لگائے ہوئے پتے سکہ چھپا نے والے بچے کے ہو جاتے۔

محلے کے بڑے میدان میں ہمارے پتوں کا کھیل جاری تھا۔ راجہ اس دن کافی ”رق“ ہار چکا تھا اور اب تقریباً فلاش ہونے کے بعد اس نے مجھے اپنے پتے نکالنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا لیکن ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ کافی دیر سے کچھ فاصلے پر اُنہوں اور اس کے چند دوست جن کا علیہ بالکل فلمی بدمعاشوں کی طرح تھا ہمارے کھیل کو وہیں سے کھڑے کھڑے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اُنہوں اور اس کے دونوں دوست آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے سروں پر کب آکھڑے ہوئے اس کی ہمیں خیر ہی نہ ہوئی اور ہم سب تباہ چھلے جب اُنہوں کی کرخت آواز ہمارے کانوں سے گمراہی۔

”اب داؤ لگانا تو سیکھ گیا ہے اب اگلے کی آنکھیں پڑھنا بھی یکھلے۔ اگلے کی آنکھوں میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ نیچے چاند تارہ چھپا ہے یا مینار پاکستان۔“ ہم سبھی کا تو جیسے سارے حسم کا خون ہی سوکھ گیا ہو۔ ہمارے منہ سے آواز تک نہیں نکل پائی۔ اُنہوں نے گذوکے ہاتھ سے سکدے کر ہوا میں اچھا لاؤ پھر ہتھیلی میں دبوچ کر اپنی دوسری ہتھیلی کی پشت پر جما کر چھپا دیا اور پھر اپنے دوست سے پوچھا۔

”کیوں بے سینڈو..... بتا کیا ہے..... چاند یا مینار.....؟“

سینڈو نے اپنے دانتوں کی نہاش کی اور جیب سے دور و پے کا نوٹ نکال کر اُنہوں کی ہتھیلی کی پشت پر رکھا اور یوں لگائی۔

”چاند ہے..... خدا قسم۔“

اُنہوں نے ہتھیلی اٹھائی۔ نیچے سے سکہ مینار کے رخ پر ڈالا۔ اُنہوں نے ایک قبہ لگایا اور دور و پے اپنی جیب میں ڈال لیے پھر اس نے دوسری بار سکہ ہوا میں اچھا لاؤ اور دوبارہ چھپا کر اپنے دوسرے دوست سے پوچھا۔

”چل بھئی سلطانے..... اب تیری باری ہے..... چاند یا مینار.....؟“

سلطانے نے کچھ وقت لیا اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اُنہوں کی آنکھوں میں گھوڑتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

”سلطانے نے بھئی کچھ گوئی نہیں کھیلی..... مینار ہے..... چل ہاتھ کھوں۔“

اُٹو نے ہیقلی ہٹائی تو یونچ سے چاند جھلک رہا تھا۔ اُٹو نے پھر زور دار قہہ لگایا اور پاٹ کا نوٹ سلطانے کی انگلوں سے اچک لیا۔ سلطانہ غصے میں بڑا لایا.....

”دھت تیرے کی..... پر گلتا ہے تو نے یاروں کے ساتھ کوئی گیم کی ہے اُٹو جانی۔“ اُٹو نے سکے دوبارہ گڈو کی طرف اچھال دیا۔

”نمیں میری جان..... کوئی گیم نہیں کھیل میں نے..... صرف تھوڑا سا دماغ چلا یا ہے اپنا اور اس..... یہ سارا بھیجے کا ہی تو کھیل ہے۔“

پھر اُٹو نے راجہ سے کہا کہ وہ سکہ ہوا میں اچھال کر زمین پر اپنی ہیتلی کے نیچے چھپا لے۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ اب ان تین دوستوں نے راجہ کے ہاتھ کے نیچے چھپے سکے پر داؤ لگانا شروع کر دیا۔ کبھی اُٹو جیت جاتا اور کبھی اس کے دوست۔ ہم سب بچے دم سادھے لیکن دل بھی سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے اور ہم سب میں سے کسی کے وہم و مگان میں بھی نہیں تھا کہ ہم سب ان جانے میں اُٹو اور اس کے دوستوں کے ساتھ اس جوے میں شریک ہو چکے ہیں کیونکہ وہ لوگ رقم بھی ہمارے ہاتھ میں دے کر بولی دیتے۔ اُٹو پاٹ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دے کر کہتا ”چل بھی منے..... لگا دے یہ بچی چاند تارے پر۔“

وہاں سے اک کا دوست خنوکے ہاتھ پر میسے رکھتا۔

”جانی..... تو بھی دل بڑا کر کے چپا دے بینارے پر۔“

یہ میری زندگی کا پہلا جو اتحا جو اس روز میں نے انجانے میں کھیلا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے زندگی میں کئی جوئے کھیلے اور ہمیشہ مات ہی میرے مقدر کا حصہ بنی۔ میں شاید پیدا ہی بارے کے لیے ہاتھ الہدا زندگی کا ہر جو اہم اسی چلا آیا لیکن شاید سب سے بڑی مات ابھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم اپنے کھیل میں مشغول تھے کہ اچانک سینڈونے اُٹو کو کہنی مار کر کہا۔

”اوے اُٹو..... تیری تائے گے والی.....“

سلطانے نے بھی سختی سی آہ بھری۔

”قشم شاہ جی کے مزار کی..... یہ تو پناخ ہے پناخ..... پوری کی پوری نشو ہے۔ اپنا تول آ گیا ہے اس پر.....“

ہم بچوں نے بھی چونک کر آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور میرے بیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ جو آپی اپنے تائے کے سے محلے کے پچانک پر اتر کر پیدل گھر کی جانب سر جھکائے روان تھیں۔ اُٹو اور اس کے دوست ہم بچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اس نیچ رستے میں کھڑے ہو گئے جہاں سے وہ جو آپی نے گزنا تھا۔ وہ جو آپی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں سر جھکائے بے خرچی آرہی تھیں۔ سینڈونے انگلی منہ میں ڈال کر ایک زور دار سٹی جھائی۔ وہ شاید اپنے کالج سے واپس لوٹ رہی تھیں کیونکہ ان کے کاندھے پر ان کا بیک ابھی سکے لٹکا ہوا تھا۔ کبھی کھار جب ان کا پریکیٹلک ہوتا تھا تو وہ یونہی کالج سے دیرے سے لوٹتی تھیں۔ میں نے گھبرا کر اوہرہ دیکھا۔ میدان دور تک سسان تھا اور کوئی برا بورڈ ہا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آپی نے کئی کاٹ کر نکل جانا چاہا لیکن اُٹو قدم بڑھا کر ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور سرسراتے لبجھ میں بولا۔

”وو گھڑی کبھی ہماری طرف بھی دیکھ لیا کرو سر کار..... ہم میں کیا کانے جڑے ہیں.....؟ ساری مہربانیاں کیا اس اکیلے پڑھا کوڈا کثر کے لیے ہیں۔“

غالباً اگو طاہر بھائی کا طعنہ دے رہا تھا۔ سینڈ اور سلطانہ زور سے ہے۔ وہ دونوں دزدیدہ نظروں سے ہو آپی کے سراپے کو سر سے پیر تک مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ غصے سے میری نئیوں کی ریگیں ابھر آئیں اور میں نے انجانے میں اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں۔ ہو آپی نے دھیر سے لیکن شدید غصے اور نفرت بھری آواز میں کہا۔

”راستہ چھوڑ و میرا.....“

سلطانے نے دانت نکالے۔

”ارے استاد..... خدا قائم..... یہ تو بوتی بھی ہے..... قربان جاؤں۔“

اب میری برداشت کی حد جواب دے پہنچی، میں بھول چکا تھا کہ میں ایک کم زور سا بچہ ہوں اور ہو آپی کے سامنے تین ہٹے کئے جوان مشنڈے سینڈتا نے کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک کے نینے میں چاقو بھی ہے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے گذو کو زور سے دھکا دیا اور بے تحاشہ ان نئیوں کی جانب سر پر بھاگا۔ میرا ارادہ تھا کہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے جا کر اگو کے پیٹ میں اپنے سر سے گلکاروں گا۔ میری گلکر سے وہ اپنی جگہ سے وہ کم از کم ایک پل کے لیے ہی کسی پرال تو جائے گا اور اسی دیر ہو آپی کے لیے وہاں سے آگے نکل جانے کے لیے بہت ہو گی پھر آگے جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ راجہ میرا ارادہ بھانپ کر زور سے چلایا۔ ”رُک جا آدمی۔“

لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اب رکنے والا نہیں ہوں لہذا وہ بھی پتے پھینک کر میرے پیچے دوڑا۔ وہ بھی بھی مجھے خطرے میں دیکھ کر پیچے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا جا ہے انعام کچھ بھی ہو۔ راجہ کو میرے پیچے بھاگتے دیکھ کر گدھ، نھو اور پوچھی خود کو روک نہیں پائے اور بھی شور چاٹے راجہ کے پیچے بھاگے لیکن میں ان سب سے کافی آگے تھا، میری آنکھوں سے آنسو ٹکنے کو بے قرار تھے، ان غندوں کی یہ مجال کہ وہ میری و جو آپی کا راستہ روکیں؟ میری رفتار تیز ہو گئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں، پیچے سے مجھے راجہ اور باقی دوستوں کے بھاگنے اور چینخے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن اچانکہ ہی مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں پکڑ کر ہوا میں متعلق کر دیا ہو۔ میں خلا میں مغلن اپنی تانکیں اسی چلاتارہ گیا اور کسی نے چند لمحوں کے بعد مجھے والپس زمین پر رکھ دیا۔ میرے پیچے بھاگنے والے راجہ اینڈ کمپنی کا شور بھی یک دم ہی بند ہو گیا۔ میں نے جلدی سے حیرت کے مارے آنکھیں کھول دیں۔ اگو اب بھی وہیں اپنی جگہ اپنے دوستوں سمیت کھڑا تھا اور وہ جو آپی بھی اپنی جگہ موجود تھیں۔ میں فوراً اپنا اور طاہر بھائی کو اپنے پیچے چنان کی طرح سیدھا ایساتا دھپا یا۔ طاہر بھائی نے ہی مجھے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے پکڑ کر اٹھا لیا تھا۔ کچھ فاصلے پر میرے باقی دوست بھی اس طرح رُک گئے تھے جیسے ہم

”برف پانی“ کھلتے ہوئے ایک دوسرے کو بھوکر ”برف“ کہہ کر جہادیتے تھے۔ لگتا تھا طاہر بھائی نے ان سب کو بھی بھوکر برف کہہ دیا ہے۔

چند لمحے طاہر بھائی اور اگو گینگ ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توتا رہا۔ اتنے میں ہو آپی کے گھر کی جانب سے فضلو بابا اپنی لاٹھی میکتے اور رکھانتے ہوئے آتے نظر آئے اور ہو آپی کو دوسرے ہی دیکھ کر چلا۔

”ارے ہو بی..... اتنی دیر کہاں لگا دی..... چھوٹی لہن آپ کے لیے پریشان ہوئی جاتی ہیں۔“

وہ آپی جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ فضلو بابا پورا ماجرا سمجھتی نہیں پائے اور ان کو لیے آگے چل پڑے۔ اُٹو گینگ نے اپنے دانت پیسے اور طاہر بھائی کے جانب بڑھ کر ان کے آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مجھے طاہر بھائی نے پہلے ہی میرا بازو پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔ اُٹو نے طاہر بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”تو اپنی حکمت چلانے کی سوچ بایو۔۔۔ اُٹو کے ساتھ ما تھا بھڑائے گا تو ساری ڈاکٹری بھلا دوں گا۔“
<http://kitaabghar.com>
 طاہر بھائی نے سکون سے جواب دیا۔

”تم اس محلے میں نئے آئے ہو اس لیے شاید یہاں کے رہیت روانج سے واقف نہیں ہو۔ آئندہ اس محلے کی کسی لڑکی کا راستہ کاٹنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ۔۔۔“
<http://kitaabghar.com>

سینڈو نے طاہر بھائی کی بات آدھے میں ہی کاٹ دی اور آگے بڑھ کر ان کے گرد بیان پر ہاتھ ڈال دیا اور جھٹکا دے کر بولا۔
<http://kitaabghar.com>
 ”ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا اوئے۔۔۔ دھمکی دیتا ہے ہم کو۔“

طاہر بھائی نے اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے علیحدہ کیا اور گریبان جھٹک کر بولے۔

”ورنہ، بہت برا ہو گا۔“

وہ تینوں شدید طیش میں آچکے تھے اور قریب تھا کہ تینوں ہی طاہر بھائی سے بھڑجا میں کہ اتنے میں غیاث چھا اور محلے کے چند اور بزرگ عصر کی نماز کے لیے مسجد جانے کے لیے گلی سے میدان کی جانب نکل آئے اور انہوں نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ کچھ گز بڑھ ہے۔ وہ سب جلدی سے ہماری جانب بڑھ آئے اور غیاث چھانے وہیں سے آواز بھی لگا وی۔
<http://kitaabghar.com>

”کیا بات ہے طاہر میاں۔۔۔ سب خیر تو ہے نا۔۔۔؟“

اُٹو اور اس کے ساتھ محلے کے بڑوں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر پدک گئے لیکن جاتے جاتے بھی اُٹو نے دھیکی آواز میں طاہر بھائی کو دھمکی دے دی۔۔۔
<http://kitaabghar.com>
 ”تجھے تو دیکھ لوں گا سا لے حکیم کہیں کے۔۔۔“

غیاث چھا اور باقی لوگوں کے ہم لوگوں تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔ طاہر بھائی نے غیاث چھا کو ٹال دیا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی بس یونہی ایک چھوٹی سی بحث ہو گئی تھی اُٹو سے، لیکن غیاث چھا کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ طاہر بھائی کی بات سے مکمل مطمئن نہیں ہوا پائے تھے اس لیے وہ تک وہاں کھڑے رہے جب تک طاہر بھائی اپنے گھر کے دروازے تک نہیں پہنچ گئے۔

اُٹو اور طاہر بھائی کی یہ پہلی باقاعدہ جھڑپ تھی لیکن اس وقت ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ ایسی آگے چل کر ایک ایسا رخ اختیار کر لے گی کہ ہم سب کی زندگیوں میں طوفان آ جائے گا۔ اس روز محلے والوں کو تو خبر نہ ہو سکی لیکن میں یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ قوآپی اور طاہر بھائی کی نظرؤں میں چھپے پیغامات کو صرف میں نے ہی محسوس نہیں کیا، اُٹو بھی اس راز سے اچھی طرح واقف ہے اور اس روز اُٹو کے تیوروں نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اب یہ از زیادہ دنوں تک راز نہیں رہ پائے گا۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی قربانی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن اسکول میں راججنے مجھے زبردست جھاڑ پائی کہ میں کل شام کیا کرنے چلا تھا۔ میں چپ چاپ اس کی اور بالے کی ڈانٹ سنتا رہا لیکن میں کرتا بھی کیا؟ کوئی ہو آپی کو سمجھ کرے اور میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہوں.....؟ ایسا تو بھی ہونیں سکتا تھا۔ بالے نے بھی اپنے بڑے بھائی کو خوب سست سایں کہ جانے کے ان کی اس مصیبت سے جان چھوٹے گی۔ بالے کا کہنا تھا کہ کل اگر اسے وقت پر اطلاع مل جاتی تو وہ کم از کم سینڈا اور سلطانے میں سے کسی ایک لوگوں کی لیتا۔ بالا کل شام اس ”جائے وقوع“ پر موجود ہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بچ کہہ رہا تھا۔ اسے اگر ہم سب کے ساتھ اپنے بھائی سے بھی لڑنا پڑتا تو وہ بھی نہ چوتکتا۔ اس نے مجھے اور راجہ کو مشورہ دیا کہ اب ہم تینوں کو بھی ایک چاقو خرید کر اپنے بستوں میں رکھ لیتا چاہیے تاکہ اگلی بار ایسا کچھ ہو تو ہم بھی پوری طرح ”صلح“ ہوں۔ ہم تینوں بھی باہم کرتے ہوئے اسکول سے واپسی پر محلے میں داخل ہوئے تو فضلہ بابا نظر آئے جو مجھے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ وہ آپی کا حکم ہے کہ کھانا کھا کر سیدھا ان کے گھر حاضری دوں۔ میں نے بستہ وہیں پر راجہ کے حوالے کر دیا اور خود اسی وقت وہ جو آپی کے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔

”ہو آپی گھر کے صحن میں ہی پھولوں کی کیاری میں اپنے پسندیدہ کالے گلبے کے پوچھے کے پاس آرام کری ڈالے متفکری بیٹھی تھیں۔ وہ گھر کے عام کپڑوں میں ملبوس تھیں، اس کا مطلب تھا کہ وہ آج کا لج بھی نہیں گئی ہوں گی؟ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اٹھیں اور جلدی سے میری جانب لپکیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

”آدمی... تم تمہیک تو ہوں...“ پیشکش

میں ان کی فکر دکھ کر نہیں پڑا۔

”ارے.... مجھے کیا ہوتا ہے..... بھلا چنگا تو ہوں.....“

پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ انہوں نے میرا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور تقریباً ردینے والے لمحے میں بولیں۔

”کل کیا ہو گیا تھا تمہیں..... یہ کیا بے وقوفی تھی ہاں..... جانتے نہیں وہ کتنے لندے لوگ ہیں..... تمہیں کچھ ہو جاتا تو.....؟“

”مجھے غصہ آگیا“ جو کوئی بھی میری ہو آپی کو ستائے گا۔ میں اس سے بھڑ جاؤں گا۔ پھر چاہے جو بھی ہو.....؟“

<http://kitaabghar.com>

”وہ آپی کی آنکھوں میں اب باقاعدہ آنسو آگئے۔“

”نہیں آدمی نہیں..... ابھی تم بہت چھوٹے ہو..... تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے..... تم پہلے خوب پڑھ لکھ کر بڑے ہو جاؤ پھر تمہاری ہو آپی کو کو

کوئی سمجھ نہیں کرے گا لیکن تب تک آدی صرف پڑھائی کرے گا..... اور کچھ نہیں بولو وعدہ..... ”

”فُوآپی نے حسب عادت مجھ سے وعدہ لینے کے لیے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ میں کچھ بچھایا۔ فُوآپی نے روٹھے ہوئے لجھ میں کہا۔

”آدی کی دوست اس سے وعدہ مانگ رہی ہے لیکن وہ وعدہ نہیں کر رہا..... ”

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”اچھا وعدہ..... ”

”فُوآپی مسکرائیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

”پکا والا۔ پکا۔ پورا پکا۔ ”

پھر جب میں نے فُوآپی کو بتایا کہ ان کی مدد کے لیے صرف میں ہی نہیں بلکہ راجہ، گندو، نخو، پوسجھی کیے بعد دیگرے میرے پیچھے بھاگے تھے تو وہ ہلکے سے نہیں دیں اور انہوں نے مجھ سے میرے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کو کہا اور ان سب کے لیے بہت سی ایرانی ”ٹیک“ بدل گم بھی دیں۔ میں نے انہیں ان کے جانے کے بعد اگو اور طاہر بھائی کے درمیان ہوئی مختصری جھپڑ کے بارے میں بھی بتایا۔ اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود ان کے سامنے طاہر بھائی کا ذکر کیا تھا۔ جانے کیوں جب طاہر بھائی نے مجھے دوڑتے ہوئے اچک لیا تھا اور خود اگو کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اسی لمحے سے میرے دل میں ان کے لیے ایک ان جانی سی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ اس دن میں نے شاید یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ فُوآپی کی حفاظت کرنے کی الہیت بھی رکھتے ہیں اور جب تک میں بڑا ہو کر خود فُوآپی کی ڈھال نہیں بن جاتا تب تک کے لیے مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ طاہر بھائی ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

لیکن فُوآپی طاہر بھائی اور اگو کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن کر جانے کیوں بہت زیادہ پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے پہلے مجھے زبانی طاہر بھائی کو پیغام دینے کا کہا کہ وہ اپنی حفاظت کریں اور اگو کی جانب سے ہوشیار ہے کی کوشش کریں لیکن ہمیں زبانی پیغام پر بھی اطمینان نہیں ہوا تو جلدی سے اندر کرے سے اپنی کاپی اور پین اٹھالا کیں اور سفید ورق پر تمیزی سے دو سطہ میں لکھ دیں۔

”آپ ان لوگوں سے ڈور ہی رہیے گا۔ دو ماہ بعد آپ کے فائل ایئر کے امتحانات ہیں۔ خدا کے لیے کسی جھگڑے میں خود کو ملوث نہ کیجیے گا، یہی میری آپ سے انتباہ ہے..... آپ کی شاگرد۔ ”

فُوآپی نے جلدی سے وہ صفحہ کاپی سے علیحدہ کیا اور میرے حوالے کر کے تاکید کی کہ میں گھر جانے سے پہلے خود طاہر بھائی کے ہاتھ میں یہ رقمہ تھما کر جاؤں اور میری زندگی میں یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں نے فُوآپی کا پیغام ٹھیک ٹھیک طاہر بھائی تک پہنچا دیا تھا۔ طاہر بھائی نے رقمہ کھول کر پڑھا اور ہلکے سے مسکرا کر میرے گال کھینچے۔

”اپنی فُوآپی سے کہنا کہ جس کا تم جیسا بہادر دوست موجود ہوا سے دنیا میں کسی سے بھی ڈرنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان

سے کہہ دینا کہ میں احتیاط کروں گا۔“

طابر بھائی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میرے کندھے فخر سے چوڑے ہو گئے۔ طابر بھائی اتنے بڑے بھی نہیں تھے جتنا میں آج تک انہیں سمجھتا رہا تھا۔ بلکہ مج تو یہ ہے کہ اس دن وہ مجھے کافی ”معقول“ شخص نظر آئے۔

ووجہ آپی نے اس دن کے بعد گھر سے اکیلے یا فضلو بابا کے ساتھ لٹکنا بالکل ختم کر دیا۔ پہنچیں انہوں نے گھر میں کیا اعذر پیش کیا ہوا لیکن اب وہ کالج کے وقت اور کالج سے واپسی پر بھی غیاث چچا کے ساتھ ہی نکلتیں۔ یوں اگو کان کے گھر کے ارد گر و منڈ لانا بھی کافی حد تک کم ہو گیا کیونکہ غیاث چچا کے غصے سے بھی واقف تھے۔ وہ تو محلے کے عام نوجوانوں کو بھی گھر کے پاس یا میدان میں خالی اور خواتین کا طریقہ کر خود ان سے پوچھ بیٹھتے تھے۔

”کیوں میاں..... خیر سے کھڑے ہو یہاں.....؟ کوئی کام وغیرہ نہیں ہے کیا کرنے کو.....؟“

اس لیے بھی ”فارغ“، قسم کے نوجوان انہیں گھر سے نکلتے یا محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر خود ہی یہاں وہاں کھک جاتے تھے۔

بہت سے دن یوں بھی گزر گئے۔ ہمارے شماہی امتحان ہو چلے تھے اور طابر بھائی کی اُکززی کا فائل امتحان چل رہا تھا۔ اگو بھی بہت دن سے محلے میں آوارہ گردی کرتے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے ہم نے بھی کچھ اطمینان کی سانس لی۔ لیکن اگلے دن ہی پڑتے چلا کہ ہمارا یہ اطمینان عارضی ہے۔

اس شام بالا بمحضے اور راجہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سینئر گر دھاری مل کی درمیانی بیٹی کلپناء دیوبی ری طرح سے اس پر عاشق ہو چکی ہے لیکن چونکہ وہ ایک انتہائی ”مشرقی“ لڑکی ہے اس لیے وہ خود اپنے منہ سے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس وقت مجھے اور راجہ کو اس کی باتیں سمجھیں نہیں آ رہی تھیں کیونکہ اس وقت میں اور راجہ دونوں ہی ”مشرقی“ لڑکیوں کے اوصاف سے ناواقف تھے۔ بالے نے اس دن میرے متعلق بھی یہ فتوی صادر کر دیا تھا کہ میں آگے چل کر انتہائی سچا عاشق ثابت ہوؤں گا کیونکہ اسے میرے اندر وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی تھیں جو اس ”منصب شاہی“ کے لیے ضروری ہو سکتی ہیں۔ ابھی ہم بالے سے ”علم و دانائی“ کا یہ عظیم خزانہ سینئر میں مصروف تھے کہ اُنہوں نے دوستوں سمیت محلے میں داخل ہوا۔ ہم تینوں نے اگو کو یوں آتے دیکھ کر گھبرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا لیکن اگو گینگ نے ہم بچوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بس ایک اچھتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ بچ پوچھتے تو یہ دیکھ کر مجھے اور راجہ کو ذرا سی بیکی کا احساس بھی ہوا، گویا اگو اور اس کے دوست ہمیں کسی کھاتتے میں شماری نہیں کرتے تھے؟ اور کچھ نہیں تو انہیں ایک لمحے کے لیے رک کر مجھے اور راجہ سے یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ اس دن ہم ان کی طرف کیوں بھاگے تھے۔ ہم نے بالے کو ان کی نوٹہ لینے کے لیے بھیجا۔ بالا بچپنی جانب سے دیوار ناپ کران کے بالکل بچپنی جانب کی دیوار کے پیچھے جا چھپا اور واپس آ کر اس نے جو کچھ نہیں بتایا اسے سن کر میرے اور راجہ کے ہوش اڑ گئے۔

وہ تینوں طابر بھائی سے لڑنے کے ارادے سے محلے میں آئے تھے۔ اگو کا ارادہ یہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہی طابر بھائی کو وہ تینوں بنے خبری میں وہر لیں گے اور ان کو اچھی طرح سبق سکھانے کے بعد وہ تینوں شہر سے باہر جانے والی کوئی بھی بس یا ٹرین یا کوئی کرپچھ دن کے لیے روپیش ہو جائیں گے۔ ہم تینوں دم سادھے بیٹھے طابر بھائی کے گھر کے دروازے کی جانب دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں گڑ گڑا کر یہ دعا مانگتے رہے کہ طابر

بھائی گھر سے نہ لکھیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی نے بھی خود جا کر طاہر بھائی کو گھر سے نکلنے سے منع کیا تو وہ ضرور باہر آئیں گے لہذا اس وقت ہم سوائے دعا مانگنے کے اور کچھ کربھی نہیں سکتے تھے۔

آخر ہماری دعا میں رنگ لا میں اور طاہر بھائی شاید اپنے اگلے دن کے پرچے کی تیاری میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی فرستہ ہی نہیں تھی۔ انہوں اور اس کے دوست پہلے تو اتنا کر سکریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے پھر ٹنک آ کروہ بڑا تھے ہوئے وہاں سے چل پڑے لیکن ان کے ارادوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع ملنے پر دوبارہ یہ کوشش ضرور کریں گے۔

راجہ نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے یہ سب کچھ قوآپی کو بتا دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی بہتر ترکیب ہو اس مصیبت سے نپٹنے کی۔ قوآپی کے نام پر بالے نے مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر راجہ سے کہنے لگا ”میری باتوں پر قوم دونوں خوب ہنسنے ہو۔ پر یہ آدمی خود جو بھی کرتا پھرے، اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔“

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>
میں نے حیرت سے بالے کو دیکھا ”کیوں.....؟ میں نے کیا کیا ہے؟“
بالے نے سختی سی آہ بھری اور راجہ کی طرف دیکھا۔

”لوحی..... یہ ہم سے پوچھ رہا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے..... سچ بول راجہ..... کیا تجھے بھی نہیں پڑتے.....؟“

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>
راجہ کی سمجھ میں شاید بالے کی بات کچھ کچھ آگئی تھی لہذا اس نے ہنس کر بات نالے کی کوشش کی۔
”جانے دے یا بالے..... یہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے.....“ لیکن اب میں اڑ گیا۔
”نہیں نہیں..... مجھے بھی تو پتہ چلتے ہیں نے کیا کیا ہے.....؟“

راجہ نے بات نالے کی بہت کوشش کی لیکن میں بالے کی جان کو آگیا کہ جب تک وہ بات نہیں بتائے گا ہم تینوں میں سے کوئی بھی گھروپس نہیں جائے گا، ورنہ دوستی ختم۔ آخر کار بالے نے دھیرے سے بات کھول دی دی۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>
”سچ بتا آدمی..... تجھے تیری قوآپی کیسی لگتی ہے.....؟“
میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
”بہت اچھی.....“

راجہ اور بالا دونوں ہی میرے انداز پر ٹھلکھلا کر فرش دیئے۔
بالے نے راجہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس..... ہم بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ تجھے تیری قوآپی دنیا میں سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اتنی کہ تو اس کی خاطر تین جوان کڑیل بندوں سے لڑنے کو بھی تیار ہو گیا تھا تو پھر جا کر اپنی قوآپی کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہیں.....؟“
میں بالے کی بات سن کر جھینپ سا گیا۔

”اے..... اس میں بتانے کی کیا بات ہے؟ وہ تو خود پہلے ہی سے جانتی ہیں کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

بالے نے روز سے اپنا ماتھا پہبیٹ لیا۔

”اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بے وقوف جب کوئی لڑکی اچھی لگتی ہے تو اسے خاص طور پر بتانا پڑتا ہے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ اس دن ”کبڑا عاشق“، دیکھی تھی ناراحت تاکیز میں..... رنگی لالے بے چارہ صرف اس لیے مارا جاتا ہے کہ وہ وقت پر شہزادی کو بتانیں پاتا کر وہ اسے اچھی لگتی ہے۔“

اب مجھے بالے کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن اب بھی میں پوری طرح اس کا مطلب سمجھنیں پایا تھا۔ بالا بھی مجھے یہ ”اہم نکتہ“ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں بڑے بھی فاران مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئے اور مجھے فوراً اپنے ساتھ گھر چلنے کو کہا کیونکہ ابا مجھے کوئی بڑی خوشخبری دینا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے اٹھ کر ان کے ساتھ چلانا پڑا۔ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ ایسی کون سی خوشخبری ہے جو ابا مجھے دینا چاہتے تھے۔ نئی سائیکل دلوانے سے تو انہیں نے پچھلے میں ہی منع کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مجھے ان کی سہرا بسائیکل پر ہی اپنا ہاتھ صاف کرنا چاہیے جبکہ مجھے ان کی پرانی سائیکل محلے میں نکالنے سے ہی بڑی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی سائیکل اتنی اوپری تھی کہ میں اس کی گدی پر بمشکل ہی پہنچ پاتا تھا اور گدہ می پر بیٹھنے کے بعد پاؤں پیدل تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس سائیکل کو چلا کر محلے میں سب کے مذاق کا نشانہ بننے سے بہتر تھا کہ میں بنا سائیکل ہی گزارہ کروں۔ انہی سوچوں میں گم میں اور بھیا گھر میں داخل ہوئے تو ابا مجھن میں ہی انگور کی بیتل کے نیچے شہلتے ہوئے مل گئے۔ ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی جا رہی تھی اور ہاتھوں میں چند کاغذ تھے جنہیں وہ بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے امی کی جانب پلٹ کر خوشی سے کہا۔

”لو بھی..... آگیا تمہارا فوجی بیٹا۔“

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن صحن میں تو اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں شک نے پیر پھیلائے۔ ”ہوں..... اس کا مطلب ہے اتنے دن تک ان سب نے مجھ سے یہ بات چھپا کر رکھی تھی کہ ابا کا ایک بیٹا اور بھی ہے جو فوجی بھی ہے.....“

لیکن کچھ ہی لمحوں میں یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ ابا نے فوراً مجھے پیار سے گلے لگایا۔ مجھے تھوڑی سی حرمت بھی ہوئی کیونکہ ابا نے کبھی یوں ”کھل“ کر مجھے پیار نہیں کیا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ میرا دا خلہ کی فوجی کالج (کیڈٹ کالج) میں ہو گیا ہے۔ اتنے ہفتوں سے ان کی جس بچاگ دوڑکو میں بڑے بھیا کے لیے سمجھ رہا تھا وہ دراصل ان کے لیے نہیں بلکہ میرے داخلے کے سلسلے میں تھی۔ عمارہ، بڑے بھیا اور امی سب ہی مجھے مبارکباد دے رہے تھے، پیار کر رہے تھے، خوشی سے شوچا رہے تھے لیکن میں گم سما کھڑا ابا کے ہاتھ میں کپڑے اپنے داخلے کے کاغذ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ میری قید کا پروانہ ہو لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے مجھے خوب بھی کیڈٹ کالج کی بورڈنگ میں جانے، فوجی لباس پہننے اور پریڈ کرتے ہوئے سلیوٹ کر کے گزرنے کا جنون تھا۔ میں اخباروں سے ایسے کیڈٹس کی تصویریں کاٹ کر اپنی کاپیوں پر چپکا تارہتا تھا۔ خاص طور پر لڑاکا جہاز اور پاکٹ تو میری کم زوری تھے۔ ابا نے میرے اسی شوق کو دیکھتے ہوئے مختلف جگہوں پر درخواستوں کے انبار بھجووار کئے تھے اور آج وہ سال بعد ان کی محنت رنگ لے ہی آئی تھی۔ ابا کی اپنی تجنواہ تو اتنی نہیں تھی کہ وہ میرے بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے لیکن میرا دا خلہ حکومت کے

خرچے پر منظور ہو گیا تھا۔ اب اسی بے تحاشا خوشی کی وجہ بھی بھی تھی کہ میں اپنے خاندان کا پہلا بچہ تھا جسے اتنا بڑا "اعراز" حاصل ہوا تھا۔ سب خوش تھے، میری دشمنوں دھام سے "خصتی" کے منصوبے بنا رہے تھے لیکن کیوں جانے کیوں خود میرا اپنادل ڈوباجار ہاتھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی سوہان روح تھا کہ مجھے اپنے گھر، امی اپنے دوستوں اور اپنے محلے کو چھوڑ کر سینکڑوں میں دور ایک انجانی جگہ پر رہنا پڑے گا۔ اس لمحے میری اداسی کایا یہ عالم تھا کہ مجھے عمارہ اور بڑے بھیا سے دور جانا بھی عذاب لگ رہا تھا۔ مجھے ان دونوں پر بھی نوٹ کے پیار آرہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی تو صرف ایک بار یہ ابا کے سامنے کہدے کہ "نہیں، ہم اپنے آدمی کو اتنی دور پڑھنے کے لیے نہیں بھیجیں گے۔ ہم اس کے بغیر اس ہو جائیں گے"، لیکن افسوس ان میں سے کسی تک بھی میرے دل کا یہ پیغام نہیں پہنچ سکا۔

اور پھر وہ آپی.....؟ وہ بھی تو نہیں رہ جائیں گی۔ میں ان کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا وہاں.....؟ اور پھر آج کل تو انہیں سب سے زیادہ میری "ضرورت" بھی تو تھی۔ اگر میرے پیچھے اس بدمعاش اگونے پھر کوئی گزبر کرنے کی کوشش کی تو.....؟ نہیں نہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے ذہن نے اسی لمحے اس "کیڈٹ کالج کی مصیبت" سے جان چھڑانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ راجہ کو "اچانک پیار پڑنے" کے بہت سے نئے معلوم تھے۔ میں نے سوچا کہ راجہ سے کہوں گا کہ کوئی ایسا نہ بتائے جس سے میں کم از کم تین چار ہفتوں کے لیے مستر پر جا پڑوں۔ پھر مجھے دادی جان کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ان کے سامنے جا کر خوب رونا دھونا ذالوں گا کہ یہ سب مل کر آپ کے سب سے لاذلے پوتے کو آپ سے دور کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ دادی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں وہ تو میری جدائی تو بالکل برداشت نہیں کر پا سکیں گی.....؟

ہاں یہ تھیک ہے۔ مجھے کل ہی دادی کے گھر جا کر انہیں اپنی مظلومیت کی داستان سنادیں چاہیے۔

میرا ذہن ساری رات اسی قسم کے منصوبے بناتا رہا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے اپنے گھر کی اور آس پاس کی ہر چیز پر اتنا نوٹ کے پیار آنے لگا تھا کہ میں نے آدمی رات کو دو مرتبہ اٹھ کر اپنے پرانے لہتے کو چوم کر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

صحیح ہوئی تو سارے محلے میں یہ چرچا عام تھا کہ آدمی کا داخلہ ملک کے سب سے بڑے اور اعلیٰ کیڈٹ کالج میں ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے استانی خالہ امی کو مبارکباد دینے آئیں اور پھر تو محلے داروں اور ابا کے جانے والوں کا ہمارے رشتہ داروں سمیت تانتا بھی بندھ گیا۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دادی کے گھر جاتے ہی ان کے گلے میں باہمیں ذال کرٹوے بہانا شروع کر دیے کہ "اب تو آپ کے آدمی کو دیکھنے کو آپ کی آنکھیں ہی ترس جائیں گی۔ خوب جی گھر کے مجھے دیکھ لیں کیونکہ چند دنوں میں مجھے یہاں سے بہت دور چلے جانا ہے۔"

دادی نے ہر بڑا کرجلدی سے اپنا پاندنان بن دیا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے تو آدمی..... کہاں جا رہا ہے تو اپنی دادی کو چھوڑ کر۔" میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً اپنے چہرے پر ازالی معصومیت اور آنکھوں میں موٹے آنسو بھر کر دادی کو اپنے داخلے کے بارے میں بتایا کہ کس طرح گھر میں میری روائی کی پر جو شیخیاں بھی شروع ہو چکی ہیں اور تو اور میرے لیے تو انہوں نے ایک نیا سوت کیس بھی خرید لیا ہے جس میں میری وہ ضرورت کی چیزیں بھری جا رہی ہیں جو بورڈنگ والوں نے اپنے خط میں لانے کو لکھی تھیں۔ دادی کا پارہ حسب توقع فوراً ہی آسمان کو چھوٹے لگا۔ انہوں نے فوراً مانگی کو حکم دیا کہ جا کر میرے ابا کو دادی کے حضور

فوراً پیش ہونے کا حکم نہ آئے۔ چند ہی لمحوں بعد ابا بھی اپنی سائیکل گھینٹے ہوئے دادی کے گھر آپنچے۔ دادی نے انہیں دیکھتے ہی واویلا شروع کر دیا کہ ”انہیں ذرا خیال نہ آیا مجھ معموم کو گھر سے اتنی دور بھیجنے کا سوچتے ہوئے؟“ اور یہ کہ ”خبردار جو کسی نے آدمی کو فوجیوں کے اسکول بھیجنے کی بات بھی کی تو، پتہ نہیں وہاں فوجی بچوں سے کیسی مشقت کرواتے ہوں گے؟ اور ہمارا آدمی تو پہلے ہی اتنا نازک سا ہے۔ وہاں اس کے کھانے پینے کا دھیان کون رکھے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ابا خاموشی سے دادی کی تمام تقریر سنتے رہے پھر انہوں نے دادی کو دھیرے دھیرے بورڈنگ کی تمام خصوصیات گوانا شروع کیں تو لگاتار آدھا گھنٹہ بولتے ہی چلے گئے اور پھر آخر میں انہوں نے وہ ترپ کا پتہ بھینکا جو ہمیشہ سے دادی کی کم زوری تھا۔ انہوں نے انتہائی جذباتی بجھے میں دادی کو یہ بات یاد دلانی کہ آج اگر محروم دادا زندہ ہوتے تو وہ اپنے پوتے آدمی کو اتنے بڑے ادارے میں داخلہ ملنے پر پورے شہر کا منہ میٹھا کروادیتے اور ایک دادی ہیں کہ بجائے فخر کرنے کے خواہ اپنے باتھوں ہمارے خاندان کو ملنے والے اتنے بڑے اعزاز سے محروم کرنا چاہتی ہیں۔ دادا کا ذکر آتے ہی دادی کا سارا غصہ جھاگ کی طرح میٹھے گیا اور وہ ابا کو یاد دلانے لگیں کہ دوسرا جنگ عظیم کے وقت جب لوگ گاؤں میں چھپتے پھرتے تھے کہ گورے انہیں ”لام“ پر نہ بھیج دیں، دادا نے خواہ اپنے آپ کو بھرتی کے لیے پیش کر دیا تھا۔

میں دور بیٹھا کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور دکھاوے کے طور پر ابا کی سائیکل کی چین ٹھیک کر رہا تھا۔ دادی کی رام کہانی سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ میں انہیں کیا سمجھا کر آیا تھا اور وہ کس زمانے کے قصے لے کر بیٹھ گئیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں دادی خود ابا کو مشورے دے رہی تھیں کہ آدمی کے لیے آم کا اچار تو وہ خود اپنے با تھے سے بنا کر بھیجا کریں گی۔ جانے وہاں اسکول میں فوجیوں کو آم کا اچار بناانا آتا ہی ہو گایا نہیں؟ اور باقی تمام مفتوحی مرتبے وغیرہ تو ہمیشہ ان کی الماری میں پہلے سے تیار ہی پڑے ہوتے تھے۔ وہ سب تھوڑے تھوڑے پیک کر دیں گی جنہیں ابا میرے جانے سے پہلے ضرور اٹھاتے جائیں۔

دادی سے مزید کوئی امید باندھے رکھنے کا اب کوئی فاکدہ نہیں تھا کیونکہ وہ پوری طرح ابا کے ”مجھانے“ میں آچکی تھیں اور اب میری آخری امید راجہ کے کار آمد نہیں تھے۔ راجہ نے میری کیڈٹ کالج جانے کی بات سن رکھی تھی اور وہ پہلے ہی سے حواس باختہ تھا۔ بالے اور خواہ ایک طرف بیٹھے میری عقل کا ماتم کر رہے تھے کہ انہوں نے مجھ سا بے وقوف آج تک نہیں دیکھا جو خود اپنی آزادی کا دشمن ہو۔ گذرا اور پچھنے ایک دوسرا ہوش رہا خبر سن کر میری رہی سہی سانس بھی کھٹکھٹی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ”بادشاہ“، ”زارع“ سے کپی خبر ملی ہے کہ ایسے بورڈنگ میں غلطی کرنے والے بچوں کو آدمی رات کو صرف ایک نیک میں میدان میں کٹرا کر دیا جاتا ہے۔

میں نے فوراً راجہ کو زور سے گلے گا کر بھیجنی لیا اور بھیگل آنکھوں سے اپنے تمام دستوں سے الٹا کی کہ خدا کے لیے مجھے ان ”وحشیوں اور جنگیوں“ کے چکل میں نہ جانے دیں۔ ان سب کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور ان سب نے مل کر مجھ سے وعدہ کیا کہ ومرتے مر جائیں گے لیکن میرا ”مستقبل“ یوں بر بادیں ہونے دیں گے۔ راجہ نے جلدی مجھے فوری بخار چڑھنے کے چند آزمودہ نہیں بتائے جو وہ اسکول سے چھٹی کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا مثلاً برف کا بڑا سائیکلزادی منٹ تک سر پر رکھنا۔ آدمی رات کو اٹھ کر بخشنڈے پانی کی پوری بالائی اپنے اوپر انٹھیا، گھروالوں سے

چھپ کر رات کو نیم گرم پانی سے نہا کر جلدی سے کمرے میں آکر پوری رفتار سے پکھا چلا کراس کے نیچے صرف ایک تو لیے لپیٹ کر سو جانا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یکے بعد دیگرے یہ تمام نئے آزمائیں لیکن ایک دو دن بخار میں تینے کے بعد میں بھلا چنگا ہو جاتا اور اب تو ویسے بھی ایک دو مرتبہ بخار چڑھنے کے بعد میری خصوصی دیکھ بھال کرنے لگی تھیں لہذا چھپ کر نہ بھی مشکل کریں سب کرتا جا رہا تھا۔ مجھے مستقل پیار رہنے کا طریقہ نہیں مل پا رہا تھا اور دن تھے کہ پرانا کراڑے جا رہے تھے۔ میرے سامان کا سوٹ کیس بھرتا جا رہا تھا۔ میرے لیے نئے کپڑے بنوائے جا رہے تھے۔ نئے جوتے، نیا ٹوٹھ برش، نیا ٹوٹھ پیٹھ اور وہ بھی صرف میرے لیے جبکہ اس سے پہلے میری، عمارہ اور بڑے بھیا کی ایک ہی ٹیوب ہوتی تھی اور ہماری اس پر خوب لڑائی ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ ٹیوب رات ہی کو چھپا دیا کرتا تھا۔ نئی گھنی، نیا شیشہ، نیا جوتا پاش کرنے والا برش اور پیٹھ نہیں کیا کیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں خوشی سے پھٹت ہی جاتا اور ساری رات اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے جا گتا رہتا کہ کہیں عمارہ اس میں سے کوئی چیز چرانہ لے لیکن ان دونوں میری راتوں کی نیند جدائی کے احساس سے ہی اڑی ہوتی تھی۔ ساری رات میں بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔ لمحہ بھر کو آنکھ لگ بھی جاتی تو خواب میں میں اپنے آپ کو صرف ایک نیکر میں ایک بڑے سے میدان میں کھڑے پاتا اور فوراً ہر بڑا کراٹھ بیٹھتا۔ یہاں میرا پریشانی اور اداسی سے یہ حال تھا کہ میری بھوک، پیاس اور نیند کبھی اڑپکے تھے اور دوسرا جانب قواؤ آپی تھیں کہ انہیں جب میرے بورڈنگ میں داخلے کا پتہ چلا تو اسی سے یہ حال تھا کہ گھر دوڑی چلی آئیں۔ غیاث بچا بھی ان کے ہمراہ تھے جنہوں نے ابا کو بہت مبارک بادی اور مجھے بھی خوب پیار کیا۔

قواؤ آپی مجھے اپنے ساتھ ہی واپسی پر اپنے گھر لے گئیں۔ شاید انہوں نے میرا ترا ہوا چہرہ اور اداسی محسوں کر لی تھی۔ وہاں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیڈٹ کالج میں پر دل سے خوش نہیں ہوں اور میں یہیں رہ کر پڑھنا چاہتا ہوں اپنے سب دوستوں کے ساتھ اور قواؤ آپی کے پاس..... میری بات سن کر قواؤ آپی کسی گھری سوچ میں پڑ گئیں۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے انہیں وہ سب کچھ سن کر شدید صدمہ ہوا ہو۔ کچھ دیر ماہول پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر قواؤ آپی دھیرے سے بولیں۔

”آدمی..... تم جانتے ہو کیڈٹ کالج میں پڑھنے کا موقع پورے ملک میں سے صرف چند بچوں کو ہی ملتا ہے۔ مجھے اپنے لڑکا نہ ہونے کا افسوس صرف ایک اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ میں لاڑکی ہونے کی وجہ سے کیڈٹ کالج نہیں جا پائی۔ اگر میں لاڑکا ہوتی تو کیڈٹ بننے کے لیے کچھ بھی کر جاتی کیونکہ مجھے کیڈٹ بے حد پسند ہیں جب مجھے پتہ چلا تھا کہ میرا دوست آدمی کیڈٹ کالج جا رہا ہے کیڈٹ بننے کے لیے تو تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر خوش ہوئی تھی صرف یہ سوچ کر کہ اب میرا آدمی کیڈٹ یونیفارم میں اپنی بڑی سی تصویر مجھے بھیجے گئے میں اپنے کمرے میں لگاؤں گی اور اپنی سب دوستوں پر رrub جماؤں گی کہ دیکھو..... یہ پیارا سا اسارت کیڈٹ میرا دوست آدمی ہے..... لیکن تم نے تو میرے سارے خواب ہی توڑ دیئے..... چلو خیر ہے..... میں نے تو سوچا تھا کہ آدمی کیڈٹ بن جائے گا تو محلے کے ان بدمعاشوں کی بھی ہمت نہیں ہو گی اس کی قواؤ آپی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی..... لیکن..... اب اور کیا کہوں..... میں جس میں تمہاری خوشی.....“

قواؤ آپی تو یہ سب کچھ کہ کر چھپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں لیکن مجھے ایک بہت بڑی مشکل میں چھوڑ گئیں۔ قدرت نے مجھے کیڈٹ بن کر قواؤ آپی کے قریب آنے کا ایک بہترین موقع فراہم کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ کیڈٹ بن کر میں طاہر بھائی کا پتہ آرام سے

کاث سکوں گا لیکن ان سب کو جھوڑ کر جانا بھی تو ایک بہت بڑا اور سب سے کڑا امتحان تھا۔ میں وہیں ڈوآپی کے برآمدے میں سر جھکائے جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ برآمدے کی ساری ڈھونپ سرک کر چھپت کی منڈر یتک چلی گئی تھی اور شام کو اپنے گھروں کی جانب لوٹنے ہوئے پرندوں کی چکار سے آنکھن گو نجتے لگا تھا۔ میرا جسم شام کی سردی سے کپکا نے لگا تھا۔ ڈوآپی اپنے کمرے سے کسی کام سے باہر نہیں تو مجھے ابھی تک وہیں بیٹھنے دیکھ کر چونکہ ہی کیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ارے آدی..... تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو..... مگر کیوں نہیں گئے.....؟“

میں نے نظر میں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ڈوآپی نے بڑی سی کالی شال پیٹ رکھی تھی جس میں حسب معمول ان کا گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

کتاب گھر کی پیشکش

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... میں کیڈٹ کالج جاؤں گا پڑھنے کے لیے۔“

خوشی سے ڈوآپی کا چہرہ کھل اٹھا اور انہیوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے سارے بال بکھیر دیئے اور زور دار نعرہ لگایا ”آدی زندہ باد۔“ میں اور وہ جو ڈوآپی زور سے نہ دیئے۔ ساری کائنات ہمارے ساتھ ہی نہ پڑی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

مقید خاک

ساحر حمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول..... مقید خاک..... سر زمین فراعن کی آنغوں سے جنم لینے والی ایک تحریر خیز داستان۔

ڈاکٹر شفیل ظفر:- ایک بارث اسپیشلٹ، جو مردہ صد یوں کی دھرنے کیں ٹوٹنے لکھا تھا..... یوساف بے:- وہ سائز ہے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... یوسا:- ایک حرمان نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مریقش:- اسکی روح صد لاوا، سے ۲۱، کرحد، خاک، میں مقید تھی، شلن، را، ۷۰، بے بھی:- اک، رائے، ۷۰، پیٹکٹ، را، صد، روا، رائے، ۷۰، کا، تباش تھی..... ص ۲:-

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا الوداع

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

رجہ، بالا، گندو، نخواور پو، سب ہی دم سادھے کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نے کیٹھ کالج جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم سب کا لوٹی کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب کھڑے قادر عاما کے آلوچوں کے ٹھیلے کے ساتھ لگے لکڑی کے بیچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ان کی پیٹیں اور جچ یونہی سا کت رہ گئے تھے۔ ٹھیلے پر گئے ریڈ یو سے عالمگیر کی آواز فضائیں تان بھیر رہی تھیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

"یہ شام اور تیرناام..... دو نوں لکھنے ملتے جلتے ہیں.....

تیرناام نہیں الوں گا..... بس تجھ کو شام کہوں گا....."

لیکن یہ شام میرے دوستوں کے مزاج سے بالکل مختلف ثابت ہو رہی تھی۔ شام بہت خوب صورت تھی لیکن ان سب کے چہرے اترتے جا رہے تھے۔ خود میرے دل کے اندر بھی اداہی کا طوفان اندر ہاتھا لیکن میں نے بڑی مشکل سے اس طوفان کو اپنے چہرے تک آنے سے روکا ہوا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو یہ سب میری جان کو آجائیں گے۔ بالآخر پوکے منہ سے خرختی سی آوازنگی۔

"لیکن..... یہاں پیچھے ہمارا کیا ہو گا۔ سالانہ امتحانات میں بالے اور راجہ کو نقش کون کروائے گا.....؟ اور ابھی جو نئی کرکٹ ٹیم بنائی ہے اس

کو کون سنجالے گا۔ سائیکل کی رلیں کس سے لگائیں گے۔"

میرے پاس ان کے ان سب سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس میں انہیں اتنا ہی بتا پایا کہ دو دن بعد ابا مجھے شام کی گاڑی سے لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ کل اسکوں میں میرا آخری دن تھا۔ مجھے اپنے ہیڈ مارٹر سے ایک ٹھنڈیت لینا تھا کہ میری اپنی چھٹی جماعت میں پوزیشن انہی اچھی

تھی کہ میں با آسانی سالانہ امتحانات پاس کر کے ساتوں جماعت میں جا سکتا تھا۔ کیٹھ کالج میں مجھے ساتوں جماعت میں داخلہ ملا تھا۔

میں سر جھکائے ان سب کی جھاڑستارا ہا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں بھیکتی گئیں اور پھر سب سے پہلے راجہ نے میرے آنسو دیکھے اور وہ جلدی

سے اپنی پیٹ پھینک کر اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

"اوے آدی..... گدھے..... روکیوں رہا ہے؟"

راجہ کی بات سنتے ہی میرے اندر کے سیالب کا باندھ ٹوٹ گیا اور میں اسے گلے گلے کر پھوٹ پھوٹ کر روپڑا۔ بس پھر کیا تھا پھر تو یہ کے بعد

دیگر راجہ اور باقی سب بھی میرے ساتھ ہی روئے گے۔ قادر مانے ہم سب کو یوں کورس میں روئے دیکھا تو وہ گھبرا کر جلدی سے بھاگتے ہوئے

ہماری جانب آیا۔

”اوے کھوتو..... روکیوں رہے ہو..... پیسے نہیں ہیں تو خیر ہے..... موجاں کرو..... پیسے تم کھوتوں سے اچھے تھوڑی ہیں.....؟“

قادرے کی بات سن کر ہم سب لپکتے آنسوؤں سمیت کھلکھلا کر فرش پڑے۔ دور پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبتا سورج بادل کی اوٹ سے نکل کر ہمیں دیکھ دیا اور پھر غروب ہو گیا۔

اگلے دن میں اسکول میں اپنے تمام ہم جماعتوں اور اساتذہ سے فرد افراد مل کر ان سے رخصت لیتا رہا۔ میرے سارے استاد میرے داخلے سے بے حد خوش تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے توصیح ترانے کے بعد اسی میں مجھے اٹیچ پر برا کر سب کے سامنے شاباش دی کہ میں نے ان کے اسکول کا نام روشن کر کے ان سب کا سرفخر سے اونچا کر دیا ہے۔ حق ہے کہ ہم اپنا سرکش کر رہی اپنوں کا سارا اونچا کر سکتے ہیں۔ اسکول میں ہی میں نے آخری مرتبہ اپنے پیارے ڈیک پر بیٹھے بیٹھے ہو آپی کے لیے ایک کارڈ بھی بنایا جس میں ایک کیڈٹ جھنڈے کو سلامی دے رہا ہوتا ہے۔ اسی کا رڈ کے نیچے میں نے صرف دو جملے لکھے ”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں..... آپ کا آدمی۔“

یہ مشورہ راجہ کا ہی تھا کہ مجھے کیڈٹ کا لج سے روائی سے پہلے و جو آپی کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دینا چاہیے تاکہ میری غیر موجودگی میں اور میرے واپس آنے تک طاہر بھائی یا کوئی اور انہیں رجھانے کی کوشش کرے بھی تو کامیاب نہ ہو سکے۔ ویسے تو وہ جو آپی نے آج دیر شام کو مجھے اپنے گھر آنے کا کہا تھا تاکہ وہ مجھے وہ ساری چیزیں اور تھنے دے سکیں جو انہوں نے میرے کیڈٹ کا لج جانے کے سلسلے میں جمع کر کی تھیں مثلاً ”انکل سرگم“ اور ”ھیگے“ والے کٹ آؤٹ، ”نوئی پا“ کی شکل والی جیو میسری، رنگوں کا بڑا اساؤٹ، ہیک چیوگم کا پورا پیکٹ اور پیٹھیں ایسی لکتی اور بہت کی چیزیں لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی و جو آپی سے جا کر مل کر اپنے ”دل کی بات“ انہیں نہ دلوں گا کیونکہ راجہ کہتا تھا کہ ایسے معاملات میں دیر اچھی نہیں ہوتی لیکن مجھے دیر ہو ہی گئی۔ گھر پہنچا تو تمام محلے کی عورتیں ”میری بلا میں“ لینے کے لیے ہمارے صحن میں جمع تھیں۔ بھی کچھ نہ کچھ میرے لیے لے کر ہی آئیں تھیں۔ ان سب سے نپتے نپتے اور اپنی ”بلائیں“ دیتے دیتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ گھر میں ایک ہنگامہ سماچا ہوا تھا۔ میرے کل کے جانے کے سلسلے میں اور سفر کے لیے پکوان بنائے جا رہے تھے۔ امی نے شروع میں تو کافی ہمت دکھائی تھی لیکن اب جب میرے جانے کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی تو ان کی آنکھیں بات بے بات بھینگنے لگی تھیں۔ صبح سے جانے لکتی مرتبہ چھپ کر روچکی تھیں۔ انہوں نے آج تک کبھی مجھے اپنے آپ سے ایک رات کے لیے بھی جدا نہیں کیا تھا اور کہاں آج انہیں پورے چھسال کے لیے مجھے بورڈنگ بھیجنا پڑ رہا تھا۔ ابا آتے جاتے انہیں ان کی ہمت بندھی رکھنے کی تاکید کر رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں کسی نہ کسی بہانے چھک ہی پڑتی تھیں کیونکہ میں ان کا سب سے نازک مزانج پچھا اور وہ جانتی تھیں کہ جس جگہ مجھے بھیجا جا رہا ہے وہاں کی زندگی اس قدر رخت اور کھر دری ہے کہ مجھ جیسا ناز نعم میں پلا ان کا ”شہزادہ“ وہاں جا کر بالکل ہی کملہ جائے گا۔ ان کا بس چلتا تو شاید آخری وقت میں مجھے روک ہی لیتیں لیکن ابا کے غصے کے خوف سے وہ دل پر پھر رکھر کر چپ تھیں۔

خدا خدا کر کے مبارکباد دینے اور مجھے الوداع کہنے والوں کا جھوم جھٹا تو میں نے جلدی سے اپنے بنتے سے ہو آپی کے لیے بنایا ہوا کارڈ نکالا اور سب سے نظر پچا کر گھر سے نکل آیا۔ شام کا ملک جھا اندھیرا پھاپ کا تھا اور محلے کے میدان کا اکلوتا یہ پوسٹ بھی جل چکا تھا۔ بر امید ان سنان پڑا تھا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ہو آپی کے گھر تک جا پہنچا۔ دو تین مرتبہ دروازہ دھیرے سے کھنکھایا کیونکہ خلاف معمول دروازہ بند تھا۔ شاید سکینہ

خالہ لوگ گھر میں نہیں تھے۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں شدید مایوسی کے عالم میں پلانا ہی تھا کہ اچانک چھٹت کے اوپر کسی کے ہلکے سے ہٹنے کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ اورہ مطلب گھروالے چھٹت پر تھے، اسی لیے دروازے کی دستک اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند ٹھوٹ میں دیوار پچاند کر اندر کو گلیا۔ وہ آپی صحن میں ہوتیں تو مجھے میرے اس ”کرتب“ پر بہت ڈانٹیں کیونکہ انہیں مجھے چوت لگنے کا خوف لگا رہتا تھا۔ کبھی بھی میں انہیں ڈرانے کے لیے ان کی دیوار پر چڑھ بیٹھتا اور جب لگانے کی دھمکیاں دے کر انہیں بھگ کیا کرتا تھا لیکن اس وقت صحن بھی بالکل سنسان تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ آج یہ سارے کے سارے چھٹت پر کیا کر رہے تھے؟ باہر برآمدے کی روشنی بھی نہیں جلائی ہوئی تھی۔ اور سے اب بھی کسی کے آہتا آہتا بتیں کرنے کی آوازنائی دے رہی تھی۔ میں دیمیرے دیمیرے صحن کی سیر ہیاں چڑھتے ہوئے چھٹت کی جانب بڑھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر وہ آپی بھی اور پر ہوئیں تو انہیں چیچھے سے اچانک جا کر ڈراوں گا۔ وہ اس طرح پہلے تو بہت ڈرجاتیں تھیں لیکن بعد میں ہم دونوں ایسی باتیں یاد کر کے خوب ہنتے تھے۔ میرے ہونٹوں پہ آنے والے لمحات کو سوچ کر خود ہی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اب بالکل چھٹت کی منڈریتک پہنچ پکھا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر وہ آپی پر ہی پڑی جو کسی سے مسکراتے ہوئے بات کر رہی تھیں۔ وہ آپی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ میں نے ان کے لبوں سے نکلتے جملے کے آخری چند لفظات ہی سنے۔

”..... میں کیا کہہ سکتی ہوں، یہ سارے فیصلے تو والدین کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ فی الحال تو آپ مجھے اپنے پاس ہونے کی خوشی منانے دیں۔ ایسے پیغامات بڑوں کے ہاتھ بھیجے جاتے ہیں۔ نہ کہ کوئی خود لے کر آتا ہے۔“ وہ آپی کے چہرے اور آنکھوں میں شرارہت تھی۔ لیکن ان کے مقابل کون تھا اس کی واضح جملک مجھے دھمائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آپی کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا اور وہ اٹھ کر دہاں سے جانے لگیں۔

”آپ بیٹھیں..... امی جاتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کرنے کا کہہ گئیں تھیں۔ واپس آکر سب سے پہلے پوچھیں گی کہ آپ کو چائے کا بھی پوچھا یا نہیں، میں دروازہ بھی دیکھ آؤں اور آپ کے لیے چائے بھی لیتی آؤں گی۔“

وہ آپی نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ کسی کے ہاتھ نے ان کا گلابی ہاتھ جکڑ لیا اور آواز ابھری۔

”ایسے تو ہم نہیں جانے دیں گے آپ کو..... پہلے میرے سوال کا جواب دیتی جائیں۔ اگر میرے گھروالے آپ کا رشتہ مانگنے آئیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا اور مجھے صرف وجہہ کا جواب سنتا ہے۔ اس کے ماں باپ کا جواب تو میرے والدین سن ہی لیں گے۔“

وہ آپی لہر اکرشم سے بل کھا کر رہ گئیں۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ہاتھ پکڑنے والا شخص بھی کھڑا ہو چکا تھا اور اب اس کا رخ بھی میری طرف ہی تھا اور وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود طاہر بھائی ہی تھے۔ میرے اندر اچانک ہی بہت کچھ چھٹا کے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ وہ آپی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے پوزر لگا رہی تھیں۔

”طاہر..... خدا کے لیے میرا ہاتھ تو چھوڑیں..... میں نے کہانا امی ابا جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔“

”اوہ میں نے بھی کہانا کہ مجھے صرف وجہہ کا فیصلہ سنتا ہے۔“

ہاں ان دونوں میں ہاتھ پکڑے رکھنے اور چھڑانے کی کش کمکش جاری تھی اور یہاں میرے ذہن و دل میں طوفانوں کے بھجن چل رہے تھے۔ آخر طاہر بھائی نے میری پسند پڑا کہ مارہی دیا تھا لیکن مجھے ہو آپی سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ وہ بھی ان سے مل چکی تھیں۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے کیٹھ بن جانے کے بعد ان کی حفاظت کا ذمہ صرف میرا ہو گا۔ میری آخری امید اب بھی ہو آپی کے جواب سے بندھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ طاہر بھائی سے صاف کہہ دیں گی کہ وہ آدمی سے ہمیشہ کی دوستی کا وعدہ کرچکی ہیں لیکن اگلے ہی لمحے میرا یہ آخری بھرم بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی ہمیشہ کے لیے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وجہہ آپی کا گلبی چہرہ جو طاہر بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے کرتے شرم سے سرخ انگارہ بن چکا تھا جبکا ہوا تھا، انہوں نے دیرے سے پکیں اٹھائیں اور آہستہ سے اب کھولے۔

”وجہہ کی طرف سے ہاں ہے.....“

کتاب گھر کی پیشکش

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زمین مجھ پر پلٹ دی ہو یا پھر آسمان خود میرے سر پر آگرا ہو۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چیزوں کو کیا یہ زمین یا آسمان سب پھٹ جائے۔ میرے ہاتھ سے میرا کارڈ جانے کے کا گرچکا تھا۔ میں جلدی سے منڈری سے پلٹا اور ایک ہی جست میں تین چار سینٹر ہیاں اترتا ہوا، تیزی سے دوڑتا ہوا وہاں سے باہر کی جانب بھاگا۔ میری آنکھیں میرے بہتے آنسوؤں سے دھنڈ لائی جا رہی تھیں اور مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتھنیں کیسے میں نے صحن کا دروازہ کھولا اور کس طرح میں باہر نکلا۔ میں دوڑتا چاہ رہا تھا اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر میرے دامن کو بھگوتے جا رہے تھے۔ پتھنیں راستے میں کس کس نے مجھے یوں روٹے ہوئے دیوارہ وار دوڑتے ہوئے دیکھا ہو گا لیکن اس وقت مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور سیدھا جا کر اپنے بستر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ ساری رات میرے آنسو میرے تیکے کو بھگوتے رہے۔ جس لڑکی کی خاطر میں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائی، اپنا گھر، اپنے سارے دوست چھوڑ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا آج اسی نے میرے دل کے لکڑے کر دیئے تھے۔ ساری رات میں بستر میں منہ چھپائے ہڑکتا رہا اور جانے کے میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن وقت یوں پر لگا کر اڑا کہ پتہ ہی نہیں چلا اور سہ پہر کے تین بج گئے۔ اب انے میرا سوٹ کیس اور اپنا بیگ سنبھالا۔ اسی صحن میں برآمدے کے قریب کھڑی اپنے آنسو سب سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی اماں، نانی اماں سب کمزوز صحن میں جمع تھے۔ گلی میں میرے دوست یوں افرادہ سی شکل بنائے کھڑے تھے جیسے کوتوالی سے کوئی حوالدار میری گرفتاری کے لیے آیا کھڑا ہو۔ امی نے مجھے گلے لگا کر آخری بار پیار کیا اور ہزار دفعہ کی ہوئی بصیرت پھر سے دوبارہ دھرا کیں کہ وہاں تمیز سے رہنا، کسی سے چھکڑنا نہیں، کھانا وقت پر کھایا، اداں نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس وقت وہ خود سب سے زیادہ اداں تھیں۔ آخر میں ضبط نہیں کر سکا اور جب انہوں نے مجھ کو خود سے جدا کرنا چاہا تو میں پلک کر دو پڑا۔ امی ارے ارے کرتیں اور میرے آنسو صاف کرتے کرتے خود بھی روپڑیں ساتھ کھڑی عمارہ بھی جو جانے کے سے میرا ہاتھ تھا مے کھڑی تھی وہ بھی روپڑی۔ بڑے بھیا بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور وہ بھی سکنے لگے۔ اب منظر یہ تھا کہ امی مجھے لپٹائے رہی تھی اور فاریہ اور عمارہ اور فاری بھیا مجھ سے پٹ کر رور ہے تھے۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے عمارہ اور فاری بھیا سے اور انہیں مجھ سے کس قدر پیار تھا۔ ہم تینوں تو ایک جسم کی طرح تھے اور قدرت

ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہی تھی، وہ اس جسم کا ایک حصہ ان سے دور کیوں لے جانا چاہتی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں قیامت تک کسی بھی بچے کو اس کے بہن بھائیوں سے جدا نہ کرنے دیتا اس بے رحم تقدیر کو، لیکن افسوس قست کی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہی کہ ہیں۔ انہیں ہلانے والا تو کہیں اور بیٹھا ہوتا ہے اور شاید اسے ہمارے بہن بھائیوں، دوستوں اور ماں کے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

بڑی مشکل سے ابا نے مجھے امی سے علیحدہ کیا۔ عمارہ اور بھیانے ضد پکڑی کو وہ دونوں بھی مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے جائیں گے۔ گلی میں تا نگ آ چکا تھا لہذا اب انے میرا سامان تانگے پر کھوایا۔ محلے کے چند بڑے پہلے ہی ریلوے پر بوجی میں میری اور اباؤ کی نشست پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ راجہ، بالے، گندو، پپا اور نخود غیرہ اپنی سائکلیں سنجا لے گلی میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ امی نے دروازے میں کھڑے کھڑے میری جانب الدواع کا ہاتھ ہلایا۔ ان کی آنکھوں سے اب بھی آنسوؤں کی بوچھاڑ جاری تھی ہے وہ اپنے دوپے کے پلوسے پوچھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ تا نگہ مڑنے سے پہلے میں نے گلی کے گذر سے آخری مرتبہ امی کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر اسی میری نظر وہ اجمل ہو گئی۔ اسٹیشن پر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی میرے دوستوں کا ہجوم پہنچ چکا تھا۔ ٹرین جانے کو تیار تھی اور اسٹیشن پر ایک بھگدڑی بچی ہوئی تھی۔ راجہ اور باقی بھی اپنے اوپر بہت ضبط کر کے کھڑے تھے لیکن جب میں ان سے گلے مل کر ٹرین پر چڑھنے لگا تو ان میں سے کوئی بھی اپنی آنکھیں خٹک نہ رکھ سکا۔ راجہ نے آخری دفعہ میرے کان میں کہا۔

کتاب گھر کی پیشکش

”مت جایا راوی، چل ہم سب بیہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔“

میں نے دھیرے سے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپٹ لگائی۔ بالے کو میں نے دھیرے سے کہا کہ جب کبھی کوئی نیا برائٹل پی کر کش لگائے تو مجھے ضرور یاد کرے۔ پپا اور گندو کو تسلی دی کہ میں وہاں سے بھی ان کے لیے نقل کے ”پھرے“ بنائے کر بھیجتا رہوں گا۔ نخوان سب میں سب سے زیادہ کم زور دل تھا اور باقاعدہ سوں کر کے رو رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھ سے وعدہ کرے کہ آئندہ جب غفور بچا کی ”مرغیاں اڑائے گا“، تو کبھی چھوٹے چزوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ نخونے رو تے رو تے وعدہ کیا۔ عمارہ نے آگے بڑھ کر اپنی مٹھی کھوئی اور اپنا سپر مین کی شکل والا سب سے پیارا شاپنگ میری جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہ پہلی تراش تھا جسے عمارہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ اسے پار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہو سکی تھی اور آج عمارہ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ شاپنگ میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پلکیں پوچھ ڈالیں۔ فاری بھیا بھی میرے لیے اپنا پسندیدہ مفلر لے کر آئے تھے۔ سرخ اور نیلے رنگ کی دھاریوں والا یہ مفلر مجھے اس لیے بہت پسند تھا کیونکہ ایک مرتبہ جب میں فاری بھیا سے چھپ کر مفلر پہن کر جو آپی کے گھر گیا تھا تو انہیں میرے لگے میں پڑا یہ مفلر بہت اچھا لگا تھا اور انہوں نے خاص طور پر مجھے کہا تھا کہ ”اوی تم اس مفلر میں بہت پیارے لگ رہے ہو۔“

لیکن فاری بھیا نے دوبارہ مجھے اس مفلر کو چھوئے تھک نہیں دیا تھا اور آج انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر یہ مفلر میرے لگے میں ڈال دیا تھا۔ میرے سارے دوست بھی میرے لیے بہت سی چیزیں لائے تھے جسے راجہ نے کاغذ کے ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالتے ہی مجھے قوآپی کی یاد اس بڑی طرح سے تھا۔ اتنے میں ٹرین نے آخری سیٹی بھائی۔ ٹرین پر چڑھنے سے پہلے فاری بھائی کا دیا ہوا مفلر گلے میں ڈالتے ہی مجھے قوآپی کی یاد اس بڑی طرح سے

آئی کہ میرے قدم ڈال گا سے گئے۔ میں کل رات ان کے گھر سے آنے کے بعد دوبارہ ان کی طرف نہیں گیا تھا۔ راجہ کے لاکھ کہنے پر بھی میں نے آج آنے سے پہلے ان کے گھر کی جانب رخ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب جاتے جاتے کیوں دل ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے مچلا جا رہا تھا..... کٹ رہا تھا۔

ثرین کو بلکا سادھا کالا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم میری نظروں کے سامنے سے سر کئے گا۔ ابا بھی اور پڑھائے۔ سب لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ بارہے تھے۔ ٹرین دھیرے دھیرے کھسک رہی تھی۔ میں اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ اچاکہ ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میری آنکھوں کو کوئی دھوکا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے دن میں بھی خواب دیکھنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے لیکن نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔ اسٹشن کے داخلی راستے سے ڈوآپی اپنی کالی شال پیٹے تیزی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ ہاں..... وہی تو تھیں، میں نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ ہاں ہاں..... وہ ڈوآپی ہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے غیاث چپا بھی ہڑبڑائے اور سپٹائے ہوئے سے تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں شاید اس سامان کا تھیلا تھا جو ڈوآپی نے میرے لیے خرید خرید کر جمع کیا تھا۔ ڈوآپی کی اب تک مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سامنے کھڑے راجہ کے پاس پہنچیں جواب باقاعدہ رورہا تھا، انہوں نے راجہ سے غالباً میرے بارے میں پوچھا۔ راجہ نے جواب میں صرف اپنی انگلی اس ڈبے کی جانب اٹھا دی جس کی کھڑکی میں سے میں سر باہر نکالے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ ڈوآپی سے پہلے غیاث چپا ساری صورت حال کو مجھ گئے اور انہوں نے بھاگ کر بوجی کے دروازے میں کھڑے ابا کو اپنے ہاتھ میں پکڑا تھیا تھا دیا اور تیزی سے چلتے چلتے ابا کو چند رخصتی کلمات کہہ دیے۔ ڈوآپی کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بے چینی سے میری جانب لپکیں لیکن بتک ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور ان کے نازک قدم اس بڑھتی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے میری جانب دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلا کیا اور دور ہی سے خیالی طور پر میرے بال کھسیر کر اپنی ناک اس طرح دبائی جیسے وہ میری دبائی تھیں۔ میرے لیے آج وہ خود بیلی بن گئی تھیں۔ میری آنکھوں سے پہنچاں آنسو گرہے تھے لیکن میں ڈوآپی کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ ان کی جانب ہلا دیا۔ ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم چھوڑتے جا رہی تھی۔ ڈوآپی دو کھڑی ہاتھ ہلاتیں میری نظروں سے او جھل ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے دوستوں کا گروپ، عمارہ اور بھیما مزید پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ سب بھی دیوانوں کی طرح میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا الوداع تھا جس نے پہلی مرتبہ ہی میں میری روح کو کاث کر جانے کتنے نکلوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میری زندگی میں بہت سے ”الوداع“ آئے اور ہر الوداع نے میری پہلے سے تقسیم روح کے مزید پر زے کر دیئے لیکن اس پہلے الوداع کی کاث ساری زندگی میرا پیچا کرتی رہی جیسے کسی بے رحم شکاری کا انداز تیر کسی گھائل غزال کا پیچھا کرتا ہے۔

ڈوآپی کی آنکھوں میں چکتے آنسوؤں میں شام کے ڈوبتے سورج کی آخری کرن لمحہ بھر کو چکی۔ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا۔ ڈوآپی کا ہاتھ ہلاتا سر پا دھیرے ایک نقطے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تیز ہوا میرے چہرے کو چھو کر میرے بہتے آنسوؤں کو بھی اڑا کر لے جا رہی تھی اور اس کے پیچیڑے شاید میرے آنسوؤں کو واپس اُسی سمت لے کر اڑے جا رہے تھے جہاں میرا دل اب بھی انکا ہوا تھا۔ ڈوآپی کا سر پا اب کمل

غالب ہو چکا تھا لیکن جانے کیوں مجھے آس پاس ہر چہرے میں انہی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر آنکھ ان کی بیگنی آنکھوں کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے تحفہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی
میری آنکھیں ہوں گی

<http://kitaabghar.com>

جنئے چہرے اچھے ہوں گے
میرے چہرے ہوں گے

اتنی آنکھیں
کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کیسے یاد رکھو گے.....؟

ٹرین تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے چھوٹے سے شہر کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔

طاہر جاوید غل کے قلم سے جہانی استاد
کی ہنگامہ خیز سرگزشت

پندرہواں حصہ شائع ہو گیا ہے



60/- روپے
قیمت فی حصہ

مکمل ایک تا پندرہ حصے دستیاب ہیں

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com> **(اردو ٹائپنگ سروس)**

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکیں سمجھے اور ہمیں سمجھ دیجئے یا

☆ اپنی تحریر و من اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں سمجھ دیجئے یا

☆ اپنامواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کرو دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادا میکی

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش دوسرا دور گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش جنتلمنین بسم اللہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ابا جب مجھے لیے کیدت کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔ بورڈ گنگ کیا تھا پورا ایک شہر ہی تو تھا، صرف واخ्तے والی عمارت ہی اتنی بڑی تھی کہ اس میں ہمارے ہائی اسکول جیسے تین اسکول آ جائیں۔ بڑی بڑی لمبی اور کشاورہ سڑکیں جس کے دونوں اطراف لبے لبے درخت اس طرح ایستادہ تھے کہ دھوپ زمین تک پہنچنے کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ ہمارے محلے سے بھی بڑے کئی گھاس کے میدان جن میں بیک وقت کئی مالی کام کر رہے تھے۔ حق پوچھیں تو ایسی جگہ اس دن سے پہلے میں نے صرف ریگل سینما میں چھپ کر دیکھی گئی انگریزی فلموں میں دیکھی تھی۔ بڑی بڑی سی لمبی لمبی چمکدار اہم ادرا ریاں جن کے سنگ مرمر کے فرش پر کوئی اپنا چہرہ بھی دیکھنا چاہتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی۔ بہت سے لوگ فوجی لباس میں اوہرہ آ جا رہے تھے۔ گھاس کے میدانوں سے گزرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک جانب بہت بڑا ساتھا بھر کا نیلا پانی دور ہی سے جگہ جگہ رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ اسے سونگ پول کہتے ہیں۔ دور ایک میدان میں بہت سے گھر سوار گھوڑے دوڑانے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ یہاں گھر سواری سکھانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ سب سے پہلے ہمیں پہل صاحب کے کمرے میں لے جایا گیا۔ پہلے نے ابا کو بہت مبارکباد دی کہ ان کے بیٹے کو ملک کے سب سے اعلیٰ ادارے میں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے ابا کو یقین دلایا کہ یہاں ان کا لاڑلا بیٹا بہت آرام سے اپنے گھر کی طرح رہے گا۔ کاش مجھے اس وقت پتہ ہوتا کہ پہل صاحب کا ”آرام“ سے کیا مطلب ہے تو میں اسی وقت وہاں سے دوڑ لگا دیتا لیکن اس وقت تو میں پہل کے عالی شان آفس کی چیزوں کو دیکھنے میں ہی اس قدر کھو یا ہوا تھا کہ مجھے ان کی با توں کی طرف دھیان دیئے کی فرستہ نہیں تھی۔ پھر ہمیں کالج کی انتظامیہ اور ہماری ”ہونے والی“ جماعت کا حصہ بھی دکھایا گیا۔ اسی بھال اور اپنی جماعت دلکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی ہی رہ گئیں۔ کلاس روم کیا تھا پورا ایک چھوٹا سا سینما ہاں ہی تو تھا۔ جس میں کریساں بھی سینما کی طرح اور پر سے نیچے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک بڑا سائچہ تھا جس کی دیوار پر بلیک بورڈ اور ٹیچر کے کھڑے ہونے کے لیے لکڑی کا ایک بڑا سائبہ (روئیم) پڑا ہوا تھا۔

اتنی دیر میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ پتہ چلا یہاں کھانے والے کمرے کو میں کہتے ہیں۔ کچھ اور بچوں کے والدین بھی ہمارے ساتھ ہی میں کی جانب چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ میں بھی کوئی بڑا سا کمرہ ہو گا جس میں بڑا سا دستخوان ڈلا ہوا ہو گا جہاں ہم سب گھر کی طرح بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور شکر ادا کر کے اٹھ جائیں گے۔

لیکن میں میں داخل ہوتے ہی ایک ساتھ بہت سے جلتے ہوئے فانوسوں کی روشنی سے میری آنکھیں چند لمحوں کے لیے یوں پختہ ہیاں

لکھیں کہ پہلے تو مجھے کچھ نظر ہی نہیں آیا پھر جب چند لمحوں کے بعد میری بینائی بحال ہوئی تو مجھے یوں لگا کہ میں رنگ و نور کے کسی سمندر میں کھڑا ہوں، وہ اتنا عظیم الشان ہال تھا کہ اس کی چھت و دیکھنے کے لیے مجھے اپنا پورے کا پورا سر آسان کی جانب اٹھانا پڑتا تھا۔ ہال کی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادتی کی تھی کہ مجھے آخری میز نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ چاروں طرف باور دی ہیرے سفید بس پہنے اور سر پر سرخ پگڑیاں سجائے ہاتھوں میں کھانے کی ٹڑے لیے اور ادھر مستعدی سے بھاگے پھر رہے تھے لیکن چاروں طرف میز کر سیاں ہی گلی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں پہنچ کر کھائیں گے؟ حالانکہ میں کا سفید فرش دھلے پانی کی طرح شفاف تھا لیکن وہاں دستِ خوان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ یہاں میز کری پر بیٹھ کر ہی کھانا تھا کیا جاتا ہے۔ مجھے الحسن تو بہت ہوئی لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ میں نے آج تک کبھی میز کری پر بیٹھ کر کھانا تھا نہیں کھایا تھا بلکہ ایک مرتبے میں اور عمارہ ہوٹل ہوٹل کھیل رہے تھے تو امی نے ہم دونوں کو کھڑے ہو کر دانتوں سے روٹی چلانے پر ایک ایک زور دار وہ پہ بھی جزو دی تھی کہ اس طرح کھانا رزق کی توہین ہوتی ہے لیکن یہاں تو کبھی رزق کی پوری نہیں تو کم از کم آدمی توہین تو کرہی رہے تھے، کیونکہ ان اوضعی اوضعی کر سیوں پر بیٹھنا مجھے ”آدھے کھڑے ہونے“ کے برابر ہی لگ رہا تھا۔ اپر سے ایک اور مصیبت میرے سر پر آ کھڑی ہوئی جیسے ہی میں نے پہلا نوالہ توڑا ایک باور دی ہیرا میرے بالکل سر کے قریب آ کر موڈب کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میں کسی چیز کی جانب ہاتھ بڑھاتا وہ جلدی سے مجھے سے پہلے اسے اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیتا پھر مسکرا کر مجھے دیکھنے لگتا۔ میں سمجھا شاید یہ بے چارہ بھی بھوکا ہے اور خود اپنے منہ کچھ مانگنے سے شرما تھے لہذا میں نے خود آدمی روٹی توڑ کر اور توہڑا ساسالن رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا لیکن اس نے نہ جانے کیوں گھبرا کر منج کر دیا حالانکہ میں نے اسے اشارہ بھی کیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چپ چاپ نہیں میز کے نیچے بیٹھ کر جلدی سے کھا لیکن وہ بے چارہ اتنا بولکھلایا ہوا تھا کہ اس نے جلدی سے روٹی واپس پلٹت میں رکھ دی اور مجھے سے کہنے لگا کہ ”سر میں یہاں آپ کی ہیلپ کرنے کے لیے کھڑا ہوں۔“ لو بھلا.....؟ کھانے میں بھی کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؟ یہاں کا توبادا آدم ہی نہ ال تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور میں بھاگ کر ابا کے پاس آگیا جو دوسروی میز پر والدین والے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اب اسے بھی اس شخص کی شکایت کی کہ وہ سارا وقت میرے سر پر کھڑا اور اس کی وجہ سے میں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ میں نے ابا سے کہا کہ مجھے باہر کسی ٹھیلے سے کچھ کھانے کو دلوادیں کیونکہ میری بھوک نہیں مشی تھی لیکن ابا کا جواب سن کر میرے توہوش ہی اڑ گئے۔ انہوں نے تباہا کہ یہاں ٹھیلے نہیں ہوتے صرف ایک بڑی ہی کینٹیں ہے کیڈس کے لیے جو صرف شام کو کھلتی ہے اور یہ جو شخص میرے سر پر ملکر نکیر کی طرح کھڑا تھا اس قسم کے لوگ ہمیشہ کھانا کھاتے وقت میرے سر پر کھڑے رہیں گے کیونکہ یہاں ہر کیڈٹ کے لیے ایک ایسا یہر پر مخصوص ہے جو کھانے کے وقت کیڈٹ کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ میں نے وہیں اپنا سر پیٹ لیا، کیونکہ میں شروع سے کسی کے سامنے کچھ بھی کھانے میں بہت شرم محسوس کرتا تھا۔ وجہا پی سب کبھی میرے لیے کچھ خاص بنا تھیں تو میں پہلے ان سے آنکھیں بند کرنے کا کہتا اور پھر جلدی سے کھا لیتا۔ کھانے کے بعد ہم سب کو تباہا گیا کہ کچھ ہی دیر میں ہمارے ہاتھ میں لے جایا جائے گا جہاں ہمیں ہمارے ”کٹ نمبر“ اور ”کٹ بیگ“ جاری (Issue) کیے جائیں گے۔ گویا یہاں کا یہ بھی ایک دستور تھا کہ ہر کیڈٹ کا کسی جیل کے قیدی کی طرح مخصوص ایک نمبر ہوتا ہے جو اگلے چھ سال تک اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے اور اسے اس کے نام سے نہیں بلکہ اس کٹ نمبر سے پکارا اور بلا یا جاتا ہے۔ کیا بے ہودہ رواج تھا یہ بھی.....

بہر حال کٹ نمبر تو سمجھ میں آگیا پر یہ ”کٹ بیگ“ کیا ہوتا ہے؟

کچھ ہی دیر میں ہم اپنے اپنے ہالٹر میں موجود تھے۔ مجھے ”محمد بن قاسم“ وغیرہ لاث کیا گیا تھا جہاں میری سب سے پہلی ملاقات ایک جابر طبیعت ہاؤس ماسٹر فہد صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے میرے ساتھ آنے والے چند اور کیدیں کو جھاڑ کر ایک جانب بٹھادیا اور خود ہمارے والدین کے ساتھ ضروری کارروائی کے لیے اپنے دفتر چلے گئے۔ ہمیں جس لمبے سے کمرے میں بٹھایا گیا تھا اس میں بارہ بستر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ ہر بستر کے ساتھ ایک میز اور کرسی بھی لگی ہوئی تھی اور بارہ الماریاں بھی دیوار میں نصب تھیں۔ اس لمبے کمرے کو وہاں ”ڈارمیٹری“ Dormetry کہتے تھے۔ ہمیں ہمارے بستر لاث کردیئے گئے اور کچھ ہی دیر میں ہماری ڈارمیٹری کا خاص خدمت گار (بٹ مین) کچھ ہی دیر میں ہر لڑکے کے لیے ایک بوری میں بہت سا سامان بھر کے لے آیا۔ پتہ چلا کہ اسی بوری کو کٹ بیگ کہتے ہیں۔ اس کے اندر سے ہمارے فوجی بڑے جوتے، پیٹی شوز، ہمارے یونیفارم، بیجنز، بیلٹ، پیٹی اور پریڈ کا لباس، بنیا نہیں، نیکر اور جانے کیا کیا الگ علم برآمد ہوا۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی مزید لباس بھی میں گے جن میں شام کو باہر جانے کا لباس (Evening Walking Out) اور رات کو کھانے کے لباس (Dinner Out) اور سونے کے لباس بھی شامل ہیں۔ میری تو یہ سن کر ہی جان نکل گئی تھی کہ یہاں صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے کے وقت تک تقریباً آٹھ لباس بدلتے ہیں۔ کانجہ ہوا گویا کسی درزی کی دوکان ہو گیا۔ وہاں گھر میں تو ہم بمشکل اسکول کی وردي ہی اسی کی لاکھ منتوں کے بعد تبدیل کرتے تھے اور وہ بھی بت اگر جی مانتا تو، ورنہ اگلے دن اسکول جانے تک اسی وردي کو چڑھائے رکھتے تھے۔ یہاں کی سب سے ترمی بات یہ پتہ چلی کہ یہاں پر اپنے سارے جوتے خود ہی پاش کرنا پڑیں گے۔ میں نے آج تک کبھی خود اپنے جوتے پاش نہیں کیے تھے۔ گھر میں تو اسی میرے جوتے پاش کر دیا کرتی تھیں یا پھر عمارہ یا بڑے بھیما کو ڈاٹ ڈپٹ کر میرے جوتے بھی پاش کروادیا کرتی تھیں۔ میں اپناسرپڑے اپنے سامنے پڑے کاملے، سفید جوتوں کے انبار کو دیکھ رہا تھا۔ ہمارے بٹ مین جس کا نام جمعہ خان تھا، نے ہمیں یہ بات بتا کر مزید ڈر ادیا کہ یہاں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے سینٹرز کے جوتے بھی پاش کرنے پڑتے ہیں اور نہ کرنے پڑھیکھاں سزا ملتی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً جھما کا ہوا اور گذوکی کبھی ہوئی بات یاد آگئی کہ یہاں سزا کے طور پر صرف نیکر پہننا کر باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کٹ بیگ میں سے اپنا سفید نیکر پہنال کر دیکھا۔ خاصہ ڈھیلاؤ حالتا تھا، اس میں تو مجھے جیسے دو مزید آؤی آسکتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں ہر بچے کو اپنا بستر خود ہی لگانا اور اٹھانا پڑتا ہے۔ کیسی واہیات جگہ تھی یہ؟ گھر میں تو صبح اٹھ کر میں ایک لات مار کر اپنی یا کمبل کو ہوا میں اچھاں دیتا تھا اور پھر امی بے چاری سارا دن میری بکھرائی ہوئی چیزیں سنجھاتی رہ جاتیں۔

اب شام ڈھلنے کو تھی، میری بیکر کے گیارہ بچے پورے ہو چکے تھے لیکن ایک بستر ابھی تک خالی تھا، بتایا گیا کہ یہ ہمارے پریلفیکٹ Prefact کا بستر ہے یعنی وہ سینٹر اور اگلی کلاس کا بچہ جو ہم سب گیارہ بچوں کا نیٹر انچارج ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا ”لوگی..... اب یا ایک اور نئی مصیبت ابھی باقی ہے۔ پتہ نہیں اب یہ کون سا نامومنہ ہو گا۔“

امتنے میں ہاؤس ماسٹر نے آکر ہم سب کو حکم دیا کہ ہمارے والدین نے ضروری کاغذات اور فارم وغیرہ بھر دیئے ہیں اور اب ان کے جانے کا وقت ہو چکا ہے لہذا ہم سب باہر والے لان میں آ کر اپنے والدین اور پیاروں سے مل جائیں کیونکہ اب ان کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ

سنتے ہی میرا دل ڈوب سا گیا۔ صبح سے اب تک میں ان ہنگاموں میں الجھایہ بھول ہی گیا تھا کہ اب اُنے واپس بھی جانا ہو گا۔

سب بچوں میں کھلبیلی ہی مجھ گئی اور سب سے پہلے میں باہر کی جانب دوڑا۔ ابا ہوٹل کے باہر گھاس کے کلڑے پر بچھے لکڑی کے نچوں میں سے ایک پر بیٹھے جانے کس سوچ میں گم تھے۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔ جانے کیوں اس لمحے وہ مجھے بالکل ایک ”نئے ابا“ و کھاتی دیئے۔ شاید وہ میری آنکھوں کا وہم ہی ہو، پر چند لمحوں کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ان کی آنکھوں میں ہلکی ہی خنی کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے مجھے میرے ہاتھوں سے تھام کرو ہیں نئی پر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ کچھ دریہم باپ بیٹا خاموشی سے بیٹھے رہے پھر اب اُنہوں نے ہلکے سے کھکھا کر کاپنا گلا صاف کیا اور دیہر سے بولے۔

”آدمی بیٹا..... اب مجھے واپس جانا ہو گا۔“

حالانکہ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ جانے والے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو، آنسو میرے ہلق میں کڑواہٹ بھرنے لگے۔ اب اُنے مجھے بہت سی باتیں سمجھائیں کہ اب مجھے انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہو گا۔ میں وہاں واحد بچہ تھا جو حکومت کے خرچ پر پڑھنے آیا تھا ورنہ باقی کبھی بچے امیر کبیر خان داؤں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ میری طرح اس بوسیدہ ٹرین کی بجائے اپنی اپنی شان دار اور عالی شان گاڑیوں میں وہاں آئے تھے۔ ابا مجھے یہی سمجھانا چاہ رہے تھے کہ میری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور مجھے یہاں رہ کر اپنے آپ کو اتنے مہنگے ادارے میں پڑھنے کا حق دار ثابت کرنا ہو گا کیونکہ اگر میں قتل ہو گیا تو حکومت مجھے واپس گھر بھجوادے گی۔ وہ سب انگریزی میڈیم اسکولوں کے بچے تھا اور ان میں واحد میں ہی ایسا بچہ تھا جو اور دو میڈیم اسکول سے آیا تھا اور شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ شاید ابا وہاں آ کر میری اور دوسرے بچوں کی حیثیت دیکھ کر اداس ہو گئے تھے۔ میں ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھتا تھا جبکہ وہ سارے بچے بڑے شہروں سے آئے تھے، بلکہ وہ بچے تو ایسے بھی تھے جنہیں بیردن ملک سے یہاں داخلہ دیا گیا تھا۔ اسی ہی لتنی باتیں اس روز اپنے جاتے جاتے مجھے سمجھائیں لیکن میرا ذہن تو ان کی روائی میں ہی انکا ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو کر کھا ہوا تھا لیکن جب وہ حتی طور پر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میری آنکھیں بھی گئیں لگیں، میں نے جلدی سے اپنی قمیص کے کف سے اپنی آنکھیں رکھ لیں تاکہ ابا کو میرے آنسو نظر نہ آسکیں۔ ابا نے آخری بار میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے پیار کیا اور جانے کے لیے پڑھے اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ خود ابا بھی مجھے سے اپنی آنکھیں چھپا رہے ہیں۔ میں نے آج تک انہیں ایک سخت گیر باپ کے روپ میں دیکھا تھا جن کے گھر میں گھستے ہی ہم بچے اپنی آواز دیکھی کر لیا کرتے تھے لیکن اس روز مجھے پتہ چلا کہ ان کے اس سخت خول کے اندر کتنازم دل باپ سانس لے رہا ہے۔ ہم بچے اپنے والدین اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو جانتے جانتے جان لیتے ہیں..... پروفوس تب تک بہت سا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

جانتے جانتے ابا نے ہوٹل کے کلڑ پر کر مجھے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا، اب سیبی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور جیسے ہی ابا ہاتھ ہلا کر جو جعل ہوئے میں بلکہ بلک کرو پڑا۔ ابا کے مژتے ہی میں بھاگ کر اس موڑ تک گیا جہاں سے ابا جو جعل ہوئے تھے اور چھپ کر انہیں دیکھنے لگا، ابا جو جعل سے قدموں سے واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان کے سامنے نہ رو نے کا بھرم تو کسی نہ کسی طور

جوڑے رکھا لیکن اب مجھے رونے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں نے آس پاس دیکھا تو ساتویں جماعت میں داخل ہونے والے بھی بچے اپنے ماں باپ کو جاتا دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رورہے تھے۔ ان انگلش میڈیم بچوں کو یوں روتا دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ چلوکم از کم کسی ایک جگہ تو ہم سب برابر تھے۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس طرح سوز میں صرف ہم اردو میڈیم بچے ہی روتے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ سبھی بچوں کے والدین کسی نہ کسی ”بہانے“ وہاں سے چلے گئے اور پہچھے ہم سب بچوں کو کورس میں رونے کے لیے چھوڑ گئے۔ ہر بچے نے اپنے رونے کے لیے اپنی پسند کی جگہ منتخب کر لی تھی اور اب کوئی درخت سے لپٹ کر کوئی بچ کے اوپر، کوئی بچ کے نیچے لیٹ کر اپنی اپنی تان میں رورہے تھے، کچھ بے شرم قسم کے بچوں نے تو وہیں سڑک پر لیٹ کر نالگیں چلاتا شروع کر دیں تھیں۔ اکیدمی کے احاطے میں چھ بھائیں تھے اور سبھی کے سامنے اس وقت ”قیامت“ کا سماں تھا۔ تمام بھائیں کے پیرے، بٹ مین اور انتظامیہ جو پہلے ہی سے اس قسم کے حالات کے لیے تیار رہتے تھے ان بچوں کو بہلانے کی کوشش کر کے انہیں اندر لے جا رہے تھے۔ میں بھی اپنے بہتے آنسو میں کی کوشش میں مصروف تھا کہ ایک بچہ کہیں سے دوڑتا ہوا آیا اور کسی اور کو سامنے نہ پا کر مجھی سے لپٹ گیا اور زور سے دھاڑیں مارنے لگا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے خود سے علیحدہ کیا اور اسے بتایا کہ میں تو خود متاثر ہیں میں سے ایک ہوں اور ابھی تک تو خود میرا ”رونا پروگرام“ ختم نہیں ہوا۔ وہ اس فرخا۔ پیرک میں میرے بستر کے ساتھ والا بستراہی کا تھا۔ بہر حال اس وقت ہم دونوں کا درد مشترک تھا اور اسی درد مشترک نے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرا کے ساتھ ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جو آگے چل کر ہماری لازاں وال دوستی کی صورت میں خوددار ہونے والا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کچھ ہی دیر میں رات بھی ہو گئی۔ اب ہمارے سینئر بھی آچکے تھے۔ ہر بھائیں میں ساتویں سے لے کر بارہویں جماعت تک کے سبھی کیڈیٹس کے لیے الگ الگ ڈارمیٹریاں (بیرکیں) موجود تھیں اور بارہویں جماعت کے کیڈیٹس کے علاوہ باقی سبھی جماعتوں کی پیرک میں ایک سینئر کیڈیٹ بطور پریفیکٹ بھی رہتا تھا۔ مثلاً ساتویں جماعت کے لیے آٹھویں جماعت کا کیڈیٹ، آٹھویں کے لیے نویں کا اور نویں جماعت کے لیے دسویں جماعت کا کیڈیٹ بطور انچارج رہتا تھا۔ ہمارے انچارج پریفیکٹ کا نام اسرار تھا اور وہ آٹھویں جماعت کا کیڈیٹ تھا، اس نے آتے ہی ہم سب کے سب گیارہ بچوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا اور سب کے نام پوچھئے، کچھ دیر خواہ کا رعب ڈالنے کی کوشش کی اور ہمیں اکیدمی کے ”رہنماء اصول“، غیرہ ہتائے کہ سینئر کو سر کہنا ہے اور سب کا حکم ماننا ہے۔ صحیح سائز ہے چار بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی اٹھنا ہو گا اور پریلیپنی کی کے لیے میدان کی طرف دوڑ لگانا ہو گی، کوئی بچ لیٹ نہیں ہو گا نہ ہی سوتا رہے گا ورنہ اسے سزا ملے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم سب بچے اکٹائے ہوئے سے پریفیکٹ سر کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ بچے ابھی تک سوں سوں کر کے سڑک رہے تھے۔ اس وقت اگر ہم گیارہ بچوں کا بس چلتا تو ہم سب مل کر اس ”پریفیکٹ کے بچے“ کو ایسا سبق سکھاتے کہ وہ یاد رکھتا۔ اتنی دیر میں رات کے کھانے کی گھنٹی بج گئی اور ہم سب بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے میں کی جانب چلنے کا ”حکم“ دے دیا گیا۔

اس بار میں کامنہ کچھ اور تھا۔ تمام میں کیڈیٹ سے بھرا ہوا تھا اور ہر جانب ڈز سوٹ میں ملبوس سینئر اور جو نیز کیڈیٹس اپنی اپنی گرسیوں کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھ سمت کچھ بچے جو کرسیوں پر بیٹھے چکے تھے، ان کے پریفیکٹس نے انہیں گھور کر کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور

ہم ہڑ بڑا کرو پس کھڑے ہو گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی سب سے سینٹر کیڈٹ جنہیں وہاں ایس۔ یو۔ او۔ (U.O.S) سینٹر اندر آفیسر کہا جاتا ہے اور جو بارہویں جماعت کے کیڈٹ ہوتے ہیں، وہ تشریف لا کیں گے اور باقاعدہ کھانے کا اعلان کریں گے تو ہم کھانا شروع کر سکیں گے۔ آخر کار ایس۔ یو۔ اوصاحب تشریف لائے جن کی کرسی چند اور کرسیوں کے ساتھ ہال کے درمیان ایک اونچے اسٹچ پر گلی ہوئی تھی۔ انہوں نے آکر میز پر پڑا میک اٹھایا اور زور سے کہا۔ ”جنتلمنین بسم اللہ.....“ پتہ نہیں ان جادوئی الفاظ میں ایسا کیا اڑتا کہ کبھی کیڈٹ فوراً کر سیاں کھینچ کر بیٹھے گئے اور کھانا شروع ہو گیا۔

یہ کھانا میرے لیے ایک نیا امتحان تھا۔ میز پر چھپری، کانے، لکڑی کی پتی ڈنڈیاں (اسٹک) لمبی لمبی (اسٹراز) اور جانے کوں کوں سے ”اوڑار“ پڑے ہوئے تھے اور سبھی کیڈٹس کو انہی ”اوڑاروں“ کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ باقی کیڈٹس نے تو پوی سہولت سے اپنے لیے کھانا نکال لیا اور چھپری کا نوٹ سے کھانے لگے لیکن مجھے تو ان چیزوں کا استعمال تو دور، انہیں تھیک طرح سے پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں تو ہم سب زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ میں ابھی ان چھپری کا نوٹ اور دیگر سامان کو اٹ پلٹ کر دیکھی ہی رہا تھا کہ وہی سینٹر کیڈٹ دوبارہ کھڑا ہوا اور اس نے ماہیک پر آکر صرف دولفظ کہے ”جنتلمنین الحمد للہ.....“ اور یہ سنتے ہی سبھی کیڈٹس اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بیٹھا رہا کیونکہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ میرے پریلیکٹ نے دوبارہ مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ یہ جنتلمنین کوں تھا جس کی پہلی بسم اللہ اور پھر الحمد للہ بھی ہو گئی تھی۔ میں تو ابھی تک بھوکا ہی تھا۔ جنتلمنین کو اگر جانا تھا تو چلا جائے پر یہ لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں گھسیتے لیے جا رہے تھے؟ میں لاکھ چینا چالایا کہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا ہے لیکن ان خالموں نے میری ایک بھی نہیں سنی اور مجھے دیگر کیڈٹ کی طرح قطار میں کھڑا کر کے دوبارہ ہائل کی جانب ”ہنکا“ دیا گیا۔

ایک تو گھر سے اتنی دوری اور پھر بھوکے پیٹ کی یہ مصیبت.....؟ غصے اور بے بھی سے میرا براحال ہو رہا تھا۔ واپسی پر پریلیکٹ نے مجھے خوب جھاڑا کہ جب جنتلمنین الحمد للہ کا اعلان ہو گیا تھا تب بھی میں کیوں بیٹھا رہا۔ میں نے غصے میں پریلیکٹ کو دیکھا اور چلا یا۔ ”جن ٹائمین کی ایسی کی تیمسی..... اگر اس کی الحمد للہ ہو گئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ مجھے تو ابھی کھانا کھانا تھا۔“

میری بات سن کر پریلیکٹ غصے کے باوجود فس پڑا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ میں بھی انہی جنتلمنیوں میں سے اب ایک ہوں اور میں میں کھانے کے لیے صرف بیس منٹ دیئے جاتے ہیں اور ہم سب جنتلمنین کیڈٹس کو انہی بیس منٹوں میں اپنا کھانا ختم کر کے الحمد للہ سنتے ہی اٹھ جانا لازم ہے۔ آج تو پہلا دن تھا اس لیے سینٹر کیڈٹ نے رعایت برتنی تھی لیکن آئندہ اگر میں الحمد للہ کے بعد بھی نہ اٹھا تو مجھے سزا بھی مل سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے اس بے ہودہ نظام پر لعنت بھیجی۔ یہاں مجھے کس مصیبت میں ڈال گئے تھے۔ ان کی تو کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھا اپنے آنے والے برے دنوں کو رہا تھا کہ اچانک پھر سے وہی تیز اور منحوس سیٹی کی آواز سنائی دی۔ تمام سینٹر کیڈٹس میں کھلبلی سی مچ گئی اور سب باہر کی جانب بھاگے۔ پتہ چلا کہ اب سب کیڈٹس اپنے ہائلز کے باہر جمع ہوں گے اور ان کی رات سونے سے قبل آخری لذتی ہے وہاں ”ناٹ فالن“ (Night Fallen) کہتے ہیں، کی جائے گی۔ سو بادل خواتستہ ہم چھوٹے کیڈٹس بھی گرتے پڑتے ہائل کے باہر والی سڑک پر آکھڑے

ہوئے۔ ہر ہاؤس (ہاٹل) کا اپنا ایک سینئر کیڈٹ بھی ہوتا تھا جسے جو نیزِ اندر آفیسر کہا جاتا تھا۔ وہی سب کی گفتگی کرتا تھا۔ سب کیڈٹس کے کٹ نمبر لپکارے جاتے اور وہ بہاؤ اور بلند اپنی حاضری "لیں سر" کہہ کر لگادیتے۔ گفتگی ختم ہونے کے بعد ہمیں واپس اندر ہاؤس کی جانب دھکیل دیا گیا اور اپنی اپنی بیرکس میں جانے کا حکم نامددے دیا گیا۔ ٹھیک رات ساڑھے دس بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی تمام ہاؤس کی بیتیاں بچھادی گئیں۔ ہماری بیرک میں بھی گھپ اندر ہیرا ہو گیا تھا۔ ہم سب بچے اپنے بستروں میں خوف کے مارے سکتے ہیں لیے ہوئے تھے۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں اپنے گھروں والوں سے ہزاروں میل دور، اس انجان جگہ پر، ابھی لوگوں کے درمیان گزار رہا تھا۔ اس رات مجھے اندر ہیرے سے جتنا ڈرمھوس ہوا، اتنا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ گھر میں میں اور بھیاں کر اندر ہیرے میں عمارہ کوڈرایا کرتے تھے اور پھر جب عمارہ ڈر کر خوف سے چھتی تھی تو میں اور بھیا خوب زور زور سے ہنتے تھے لیکن آج یہاں خود میرا دل اس اندر ہیرے کے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنا سراچھی طرح کمبل کے اندر چھالیا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جیسے میں اپنے گھر کے بستروں میں موجود تھا جاں آس پاس امی ابا وغیرہ بھی میری حفاظت کے لیے موجود تھے۔ ابھی اس کوشش میں مجھے پوری طرح کامیابی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ اپاٹک میں بلکی اسی سوں سوں کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے گھبرا کر سر کمبل سے باہر نکلا تو پتہ چلا کہ اس فرمیاں اپنے پسندیدہ مشغل یعنی آنسو بھانے میں مصروف ہیں۔ اس فرست پر اپنے گھنٹوں کے درمیان سردی یہ بیٹھا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "کیا ہوا.....؟ سوتے کیوں نہیں۔" اس فرنے سراٹھا یا "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میری امی کو بولوادو۔"

کتاب گھر کی پیشکش

اب میں اسے کیا بتاتا کہ خود میرا بھی خوف کے مارے بر حال ہے۔ میرے ساتھ والے دوسرے بست پر فیصل کا بست تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس نے بھی آہستہ سے کمبل سے سر باہر نکال دیا۔ اس کے آنسو بھی پچنے کے لیے تیار تھے۔ تیرے بست پر سندھی وڈیرے کا یہاں مجبید تھا، پھر موٹا اشتیاق، پھر خالد لمبا، پھر عمر، شثار، الطاف، جن کے بست ہمارے سامنے والی قطار میں چھ بستروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ بھی دھیرے دھیرے اٹھ پڑیے، صرف ہمارے پریلیکٹ کے خرائے اس لمبی بیرک میں گونج رہے تھے، باقی بھی بچے خاموشی سے ایک ہی سر میں ٹسوے بھارہ ہے تھے۔ ہم سبھی گیارہ کے گیارہ پچھے اس رات خوف اور ڈر کے ایسے ساتھی درد میں بندھے ہوئے تھے جس کی کاش ساری زندگی میرے خون کے اندر موجود رہے گی۔ اس لمحے ہم سب کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بھرپور دنیا میں ہمارا پاکوئی بھی نہیں ہے۔ ہمیں ساری عمر اسی انجانی اور ویران جگہ میں انہی ابھی لوگوں کے درمیان رہنا ہوگا۔ غالباً یہی وہ پہلی رات تھی جس نے میری شخصیت کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کا ایک حصہ وہ آدمی تھا جسے میں اپنے پرانے محلے میں چھوڑ آیا تھا اور دوسرا حصہ یہ آدمی تھا جو دنیا کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلسلہ ہوا کیڈٹ تھا لیکن جس کے اندر پلتے خوف اور درد کو بھی کوئی محسوس نہیں کر سکا۔ مجھے یاد آیا کہ ایسی اندر ہیری راتوں میں چپ چاپ امی کے پاس جا کر چھپ جاتا تھا اور وہ تھپک تھپک کر مجھے سلا دیتی تھیں.....

رات اندر ہیری، جنگل گھٹتا ہے

چھوڑ کے مجھ کو، نہ جاؤ ماں

شام ڈھلے کیوں گھر سے نکالا



<http://kitaabghar.com>

رابطہ ادبی فورم

ٹپوری دنیا کے ادبیوں اور شاعروں کا مشترکہ پلیٹ فارم

<http://kitaabghar.com>

رنکنیت سازی اور معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

ادبی رابطہ اسٹر نیشنل کراچی

00 92 333 222 1689

raabtapk@yahoo.com

<http://kitaabghar.com>

کیا اتنا بڑا ہوں؟ بتاؤ ماں
سو کھچ چکے ہیں سارے آنسو

کتاب گھر کی پیشکش
اب تو چپ کراؤ۔۔۔ ماں

<http://kitaabghar.com>

ہاں ڈر بہت اندر ہیرے کا ہے

کیے تمہیں بتاؤ۔۔۔ ماں

کیوں دُور کیا ہے خود سے اتنا

گھر لوٹ بھی نہ پاؤ۔۔۔ ماں

سب جگ پھونٹا، تم بھی رو چھیں

<http://kitaabghar.com>

کیے تمہیں مناؤں۔۔۔ ماں

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

ادب اور ادیب کا ترجمان ادب کی روشن کرن

ادبی قلمکار

تئے ادبیوں کا رہنماء ادارہ جو آپ کی صلاحیتوں کو
مزید تکھارنے کے موقع دینا چاہتا ہے۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

ادبی قلمکار کراچی

0333 222 1689

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش راجہ کی کہانی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

آدمی کو گئے آج دوسرا رات تھی۔ راجا بھی بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ کل جب وہ باقی تمام دوستوں کے ساتھ آدمی کو اٹھیں پرالوداع کہنے گیا تھا کہ آدمی کے ساتھ ہی اس کے جسم اور روح کا آدھا حصہ بھی اسی ٹرین میں کہیں دور جا رہا تھا۔ راجہ سوچ رہا تھا کہ آج کی رات آدمی کی کیڈٹ کالج میں پہلی رات ہو گی۔ جانے آدمی کو تکمیل کیسا ملا ہو گا۔.....؟ جانے اس کا بستر آرام دہ ہو گیا فوجیوں نے اسے بھی اپنی طرح بان کی کھڑی چارپائی پر سلاپا یا ہو گا۔ آدمی کو تو اپنے پندیدہ پروں والے عکیے پر سر کھے بغیر نیند بھی نہیں آتی تھی، جانے وہ اپنے عکیے کے بنا رات کیے گزارے گا۔ آدمی نے راجہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب بھی عمارہ اور فارمی بھی ادا جان کے گھر رات رہنے کے لیے چلے جاتے ہیں تو اس کی ای اندھیرے کمرے میں تھا نہیں چھوڑتیں اور اپنے کمرے میں سلاتی ہیں۔

راجہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ نجائزے آج آدمی کو وہاں کیڈٹ کالج میں تھا نہیں آبھی رہی ہو گی یا نہیں۔۔۔ جب سے اس نے ہوش سنجا لاتھا یہ اس کی زندگی کی دوسرا رات تھی جب وہ آدمی سے ملے بغیر اور اگلے دن کا کوئی منصوبہ ہائے بغیر سونے کے لیے بستر پر آیا ہو۔ ایک کل کی رات جب آدمی ٹرین میں سفر میں تھا اور دوسرا آج کی رات۔ ورنہ ایسا بھی ہوا نہیں تھا کہ وہ دونوں رات کو اپنے اپنے گھر جانے سے پہلے کسی کلی کے نکل پر محلے کے بڑے میدان میں یا کالونی کے چھاٹک پر دیگر دوستوں سمیت نہ ملے ہوں یا انہوں نے اگلے دن کی کسی شرارت کا پروگرام نہ بنایا ہو۔ آج رات بھی گذڑ، پوپ، نخو، بالا بھی تو رات تک اکٹھے ہی تھے لیکن آج ان سب کامن کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ نخو تو آدمی کے ذکر پر دو مرتبہ رو بھی چکا تھا۔ آدمی کے بنا نہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس شام آسمان کے تیور بھی کچھ بد لے بد لے سے تھے۔ راجہ کو یاد آیا کہ برسی برف کی راتوں میں بھی وہ سب کسی نہ کی طور آدمی کو اس کے سخت مزاج ایسا کی نظر سے بجا کر باہر بلایا کرتے تھے اور پھر وہ سب دوست مل کر محلے کے بڑے میدان میں بڑا سا برف کا پتلا بنایا کر سے کسی گلی میں ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیتے تھے جہاں آتے جاتے راہ گیر رات کو اچاٹک اپنے سامنے کسی شخص کو سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں پسل (جو کر اصل میں راجہ کا حکومتی پتوں ہوتا تھا) پکڑے دیکھ کر ایک لمحے کو تو سر ایسیدہ ہی ہو جاتے تھے۔ کئی ایک تو چیختنے چلاتے ائمہ پیروں بھاگ جاتے، انہی میں سے ایک سینٹھ گردھاری مل بھی تھے جو ایک رات ایک ایسے ہی برف سے پتلے سے ڈر کر یوں بھاگے تھے کہ انہیں اپنی بڑی سی دھوتی سنجا لانا بھی مشکل ہو گئی تھی اور دو رخت کے پیچھے چھپے ان سب دوستوں کے پیٹ میں بس پس کر بل پڑ گئے تھے۔

یہ سب کچھ یاد کر کے راجہ کے بیوی پر بھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کل شام جب آدمی کی ٹرین پلیٹ فارم سے چھوٹ رہی تھی اس سے لے کر اب تک اس کا دل کثنا جا رہا تھا اور کل پلیٹ فارم پر تو خود ہو آپی بھی پھوٹ پھوٹ کر ردویں تھیں جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچیں تو گاڑی چل پڑی

تھی۔ سب سے پہلے راجہ ہی کی نظر ان پر پڑی تھی اور وہ بھاگ کر راجہ کے پاس ہی آئیں تھیں۔ تب راجہ کے منہ سے تو کوئی لفظ نہیں نکل پایا تھا لیکن اس نے انگلی اٹھا کر ہو آپی کو اس بیوگی کی نیشان دہی کروادی تھی جس کی گھڑکی میں سے راجہ سر باہر نکالے بیٹھا ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ بدار ہاتھا۔ ہو آپی تو بے چاری تھیک طرح سے آدمی کی جانب دیکھ کر ہاتھ بھی نہیں ہلا پائی تھیں کہ تین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ تبھی ہو آپی نڈھال سی ہو کر وہیں پلیٹ فارم کی کرسی پر جیسے ڈھنے سی گئی تھیں اور ان کی آنکھوں سے برکھا کی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ وہ راجہ سے اور آدمی کے باقی دوستوں سے بس ایک ہی سوال پوچھ دی تھیں کہ آدمی ان سے ملے بنا ہی کیوں چلا گیا؟ لیکن اس سوال کا جواب تو خود راجہ سمیت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ہو آپی کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ آدمی ان سے ملے بنا تھی دوڑ چلا گیا ہے۔ انہوں نے راجہ کو بتایا کہ وہ کالج سے واپس آئیں تو آتے ہی انہوں نے آدمی کے لیے جوڑ اسامان اور اس کے تھنے جمع کر کے رکھ دیئے تھے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ آدمی کی ترین شام چار بجے ہے اور ہو آپی تو ساڑھے بارہ بجے دن ہی کو لوٹ آئیں تھیں لیکن وقت دھیرے دھیرے سرکار ہا پھر ہو آپی یہ سمجھیں کہ آدمی گھر والوں سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن کے لیے نکلتے وقت ان سے ملتا جائے گا لیکن جب تین بجے گئے تو انہیں تشویش ہوئی اور انہوں نے فضلو بابا کو آدمی کے گھر کی جانب دوڑایا کہ خیر خبر پوچھ آئیں۔ فضلو بابا چند ہی لمحوں میں اٹھ پاؤں دوڑے چلے آئے اور خبر دی کہ آدمی تو چند لمحے پہلے ہی اسٹیشن کے لیے نکل چکا ہے اور گاڑی کا وقت بھی چار نہیں بلکہ ساڑھے تین بجے کا ہے۔ یہ سن کر ہو آپی کے تباہت پاؤں ہی پھول گئے کہاب کیا کریں۔ تبھی غیاث چچا گھر میں کہیں باہر سے داخل ہوئے تو ہو آپی نے انہیں تمام ما جراستا یا اور تبھی غیاث چچا انہیں بھاگ بھاگ اپنے اسکوڑ پر بٹھا کر اسٹیشن لے آئے تھے پرتب تک آدمی کی ترین روائیہ ہو چکی تھی۔

غیاث چچا نے بڑی مشکل سے ہو آپی کو چپ کر دیا اور انہیں باقی محلے والوں سمیت لے کر واپس آگئے تھے لیکن ہو آپی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں آدمی کے یوں بنانے کا بہت افسوس ہے۔ راجہ خود بھی پوری بات نہیں جانتا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ آدمی ان سے ملے بنا ہی اتنی دور چلا گیا تھا جبکہ یہی آدمی تھا جو محلے سے باہر جانے سے پہلے بھی دس بار ہو آپی سے پوچھتا تھا۔ آدمی ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ ہو آپی کو بھی یہی ایک سوال پر بیشان کیسے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی ایک ہستی پر کس قدر حق جتا کرجی رہے ہوتے ہیں کہ اس ہستی کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جا گنا، چلنا پھرنا..... سب کچھ ہمارے ایک ان جانے اختیار میں ہوتا ہے۔ ایک ایسا اختیار جس کا احساس شاید خود ہمیں بھی تب تک نہیں ہوتا جب تک اچانک کسی ایک دن ہم سے وہ اختیار چھوٹ جاتا ہے تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی انمول نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ شاید ہو آپی کو بھی اس لمحے بھی سب کچھ محسوس ہوا ہو جس نے ان کی جھیل جیسی گھری آنکھوں میں برکھا کی پھوار بھردی تھی۔

بہر حال اس رات کی اس گھڑی راجہ کے لیے آدمی کا یوں ہو آپی سے ملے بنا چلے جانا ایک سر بستہ راز ہی تھا لیکن راجہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ آدمی کے نازک دل کو ضرور کسی بات سے ٹھیس لگی ہوگی، ویسے بھی وہ ہو آپی کے لیے بے حد حساس تھا، انہی سوچوں میں غلطان راجہ کی نظر دیوار پر گلی گھڑی پر پڑی صبح کے ساڑھے چار بجے رہے تھے۔ باہر بادل زور سے گر جے، راجہ نے تھک کر آنکھیں موندھ لیں۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی پریڈ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

رات کے جانے کس پہر ہماری بیرک کے سمجھ بچوں کا رونے کا کورس مکمل ہوا اور چند گھنٹوں کے لیے ہی میری آنکھیں ہی تھیں کہ اچانک یوں لگ جیسے اکیدی میں بھونچاں آگیا ہو۔ ہر جانب سے تیزیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور چاروں جانب ایک بھگڑی سی مجھ گئی۔ میں ہر برا کر انہوں نے بھیک ساڑھے چارنگ رہے تھے، کچھ دیر تو مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں پر ہوں اور یہ جیل کی بارک نما لباس اکمرہ کس کا ہے۔ پھر اچانک ہی ذہن میں جھما کا ہوا۔ میں کیڈٹ کالج میں تھا اور یہ ہماری اس اکیدی میں پہلی صبح تھی۔ صبح خاک تھی، ابھی تو آدمی رات ہی اور باہر اندر ہتھ رکھا۔ باہر ہمارے انسٹرکٹریاں بجا کر ہمیں جگا رہے تھے اور اندر ہمارا پریفیکٹ اسرار چلا چلا کر ہم سب کوڈاٹ کر اخبار ہاتھا کہ باہر پریڈ کے لیے فالن (Fall) ہو رہا ہے۔ بی کوئیک (Be Quick)۔ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو میں کہیں سے بڑا سا کوئی کپڑا لے کر پریفیکٹ کے منہ میں ٹھوٹ دیتا تاکہ اس کی کرخت آواز ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑتی۔

ہمارے بٹ مینوں نے رات ہی کو ہم سب بچوں کی یونیفارم ہماری الماریوں میں کلف لگا کر انکا دیں تھیں، اب یہاں ایک دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں ایک تو یہ باندھ کر کپڑے بدلا تھے کیونکہ یہاں کپڑے بدلتے کا کوئی الگ کمرہ تو تھا نہیں لیکن اس بھگڑی میں کسی کو کسی کی جربہ کیاں تھی۔ کچھ بچوں کے تو لیے پتوں چڑھانے سے پہلے ہی گر گئے اور کچھ نے جلدی میں اٹھ سیدھی یونیفارم پہن تو لی پر کوئی زپ بند کرنا بھول گیا اور کسی کی بیٹ اتنی ڈھیل تھی کہ باہر کی جانب بھاگتے ہوئے پینٹ بیٹ سمیت زمین پر چیچھے پڑی رہ گئی۔ میرے لیے تو یہ پینٹ شرٹ کا یونیفارم دیے بھی عذاب تھا کیونکہ گھر میں میں نے کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تھی۔ میں تو وہاں ہمیشہ کرتا شلوار ہی پہنتا تھا۔ بہرحال میں نے بھی اس پاس فیصل اور اسفر کی دیکھا دیکھی خود کو کسی نہ کسی طرح اس کلف لگا کر ٹھیک ہوئے خاکی یونیفارم میں کھنچ کھانچ کر فٹ کر رہا۔ سر پر ٹوپی جہانی اور باہر کی جانب بھاگا۔ ہمارے انسٹرکٹر جنہیں وہاں پی۔ او (پیٹ آفس) کہتے تھے، نے مجھے تیزی سے ہائل سے باہر کی جانب بھاگتے دیکھا تو وہیں سے زور سے چلا یا۔

”جوان.....ڈاکخانہ بند کرو پان۔“

میں نے گھبرا کر اور ہدایکھا کہ ”یا ب کس ڈاکخانے کی بات کر رہا ہے۔“ وہ پھر چلا یا۔ ”جوان.....کلوز یور پوسٹ آفس۔“ Close your post office۔ جلدی کرو۔“

اب کی بار میں نے اس کی نظر وہیں کے تعاقب میں دیکھا تو میں اپنے پتوں کی زپ جلدی میں بند کرنا بھول گیا تھا۔ ”اوہ.....“ میں نے جلدی سے بھاگتے بھاگتے ہی زپ چڑھا لی۔

ہم ساتویں کے چھوٹے بچوں کے لیے علیحدہ پریڈ سکھانے کا انتظام موجود تھا۔ ہمیں دوڑاتے ہوئے اُسی مُند انہیہرے اور ”آدمی رات“ کے وقت پریڈ گراونڈ پہنچا دیا گیا جہاں باقی سینزرز ایک جانب پریڈ کر رہے تھے اور سی۔ پی۔ او۔ (چیف پیٹی آفسر) کو سلامی دے رہے تھے۔ ساری فضا ”چپ، راس، چپ، راس، چپ، راس (Left, right, left, right) کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ ہم میں سے آدھے جو نیز کیڈیٹس کی آنکھیں اب تک نیند کے اثر سے بند تھیں اور وہ خواب میں چلنے کی سی کیفیت میں پریڈ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری پیٹی آفسر کا نام طالب تھا (جسے بعد میں ہم نے چونسا آم کا خطاب دے دیا تھا)۔ طالب نے ہم سب جو نیز کیڈیٹس کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سب سے پہلے ہمارے یوں مقام چیک کیے جن بچوں کے پیٹ ڈھیلے تھے ان کے پیٹ کو زور دوسرے کھیچ کر ان بچوں کو جھکتے دیئے۔ چند ایک بچوں نے روئے کی کوشش کی تو انہیں زور دار کاش (Caution) کی آواز نکال کر ڈر اکر چپ کروادیا۔ پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر میں چیف پیٹی آفسر محمد بخش صاحب خطاب کریں گے۔ سی۔ پی۔ او۔ ایک انتہائی ڈراؤن اور کرخت قسم کا انسان تھا جسے ہم کیڈیٹس نے کچھ عرصہ بعد بخشوک خطاب دے دیا تھا۔ محمد بخش صاحب نے اشیج پر چڑھ کر پہلے چند عجیب و غریب قسم کی آوازوں نکالیں اور پھر کڑک دار آواز میں ہم سب ”معصوموں“ کو یاد دلایا کہ اب ہم ملک کی سب سے بہترین اکیڈیمی میں ہیں لہذا اپنی ماوں کی گود کا خیال ذہن و دل سے نکال دیں اور سخت دل اور سخت جان بن کر جیسیں پھر انہوں نے جو نیز کیڈیٹس کے پیٹی آفسر کو صرف پندرہ دن کا وقت دیا کہ وہ ہمیں ڈرل میں اس قدر طاقت کر دیں کہ دو ہفتے کے بعد ہم نئے کیڈیٹس بھی اپنے سینزرز کے ساتھ مل کر پوری کمپنی کے ساتھ پریڈ کر سکیں۔ سی۔ پی۔ او (C.P.O.) نے یہ حکمی بھی دی کہ جس بچے نے پریڈ سکھنے میں زیادہ وقت لیا تو وہ اسے الثانیانگ دے گا۔ ہم سب بچوں نے گھبرا کر پریڈ کراؤند میں اور ہرا ہر دیکھا لیکن ہمیں وہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں ہمیں الثانیانگا جا سکتا۔ مجھے فوراً اپنے گھر کی بقریعید یاد آگئی جب قصائی آکر ہمارے بکروں کی قربانی کے بعد ان کی کھال اتنا نے کے لیے انہیں باہر گلی میں گئے ایک بڑے سے لوہے کے کنڈے سے الثانیانگ دیتا تھا۔ مجھے اس لمحے بخشوک ایک سفاک قصائی کے روپ میں دکھائی دیا جو ہم بچوں کو بکروں کی طرح الثانیانگ کرنا کی کھال اتنا نے کے لیے اپنی چھریاں تیز کر رہا ہو۔

کچھ ہی دیر میں طالب ہم سب جو نیز کیڈیٹس کو ہائک کر مرکزی پریڈ گراونڈ سے ملکی ایک اور چھوٹے گراونڈ میں لے آیا۔ وہاں ایک عجیب شخص لمبا سا کوت پہنے سامنے ایک کالا بکس (صندوق) رکھے بیٹھا تھا۔ قریب ہی ایک لمبا سا اسٹول پڑا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے سے فیصل سے پوچھا جو میرے ساتھ ہی بے زار سا کھڑا تھا۔

”یہ کیا بلاہے؟“

فیصل نے ایک لمبی سی جھائی لی۔

”مجھے تو یہ کوئی جگوار (Jaggular) دکھائی پڑتا ہے۔ ہمارے پرانے سکول میں اس قسم کے نمونے میں ایک آدھ مرتبہ آکر تماشہ دکھا جاتے ہیں۔ تم دیکھنا یا اب ہم سب بچوں سے پیسے مانگے گا۔“

لیکن ہماری توقعات کے بر عکس اس شخص نے اپنا اسٹول سیدھا کیا اور اپنے صندوق میں سے ایک بڑا سا کالا کپڑا انکلا۔ طالب پی۔ او۔ اچانک زور سے دھاڑا۔

”کیڈٹ ٹوپی اتارے گا۔ کیڈٹ ٹوپی۔۔۔ یہی۔۔۔ یہی۔۔۔ اتار۔“

اس نے ٹوپی۔۔۔ یہی۔۔۔ پر اس قدر زور دیا اور لفظ کو اتنا کھینچا کہ ہم سب نے گھبرا کر ٹوپیاں اتار کر باقاعدہ اس کے قدموں میں پھیک دیں کہ ”لو بھئی اپنی ٹوپی، ہم نے کب کہا تھا کہ ہمیں چاہیے؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

یا اللہ یہ کیا ذرا رام ہے؟ کبھی کہتا ہے ٹوپی اتار کبھی کہتا ہے ٹوپی اٹھا۔ پھر پی۔ اونے ہمیں خود یمانشیریٹ (Demonstrate) کر کے بتایا کہ ٹوپی کو کس طرح کندھے پر لگے بلکل میں پھسایا جاتا ہے۔ ہم میں سب سے دائیں جانب اسٹرکٹھ اھا۔ پی۔ اونے اس کو دو قدم آگے آنے کا کہا۔ اسٹرگھبرا کر کچھ زیادہ تی آگے بڑھ گیا۔ طالب نے اسے جھاڑ کر دو قدم پیچھے جانے کا کہا۔ اس بارا سفر ہم سے بھی پیچھے چلا گیا۔ پی۔ اونے جھنجھلا کر اسے اس کے بیٹھ سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے اسٹول تک لے گیا اور اسٹول پر بٹھا دیا۔ جادو گرنے اپنے صندوق میں سے اپنے ”اوزار“ کالے اور تب ہمیں سمجھا یا کہ یہ تو جام ہے۔ میں نے گھوڑ کر فیصل کو دیکھا۔ فیصل آہستہ سے بڑھا دیا۔ ”کمال ہے۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب یہ کرت و کھائے گا۔“ اور پھر اس جام نے واقعی کرت و کھانا شروع کر دیے۔ گیارہ بچے تو صرف ہم ”قاسم ہاؤس“ والے تھے جبکہ اسی طرح باقی ہر ہاؤس کے ساتوں کلاس کے گیارہ گیارہ بچے یعنی کل ملا کر چھ بھائیز کے چھیاٹھ (۲۶) میں اس کم بخت نے کل چھیاٹھ (۲۶) منٹ بھی نہیں لیے۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا پیالہ لے کر آیا تھا جو بدستی سے ہم سب بچوں کے سر پر مکمل فٹ آتا تھا۔ وہ پیالہ ہمارے سر پر رکھ کر آس پاس مشین پھیردیتا اور پھر پیالہ اتار کر ”باتی ماندہ“ سر پر اپنی بے رحم قینی اس طرح چلاتا کہ پکھھی دیری میں ہم سب کی شکنیں بھی پچانی نہیں جاری تھیں پھر طالب پی۔ اونے ہم سب کے سینوں پر ہمارے کٹ نمبرز کی پیٹیں لگادیں اور بتایا کہ آج سے ہماری بچپناں بھی نمبرز ہیں۔ میرا کٹ نمبر 8336 تھے ہمارا پی۔ او بڑی لے میں ”تراسی چھتی“ کہتا تھا۔ اب اگلے چھ سال کے لیے میں تراسی چھتی تھا۔ میں نے جام کے ہاتھ میں پکڑا چھوتا سا شیشہ دیکھا ہے وہ ظالم جام بال کاٹنے کے بعد ہم بچوں کو دکھا کر ڈرانے کا کام لیتا تھا۔ میرے دل نے ہلکے سے مجھ سے سرو گوشی کی۔ ”آدمی بیٹا۔۔۔ یہ کن وحشیوں کے ٹو لے میں آن پھنسنے ہو۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر انہوں نے اگر تمہارا یہ حال کر دیا ہے تو نہ جانے آگے چل کر کیا کیا نہ ہو گا۔“

وفعت پھر سے وہی منحوں سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پتہ چلا کہ پریڈ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر سے بھگاتے ہوئے پی۔ اوکی معیت میں ناشتے کے لیے میں بھجوادیا گیا۔ ناشتے کی میز پر پھر سے وہی مسئلہ۔ اپنے گھر میں تو امی تندور کی خشک روٹی پر مجھے تھوڑا سا مکھن یا اصلی گھنی لگا کر دے دیتی تھیں اور میں چائے کے پیالے کے ساتھ ناشتہ کر لیتا تھا۔ سر دیوں میں ہم سب بچے کر کے میں کو کلے کے اسٹوپ کے گرد جمع ہو کر بیٹھ جاتے اور اس کے چمنی کی طرف جاتے پاپ کے اوپر اپنی اپنی روٹی رکھ کر گرم کر کے اور مکھن لگا کر مزے سے کھاتے جاتے اور اپر سے امی کے ہاتھ کی بنی گرم گرم چائے کے گھوٹ۔۔۔ آہ۔۔۔ تب زندگی کتنی حسین تھی لیکن یہاں تو میز پر ہی چھری کاٹنے، بوائل اندھوں کے مخصوص کپ، مار جرین، مایونیز، توں، فرجخ توں اور ان سب کو کھانے کے لیے سب ہی اپنے گلے میں رومال باندھے چھری کاٹنے اٹھائے ہوئی نفاست سے کاٹ پیٹ کر اور کافٹوں میں پروپر کر حلقت سے اتار رہے تھے۔ میں نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے جلدی سے ڈبل روٹی توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو

اسرار پر میٹیکٹ نے (جو ہماری میز کا انچارج تھا) گھوکر مجھے دیکھا اور چھپری کا نئے کا استعمال کرنے کا کہا۔ میرا دل چاہا کہ وہیں سے ایک ابلہ ہوا اندھہ اٹھاؤں اور اس کے سر پر دے ماروں۔ فیصل جو گزشتہ رات بھی میری مصیبت کا مشاہدہ کر چکا تھا اب سمجھ گیا تھا کہ مجھے ان اوزاروں کی کلری کے ساتھ کھانے کی عادت نہیں ہے۔ اس نے تیزی سے جام اور مکھن لگا کر ایک توں بنایا اور درمیان میں آمیٹ کا بڑا سائلکار کر میز کے نیچے ہی سے کہنی مار کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بناء کسی توقف کے فوراً توں طلق سے پار کر دیا اور فیصل کو اشارہ کیا کہ خدا کے لیے یہ ”بیرونی امداد“ جاری رکھے۔ وہاں کی چائے کا انتظام بھی انہیلی بے ہودہ تھا۔ گرم پانی الگ تھا، پتی کے پیکٹ الگ دھرے تھے اور دودھ اور چینی کسی تیرے کو نہیں میں رکھے ہوئے تھے۔ پہلے پہل تو میں نے تھرماں سے جب کپ میں اپنی جانب سے چائے انڈیلی توں میں سے صرف گرم پانی نکلتے دیکھ کر میری توہنی ہی چھوٹ گئی۔ ”بڑے مہذب بنے پھرتے ہیں اور اپنا حال یہ ہے کہ تھرماں میں چائے کی بجائے بھول کر صرف گرم پانی ڈال کر بیجھ دیا ہے۔“ میں نے اپنے سر پر کھڑے مٹکنیک سے کہا کہ یہ گرم پانی لے جا کر کہیں پھینک دے اور مجھے اس میں چائے لادے۔ مٹکنیک نے سمجھ دیکھے سے پوچھا۔ ”سرمیں آپ کے لیے چائے بنادوں؟“

میں نے حرمت سے ادھرا دیکھا لیکن مجھے آس پاس کہیں کوئی چولہا نظر نہیں آیا جس پر وہ میرے لیے چائے بنائے۔ بہر حال میں چپ ہی رہا۔ تب اس بلنے میرے سامنے ہی یہ ساری چیزیں ادھرا دھرے جمع کر کے میرے کپ میں ڈال دیں اور کچھ دیر ہلانے کے بعد وہ چائے نما چیزیں میرے سامنے رکھ دی اور انہیلی مودب انداز میں ”ٹی سر.....“ (Tea Sir) کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے حرمت سے اپنے کپ کی جانب دیکھا۔ لگتی تو چائے ہی تھی لیکن نہ توں نے پتی چینی اور دودھ ڈال کر اسے امی کی طرح تین چار بالیاں دیں تھیں اور نہ ہی اس پر جھاگ بننے دی تھی جس سے چائے کی اصل خوبی فضایں بکھرتی ہے۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ارے یہ کیا؟ مجھے زور کی ایک ابکانی آئی اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے سامنے ہی بیٹھنے اسٹر کا چہرہ چائے سے رنگی ہونے سے بچایا۔

یہ چائے تھی یا کاڑھا.....؟ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ بد مردہ چائے آج تک نہیں پتی تھی لیکن حرمت کی بات یہ تھی کہ باقی کیدڑش مزے لے لے کر بھی کاڑھا اپنے طلق سے اتارے جا رہے تھے۔ میں نے غصے سے چائے کے کپ کی جانب دیکھا۔ گویا ب یہی چیز چائے کے نام پر مجھے یہاں پتی پڑے گی؟ لعنت ہو ایسی زندگی پر جس میں انسان کو ڈھنگ کی چائے بھی پینے کو نہ ملے۔ اس لمحے مجھے امی کے ہاتھ کی چائے بے تحاشا اور اس قدر شدت سے یاد آئی کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں تب چونکا جب فیصل نے پھر سے مجھے کہنی ماری اور توں میز کے نیچے سے میرے حوالے کیا۔ اس مرتبہ توں کے میٹھے جام کے ساتھ میرے آنسوؤں کی کڑاہت بھی میرے طلق سے نیچے اتر گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہی سینر کیڈٹ اٹھا اور اس نے اپنا پیٹ بھر جانے کے بعد بنایا دیکھئے کہ ہم معصوم بچوں نے ابھی تک اپنا ناشتم ختم نہیں کیا۔ زبردستی مایک پر آ کر چنبلیوں کی الحمد للہ کروادی۔ پریمیکٹ اپنی پلیوں سے ابھی تک چکے ہوئے جو نیر کیدڑش کو بھیت کھانچ کر کھڑا کرنے لگے۔ اب یہاں سے ہم سب کو اپنی اپنی کلاس کی جانب جانا تھا۔ میں نے میں کی گھری کی جانب دیکھا۔ صبح کے آٹھوچھر ہے تھے۔

کتاب گھر کی پیشکش

محافظ

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

ر الج کی ماں زور سے چلا گئی۔

”لڑکے تو آج میری بات کیوں نہیں ملتا۔ صبح کے آٹھ جنگ گے ہیں۔ تجھے اسکوں نہیں جانا آج۔ اب آدمی نہیں آئے گا تجھے اپنے ساتھ لے جانے۔ چل جلدی کر۔“

ر الج نے ماں کی مسلسل چھٹی مرتبہ ڈاٹ سنی اور بر اسمانہ بناتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر ماں کے پاس باور پی خانے میں آگیا۔

”ماں..... آج میرا من نہیں ہے اسکوں جانے کو۔“

اس کی ماں نے جلدی جلدی ر الج کا پراٹھا توے سے اتارا اور انڈے کی پلیٹ ر الج کی جانب بڑھائی۔

”جانشی ہوں تیرا من آدمی کے بغیر کہیں نہیں لگے گا اب۔ کاش تو آدمی سے ہی کچھ عقل ادھار لے لیتا۔ کیسا ہونہا ر بینا نکلا وہ اپنے ماں باوا کا۔ کتنے بڑے فوجی اسکوں میں داخلہ ہو گیا اس کا۔ کل کو بڑا افسر بن کر آئے گا تو پورے محلے کی شان بڑھائے گا اور تو اور تیرے باقی نکلے دوست بیٹھے رہنا یا نہیں۔ ارے تم لوگوں کو تو آدمی تاب اپنا چپڑا اسی بھی نہ لگائے گا۔“

ر الج کی ماں جانے کیا کیا بڑی بڑی رہی۔ ناشستہ کرتے ہوئے ر الج سوچنے لگا کہ کیا واقعی آدمی بڑا افرنبختے کے بعد اپنے دوستوں سے منہ پھیر لے گا؟ پھر خود ہی اس نے اپنی سوچ کو زور سے سر جھٹک کر پرے کر دیا۔ ”نہیں نہیں۔ آدمی ایسا بھی نہیں کرے گا بلکہ ر الج کو پورا عین تھا کہ آدمی بڑا افسر بننے کے بعد اپنے سارے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ ہی اپنے بنگلے میں رکھ لے گا۔“ اتنے میں باہر و جو آپی کے تانگے کے بھونپوکی آواز گوئی۔ دفعتہ یہ آوازن کر ر الج کے ذہن میں زور سے ایک جھما کا ہوا۔ آدمی نے جانے سے پہلے ر الج کو تختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ ہمیشہ تو آپی کے کان جانے اور واپس آنے کے وقت محلے کے پھانک پر یا بڑے میدان میں موجود رہے تاکہ کوئی دوبارہ ہو آپی کو تگن نہ کر سکے۔ ر الج نے اپنی بھلکلہ طبیعت کو کوسا اور یستھا کر باہر کی جانب بھاگا۔ اس کی ماں اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی کہ اپنا ناشستہ تو ختم کرتا جائے لیکن اب ر الج کو کسی اور بات کا ہوش ہی کہاں رہ گیا تھا۔

ر الج تیزی سے دوڑتے ہوئے بڑے میدان تک پہنچا اور یہ دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑے میدان میں ہو آپی کے گھر کے باہر ان کا تاگل ابھی تک کھڑا تھا جس کا مطلب تھا کہ ہو آپی ابھی تک گھر سے باہر نہیں لکھی ہیں۔

ر الج نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کیں کہ آس پاس کوئی مخلوق شخص تو موجود نہیں لیکن میدان سنان تھا۔ اتنے میں طاہر بھائی دور سے اپنے

گھر سے اپنے مخصوص انداز میں اپنا سفید گوٹ اور کانوں کو لگانے والا آلے اپنے ہاتھ میں پکڑے لئے اور ایک اچھتی سی نگاہ ڈھاؤپی کے تالے لئے پر ڈالتے ہوئے محلے کے چھانک کی جانب بڑھ گئے۔ پتہ نہیں کیوں راجہ کو آدمی کے جانے والے دن سے ہی اندر ہی اندر کہیں یہ یقین ضرور تھا کہ آدمی کے یوں ڈھاؤپی سے ملے بنا چلے جانے کی وجہ طاہر بھائی ہی ہیں۔ اتفاق سے طاہر بھائی کے چھانک تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بس محلے کے گیٹ پر آ کھڑی ہوئی اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔ طاہر بھائی نے ایک لمحے کو پلت کر دیکھا اور پھر جلدی سے بس میں سوار ہو گئے۔ بس کے آگے بڑھتے ہی ڈھاؤپی کے گھر سے فضلو بابا نکلے اور کھانتے کھانتے ڈھاؤپی کا بیگ وغیرہ تالے پر رکھا نے لگے۔ اچانک اسی وقت کسی گلی کے نکلا سے اٹو گلے میں اپنا مخصوص روپاں باندھے برآمد ہوا، شاید وہ فضلو بابا کے نکلنے کا ہی انتفار کر رہا تھا اور اس نے طاہر بھائی کو محلے سے نکلتے دیکھا ہی نہیں تھا ورنہ یہ ہونہیں سکتا تھا کہ وہ ان کی راہ نہ روکتا یعنی اس کی ساری توجہ اس وقت گھر سے سر جھکائے نکتی ڈھاؤپی کی جانب تھی۔ راجہ کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ اٹو تو جان ہی کو آگی تھا۔ راجہ نے آس پاس کسی بڑی اینٹ یا پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑا کیں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اٹو نے آج ڈھاؤپی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ بنا کچھ مرید سوچے اسی پتھر سے اٹو کا سر پھوڑ دے گا۔ راجہ نے اپنی پوری ششن سنبھالی۔ اٹو نے ڈھاؤپی کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کرتے میں ڈھاؤپی کے پیچھے ہی گھر سے غیاث چھا بھی برآمد ہوئے۔ وہ اپنے اسکوٹر پر تھے۔ راجہ اور اٹو کو ہی یہک وقت ہی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ڈھاؤپی تالے پر بیٹھ گئیں۔ غیاث چھاتا تالے کے پیچھے پیچھے گیٹ تک اپنے اسکوٹر پر چل دیئے۔ پھر تالے ایک جانب اور غیاث چھا دوسرا جانب مڑ گئے۔ راجہ نے ایک گھری سی سانس لے کر پتھر پھینک دیا۔ اٹو جو دور کھڑا راجہ کی اس تمام کارستانی سے بے خبر تھا، وہ بھی بے زاری سے واپس گلی میں مر گیا۔ راجہ نے اپنا بستہ اٹھایا اور اسکوں کی جانب بھاگ گیا۔

کتاب گھر کی پیشکش دو بوندیں ساون کی گھر کی پیشکش

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جنفری آرج کے شہرہ آفاق ناول کیں اینڈہ استبل کا ہے اور دوزبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقیقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و بر باد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چیچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرے بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاذ زمانہ تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جاستا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش چینچ پہلا

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

مجھے فیصل اور اسٹر کو ساتویں الف (A 7th) میں جانے کو کہا گیا تھا لہذا ہم سب اس وقت اپنی جماعت کے ڈیک Desk سنjal چکے تھے۔ ہماری کتابیں پہلے ہی سے ہمارے ڈیک میں موجود تھیں۔ میں نے کتابیں دیکھیں۔ سبھی بالکل نئی تھیں۔ جبکہ گھر میں ہمیشہ مجھے عمارت کی پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں لیکن یہاں پھر ان کیڈٹ کالج والوں سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ میں نے ساری کتابیں الٹ پلٹ کرو کیوں لی تھیں لیکن ان میں سوائے ”اردو کی ساتویں کتاب“ کے دوسرا کوئی تھی ہی نہیں۔ نہ ہی معاشرتی علوم، نہ سائنس، نہ ہی ریاضی اور دینیات کی کتاب موجود تھی۔ پرانیں کس کس کی کتابیں اٹھا کر میرے ڈیک میں بھروسی گئی تھیں۔ یہ سب کی سب انگریزی سبھی ایسی کمیرے پلے تو ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ ہم نے اپنے پانے اسکول میں ابھی زیڈ فارز زیر Zebra for Thirsty Crow شروع کر کھی تھی لیکن ان ساری کتابوں میں میری والی انگلش گرامر کی کتاب تو کہیں دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کس سے کہوں کہ میرے پاس غلط کتابیں آگئیں کہ ایک صاحب بڑا سا کالا لچڑھا (گاؤں) پہنے اندر داخل ہوئے، سب کیڈٹ اس ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ پتہ چلا کہ یہ صاحب انور شاہ ہیں اور یہی ہمارے ٹیچر بھی ہیں۔ انوار صاحب نے اپنے موٹے سے چھٹے کے پیچھے سے ہم سب کیڈٹ کو بغوردی کیا اور سب کو اٹھ کر فردا فردا اپنا تعارف کروانے کا کہا۔ تعارف کے بعد سبق دھراتی کا مرحلہ شروع ہوا۔ انوار صاحب خاص انگریزی کے استاد تھے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں ہر مضمون پڑھانے کے لیے ہر پیریڈ میں ایک الگ استاد آئے گا۔ مجھے تو یہ انوار صاحب بھی کافی لائق فائق نظر آرہے تھے، کوئی حرج نہ ہوتا اگر بھی ہمیں سارے مضمون پڑھادیتے، خوانوواہ اکیدی و والوں نے اتنی ”فضول خرچی“ کی۔ کیڈٹ مطبع کے بعد میر انبر آگیا اور مجھے ٹیچر نے انگلش کی کتاب نکالنے کا کہا۔ میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ یہاں تو ساری کتابیں ہی انگلش کی ہیں، کون سی والی نکالوں، میں اپنے ڈیک کو کھنگاں ہی رہا تھا کہ میرے ساتھ ٹیچر نے جلدی سے ایک کتاب در ق پلٹ کر میرے حوالے کر دی۔ چلو پہلا مرحلہ تو سر ہو گیا پر اب آگے کیا کروں.....؟ انوار صاحب نے دوبارہ ذرا جھٹک کر کہا کہ ”بوائے..... فرست لیسن (First Lesson) سے شروع کرو۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی یہ بھی نہیں پتہ کہ N.O.E.S.S.O.L کیا ہوتا ہے.....؟ اس موقع پر پھر اسٹر نے میری مدد کی اور جلدی سے اٹھ کر صفحہ پلٹ کر میری انگلی تیسرے صفحے پر ایک سبق پر رکھ دی۔ میں نے یہ جوڑ کر شروع کرنے کی کوشش کی لیکن بہت کوشش کے بعد بھی لفظ نہیں جوڑ پایا۔ انوار صاحب اور پوری کلاس مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اب انوار صاحب زور سے گر جے۔

”تم پڑھنا شروع کیوں نہیں کر رہے۔ وائے ڈونٹ یواشارٹ ریڈنگ؟“ میری سمجھ میں اس وقت اور کچھ نہیں آیا اور میں نے فوراً روتا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے چھوڑ کر اگلے بچے کی جانب بڑھ جائیں گے۔ مجھے روتا دیکھ کر اگلی لائن میں بیٹھے اشتیاق موٹے اور عمر نے بھی روتا شروع کر دیا۔ شاید انہیں بھی میری طرح سبق نہیں آتا تھا۔

انوار صاحب ہمیں روتا دیکھ کر بوکھلا سے گئے اور انہوں نے جیرت سے مجھ سے پوچھا کہ میں روکیوں رہا ہوں؟ کیا میں ہوم سکنس (Home Sicknes) فیل کر رہا ہوں؟ اس وقت میرے فرشتوں کو بھی نہیں پڑھتا تھا کہ یہ ہوم سکنس کیا بلا ہوتی ہے۔ میں نے انہیں روتے روتے بتایا کہ یہ کتاب میں میری سمجھ سے بالکل باہر ہیں اور میں نے آج تک کبھی اتنی ساری انگریزی کی کتابیں اکٹھی نہیں دیکھیں۔ ہماری توانگش کی کتاب میں بھی سامنے اردو میں اس انگریزی لفظ کے جچے لکھے ہوتے تھے جبکہ یہاں تو صفحے کے صفحے انگریزی میں کالے کئے ہوئے تھے۔ یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ٹیچر حیرت زدہ سے میری داستان سنتے رہے اور پھر انہوں نے فوری طور پر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے لیتے ہوئے اکیدی کے دوسرے حصے میں لے آئے اور تب میں نے دیکھا کہ ہم پر پسل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں کل بھی ابا کے ساتھ اس کمرے میں آپ کا تھا۔ اس پر کل بھی وہی کمانڈر علی احمد اسرا رکی تختی گی ہوئی تھی۔ انوار صاحب نے کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر اندر بھیجا اور چند لمحوں میں ہمیں اندر بلا بیا گیا۔ پر پسل صاحب اپنی بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور ٹیچر سے پوچھا۔

”لیں مشر انوار..... اینی پر اپلمب..... Yes Mr. Anwar, Any Problem“ انوار صاحب نے پر پسل کو بیجان خیر انداز میں بتایا کہ یہ پچھلے سے ہماری اکیدی میں آگیا ہے۔ یہ تو ارودمیڈیم ہے اور اس نے ابھی اے۔ بی۔ سی ختم کی ہے جبکہ یہاں تو ساتوں جماعت میں آکسفورڈ شینڈرڈ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور تو اور یہ تو ابھی معاشرتی علوم، دینیات اور ریاضی کے پھیر سے ہی باہر نہیں لکھا۔ اسے تو ان مضامین کے انگریزی ناموں کا بھی پڑھنے ہیں۔ چہ جا یکہ ان مضامین کو انگریزی میں پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھنا؟ انوار صاحب نے پر پسل کو پورے یقین سے کہا کہ یہ پچھے باقی کلاس کے ساتھ نہیں چل پائے گا۔ انہیں تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ مجھے اس اکیدی میں داخلہ کیسے مل گیا کیونکہ یہاں داخلے کے لیے ہر بچے کو ایک بہت سخت امتحانی میٹیٹ اور زبانی سوال جواب (ائز و یو) سے گزرنا پڑتا تھا۔

پر پسل نے بڑے غور سے ان کی ساری بات سنی۔ مجھے ان دونوں کی گفتگو کا صرف وہی حصہ سمجھ میں آیا جو انہوں نے درمیان میں کہیں کہیں

اردو میں بولا تھا لیکن میں ان دونوں کی گفتگو کا لب باب سمجھ گیا تھا۔

پر پسل نے ٹیچر کو بتایا کہ میرا چنان اوپر فیڈر ل گونمنٹ نے بطور فیڈر ل سیکم کے امیدوار کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مرکزی حکومت ملک کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں سے ہر سال چندایسے بچوں کو چنتی تھی جن کا اپنے اسکول میں تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہو لیکن وہ ایسے مہنگے اور دور روز کے کیڈٹ کالج اور اکیدی میز کی پڑھائی کا خرچ خود برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ حکومت کی ایک خاص ٹیم ہر علاقے میں جا کر خود ایسے بچوں کا چنان اور کر کے ان بچوں کو اپنے خرچے پر ان دور روز کے کیڈٹ کا الجوں میں بھجوائی تھی۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ یہ پچھا آکسفورڈ کے معیار کی کتاب

نہ پڑھ سکتا ہو یکن بہر حال اپنے اسکول کا ایک ہونہار طالب علم ہو گا تھی اسے اس کیڈٹ کا لج میں بھیجا گیا ہے۔ لہذا بیان کی ذمہ داری ہے کہ اس بنچے کو باقی بچوں کے معیار کے بر ابرا لایا جائے۔

انوار صاحب نے ماہی سے سرفی میں ہلایا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ناممکنات میں سے تھا۔ مجھے جیسے اردو میڈیم بنچے کو چند دنوں میں آکسفورڈ لیوں کی تعلیم والا کرسب کے بر ابرا لانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں خود بھی اس وقت انوار صاحب کی بات سے متفق تھا۔ بھلا مجھے جیسے گزار کے لیے چند دنوں میں ان انگریزی کتابوں کے اب اگر گھوول کر پی جانا ناممکن نہیں تو اور کیا تھا؟

پرنسل نے انوار صاحب کو مجھے ایک ہفتہ "انڈر آبڑ روشن" رکھنے کا کہا اور چلتے چلتے انہوں نے انوار صاحب کو انگریزی میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب میں اس وقت تو نہیں سمجھ پایا لیکن آگے چل کر میری زندگی کی کئی تین را ہیں متعین کرنے میں اس جملے نے کلیدی کرواردا کیا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو پہنچے سے پرنسل صاحب کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر انوار..... ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے بی ویری کئی فل اباؤٹ داسیف رسپیکٹ آف داکڈ"

"Be very carefull about the self respect of the kid."

مجھے اس لمحے ان کی انگریزی میں کہی ہوئی یہ بات سمجھنیں آئی اور جب بہت عرصے بعد میں کمانڈر صاحب کا یہ جملہ سمجھنے کے قابل ہوا تب مجھے احساس ہوا کہ ان کا یہ جملہ ہی آگے چل کر کہیں نہ کہیں میرے کروار کی بنیاد بن چکا تھا۔

انوار صاحب نے پرنسل کی بات سن کر اب اس میں سر ہلا کیا اور مجھے پرنسل کے آفس سے لے کر نکل آئے۔ اس دن کلاس میں مجھ سے پھر کسی دوسرے پیچرے نے کچھ نہیں پوچھا تھا حتیٰ کچھ پڑھنے کو کہا۔ بس بہی پیچر مجھے یہ سمجھاتے رہے کہ میں دوسرا کیڈٹ کو دھیان سے پڑھتا ہوا دیکھوں اور سنوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سارے استاد کلاس میں بچوں سے انگریزی میں بات کرتے تھے اور ان کی باتیں میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ اس مرحلے پر بھی اس فرماور فیصل میرے کام آئے اور ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی مجھے اردو میں ان باتوں کا ترجمہ پیچر سے نظر بچا کر بتاہی دیتا تھا۔ خدا کر کے پہلے دن کی کلاس ختم ہوئی اور ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے میں جانے کا موقع عمل گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے آس پاس موجود فیصل اور اسفر کی مدد سے کسی نہ کسی طور زہر مار کر ہی لیا۔ اب دو گھنٹے کی بریک تھی اور پھر شام ساڑھے چار بجے ہمیں کھلیل کے میدان میں پہنچنا تھا۔ عجیب زبردستی تھی۔ میرا دل سونے کو چاہ رہا تھا لیکن پھر سے وہی منحوس سیٹوں کا عذاب اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ بار بار لباس تبدیل کرنے کی فہیک (Fatigue) بھلا اس غدر میں کس بچے کا دل کھینے کو چاہ رہا ہو گا؟ لیکن نہیں جتنا ب، زبردستی سب کو کر کت، ہا کی اور فٹ بال کی ٹیموں میں تقسیم کر کے کھینے کا حکم دے دیا گیا۔ کھلیل کے فوراً بعد سب بچوں کو شاور لینے کی ہدایت کی گئی اور پھر شام کی "چیل قدی" کا لباس پہننے کا حکم دیا گیا۔ پہنچا چلا کہ اب شام کی چائے پیش کی جائے گی۔ چائے.....؟ ہونہہ..... چائے کے نام پر پھر وہی بد مرہ مخلوقوں میں پینے کے لیے دے دیا گیا۔ ابھی اس مخلوق کی کڑواہت حلقوں میں موجود تھی کہ ساڑھے چھبیس کے قریب پھر سے سیٹاں بجھنے لگیں۔ یادا ب کیا مصیبت آ گئی؟ بتایا گیا کہ اب ہر بچہ اپنی اپنی میز کری پر بیٹھ کر ایک گھنٹہ پڑھے گا اور اسکول کا کام کرے گا۔ اس مرحلے کو ایونینگ پریپ (Evening Prep) کا نام دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد

دوسری سیٹی بجی اور ہمیں ڈنزروٹ پہنچ کر میں جا کر رات کا کھانا کھانے کا حکم دے دیا گیا۔ کیا ہے؟ وہ نظام تھا۔ بھلارات آٹھ بجے بھی کوئی رات کا کھانا کھاتا ہے؟ مجھے شدت سے اس وقت راجہ اور غفور چچا کی ٹوپی کی یاد آئی۔ میں نے سوچا اس وقت راجہ، نخو، پوپو، گدھو، بالا اور مشی، میرے سارے دوست غفور چچا کے گھر بیٹھ کر مزے سے ڈرامہ دیکھ رہے ہوں گے اور ایک میں بد قسمت ہوں کہ یہاں یہ عجیب قسم کا باس پہنچانے جو کروں کے درمیان پھنسا رات کا کھانا کھانے ”لے جایا“ جا رہا ہوں۔ رات کو کھانے کے باس میں مجھے سب سے زیادہ مشکل نائی باندھتے ہوئے ہوئی۔ مجھے ہر گز پتہ نہیں تھا کہ بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا یہ گلے کا روماں، اس قدر مشکل سے باندھا جاتا ہوگا۔ اس کا حل مجھے لندن سے آنے والے پچھے آصف نے نکال کر دیا اور میرے گلے میں یہ پہنچا بنا کر ڈال دیا اور مجھے سکھایا کہ میں اتارتے وقت اسے پورا نہ کھلوں اور ذرا سا ڈھیلا کر کے گلے سے اتار لوں اور جب کبھی دوبارہ پہنچ ہوتے گلے میں ڈال کر اس کی گردھی کھینچ لوں۔ چلو..... فی الحال یہ مسئلہ توصل ہوا۔ فیصل کے پاس اس کا اور بھی آسان حل موجود تھا۔ اس کے پاس ایسی دو نائیاں تھیں جن کی گردھی پہلے سے بنی ہوئی تھی اور پہنچ کے لیے ان میں الائک کی رہڑ جڑی ہوئی تھی۔ نہ گردھی بنا نے کی زحمت نہ بار بار اتارتے کی۔ بس گلے میں رہڑ کا ہار ڈال کر کار کے پیچھے چھپا لو یکنہ فیصل نے مجھے بنی نائی نائی دیتے وقت خاص تاکید کی کہ اس پر ملکیت نامی مصیبت سے اسے چاکر ہی پہنون کیونکہ یہاں اکیڈمی میں ایسی نائیاں پہنچنے کی اجازت نہیں تھی۔ گویا ان اکیڈمی والوں نے طکر لیا تھا کہ ہم بچوں کو ایک سانس بھی سکون سے نہیں لینے دیں گے۔ رات کے کھانے سے پہلے بھی کچھ بچوں نے اپنے اپنے ماں باپ کو یاد کر کے روئے کا فریضہ پورا کیا کیونکہ سارا دن تو ان بے رحم اکیڈمی والوں نے ہمیں اس قدر مصروف رکھا تھا کہ ہم میں سے کسی کو بھی روئے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ اب جو چند لمحے میں تو ہم سب نے ہی تھوڑے تھوڑے آنسو بھاکر اپنے شہرے دنوں کو یاد کیا اور اپنی اپنی ”عینوں“ کی یاد میں کچھ آہیں بھر کر رات کے کھانے کے لیے چل دیئے۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹے کا وقہ تھا جس میں چند کیڈٹ نماز وغیرہ پڑھنے اور چند ہائل میں موجود تفریح کے کمرے میں ٹیکیں۔ وہی دیکھنے یا نیبل ٹینس اور کیرم وغیرہ کھینچنے کے لیے چلے گئے لیکن میرا دل نہ نماز پڑھنے کو چاہ رہا تھا اور نہ ہی کسی تفریح میں حصہ لینے کو۔ مجھے راجہ کی یاد بری طرح ستاری تھی الہمیں ہائل کی راہداری میں لگی جاتی کے سامنے کھڑا ہر آسمان پر چکتے چاند کو دیکھنے لگا اور یہ سوچتا رہا کہ کیا یہی چاند اس وقت ہمارے محلے کے اوپر بھی چک رہا ہوگا۔ پھر اچانک ہی چاند کو دیکھنے دیکھنے مجھے وہ آپی کی یاد آگئی۔ یہی چاند تو وہ جو آپی کی چھٹ پر بھی اپنی چاندنی پھیلارہا ہوگا۔ میں اور وہ آپی اکثر اپنی چاندنی راتوں میں ان کے چھٹ کی منڈپ پر بیٹھ کر شمالی ستارہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ مجھے ہر بار وہ شمالی ستارہ جنوب یا مشرق میں کہیں ملتا اور میرا ہمیشہ وہ آپی سے اس بات پر جھگڑا ہو جاتا کہ وہ ہر بار کسی نئے تارے کو شمالی ستارہ بتاتی تھیں۔ وہ جو آپی کی یاد نے تو مجھے اسی سے ٹھہرایا کہ کیا ہوتا اگر میں ان سے مل کر آ جاتا؟ ساری شرارت تو طاہر بھائی کی تھی۔ وہ تو بار بار سہی کہہ رہی تھیں کہ آپ میرے ماں باپ سے بات کر لیں۔ وہی ان کی جان نہیں چھوڑ رہے تھے اس لیے مجبوراً انہیں باں تو کہنا ہی تھی اور پھر اٹھیں پر انہیں یوں بھاگ بھاگ اپنی ٹلاش میں آتے دیکھ کر تو میرا دل بالکل ہی چیخ گیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اب تو میں ان سے اتنا دو رکھا کہ یہاں تک آنے میں تین نے بھی پورا ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کیا تھا۔ پتہ نہیں اگر پیدل جانا ہو تو شاید میں بھر سے زیادہ لگ جائے چلتے چلتے میں انہی سوچوں میں گھرا، رو دینے کی حد تک اداں سا کھڑا راہداری کے ہنگلے سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں وہاں سے دو سینکڑیاں

گزرے۔ میں نے صحیح بھی انہیں پریڈ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دونوں دسویں جماعت والی قطار میں کھڑے تھے۔ ان دونوں نے مجھے وہاں کھڑا دیکھا تو میری جانب آگئے۔ ان میں سے ایک دھاڑا۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

”ہے یوگر Hey you bugger..... کم ہمیر Come here۔“

ہاتھ کے اشارے سے میں سمجھ یا کہ وہ مجھی کوبلا رہے تھے۔ میں ان کے قریب آیا۔

دوسرے نے پوچھا۔

”ویسرا ریفرام Where are you from۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بھی۔“

<http://kitaabghar.com>

وہ پھر چیخنا۔

”بات سمجھ میں نہیں آتی؟ کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے سہم کر جواب دیا۔

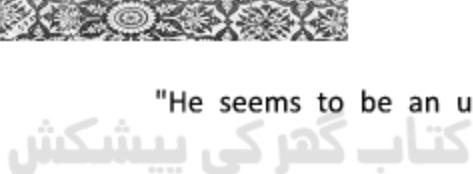
کتاب گھر کی پیشکش

پہلے نے دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا۔

<http://kitaabghar.com>

”شال کوٹ۔“ ویسا راز! Where is it?“

دوسرے نے متاخر سے میری جانب دیکھ کر اپنے دوست سے کہا۔



”ہی سیمرٹوپی این اردو میڈیم چک۔“ He seems to be an urdu medium chick.

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

”ٹیل ڈاؤن Kneel down۔“

میں روہانسا ہو گیا۔

”اردو میں بات کریں جتنا۔“

کتاب گھر کی پیشکش

وہ دونوں زور سے نہیں۔ پہلا زور سے چلا یا۔

”آئی سیڈ ٹیل ڈاؤن اینڈ شارت فرنت رولفز۔“ I said kneel down & start front rolls.

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان میں سے ایک نے باہر کی پکی سرک کی طرف مجھے اشارہ کر کے کچھ دیکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے باہر کی جانب دیکھا تو ایک سینر کیڈٹ کسی جونسیر کیڈٹ کو خالی سرک پر اچھے بھلے صاف سترے کپڑوں میں قلا بازیاں دلوار ہاتھا۔ جونسیر کیڈٹ کی حالت بری تھی

اور اس کے سارے کپڑے سڑک کی گرد سے اٹ پکے تھے۔ اب میں سمجھا ”فرنٹ روڈ“، بہاں کی زبان میں فلابازی کھانے کو کہتے تھے۔ میرے پاس ان کی بات مانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے مجبوراً میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اگر یہ دن ہونے میرے محلے میں کہیں مجھے ملے ہوتے تو میں ان دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔ جب میں نے اٹو چیسے غنڈے کی کوئی پرواد نہیں کی تو پھر بھلا یہ دو چوزے کس کھیت کی موی تھے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس وقت ان کی سلطنت میں اور اس اکیڈمی میں تھا جہاں کا ہر اصول ہی نزاٹ تھا لیکن ابھی میں گھٹنوں کے بل جھکا ہی تھا کہ زور سے سیٹی بنخن کی آواز آئی۔ وہ دونوں مجھے یوں ہی گھٹنوں کے بل بیٹھا چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گئے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ ہی دری میں کیدش بھاگتے ہوئے اپنے کروں میں اپنی میز پر جا بیٹھے۔ کہیں سے فصل بھاگتا ہوا آیا اور مجھے بھی راہداری میں رکوں میں جھکے جھکے ہی کھینچتا ہوا اپنی ڈارمیٹری میں لے گیا۔ پتہ چلا کہ یہ رات کی دوسرا پڑھائی یعنی Prep 2nd کا وقت ہے جب ہاؤس ماسٹر صاحب ہریک کا خود ان سمجھکش کرتے ہیں اور ہر بیچ کو پڑھتا ہواد یکھنے کے لیے فردا فردا سب کے پاس جاتے ہیں۔ وہ دونوں سینز کیدش بھی اسی لیے مجھے پوری سزا دیے بناہی بھاگ گئے تھے کیونکہ انہیں ہاؤس ماسٹر کے آنے کا ڈر تھا۔

رات کی پڑھائی کا دورانیہ بھی ایک گھنٹہ تھا اور ہاؤس ماسٹر نے سرسری طور پر ہریک کو چیک کیا کہ کیدش پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ ہماری ساتویں جماعت والی ہیرک میں زیادہ تر کیدش میز پر سر رکھے سور ہے تھے اور ان میں سے کچھ کی نیند میں بند آنکھوں کے کناروں سے بھی جگ گاتے آنسوؤں کی لڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ سینڈ پریپ کے ختم ہوتے ہی دوبارہ سیٹی بھی اور ہم سب کیدش کو دوبارہ رات کی گنتی کے لیے نیچے جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ گنتی کے بعد ہمیں کل صبح کے لیے یونیفارم وغیرہ تیار کرنے کے لیے اور جو تے پاش کرنے کے لیے پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ ہمیں ”جو کچھ“ بھی کرنا تھا اسی پندرہ منٹ کے وقٹے میں کرنا تھا کیونکہ ٹھیک سائز ہے دس بجے یعنی پندرہ منٹ کے بعد بتیاں بجھانے کی سیٹی بج جانی تھی اور پھر مکمل اندر ہیرا چھا جانا تھا۔

یوں ہمارا اکیڈمی کا پہلا دن اپنے اختتام کو پہنچا۔ ہم سب بچوں کے جسم درد اور تھکن سے ٹوٹ رہے تھے لیکن ابھی آگے پہاڑ جیسی ایک اور رات منہ کھولے ہمارا راستہ دیکھ رہی تھی کیونکہ نیند ہم میں سے کسی کی بھی آنکھوں میں دو دو رنگ نہ تھی۔ آخر ٹھیک سائز ہے دس بجے ہمارے پر یافیکٹ صاحب کہیں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے زوردار کاشن میں ہم سب بچوں کو اپنے بستروں میں دبک جانے کا حکم دیا۔ ہم سب اپنے بستروں کی جانب یوں بھاگے جیسے فوجی حملہ کے وقت خندق کی جانب بھاگتے ہیں۔ چند لمحے تک پر یافیکٹ نے بچلی کے سوچ کے پاس کھڑے ہو کر اطمینان کیا کہ ہم سب بستروں میں گھس چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سوچ آف کر دیا۔ چاروں جانب یا کیک گھپ اندر ہیرا اور ستائا چھا گیا۔ ہم سب کے دلوں کے اندر چھپا خوف پھر سے اچھل کر باہر آ گیا اور ڈارمیٹری کی چھپت اور دیواروں پر عجیب و غریب ڈاروں کی شکلیں بنا بنا کر ہماری جان لکانے لگا۔ میں نے کبل پوری طرح اپنے اوپر لے کر اپنے آپ کو اس اندر ہیرے سے بچانے کی کوشش کی لیکن اس کبل کے اندر دبکے ہوئے بھی میں آس پاس کے بچوں کے رونے کی آواز اور سکیاں سن سکتا تھا۔ خود ہیری آنکھیں بھی امی، عمارہ اور بھیا کو یاد کر کے بھیکیت گئیں اور میں نے زور سے آنکھیں بھیکھیت لیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہاڑ

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

رات کے سارے دس نج رہے تھے۔ محلے کی بجلی بھی ہوئی تھی اور اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ اور بالے سمیت باقی سارے دوست بڑے میدان میں برگلڈ کے پیڑ کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔ ان کا ارادہ ”چپن چھپائی“ کھینچنے کا تھا لیکن راجہ نے سب سے پہلے انہیں صبح کی ”ہوتے ہوتے رہ گئی واردات“ کے بارے میں بتایا کہ آج انکو نے پھر صبح سویرے ہی چوآپی کا راستہ رونکنے کی کوشش کی تھی لیکن غیاث پچا کو دیکھ کر وہ بدک گیا۔ گذراور پوپ نے مشورہ دیا کہ ان سب کو فوراً مل کے ایک خط لکھ کر آدمی کے نام بھیج دینا چاہیے تاکہ وہ فوراً واپس لوٹ آئے لیکن راجہ نے سختی سے اس بات کی مخالفت کی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ آدمی وہاں نہ جانے ”ظالم فوجیوں“ کے گھرے میں پھنسا عذاب جھیل رہا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گا کہ اس کے دوستوں سے اک ذرا سا کام بھی نہ ہو سکا؟ جو کچھ بھی کرنا تھا اور سبھیں کرنا تھا۔ طے یہ پایا کہ کل سے صبح سے لے کر رات تک اسکوں کے اوقات کو چھوڑ کر باری باری سمجھی چوآپی کے گھر کے باہر پھرہ دیں گے اور کسی صورت میں بھی چوآپی کے دروازے کو بالکل خالی نہیں چھوڑا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی بچہ وہاں آس پاس ضرور موجود رہے گا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ سیٹی بجا کر اپنے باقی دوستوں کو بھی خردار کر دے گا۔ انہوں نے اسی وقت مل کر اس مخصوص سیٹی کی دھن بھی منتخب کر لی۔ یہاں سیٹی سے کافی مختلف تھی جو وہ عام طور پر ایک دوسرے کو گھر سے بلانے کے لیے بجائے تھے۔ یہ خاص سیٹی جو انہیں صرف خطرے کے وقت میں مرتبہ بجائی تھی۔ راجہ نے ان سب کو یہ تاکید بھی کی کہ ایسی میں سیٹیوں کی صورت میں ہر گھر سے آتے وقت اپنی ہاکی، بلا یا جو چیز بھی ہاتھ لے اٹھاتے لاکیں کیونکہ آگے معاملہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مل کر بالے کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ چونکہ اس معاملے میں براہ راست اس کا بڑا بھائی ملوٹ ہے اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ بلا اس جھگڑے سے دور ہی رہے لیکن بالے نے زور سے نفی میں سر ہلا کیا، پلکہ وہ تو ان سب سے باقاعدہ روٹھھا تھا گیا۔ بالے کی آنکھیں ان سب کو یہ بتاتے ہوئے بھیگ گئیں کہ اس سے آج تک اس کے گھر میں بھی کبھی کسی نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ جتنا پیارا سے آدمی اور ان سب دوستوں سے ملا ہے اس کا تو اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اب اس مشکل مرحلے پر ان کا ساتھ چھوڑ کر گھر میں چھپا بیٹھا رہے؟

اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہے، نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام گھروالے بھی شدید نالاں ہیں۔ وہ لوگ انکو کی حرکتوں کی وجہ سے پہلے بھی مختلف مخلوقوں سے نکالے جا چکے تھے اور اس بار تو انکو کے ابا نے انکو کو آخری وارنگ دے دی تھی کہ اگر یہاں بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے گھر بدر کر دیں گے۔ آخر کار ان سب کوئی بالے سے معافی مانگنی پڑی اور اسے منانا پڑا۔ کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ بالا اپنی ضد کا کتنا پاک ہے۔ ایک بار روٹھ جائے تو پھر روٹھ ہی جاتا ہے۔ لہذا طے ہو گیا کہ وہ چوآپی کو کسی بھی

خطرے کی صورت میں وہ سارے کے سارے مل کر ان کے لیے لڑیں گے۔

اگلے دو دن تک وہ سب مکمل پھرہ دیتے رہے لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ بالے نے بتایا کہ پچھلے دون سے اٹو گھر بھی نہیں آیا تھا۔ یا اس کے گھروالوں کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ اسی طرح کام کے بہانے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا تھا لیکن تیرے دن وہ انہوں ہو کر ہی رہی جس کی تدبیر وہ سارے دوست جانے کب سے کر رہے تھے لیکن ان کے وہم و مگان میں بھی نہیں تھا کہ اس باراں کا نشانہ ہوا پی نہیں بلکہ طاہر بھائی ہوں گے۔ وجہ آپی کالج سے اپنے وقت پر ہی آگئی تھیں۔ غیاث پچا بھی ان کے ہم را تھے الہزار بوجاں وقت پھرے پر وہاں بڑے میدان میں موجود تھا، بے فکر ہو کر گھر کے لیے پلت گیا لیکن ابھی وہ اپنے گھر میں داخل ہو کر اپنی اماں کے سامنے سر میں تیل ڈالوانے کے لیے دو گھنی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک باہر محلے میں ہلدہ بیج گیا۔ راجہ کی اماں تیل سے چپڑے ہاتھ لیے چلا تھا لیکن راجہ دوسرے ہی لمحے ان سے دامن چھڑا کر بڑے میدان کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم مجع تھا اور سبھی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔

پتہ چلا کہ اٹو اور طاہر بھائی آپس میں بھڑگنے اور طاہر بھائی کو کافی چوتھ بھی آتی ہے۔ راجہ بدھوں ہو کر طاہر بھائی کے گھر کی جانب دوڑا، راستے میں کانوں میں پڑتی خبروں سے اسے پتہ چلا کہ جیسے ہی دخواپی گھر میں داخل ہوئیں تبھی طاہر بھائی بھی محلے میں داخل ہوئے تھے اور اپنے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے کہ اٹو ان کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر دنوں میں کسی بات پر تکرار ہوئی پھر اچانک اٹو نے اپنے دہنی ہاتھ میں پہنے ہوئے آہنی کے سے طاہر بھائی پر حملہ کر دیا۔ طاہر بھائی نے جھکائی دے کر اپنا پچھہ تو اس آہنی کے کی ضرب سے بچا لیا لیکن اٹو کا ترچھا وار سیدھے ان کے سر پر جالا اور اگلے لمحے ہی خون کا فوارہ ان کے سر سے ابل کر سا تھا وہی دیوار کو رنگین کر گیا۔ طاہر بھائی کا اپنے چھاؤ میں اٹھا تھا کچھ اس طرح سے اٹو کے چہرے پر پڑا کہ اٹو کی بھی نکیر پھوٹ گئی۔ اس کے بعد دنوں عجمت گھٹھا ہو گئے لیکن اتنی دیر میں آس پاس سے گزرتے محلہ دار لپک کر دنوں کی جانب بھاگے اور انہیں علیحدہ کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن تب تک دنوں ہی کے کپڑے خون سے ترتبہ ہو چکے تھے۔ اٹو تو دوسرے ہی لمحے وہاں سے کہیں چھپت ہو گیا اور طاہر بھائی کو لوگوں نے ان کے گھر پہنچا دیا۔ محلے کے لوگ سر گوشیوں میں ایک دوسرے سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ان میں سے کسی نے اٹو کے منہ سے ڈوبی کا نام بھی سناتھا۔ سب ہی پریشان تھے کہ خدا جانے کیا ماجرا ہو گیا؟ لیکن راجہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جھٹکے کی اصل وجہ کیا تھی۔

راجہ جب طاہر بھائی کے ٹھن میں داخل ہوا تو اس وقت تک طاہر بھائی کے ابا اور اماں ان کا سر دھلوا کر اس پر پٹی وغیرہ باندھ پکے تھے اور طاہر بھائی ٹھن میں ہی پڑی کرسی پر بیٹھے اپنے اماں ابا کو نسلی دے رہے تھے کہ صرف سر کی جلد پھٹی ہے اس لیے اب اتنا گھبرا نے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آخر وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں اپنے زخم کے بارے میں جانتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں غیاث پچا اور محلے کے دیگر بزرگ بھی طاہر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ غیاث پچا کی وجہ سے محلے والوں نے کھل کر طاہر بھائی سے جھٹکے کی اصل وجہ نہیں پوچھی لیکن خود غیاث پچا بھی کچھ انجھے انجھے سے نظر آ رہے تھے۔ طاہر بھائی نے سب کو سبھی بتایا کہ غالباً اٹو کو ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی الہزار اس نے ان کا جواب سے بغیر ہی ان پر حملہ کر دیا۔ انہیں خود نہیں پتہ کہ اٹو کے ذہن میں کیا حساس سما یا ہوا ہے لیکن محلے کے سارے بزرگ اس بات پر مصروف تھے کہ اب وہ اٹو کو مزید اس محلے میں برداشت

نبیس کریں گے۔ غفور چچانے بنا کی کوتا نے اپنا "اٹرو سوٹ" استعمال کرتے ہوئے علاقہ ایس انجوں اکو بھی اطلاع کر دی تھی۔ طاہر بھائی نے بڑی مشکل سے سب کو کسی طور مطمئن تو کر دیا لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ بات اب بہت آگے گز بڑھ چکی ہے۔ وہ اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ لوگ اسے معمول کا ایک واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں اور اس کے اثرات کے چھینٹے جو آپ کے پاک دامن تک نہ پہنچنے پا سکیں لیکن بات اب شاید ان کے بس سے بھی باہر ہو چکی تھی۔

پاکستان عالمی سازش کے نزعے میں

کتاب گھر کی پیشکش

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضمایم کا مجموعہ..... جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندر و خارجی خطرات و سازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4 اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی توجہ انوں کو باشور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش..... درج ذیل مضمایم اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر وہشت گروہوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، طن کی فکر کرنا دا ان!، پاکستان عالمی سازش کے نزعے میں، حکمتِ عملی یا سازش، طالبان آر ہے ہیں؟، محلاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک واٹر آرمی، اکتوبر سر پر ایک اور "کشیری وہشت گرد"؛ سازشی تحرک ہو گئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف "گریٹ گیم"؛ جیت نام تھا جس کا.....، آئی ایک ایف کا پھندہ اور لائن آف کا مرس، آئی ایس آئی اور ہمارے ارباب اختیار، ڈاکٹر عاصی صدیقی کا اغوا، کمانڈو جرنیل بالا خروعام کے غصب کا شکار ہو گیا، انجام گلتات کیا ہو گا؟، خون آشام بھیڑ یے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر! APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہو گا؟، ایکشن 2008 اور تین زمینی تھائی، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا "کھیل"، کھیل رہے ہیں! نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قوے فروختند و چہ ارزائی خروجی اخوار کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنچانی درویش کو تاج سردار، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمه، بنے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواغذہ، صدر کو، ہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر اپاکستانیوں پر بھی اعتقاد کیجئے!، نیا صدر..... بنے چیخن اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزم اور ہماری بے بُسی، پاکستانی اقتدار عالمی کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقت دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیر اعظم کے دورے، عالمی مظہر نامہ بدلتا رہا ہے، باراک اوباما، مبینی لزانہ، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشیری میں آزادی کی نئی اہم اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکیشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چرچ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلا ایک ہفتہ بھی اکیڈمی میں اسی قسم کے مختلف مذاہوں سے نہ ردازما ہوتے گزر گیا۔ ہماری روشنی میں تھوڑی بہت تبدیلی اُس دن آئی جب ہمیں شام کوھیل کے میدان کی بجائے سومنگ پول تیرا کی سکھانے کے لیے لے جایا جاتا۔ ہفتے کے چھ دنوں میں سے ہر دن ایک باؤس کے لیے مخصوص تھا۔ قاسم باؤس کی باری جمعرات کو آیا کرتی تھی۔ پہلے دن جب ہمارے انسٹرکٹرنے ہمیں پانی میں اتارنے کی کوشش کی تو ہم گیارہ کے گیارہ اس طرح رسیاں ترا کر جھاگے جیسے کوئی قربانی کا بکرا قصائی کے ہاتھوں سے نکل کر بجا گتا ہے لیکن اس پاس موجود دیگر سینٹر کیڈس نے ہمیں اخنا اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نیچے سے اوپر آئیں پاؤں گا۔ دوسرا مصیبت یہ تھی کہ پانی کے اندر رہتے ہوئے چلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال رفتہ رفتہ ہمارا پانی سے ڈرخت ہونے لگا۔ ہماری پریڈ بھی اب کافی بہتر ہو گئی تھی اور اب راستے میں کسی جو نیز کیڈٹ کی پتلوں بھی شاذ و نادر ہی اترا کرتی تھی۔ اب ہفتے میں دو مرتبہ ہمیں گھر سواری سکھانے کے لیے بھی لے جایا جاتا۔ اسٹر کو گھوڑوں سے بہت ڈر لگتا تھا لہذا گھوڑوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ جب بھی موقع ملے وہ اسٹر کو زمین پر ضرور پٹھیں گے جبکہ مجھے اور فیصل کو ایک مرتبہ گھوڑے لے کر ”بھاگ“ گئے تھے نہ جانے اچاک ہم دنوں کے گھوڑوں کو کیا ہوا اور وہ جنگل پھلانگ کراچھلے اور ہمارے لاکھ چیختے چلانے کے باوجود وہ دور گھاس کے میدانوں کی جانب بھاگتے چلے گئے۔ ہمارے پیچھے ہمارے انسٹرکٹروں نے گھوڑے دوڑائے اور جانے کتنی دور سے ہمیں گھوڑوں سمیت پکڑ کر واپس لائے۔ بعد میں کلاس کے دوران مجھے فیصل نے بتایا کہ اس نے گھوڑے کے کان میں کچھ ”ایسا“ کہا تھا جس سے وہ ناراض ہو کر بھاگ اٹھا تھا اور میرا گھوڑا اسے دیکھ کر خود پہ قابو چھوڑ بیٹھا تھا۔

پرنسپل صاحب نے انوار صاحب کو مجھے انذر آبزرویشن رکھنے کے لیے جو ایک ہفتہ دیا تھا وہ بھی گزر چکا تھا۔ لہذا اگلے روز کلاس لگتے ہی وہ مجھے پرنسپل کے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پرنسپل کے سامنے میری مایوس کن رپورٹ رکھ دی۔ میں اب تک اکیڈمی میں استعمال ہونے والے پیشتر انگریزی کے لفظ سمجھ چکا تھا اور بول بھی سکتا تھا۔ مثلاً پریڈ کے تمام کاشن، سینٹر زکی ڈائٹ، پیٹنی آفسرز کے مخصوص جملے، یہروں اور بلزر کی باتیں لیکن مجھے ابھی تک کورس کی کتابوں میں سے ایک لفظ بھی پڑھنا نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر خود بھی ہر طرح کی کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن اتنا مشکل کورس اتنے کم عرصے میں سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔

پرنسپل صاحب نے میری رپورٹ غور سے پڑھی۔ حق پوچھیں تو میں دل ہی دل میں کہیں اندر اس بات سے خوش بھی تھا کہ یہ لوگ آخر کار خود ہی مجھے اکیڈمی سے نکال دیں گے کیونکہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ کمانڈر صاحب نے انوار صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ان کے دفتر

میں ہی بیٹھا رہنے دیں اور خود جا کر اپنی کلاس اٹینڈ کریں۔ انوار صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی میز کی دراز سے لسکٹ کا ایک ڈبہ نکالا اور اس میں سے مجھے لسکٹ نکال کر کھانے کو دیئے۔ میں سب سمجھ رہا تھا اب کچھ ہی دیر میں کمائٹر صاحب مجھے یہ خوشخبری سنائیں گے کہ مجھے اکیڈمی سے نکالا جاتا ہے اسی لیے وہ پہلے مجھے خوش کرنے کے لیے یہ لسکٹ وغیرہ کھلا رہے ہیں تاکہ مجھے زیادہ "صدمنہ" نہ ہو۔ میں مزے سے لسکٹ کھاتا رہا۔

<http://kitaabghar.com>

"ہاں بھی کیڈٹ نمبر 8336 یہ تو بڑی گزر بڑی ہو گئی۔ تم نے پچھلے ایک ہفتے میں مخت تو بڑی کی لیکن کلاس میں امپروو (Improve) نہیں کر پائے۔ البتہ تمہاری پریئری، رائیڈنگ اور سوئنگ کے علاوہ گیمزکی رپورٹ اے ون ہے۔ ڈبہ گذہ good That's good۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنی جانب سے پوری کوشش کر دیکھی ہے لیکن میں خود بھی اس معاملے میں بے بس ہوں۔ پرنسپل صاحب نے گھری سی سانس لی اور بولے۔

<http://kitaabghar.com>

"تمہارے ابو نے مجھے تمہاری تعلیم اور اسکول کے مضمون کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دم سے اردو میڈیم سے انگلش میں سوچ اور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال اب تم بتا دی، تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

میں ان کی بات سمجھا نہیں۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں خود اپنی زبان سے انہیں کہہ دوں کہ مجھے یہاں سے فارغ کر دیا جائے۔ چلو یونی ہی۔ مقصد تو اس جیل سے چھکتا رہی ہے تا۔ چاہے میں خود کہوں یا وہ مجھے جانے کو ہیں۔

<http://kitaabghar.com>

میں نے انہیں کہا کہ میں اپنی کلاس میں بہت شرمدگی محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں ان سب کی طرح انگریزی نہیں بول سکتا۔ اپنا سبق یاد نہیں کر سکتا۔ کاپی پر ہوم و رک نوٹ نہیں کر سکتا۔ سارے سینٹر ز کیڈٹ بھی میرامداق اڑاتے ہیں۔ میرے سامنے ہی مجھے انگریزی میں جانے کیا کچھ سنا تے رہتے ہیں لیکن میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ان سب باتوں کی بھی خیر ہوتی اگر میں اپنی کلاس میں ہی کم از کم اتنا تو بہتر ہوتا کہ اگلے آنے والے امتحانات میں پاس ہی ہو جاتا لیکن یہاں تو یہ بھی ناممکن و کھائی دے رہا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب کو یہ بھی بتایا کہ میں آج تک اپنے اسکول میں کبھی فیل نہیں ہوا تھا بلکہ ہر بار اول یادوں کم ہی آتا تھا۔ اب یہ میرے لیے تکمیل "ڈوب مرنے" کا مقام ہو گا اگر میں اکیڈمی میں فیل ہو جاتا میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس بے عزتی سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ مجھے واپس شال کوٹ بھیج دیں۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے میں با آسانی واپس جا کر اپنا ہائی اسکول پھر سے جوان کر سکتا تھا۔ ہاں البتہ اتنے دن تک جو اکیڈمی والوں نے میری "مہمان داری" کی ہے اس کے لیے میں تہذیل سے ان کا شکر گزار ہوں گا۔

پرنسپل نے دلچسپی سے میری ساری باتیں سیئیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ پڑھائی کے علاوہ مجھے اور کوئی دوسرا مسئلہ تو وہاں درپیش نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اور تو کوئی خاص مشکل نہیں لیکن مجھے میں میں کھانا کھاتے وقت جس عذاب سے گزرتا پڑتا تھا اس کی ساری تفصیل میں نے انہیں اف سے لے کر میں تک سنادی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اب جب میری یہاں سے واپسی کا فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو برائے مہربانی میرے گھر واپس جانے تک میرے "کھانے پینے" کا بندوبست کہیں اور کر دیا جائے کیونکہ گزشتہ ایک ہفتے سے میں میں کے ان سخت اصولوں کی وجہ

سے پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھا سکتا۔ پُرپل صاحب میری بات سن کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔ مجھے اس لمحے وہ بہت بچھو نے انسان محسوس ہوئے۔ ویسے تو اکیدی میں ان کا بہت رعب داب تھا اور چھرے مبرے سے وہ کافی سخت گیر انسان محسوس ہوتے تھے لیکن آج مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی میرے ابا کی طرح اور سے انتہائی سخت گیر جبکہ اندر سے ایک ہمدرد اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ کماں در صاحب نے مجھے سے میرا قائل فیصلہ پوچھا۔

”اوے کے..... تو کیدیٹ عبادت میں اپنے گھر جانا چاہتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے لیکن سب سے پہلے تمہارے ابا جان کو خبر کرنا ضروری ہے کہ وہ خود آکر تمہیں لے جائیں گے یا پھر ہم خود تمہیں یہاں سے بچھوانے کا کوئی بندوبست کریں۔“

پُرپل صاحب گھوم کر اپنی کرسی کی جانب آئے اور میر پر پڑے ٹیلی فون سے انہوں نے کوئی نمبر ملا۔ کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ میرا یہاں بے چینی سے براحال ہو رہا تھا کہ جانے ابا پر یہ خبر سن کر کیا اثر ہو گا؟ لیکن پُرپل صاحب انہیں یہ بھی تو ضرور بتا کیں گے کہ میں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں رکھ چکوڑی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ دوسری طرف سے لائن مل گئی۔ پُرپل صاحب نے کھنکا کر کہا۔

”جی..... میں کماں در اسرار اللہ بول رہا ہوں۔ جی کیا میں رفیع اللہ صاحب سے بات کر سکتا ہوں..... جی جی..... بہتر ہے.....“

کچھ دیر تک پُرپل صاحب انتظار کرتے رہے اور پھر دوسری جانب ابا کے آجائے پر انہوں نے ساری صورت حال ان پر واضح کر دی۔ مجھے ان کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ وہ ہر جملے کے بعد یہ ضرور کہتے کہ ”نہیں نہیں..... عبادتو اپنی جانب سے بہت محنت کر رہا ہے لیکن یہاں کا کورس ہی اتنا مشکل ہے کہ اس بے چارے سے کچھ بن نہیں پا رہا.....“ جی..... جی جی..... اوہ..... یہ تو بہت برقی بات ہے..... اچھا..... انہوں نے ایسا کہا..... یہ تو بہت برقی بات ہے..... اچھا..... چلیں آپ کہتے ہیں تو یوں ہی سمجھی.....“

پُرپل صاحب جانے کیا کچھ کہ رہے تھے اور یہاں میرا بے چینی سے براحال ہو رہا تھا۔ آخر یہ دونوں کن لمبی چوڑی کہانیوں میں پڑ گئے تھے۔ جلدی سے فیصلہ کر کے بات ختم کرنی چاہیے تھی۔ آخر خدا خدا کر کے پُرپل صاحب نے فون رکھا اور میری طرف پلٹے۔

”تمہارے ابا جان راضی ہو گئے ہیں۔“

خوشی کے مارے میرے ہاتھوں سے لکٹ کا ڈبہ یخچے گر گیا جیسے میں نے جلدی سے اٹھا کر واپس میر پر رکھا اور جلدی سے پُرپل صاحب سے پوچھا۔

”وہ ناراض تو نہیں تھے نا مجھ سے..... وہ آپ کی بات تو سمجھ گئے تھے نا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے؟“

”نہیں نہیں..... ناراض تو وہ بالکل نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی ایک الحصون بتائی ہے جسے سن کر میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ تمہیں واپس بچھوانے سے پہلے تمہارے کمزز اور پچازا دوں سے کیا بہانہ کیا جائے.....؟“

میں پُرپل صاحب کی بات سن کر چونکہ گیا۔ میرے پچازا دوں کا کیا ذکر کل آیا تھا اس وقت؟

پُرپل صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے کیدیٹ کالج آنے کے بعد میرے کمزز نے بہت سی باتیں بنائی تھیں کہ دیکھ لینا آدمی ہفت دن و دن بھی کیڈیٹ کالج میں نہیں نکال پائے گا اور انہوں نے میرے بہن بھائیوں سے شرط بھی لگائی تھی کہ آدمی دوسرے ہفتے ہی واپس نہ لوٹ آیا تو جو چور کی

سزاوہ ان کی سزا۔ غصے سے میرا براحال ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی پڑتا تھا کہ وہ سب مجھ سے جلتے ہیں۔ یہ ضرور عابد، ساجدا اور روبی وغیرہ ہوں گے۔ انہی کو میرے کیڈٹ کالج آنے سے بہت زیادہ تکلیف تھی۔ میں نے جلدی سے پُل صاحب سے پُل صاحب سے پوچھا کہ کیا اپنا نام بتائے ہیں۔ کمانڈر صاحب نے جلدی سے سرہلایا اور کہا کہ میرے اباٹک بھی یہ بات پہنچ چکی ہے لہذا اب وہ صرف اس بات سے پریشان ہیں کہ آدمی صاحب جب وہ اپس آئے گا تو ان سب خاندان والوں کا سامنا کیسے کرے گا۔ یعنی کرتومیں خود بھی گھری سوچ میں پڑ گیا کیونکہ واقعی معاملہ عکین تھا۔ مجھے عابد وغیرہ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ میرے پیچھے وہ خاندان بھر میں ایسی باتیں کر کے مجھے بدنام کریں گے۔ پُل صاحب نے مجھے گھری سوچ میں ڈوبے دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر خود ہی بولے۔

”ویسے میرے ذہن میں تمہاری اس مشکل کا ایک حل موجود ہے اگر تمہیں قبول ہوتا.....؟“
میں نے جلدی سے سرہلایا کیونکہ اس وقت میرے آس پاس وہی ایک میرے میجا تھے۔

”میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے کرزز کامنہ بند کرنے کے لیے چند بخت یہاں مزید شعبہ جاؤ۔ ایک دم سے واپس جاؤ گے تو وہ سب تمہارا بہت مذاق اڑائیں گے۔ تم یہاں مزے سے رہا اور پڑھائی وغیرہ کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی چاہے تو کلاس آیا کرو۔ جی نہ چاہے تو نہ کہی۔ البتہ تمہارے واپس جانے تک تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہوئی چاہیے کہ تم وہاں انگریزی بول کر سب کامنہ بند کر سکو۔ ورنہ انہیں شک ہو جائے گا کہ تم کیڈٹ کالج گئے بھی تھے یا نہیں۔“

میں نے ان کی جانب سوالیں لگا ہوں سے دیکھا کیونکہ اصل مسئلہ ہی تو انگریزی کا تھا۔ پُل صاحب نے تفصیل سے مجھے بتایا کہ میرے باقی مانندہ ڈنوں کے لیے انہوں نے سوچا ہے کہ مجھے اکیڈمی کے پچھلے حصے میں ٹیچر اور باقی اسٹاف کے چھوٹے بچوں کے لیے جو گرامر اسکول ہے۔ وہاں کی ٹرنس (Nuns) کے حوالے کر دیا جائے۔ وہاں کی بڑی مدد اور باقی تن ستر ٹرنس مجھے میرے فارغ وقت میں انگریزی زبان اور انگریزی رکھ رکھاؤ اور کھانے پینے کے طریقے بھی اچھی طرح سکھا دیں گی۔ اس طرح جب میں واپس شاہ کوٹ جاؤں تو وہاں سارے خاندان کے سامنے میری سمجھی نہ ہو سکے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی کیونکہ اب اتنی دور آہی گیا تھا تو کچھ سیکھ کر جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں تھیک طرح سے یہاں کی انگریزی سیکھ لوں گا تو جو آپنی کو بھی واپس جا کر پڑھا دیا کروں گا پھر ہم دونوں کو طاہر بھائی کی ”محترمی“ سے بھی نجات مل جائے گی۔

میں نے پُل صاحب کو کہا کہ مجھے ان کی تجویز مظہور ہے۔ انہوں نے خوشی سے چکنی بھائی۔

”ڈیس گڈ That's Good..... میں جانتا ہوں تم ایک بہادر کیڈٹ ہو.....“

پُل نے فون انٹھا کر کسی کو چند بدایات دیں اور جب میں جانے لگا تو انہوں نے مجھے فصیحت کرنے کے انداز میں کہا کہ انگریزی بھی باقی زبانوں کی طرح صرف ایک زبان ہے۔ میرے آس پاس جو بچے انگریزی لکھ اور بول سکتے ہیں اس کی وجہ صرف اتنی ہی ہے کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آس پاس اور اسکوں میں سب کو یہ زبان بولتے ساتھا اس لیے وہ یہ زبان سیکھ گئے اور اگر میں آج سے دل لگا کر یہ زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ چند بفتون میں میں بھی یہ سب کچھ نہ سیکھ سکوں۔ شرط صرف ان تھک محنت اور زبان سے لگاؤ ہے۔ میں نے ان سے

وعددہ کیا کہ اب جب ہماری ملاقات ہو گی تو وہ مجھ میں واضح تبدیلی محسوس کریں گے۔

پرنسپل کے کمرے سے نکل کر میں واپس اپنی کلاس میں آ گیا۔ فیصل اور اسٹر کو مجھ سے سب کچھ جان لینے کی شدید بے چینی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری آزادی کا پروانہ آ گیا ہے اور اب بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب میں یہاں سے ”پھر“ ہو جاؤں گا۔ ان دنوں نے وجہ سن کر اپنے سر پر بیٹ لیے کہ کاش وہ بھی اردو میڈیم ہوتے۔ خواجوہ انہوں نے اپنا سارا بچپن اس فضول زبان کو سکھنے میں برباد کر دیا اور آج وہی زبان ان کے گلے پڑ گئی ہے۔ اس دن اتنے دنوں کے بعد پہلی مرتبہ دوپھر کے کھانے کے بعد میری اتنی بہت ہوئی کہ میں نے گھر سے لائے اپنے سامان اور سوت کیس کو گھول کر فیصل سے دیکھا ورنہ پہلے دن ضرورت کی چیزیں نکالنے کے بعد میں نے اپنے سامان کو با تھہ تک نہیں لگایا تھا۔ کیونکہ جانے کیوں جیسے ہی میں ان چیزوں کو دیکھتا تھا مجھے شدت سے گھر کی یادستانے لگتی تھی۔ تبھی میرے ہر سوت کیس کے اندر رکھ کے اس تھیلے پر بھی میری نظر پڑ گئی جو غیاث پر چجانے والیں پر بھاگ دوڑ میں ابا کے حوالے کیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس تھیلے کو گھولا۔ سب سے اوپر جو آپ نے میرے لیے مبارکباد کا ایک کارڈ رکھا تھا جس میں اپنے با تھہ سے انہوں نے میرے لیے بہت سی دعائیں لکھی تھی۔ میری آنکھیں ایک دم ہی بھیگنے لگی تھیں۔ میں نے جانے کتنی بار اس کارڈ کو پڑھا ہو گا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قوآپی یہیں کہیں میرے آس پاس ہی موجود ہیں۔ ویسے بھی جب میں نے ان کا دیا ہوا تھیلا کھولا تھا تو ان کی خوبصورتی آس پاس ساری ڈارمیٹری میں بکھر گئی تھی۔ کارڈ کے نیچے میری پسندیدہ چالکیں تھیں پھر کچھ کہانیوں کی کتابیں، جیویٹری بکس، میرے پسندیدہ کار ٹو نز کے بہت سے اسٹکرز، قوآپی کا وہ پین جو مجھے بہت پسند تھا اور بہت سے نئے پین، رنگیں پنسلیں اور جانے کیا کیا۔ میری حالت بری تھی۔ میں سامان دیکھتا جاتا اور میری آنکھوں سے آنسو پشپت گرتے جاتے۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس وقت باقی سارے بچے نیچے گراڈ میں سینٹر کیڈس کافی بال مقیح دیکھنے لگے ہوئے تھے اور پیر ک خالی تھی۔ ورنہ ان سب کے سامنے مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جو آپی کی دی ہوئی یہ چیزیں اس کیڈٹ کا جمعیتی فضول جگہ پر استعمال کر کے بھی ان کی ”توہین“ نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ انہیں سنجال کر اپنے پاس رکھوں گا۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اپنے گھر کے سامان کو دیکھ کر بھی ہوا۔ اسی، بھیا، عمارہ اور ابا کی دی ہوئی چیزوں کو میں نے نہایت عقیدت سے فرد افراد اپنی آنکھوں سے لگا کر چوما اور سنجال کرو اپس رکھتا گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میرے ابا نے کتنی محنت سے پائی پائی جوڑ کر میرے لیے یہ سامان خریدا ہو گا۔ نئی پینٹ شرٹ کے کئی جوڑے، نئے شلوار کرتے، نئے جوتے، نیا کوٹ، نئے سویٹر، نئے بنیان، نئے رومال، نیا شیشہ، غرض ہر چیز نی تھی۔ حتیٰ کہ نیل کڑ (ناخن تراش) تک انہوں نے نیا لے کر سوت کیس میں رکھوایا تھا۔ مجھے خواجوہ اپنے آپ پر ہی عصہ آنے لگا کہ مجھے یہ ناکارہ اور فضول لڑکے پر انہیں اس قدر خرچ کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر اوپر سے ٹرین کے آنے جانے کے ٹکٹک کا خرچ الگ، میں نے تبھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان میں سے حتیٰ الامکان نئی چیزیں چھا کر رکھوں گا اور گھر واپس جاتے ہی اسی کے حوالے کر دوں گا کہ انہیں بازار میں واپس دے کر ابا کے پیسے واپس لے آئیں۔

ابھی میں اپنے انہی متفقین کے سپنوں میں کھویا ہوا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب دبے پاؤں چلتے ہوئے ہماری پیر ک میں داخل ہو گئے۔ میں نے ہڑ بڑا کر جلدی سے اپنا سوت کیس بند کر دیا۔ وہ اپنی آنکھوں پر لگے موٹے سے چشمے کے عقب سے میری

جانب مغلک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ باقی کیدڑس کے ساتھ مجھ دیکھنے کیوں نہیں گئے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت کچھ تھیک نہیں ہے لیکن ہاؤس ماسٹرز پر عموماً اس قسم کی ہاؤس کا اثر کچھ کم ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے گیرز ڈریں پہن کر باقی کیدڑس کو جو ان کرنے کا حکم دیا اور رتب تک وہیں کھڑے رہے جب تک میں ہاؤس سے نکل نہیں گیا۔

اسی دن شام کو ہمارا ہاؤس بٹل جمعہ مجھے کیدڑی کے اس حصے میں لے گیا جہاں ٹھپرزا اور اسٹاف کے بنگلے بنے ہوئے تھے اور جہاں ان کے بچوں کا گرام اسکول اور جو نیز سکشنس موجود تھا۔ یہاں پر باقی تمام کیدڑس کا داخلہ ممنوع تھا اور میں نے دیکھا کہ یہ تو ایک الگ ہی دنیا تھی۔ بڑے بڑے خوب صورت بنگلے، پارک، کھانے پینے کی دو کافیں، دیگر ضرورت کی چیزوں کے لیے ایک خوب صورت سی چھوٹی مارکیٹ، بچوں کے لیے پلے لینڈ، جھوٹے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا خوب صورت سا چرچ اور کانونٹ اسکول کی عمارت، مجھے تو جگہ کسی پرستان کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں نتو پہنچ آفیسرز کے کرخت چہرے تھے نہ نیز کیدڑس کی بک بک اور سزا کا ذر۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ جحمد میرا ہاتھ تھامے اس سڑک پر چل رہا تھا جس کے دونوں اطراف سرو کے اوپنے اوپنے درخت موجود تھے۔ ان درختوں کے عقب میں دور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور پرندے اپنے گھروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ہر درخت کی ایک شاخ پر ان پرندوں کے لیے لکڑی کا ایک خوب صورت چھوٹا سا گھر بھی بنا کر رکھا گیا تھا اور ایسے ہر گھر پر ایک نمبر بھی لگا ہوا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کچھ ہی دیر میں ہم بل کھاتی سڑک سے ہوتے ہوئے اور پہاڑی پر بننے کا نوٹ کی عمارت کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چرچ کے سامنے ایک بہت بڑا سماں تھا جس میں ترتیب وار ایٹھیں یوں لگی ہوئی تھیں کہ دور سے سورج کا مہی کا بڑا سا پھول محسوس ہوتی تھیں اسی مناسبت سے ایٹھوں پر پیلا اور بچوں ارنگ بھی کیا گیا تھا۔

جمع نے آگے بڑھ کر چرچ کے دروازے پر لگی بڑی سے گھنٹی ہلائی اور دور کہیں چرچ میں اندر بھی ویسی ہی گھنٹی بجھنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس گھنٹی کی ڈوری اندر بھی کسی ایسی ہی چھوٹی لوہے کی گھنٹی سے بندھی ہو گی۔ کچھ ہی دیر میں سفید لباس میں ملبوس ایک مہربان سے چہرے والی عورت نے دروازہ کھولا۔ جھونے اسے بتایا کہ میرا نام کیدڑ عباد ہے اور ہمیں مکانٹر صاحب نے یہاں بھیجا ہے۔ عورت نے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں چرچ کی عمارت میں بنی ایک راہداری سے گزار کر اس جانب لے آئی جہاں دفاتر بنے ہوئے تھے۔ ایک دفتر میں ہمیں بھاکروہ چند لمحوں کے لیے معدتر کر کے چلی گئی اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک ملٹی سے چہرے والی بہت گورے رنگ کی ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔ پتہ چلا کہ یہی بڑی ہمدرکی تھی ہیں جو یہاں کی انچارج ہیں۔ مجھے تو وہ انگریز ہی لگ رہی تھیں لیکن جب ان کے منہ سے میں نے اردو سی تو میں جیران ہی رہ گیا۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام وغیرہ پوچھا اور میرے لیے چائے سکت بھی مٹکوائے۔ انہوں نے جمع سے کہا کہ پرپل صاحب کا پیغام ایٹھیں مل چکا ہے اور وہ کیدڑ عباد کو اپنے کا نوٹ میں خوش آمدید کہتی ہیں۔ انہوں نے جمع کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ روزانہ شام چار بجے مجھے یہاں چھوڑ جایا کرے اور رات آٹھ نوبجے یعنی سیکنڈ پر یپ سے پہلے مجھے واپس لے جایا کرے۔ گویا کل سے روزانہ چار گھنٹے مجھے یہاں گزارنا تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ

ان چار گھنٹوں میں دو گھنٹے میری انگلش اور دیگر مضمایں کی ٹیوشن ہوا کرے گی اور باقی دو گھنٹے مجھے اکیڈمی کے دیگر طور اطوار چلنا پھرنا، کھانا پینا اور مختلف موقع کے مختلف لباس اور رواجوں وغیرہ کے بارے میں سکھایا جائے گا۔

چائے کے بعد انہوں نے جمع کوتاؤ واپس بھیج دیا اور خود مجھے لیے کافونٹ اور چرچ کے مختلف حصوں کی سیر کرواتی رہیں۔ پانچ بجے کے قریب انہی کی طرح سفید لباس پہنے ایک خوب صورت ہی جو نیز من ہیلین آگئی۔ مرکیتھرین نے مجھے بتایا کہ ہیلین ہی میرے تمام مضمایں کی ٹیوشن پیچھے ہو گی۔ انہوں نے ہیلین سے پوچھا کہ شیرل کہاں ہے۔ ہیلین نے بتایا کہ شیرل آج اپنے پاپا کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہے البتہ کل سے وہ بھی اپنے وقت پر آجائے گی۔ پھر ہیلین نے خود مجھے بتایا کہ شیرل پڑھائی کے علاوہ دیگر امور کے لیے میری پیچھے مقرر کی گئی ہے۔ چرچ میں سمجھی لوگ اس قدر ہنس لکھتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو میں اکیڈمی کے کرخت اور بے زار کن ماخول کو بھول ہی گیا تھا۔ مرکیتھی نے مجھے ہیلین کے حوالے کر دیا اور خود عبادت کے لیے اندر چرچ کی مرکزی عمارت کی جانب بڑھ گئیں۔ ہیلین بہت دیر تک مجھے سے با تین کرتی رہی اور اس نے مجھے سے میرا مکمل تعارف بھی حاصل کر لیا تھا، لہذا باب طے یہ ہوا کہ کل سے میں اپنی تمام کتابیں بھی آتے ہوئے ساتھ لے کر آیا کروں گا۔ اس کے علاوہ جب شیرل پیچھے کل سے آ جائیں گی تو جو کچھ وہ بتائیں مثلاً میرے لباس وغیرہ میں سے کوئی لباس تو وہ بھی مجھے پہن کر آنا ہو گا یا ساتھ لے کر آنا ہو گا۔ مجھے اس شام وقت گزرنے کا پیچہ بھی نہیں چلا اور رات کے آٹھ بھی نجع گئے۔ میں اس وقت چونکا جب ہمارا ہاؤس بنلر جمع مجھے لینے کے لیے واپس آپنچا۔ میں ہیلین سے رخصت ہو کر جیسے ہی کافونٹ اور چرچ کے رہائش علاقوں سے باہر نکلا اور میں نے اکیڈمی کی طرف جاتی سڑک پر قدم رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گھر سے خواب سے جاگ کر اٹھا ہوں۔ میرے ہاؤس تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے سارے ہم جماعتوں کو میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ بھی مجھے سے اکیڈمی کی اوپنچی لمبی اور خاردار تارتوں سے ڈھکی ہوئی چار دیواری کے باہر کی دنیا کے بارے میں جانتا چاہتے تھے۔ جبکہ چند میٹر ک اور فرشت ایئر کے کیڈیٹس بھی ہائل کے دروازے پر مجھے سے یہ پوچھنے کے لیے کھڑے تھے کہ میں نے وہاں کافونٹ میں کتنی لڑکیوں کو موجود پایا۔ ان کے نام کیا تھے اور کیا انہوں نے مجھے سے ”قاسم ہاؤس“ کے سینز کیڈیٹس کے بارے میں پوچھا تھا یا نہیں..... اس دن مجھے پہنچا کہ شیرل کا کی چار دیواری کے باہر چرچ والی یہ دوسری چار دیواری تو واقعی سینز کیڈیٹس کے سپنوں کی دنیا ہے، کیونکہ وہ سب صحیح پر یہ کے وقت اس چار دیواری سے لڑکیوں کی کالج بس کو نکلتے ہوئے دیکھتے تھے اور انہوں نے کئی مہر رخوں کو اس بس میں بیٹھے جاتے دیکھا تھا۔ میں پہلا کیڈٹ تھا جسے انتظامیہ نے خود اس چار دیواری تک رسائی کی اجازت دی تھی ورنہ کئی کیڈیٹس تو اس چار دیواری کے آس پاس چکنے کی پاداش میں ہی ہفتواں سزا کھاتے رہے تھے۔ تمام سینز کیڈیٹس نے مجھے کسی نہ لٹھی، ناکہ، بیٹھا، عینی، پنکی یا ناہید وغیرہ کا اتنے پیچہ معلوم کرنے کی ”مشقیں“ کیس۔ یوں اس دن کا اقتداء ناٹ فائل کے بعد یوں ہوا کہ آدی ”محمد بن قاسم ہاؤس“ کا سب سے اہم کیڈٹ بن چکا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

بوا کی افواہ

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

کہتے ہیں کچھ سرو گوشیوں کی رفتار چیزوں سے بھی تیز ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ طاہر بھائی اور ان کے جھٹے سے بھی مشکل تھا۔ لوگ تو شاید کسی طور اس واقعے کو بھلا بھی دیتے لیکن شکورن بوا کی گھر پھر نے محلے داروں کی یادداشت سے یہ انہوں کبھی مٹنے نہ دی۔ نام تو ان کا شکورن تھا لیکن آج تک کسی نے انہیں کبھی خدا کا شکر ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شکورن بوا آدمی کے محلے کی سب سے قدیم شے تھیں۔ جب آدمی کے ابا درور دراز کے علاقے سے ٹرانسفر ہو کر اس شہر میں تعینات ہوئے تھے اور اس کا لوٹی میں آ کر بے تھے، شکورن بوا سب سے بھی پہلے کی یہیں آباد تھیں۔ محلے کی جانے کتنی نسلیں ان کے سامنے ہی جوان ہو کر اب بڑھا پے کی دلیز پر دستک دے رہی تھیں لیکن شکورن بوا بھی ویسی کی ویسی ہی تھیں۔ لگائی بھائی اور ادھر کی ادھر لگانا ان کا پسندیدہ مشغله تھا، گزر بسر کے لیے انہوں نے گھر ہی میں بچوں کے لیے یعنی گولیوں، کٹھے یعنی چورن، پیکٹ میں بندالی، خشک شہتوت اور بیر اور ایسی ہی جانے اور کتنی آتم غلام چیزوں کی دوکان سجارتی تھی۔ جب اسکوں کی چھیاں ہوتیں تو محلے کے بچوں کا پسندیدہ مشغله صحنِ اٹھنے کے فوراً بعد جیب میں چونی اٹھنی ڈال کر شکورن بوا کے ”ڈیپارٹمنٹ ٹھوڑ“ کا رخ کرنا ہی ہوتا تھا۔ راجہ اور آدمی بھی شکورن بوا کے مستقل گاؤں میں شامل تھے۔

اب یہ راجہ کی بدستی تھی کہ وہ طاہر بھائی اور ان کے جھٹے کے وقت وہاں موجود نہیں تھا لیا پھر شکورن بوا کی خوش قصمتی کہ وہ عین اسی وقت اپنے ششل کا ک بر قعے سمیت اپنی دوکان کے لیے خریدا ہوا سامان انھائے گزر رہی تھیں جب انکو نے طاہر بھائی کے سر پر آئی کے سے وار کیا تھا۔ طاہر بھائی کے سر سے نکلتی خون کی پھوار دیکھ کر حواس باختہ ہو کر جب وہ چھیں تھیں تب ہی باقی راہ گیراں جانب متوجہ ہوئے تھے۔ یہ انکشاف انہوں نے ہی سب سے پہلے کیا تھا کہ دونوں لڑکوں میں ہاتھا پائی سے پہلے انہوں نے کسی ایک کے منہ سے وجہہ کا نام خود اپنے کانوں سے سناتھا۔ یہ تو غیاث چچا کا عرب دا بھی ایسا تھا کہ انہیں ”گھل“ کر اپنے زریں خیالات کے اظہار کا موقع نہیں مل سکا ورنہ اب تک وہ محلے کے ہر گھر میں اس بات کا ڈھنڈ را پیٹھ چکی ہوتیں۔ کچھ لوگ خود بھی شکورن بوا کی عادات سے واقف تھے اور کچھ غیاث چچا اور ان کے معزز خاندان کا بھی لوگوں کو دھیان تھا اس لیے مردوں نے تو اگر اسے کچھ کہتے سنائی تو وہیں جھڑک کر چپ کر وا دیا۔ رہی بات محلے کی عورتوں کی تو ہو آپی ان کے سامنے ہی پنجی سے جوان ہوئی تھیں۔ وہ سب ان کے کردار سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود شکورن بوا کی زبان کو مستقل لگا مدمینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اب جانے یہ سرو شیاں غیاث چچا کے خاندان تک اس وقت پہنچ پائی تھیں یا بھی وہ لوگ ان افواہوں سے لعلم تھے کہ جب لکینے خالہ اور وجوہ آپی نے طاہر بھائی کی عیادت کے لیے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ محلے میں ایک دستور عام تھا کہ کسی کے گھر مہمان بن کر جانے سے پہلے کسی

بچے کو سمجھ کر اطلاع کروادی جاتی تھی تاکہ اچانک جانے سے کسی کو زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جھگڑے کے دوسرے دن فتو آپی نے اپنے گھر کے دروازے سے باہر جھانکا تو راجہ اور گذوپہلے سے ان کے ”پہرے“ پر موجود تھے۔ دونوں نے چونکہ کر فتو آپی کو دیکھا۔ آپی نے اشارے سے ان دونوں کو پاس بلایا اور انہیں طاہر بھائی کے گھر ان کی اماں کو پیغام دینے کا کہا کہ سیکنڈ خالہ اور وجہہ ان کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ راجہ نے گذو ہیں آپی کے گھر کے باہر چھوڑا اور خود بھاگتے ہوئے طاہر بھائی کے گھر آپنچا اور عزیزہ خالہ (طاہر بھائی کی اماں) کو آپی کا پیغام دیا۔ انہوں نے حسب معمول ”سوبار آئیں، ان کا اپنا گھر ہے“ کا جواب راجہ ہی کے ہاتھ بھجوادیا جسے راجہ نے دوسرے ہی لمحے فتو آپی کے گھر جا کر انہیں منتقل بھی کر دیا اور پھر جب فتو آپی اور سیکنڈ خالہ طاہر بھائی کے گھر کے لیے نکلیں تو راجہ نے ہوشیاری سے گذو کو بھی ان کے پیچے طاہر بھائی کے گھر بھیج دیا۔ تھمی شکورن بوا بھی اپنے دروازے پر پڑی چاک اٹھا کر باہر نکل آئیں اور انہوں نے راجہ سے پوچھا۔

”ہے بچے..... ادھر آ..... یہ کون دو(۲) ابھی طاہر میاں کے گھر گھسی ہیں۔“ راجہ نے انہیں بتایا کہ فتو آپی اور سیکنڈ خالہ ہیں۔ یہ سن کر بوا چمک کر بولی۔

”ہاں ہاں..... وہ کیوں نہ جائیں گی مزاج پری کو..... سب ہی جانتے ہیں کہ دونوں لوٹنے اپنی وجہہ بی کی لگائی ہوئی لڑائی ہی تو لڑ رہے تھے۔“

راجہ کو ان کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ شکورن بوا کا پہلے ہی اتنا مقروض تھا اور ان کے ہاں سے ادھار کی اتنی چیزیں لے کر کھا چکا تھا کہ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شکورن بوا جس طرح شتم پنجم باہر نکلیں تھیں ویسے ہی فوراً اپس اندر بھی چل گئیں۔ کچھ ہی دیر میں گذو نے آ کر راجہ کو پورٹ دی کہ گھر میں طاہر بھائی سمیت کبھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو سیکنڈ خالہ نے جاتے ہی طاہر بھائی کی بلا میں لیں کیونکہ طاہر بھائی نے ہمیشہ ان کی بیٹی کو بہترین نمبروں سے پاس کروانے کے لیے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھیں پھر انہوں نے بھی چھوٹتے ہی وہی سوال کیا جو سارے محلے کی زبان پر تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ معاملہ اس قدر بڑھ گیا؟ گذو نے بتایا کہ اس سوال پر فتو آپی نے جواب تک سر جھکائے تیٹھی تھیں، نظر اٹھا کر طاہر بھائی کی جانب دیکھا، ان کی نظر میں طاہر بھائی کے نام ایک ایجاد تھی کہ اب مناسب یہی ہو گا کہ طاہر بھائی پوری بات کھل کر سب کو بتا دیں لیکن طاہر بھائی نے فتو آپی کی نظروں کی سی ان سی کرتے ہوئے وہی مخصوص جواب دیا کہ اُو تو بس خو مخواہ ہی ان سے الجھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے، ورنہ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ سیکنڈ خالہ نے طاہر بھائی کو مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں سے دور رہنا ہی شریف زادوں کے لیے بہتر ہے۔ آئندہ طاہر بھائی اس راستے سے ہی نہ گز ریں جہاں وہ مُؤا اُکوان کا راستہ کامنے کے لیے کھڑا ہو۔

اب سیکنڈ خالہ کو یہ بات کون سمجھتا کہ راستہ تو وہ ان کی لاڈی و جو مکا کا نانا چاہتا ہے لیکن ہر بار طاہر بھائی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اکونے پہلے اس رکاوٹ کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن طاہر بھائی کے سر کی پٹی اتر گئی اور اس سے اگلے دن ٹاکے بھی کھل گئے۔ علاقہ ایسیں ایچ او نے دو مرتبہ ان کے گھر کے چکر مزید لگائے تاکہ طاہر بھائی اکو کے غلاف روپورت کروانا چاہیں تو وہ درج کرنے کو تیار ہے لیکن طاہر بھائی نے اسے ٹال دیا کہ یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے اور اب وہ غلط بھی بھی دور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اُکوان سے لڑ پڑا تھا لہذا ایف آئی آر

درج کروانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بالے نے اگلے روز راجہ کو بتایا کہ اگورات کے اندر گھر کے اندر کو داخلا کیں اس کے ابا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اگو کو بہت بے عزت اور ذلیل کرنے کے بعد اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اگو اسی وقت ان کے ساتھ چل کر طاہر بھائی اور اس کے گھر والوں سے معافی مانگ لیں اگو نے صاف انکار کر دیا کہ وہ مرتے مر جائے گا لیکن کبھی طاہر سے معافی نہیں مانگے گا۔ اس بات پر بالے کے ابا مزید بھڑک گئے اور انہوں نے اگو کو اسی وقت گھر سے نکل جانے کا کہوارہ دوسرا صورت میں انہوں نے پولیس کو بلانے کی دھمکی دے دی تھی۔ اس پر اگو نے طنزیہ بنی کے ساتھ باب کو درمیان میں ہی ٹوک دیا کہ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ وہ شیم حکیم (مطلوب طاہر بھائی) بھی آج کل پولیس کے ساتھ بہت راہ و رسم بڑھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو بھی جا کر خبر کر دے کہ اگو نے بھی کچھی گولیاں نہیں کھلیں۔ اگر اس نے پولیس میں رپٹ درج کروانے کی غلطی کی تو اگو بھی چپ نہیں بیٹھے گا اور سارے شہر میں طاہر کے معاشرے کی خبر پھیلادے گا۔ بالے نے راجہ کو بتایا کہ شاید اس کے ابا کو تو اگو کی دی ہوئی اس دھمکی کی اتنی سمجھنے آئی ہو لیکن بالے کے کان اگو کی بات سنتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بمحض گیا تھا کہ اگو کا اشارہ کس طرف ہے لیکن تب تک اگو کے ابا اس حد تک پھر گئے تھے کہ انہوں نے خود اگو کو باہم سے پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیا۔ بالے نے راجہ کو یہ بھی بتایا کہ گھر سے نکلتے ہی اگو بالکل ہی بھتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے طاہر بھائی سمیت خودا پنے گھر والوں کو بھی ٹکین متعالج کی دھمکیاں دیں کہ اب وہ بھی چین سے نہیں بیٹھے گا اور نہ اپنے گھر والوں کو اور نہ اسے چین سے بیٹھنے دے گا جس کی وجہ سے آج اسے گھر بدر کیا گیا ہے۔ اگو بہت دیر تک وہیں دروازے پر کھڑا بکتا جھلتا رہا اور پھر دیگر محلے داروں کے گلی میں جھانکنے اور دروازے کھلنے کی آواں سن کر وہاں سے کہیں چلا گیا۔

بالے کی زبانی یہ سارا ماجرا سن کر راجہ اور باقی سارے دوست گھری سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں تو صرف ہوآپی کی فکر ہی کھائے جا رہی تھی لیکن یہاں تو طاہر بھائی کی جان کے بھی لا لے پڑتے نظر آرہے تھے۔ اب وہ کیا کریں؟ بس یہی اک سوال ان سب کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر راجہ کو آدمی کی یاد بہت ستائی تھی کیونکہ جب ان سب کے دماغ ہتھیار ڈال دیتے تھے تب ایک آدمی ہی تھا جس کی عقل ایسے میں کوئی دور کی کوڑی لے کر آتی تھی لیکن آدمی تو اس وقت یہاں سے ہزاروں میل دور جانے کن ظالموں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ کاش آدمی یہاں ہوتا..... کاش..... کاش..... راجہ کا ذہن اسی ایک کاش کا اور دوسری تارہا لیکن اسے کون سمجھاتا کہ ہماری زندگیاں ایسے بہت سے ”کاش“ کا مجموعہ ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک کاش بھی اگر اپنی جگہ سے مت پاتا تو شاید ہم سب خود اپنی قدر یہ لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں تھا..... کاش یہ ممکن ہو پاتا۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی ڈیشن

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن ٹھیک وقت پر جمع (ہاؤس بیرا) مجھے کانونٹ کے احاطے میں چھوڑ آیا۔ مدرکیتھرین وہیں چرچ کے احاطے میں بنے چھوٹے سے باعثیجی میں بیٹھیں خود اپنے ہاتھوں سے پوپوں کو پانی وغیرہ دے رہی تھیں، پاس ہی ان کا با غبانی کا سامان بھی پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دور ہی سے گرم جوشی سے ہاتھ ہلا کیا اور مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ آج میں اپنی کتابیں بھی ساتھ لے کر آیا تھا اور جمعہ پہلے ہی میری یونیفارم اور دیگر ضروری لباس لکڑی کے بڑے بڑے ہنگر میں لٹکائے وہاں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مدرکیتھی نے مجھے سے پوچھا کہ مجھے گھر میں کس نام سے بلاتے ہیں۔ میں نے بتایا آدمی، تو وہ مسکرا کر بولیں کہ میں بھی تمہیں تمہارے گھروالے نام سے پکاروں گی اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ میں نہیں پڑا۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی میرے کان کیڈٹ عباد، کیڈٹ عباد سن سن کر پک گئے تھے اور پہنچی آفیسر زکا اپنے کرخت لبھے میں ”ہے یورک نمبر 8336 کہنا یا پھر طالب پی او کا تر اسی چھتی کہنا تو یہ ہی مجھے خخت نا پسند تھا۔

اس دن کافی دیر تک مدرکیتھی مجھے سے میرے گھر بار اور تعلیم کے بارے میں پوچھتی رہیں اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس بورڈنگ میں آنے سے پہلے آج تک کبھی پتلاؤ نہیں پہنچی تو وہ یہ سن کر بہت دیر تک مسکراتی رہیں۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس میں ایسی کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ لباس اور زبان انسان ضرورت کے لحاظ سے اختیار کرتا اور چھوڑتا رہتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی مثال دی کہ انہوں نے جو یہ سفید عبا پہن رکھی تھی جو چرچ کی نن کا مخصوص لباس ہوتا ہے، اسے انہوں نے اپنی عمر کے انیسویں سال تک چھوا بھی نہیں تھا لیکن جب ضرورت پڑی تو انہوں نے پہن لی اور پہلے دن انہیں بھی اس لباس میں بہت بے آرامی اور بالجن محسوس ہوئی تھی لیکن اب یہی لباس انہیں دنیا کا سب سے بہترین لباس لگتا ہے۔

انتہی میں ہیلین بھی آگئی۔ مدرکیتھی نے اسے میرے گھر میونام سے آگاہ کیا اور مجھے ہیلین کے جواہ کر کے خود عبادات کے لیے چرچ کے اندر چل گئیں۔ ہیلین نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور پوچھا۔

”ہاں تو مسٹر آدمی..... کہاں سے شروع کریں.....؟“

اس نے کے منہ سے اپنا نام مسٹر کے اضافے کے ساتھ سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اپنی کتابیں ہیلین کی طرف بڑھادیں۔ ہیلین نے چھان پیٹک کے بعد سب سے پہلے انگریزی کوئی منتخب کیا اور پہلے مجھے سے پوچھا کہ میں نے اپنے پچھلے اسکول میں کہاں تک انگلش پڑھی ہے۔ میں نے فوراً انہیں اپنی گزشتہ ”انگریزی کی استعداد“ کے بارے میں تفصیل سے بتاویا۔ ہیلین نے اسی حساب سے میرے لیے روزمرہ کا ایک چارت تیار کر لیا اور اس میں ہر ہفتے کے لیے مختلف اہداف مقرر کر دیئے اور ٹھیک وہیں سے ابتداء کی جہاں سے میں چھوڑ کر آیا تھا۔

پھر اس نے دیگر مضامین کے بارے میں مجھے مختصر آتنا بتایا کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں پہلے اپنے پرانے اسکول میں پڑھ پکا ہوں۔ صرف زبان ہی کا فرق ہے۔ مثلاً ھیلین نے ریاضی کی کتاب ہائل کر مجھے سوالات دکھائے۔ میں ہندسوں کو تو فوراً سمجھ گیا لیکن ان کے نیچے دی گئی انگریزی کی عبارت کو نہیں سمجھ پایا۔ اس نے مجھے ”جذر“ کے دوسرا حل کرنے کو دیئے جو میں نے فوراً حل کر دیے۔ تب ھیلین نے مجھے بہت شباباًش دی اور وہی حل شدہ سوالات مجھے میری ہی کتاب کی مشق والے حصے میں دکھائے۔ سب کچھ ہو بہو دیئے ہی حل کیا گیا تھا جسے میں نے کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے واپسی ہاتھ سے شروع کیا تھا اور عبارت اردو میں لکھی تھی جبکہ وہاں کتاب میں وہی سوال بائیس جانب سے حل کیا گیا تھا اور عبارت انگریزی میں تھی۔ ھیلین نے مجھے بتایا کہ یہ انگریزی میں وہی عبارت ہے جسے میں نے ابھی ابھی اردو میں لکھا ہے بلکہ وہ یہ بتاتے ہوئے تو زور سے بس دی کہ اسے تو اردو میں ریاضی بہت ہی مشکل لگتی ہے اور وہ کبھی اردو میں سوال حل بھی نہیں کر پاتی۔ مجھے ھیلین کی باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ تو کھودا پپڑا اور نکلا چبھا والی بات ہو گئی۔ میں خواجواہ اتنے دن سے ان کتابوں سے ڈر رہا تھا۔ ھیلین نے یہی بعد دیگرے اسی طرح مجھے معاشرتی علوم ہے وہاں سو شش اسٹڈیز کا نام دیا گیا تھا۔ دینیات ہے وہاں اسلام اسٹڈی کہتے تھے اور سائنس وغیرہ کے بارے میں بڑی سہولت سے بتا دیا کہ آسٹین کو انگریز بھی آسٹین ہی کہتے ہیں، صرف لکھتے Oxygen ہیں۔ مجھے یہ جان کر کافی اطمینان ہوا کہ انگریز بھی ہم جیسے ہی ”مسلمان“ ہوتے ہیں اور ان سے خواجواہ معروب ہونے کی مجھے قطعی ضرورت نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ انگریز بھی ہماری طرح ہی اردو لکھتے اور بولتے بھی..... پھر تو یہ سارا بھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ ھیلین نے ان پہلے دو گھنٹوں میں ہی میرے اندر سے انگریزی اور انگریزی پڑھائے جانے والے تمام مضامین کا وہ خوف یوں دور کر دیا جیسے وہ خوف میرے اندر کبھی تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس نے میرے اندر آہستہ آہستہ ایک تجسس کی لہر بیدار کر دی تھی کہ جو چیز میرے لیے اردو میں ”سبق“ ہے وہ انگریزی میں Lesson کیسے بن جاتی ہے لہذا مجھے اب اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔

انتہے میں چرچ کے گھنٹہ گھنے شام کے چھ بجنتے کا اعلان کر دیا۔ ھیلین نے مجھے بتایا کہ آج کے لیے میری ٹیوشن ختم اور اب آگے شیرل مجھے یہاں کے بارے میں تعلیم دے گی۔ ھیلین پوری ٹیوشن کے دوران مجھے نوکتی رہی کہ میں اسے سڑھیلین یا صرف سڑھیل کہوں لیں گے میرے منہ سے ھیلین ہی لکھتا اور جب وہ گھوکر مجھے دیکھتی تو میں جلدی سے اس کے نام کے آگے سڑھ کا لاحق جوڑ دیتا اور وہ بس دیتی۔ پہلی ٹیوشن ختم ہونے سے پہلے ہی ہم دونوں کے درمیان کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ ہم چرچ کی مرکزی عمارت کے اندر ہی موجود ایک بہت کھلے اور اوپری چھت والے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔ چھ بجنتے کے بعد ھیلین مجھے لیے چرچ کی مرکزی عمارت سے باہر آئی تو سامنے والے باعینچے میں تو کرچائے لگا چکا تھا اور کوئی لڑکی نہیں کپڑے پہنے ہماری جانب پشت کی بیٹھی تھی۔ ھیلین اور میرے قدموں کی آوازن کروہ پلٹی اور میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ہو بہو ھیلین کی دوسری نقل تھی۔ وہ ناک نقشہ، وہی روپ، وہی نہیں..... دونوں میں اگر فرق تھا تو صرف ان کے لباس کا، ھیلین نے کے سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھی جبکہ اس نے نہیں لباس پہننا ہوا تھا اور لمبے سے فیروزی رنگ کے اسکرٹ اور کالی دھاریوں والی قیص پہن رکھی تھی۔ ھیلین اور وہ لڑکی میری حیرت دیکھ کر ایک ساتھ بس پڑیں۔ ھیلین نے میر اعتراف کر دیا۔

”یہ ہے کیڈٹ عباد اور یہ ہے میری چھوٹی بہن شیرل.....“ شیرل نے اپنا تھہ ملانے کے لیے میری طرف بڑھایا۔

”چھوٹی ضرور ہوں لیکن اتنی نہیں کہ ھیلین کے رعب میں آ جاؤں۔ صرف چار منٹ ہی چھوٹی ہوں۔“

میں جیران سا بھی حیلین اور بھی شیرل کی طرف دیکھتا رہا۔ تب حیلین نے مجھے بتایا کہ وہ اور شیرل دراصل جڑواں نہیں ہیں۔ حیلین نے میٹرک کے بعد چرچ کی راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی جبکہ شیرل اب بھی اپنے باپ کے ساتھ کافونٹ کے پچھلے حصے میں موجود ہائشی کا لوئی میں رہتی تھی جبکہ ان کی ماں کا انتقال چار سال پہلے اس وقت ہو گیا تھا جب شیرل اور حیلین اپنے میٹرک کے امتحانات سے صرف دو دن پہلے ہی فارغ ہو کر بورڈنگ سے گھر آئیں تھیں۔ ان کی والدہ خود بھی بے حد نہ ہی خیالات کی حامی اور روزانہ چرچ سروس میں شرکت کرنے والی تھیں۔ حیلین کو چرچ سے بہت محبت ماں سے ہی ورثے میں ملی تھی جبکہ شیرل شروع ہی سے بے حد شرارتی اور چلبی طبیعت کی حامل تھی لیکن مزاج کے اس تضاد کے باوجود دونوں بہنوں میں مثالی پیار تھا۔ حیلین مجھے شیرل کے حوالے کر کے اور مجھ سے کل تک کے لیے رخصت لے کر اپنے دیگر امور پنپانا نے چلی گئی لیکن جاتے جاتے اپنی بہن کو انگریزی میں بتائی کہ مجھے آدمی پکارے جانا اچھا لگتا ہے، تبھی شاید شیرل نے اس کے جانے کے بعد جب مجھے کیڈٹ آدمی کہہ کر پکارا تو اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج ہم یہیں چرچ کے باعثے میں بیٹھ کر ”گپ شپ“ کریں گے جبکہ کل سے مجھے حیلین سے ٹیوشن کے بعد فارغ ہو کر شیرل کے پاس ان کے گھر آنا ہو گا لیکن کچھ ہی دیر میں مجھے شیرل کی اس ”گپ شپ“ کا مقصد بھی سمجھا گیا۔ اس نے اپنے کام کا آغاز اسی دن شام کی چائے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات میں چرچ کی بیکری سے بنی ہوئی پیشہ اور کیک وغیرہ بھی موجود تھے اور شیرل نے سب پہلے مجھے کاشا اور چھری اٹھا کے کیک اور پیشہ کاٹ کر اپنے لیے پلیٹ میں الگ کرنے کو کہا۔ مجھے جس طرح بھی سمجھیں آیا میں نے یہ دشوار فریضہ سرانجام دے ہی دیا۔ پھر شیرل نے بنا کچھ کہے خود پہلے کیک کا ایک حصہ چھری اور کاٹنے سے اپنے لیے علیحدہ کیا اور پھر دیگر چیزوں کو کاٹنے سے بڑی نفاست سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے میرے سامنے بھی کھانے کے لیے رکھتی گئی، میں بہت غور سے شیرل کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دن مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کاٹنے کے صحیح طریقہ استعمال کے بارے میں پڑھا چلا۔ شیرل نے خود اپنے منہ سے مجھے نہ کسی بات پر ٹوکا اور نہ ہی خود سے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ بس وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اور کچھ میرے بارے میں پوچھتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے مجھے سب کچھ سکھاتی رہی۔ شاید اگر وہ شعوری طور پر مجھے سکھانے کی کوشش کرتی تو میں وہ آداب اتنی جلدی نہ سکھے پاتا۔ حیلین اپنے انداز والطوار میں جس قدر سنجیدہ اور مدبر دکھائی دیتی تھی شیرل اتنی ہی زندگی سے بھر پور اور ہربات کو ہنسی میں اڑا دینے والی شوخ چیخل تھی۔ پہلی ہی شام اس نے مجھے چائے پینے کے انگریزی آداب سے اچھی طرح روشناس کرو دیا تھا۔ میرے اور انگریزوں کے چائے پینے میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا، بلکہ مجھے اس روز انگریزوں پر بہت ترس بھی آیا کہ چائے جیسی نعمت کو وہ کس قدر احتیاط اور خود کو پابند یوں میں جکڑ کر پیتے ہیں۔ وہاں ہمارے محلے میں تو میرے اور راجہ کے درمیان باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا کہ کون ایک ہی گھونٹ میں چائے کا بھرا پیالہ ایک زور دار ”سرڑڑ.....“ کی آواز کے ساتھ سب سے جلدی ختم کر سکتا ہے۔ جب کہ یہاں شیرل مجھے یوں نفاست سے دھیرے دھیرے اور چھوٹی چھوٹی چکیاں لے کر چائے ختم کرنے کا درس دے رہی تھی جیسے وہ چائے کا کپ نہ ہو ”آپ زم زم“ ہو۔ حق پوچھیں تو مجھے اس طرح چائے پینے میں ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ پرمatta کیا ہے کرتا۔ آدمی کو کیڈٹ عبادی کی طرح برتاو کرنے کے لیے یہ سب سیکھنا بے حد ضروری تھا۔ میں شیرل کو دیکھ کر اس کی طرح سب کچھ دھراتا رہا اور دل ہی دل میں اس دن کو ستارہ اجنب میں نے دو سال قبل خود ابا کے سامنے ”فوچی کانچ“ میں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

پابندی

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

اُس رات اُگو کو گھر سے تو نکال دیا گیا تھا لیکن دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے جو حملکیاں دیں تھیں اور طاہر بھائی اور ڈھو آپی کے بارے میں جو زہرا فشنی کی تھی اسے محلہ دار، بہت دن تک اپنے ذہن سے نہیں نکال پائے تھے۔ رہی سہی کسر شکورن بوا کی قیچی کی طرح چلتی زبان نے پوری کردی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی بیٹھی کسی نہ کسی بہانے طاہر بھائی اور اُگو کے جھگڑے کو زیر بحث لے ہی آتی۔ رفتہ رفتہ اب بھی محلے کو اتنی خبر تو ہو ہی گئی تھی کہ اُگو اور طاہر کے جھگڑے کی در پر وہ وجہ سچھا اور ہتی ہے لیکن پورا محلہ غیاث پچا اور ان کے گھرانے سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھا اور اُگو کے کرتوت بھی بھی کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ رجہ اور بالے نے چند ایک دفعہ خود شکورن بوا کی اس افواہ سازی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا تھا اور ہر دفعہ راجہ، بالے، گندو، پوپیا کسی بھی دوست کے ذریعے انہوں نے شکورن بوا کی بات پلنٹنے کی کامیاب کوشش کر کے بوا کو اس منظر سے ہٹا بھی دیا تھا مثلاً ایک مرتبہ وہ جن خالد کے ہاں دروازے سے باہر بنے چوتھے پر دھوپ سینکتے ہوئے جب انہوں نے طاہر اور اُگو کا ذکر شروع کیا راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے جلدی سے بالے کو اشارہ کیا۔ بالے نے موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا اور بھاگتے ہوئے بوا سے جا کر کہا کہ آپ کے گھر کے باہر متی آپا واویلا کر رہی ہیں کہ آپ شاید دودھ چولہے پرہی ابلا چھوڑ آئی ہیں اور اب اس دودھ چھلنے کو ہی ہے۔ یہ سنتے ہی شکورن بوا اپنا شل کا ک خیمہ نما بر قع سنبھالتے ہوئے بنا یہ سوچے گھر کی طرف دوڑیں کہ دودھ تو انہوں نے آج لیا بھی نہیں تھا کیونکہ ابھی تک دودھ والے کے آنے کا وقت ہی کہاں ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ جب راہ چلتے انہوں نے غور پچا کو روک کر ان سے پولیس میں جھگڑے کی شکایت کا ذکر چھیڑا تو انہوں نے جو قریب ہی رجہ اور دیگر دوستوں کے ساتھ پھوگرم کھیل رہا تھا، جان بوجھ کر اس زور سے گیند شکورن بوا کی کمر میں دے ماری کر شکورن بوا سب بھول بھال اور سب چھوڑ چھاڑ کر لائی ہی کے کران سب کے پیچھے دوڑ پڑیں۔ تھوپاری میں سے تو کوئی ان کے ہاتھ نہیں آیا البتہ شکورن بوا اپنی کمر کی سکائی اگلے تین دن تک لگاتار کرواتی رہیں لیکن باز پھر بھی نہیں آئیں۔ جانے انہیں طاہر بھائی اور ڈھو آپی کے گھرانے سے خدا اس طے کا ذکر کیا تھا؟ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں سارے زمانے سے ہی شکایت تھی۔ محلے کی کچھ بڑی بوڑھیاں اس کی وجہ یہ بتائی تھیں کہ شکورن بوا اگر میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ماں باپ کی یکے بعد دیگرے ناگہانی موت کے بعد انہوں نے ہی ساتوں بہن بھائیوں کی پروش کچھ اس طرح سے کی کہ ان کی فکر میں اپنی ساری جوانی ہی جلا کر راکھ کر دی اور جب تک شکورن بوا اپنے فرائض سے فارغ ہوئیں اور سب سے چھوٹی بہن کی ڈولی رخصت کروائی تب تک خود ان کی ڈولی اٹھنے کی عمر کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بھی بہن بھائی اپنی زندگی اور گھر انوں کے پھیر میں یوں الجھے کہ شکورن بوا کی طرف سے ان کا دھیان ہٹا گیا اور شکورن بوا چڑی چڑی ہوتی گئی پھر ایک دن انہوں نے خود ہی بھی کنبے سے قطع تعلق کر لیا اور

اپنے دروازے بھی پرہیش کے لیے بند کر لیے۔ تب سے لے کر آج تک انہیں محلے میں جوان ہوئی ہر لڑکی سے بیرون رہتا تھا۔ وہ کسی کی بھی ڈولی اٹھتے ویکھتیں تو خود ان کے دل میں ایک ایسی ہوک اٹھتی جوان کے اندر کا سارا زہر ان کی زبان تک لے آتی اور اب تو پورا محالہ ہی ان کی اس زہر اُگلتی زبان کا عادی ہو چکا تھا لیکن راجہ، بالے اور دیگر دوستوں کو اور تو سب کچھ منظور تھا لیکن وہ اپنے آدمی کی چیتی ہو آپی کے خلاف کچھ برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آدمی جاتے ہوئے ان کی ذمہ داری ان سب دوستوں پر ڈال گیا تھا البتہ وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان کی موجودگی میں ہو آپی کے پا کیزہ کردار پر کچھ اچھا لئے کی کوشش بھی کرے لیکن کہتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں دیواروں کے بھی کان نکل آتے ہیں اور کبھی کبھی ہلکی سی آواز میں کی گئی سرگوشی کسی دھماکے کی آواز سے بھی پہلے ان دیواروں میں سراہیت کر کے دوسرا طرف پہنچ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہو آپی اور طاہر بھائی کے بارے میں بھی ہورتا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

رہی سہی کسر اس ایک واقعے نے پوری کردی۔ علاقے کا ایس ایج اور بازار میں گشت کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اُگلو اور اس کے دو دوستوں پر پڑ گئی۔ اُگلو کے خلاف باقاعدہ کوئی آئی آئی آر تو کسی نے درج نہیں کروائی تھی اور طاہر بھائی نے خود ایس ایج اور کھنچی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو پولیس میں نہیں لے جانا چاہتے لیکن پھر بھی ایس ایج اونے سوچا کہ اُگلو کو بلا کرو ہیں بازار میں ذرا سختی سے تنبیہ کر دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ وہ طاہر بھائی اور ان کے گھر ان کی شرافت سے اچھی طرح واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اُگلو دوبارہ طاہر بھائی سے الجھے یا کوئی اور شرارت کرے۔ ایس ایج اور ملک ریشم خان نے زور دار آواز میں اُگلو کو پکارا۔ اُگلو اور اس کے دوستوں نے ایس ایج اور کو دیکھا تو جانے کیا سمجھا اور بدک گئے۔ ملک ریشم نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو پکڑ کر حاضر کیا جائے پھر کیا تھا پرے بازار میں اُگلو گروپ اور سپاہیوں کی دوڑیں لگ گئیں اور آخر کار اُگلو اور اس کا ایک دوست پولیس کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ملک ریشم نے پہلے تو ہیں بازار میں ان دونوں کی خاطر تواضع کی کہ وہ بھاگے کیوں تھے؟ اُگلو سمجھا کہ طاہر بھائی نے ایس ایج اور کو اس کے چیچے لگا رکھا ہے اور اس نے آؤ دیکھنا تھا اور وہیں بھرے بازار میں جیچ جیچ کر اپنی بے گناہی اور طاہر اور توکی "محبت" کی داستان پورے زمانے کو سنانے لگا۔ بھیڑ جمع ہو چکی تھی اور ملک ریشم نے جب تک معاملے کی نزاکت کو سمجھا تب تک اُگلو کافی بکواس کر چکا تھا۔ ملک کے اشارے پر سپاہیوں نے اُگلو کامنہ کپڑے سے باندھ کر اسے پولیس کی ولیز (willes) جیپ میں لا پھینکا اور تھانے لَا کر اسے کافی دیر تک اٹھ لئے تاگے رکھا۔ ایس ایج اونے اس سے ایک سادہ کاغذ پر حلیفہ بیان بھی لیا کہ آئندہ اگر اُگلو یا اس کے دوستوں نے کا لوٹی کا رخ بھی کیا تو جو چور کی سزا وہ ان کی اور شام تک اُگلو کوڑا دھمکا کر رہا بھی کر دیا۔ کیونکہ ایس ایج اور کوپلے ہی اسے گرفتار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر اُگلو بازار میں چپ چاپ آ کر ملک ریشم کی بات سن جاتا تو اسے اتنی مار بھی نہ ہنسی پڑتی لیکن بات بگزتی ہی گئی۔

ملک ریشم خود بھی نہیں کا باب تھا اور ایسے معاملات کی نزاکت کا غیر معمولی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے شام ہی کو پولیس لائن سے ایک تاگہ کپڑا اور غیاث پچا کے گھر چلنے کو کہا۔ اپنی پولیس کی جیپ میں وہ اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا تاکہ لوگ اسے وردي میں یا سرکاری جیپ میں دیکھ کر چونکہ نہ اٹھیں۔ غیاث پچا کو گھر سے باہر بلاؤ کر اس نے نہ جانے کیا بات پچا سے کہی کہ غیاث پچا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا۔ ملک ریشم وہیں دروازے سے ہی بنا کچھ کھائے پئے پلٹ گیا لیکن جاتے جاتے وہ غیاث پچا کے کامنے پر ہاتھ رکھ کر انہیں یہ کہا نہیں بھولا کر غیاث پچا اُگلو کی زبان سے اگلے

زہرا اور اس کی تمام بکاؤں کا ذرہ بھی ملاں نہ کریں کیونکہ وہ ایسے گلی کے معمولی غنڈوں اور لوفروں کی کھال کھینچنا خوب جانتا ہے۔ غیاث پچا ایس ایج اور کی بات سن کر اس قدر جھکلے میں تھے کہ وہ اسے ٹھیک طرح سے خدا حافظ بھی نہیں کہہ پائے اور اس وقت چوڑے کے جب موذن نے مغرب کی اذان کی سکبیر بلند کی۔ غیاث پچا ابھی تک اپنے دروازے پر ہی بت بنے کھڑے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے سکینہ خالہ کی ان پر نظر پڑی اور وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ غیاث پچانے ان کے لائے ہوئے پانی کے گلاں کو پکڑنے کی بجائے ان سے پوچھا کہ ”وجیہہ کہاں ہے.....؟“

”انہ را پہنچ کرے میں ہو گی۔ صبح کا لیج جانے کے لیے اپنایوں نیقا مر استری کر رہی ہے۔“ سکینہ خالہ نے حیرت سے جواب دیا کیونکہ انہیں غیاث پچا کے لیج میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس ہو گئی تھی۔ غیاث پچانے چند لمحے تک خلاء میں گھونے کے بعد سردی آواز میں اپنا فیصلہ سنادیا۔ ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں..... وجیہہ سے جا کر کہہ دو کہ وہ کل سے کا لیج نہیں جائے گی۔ میں نے اس کی پڑھائی ختم کروا نے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ سکینہ خالہ کے ہاتھوں سے کا لیج کا گلاں زمین پر گرا اور چھٹا کے سے ٹوٹ گیا۔

کتاب کفر کی پیشکش دجال (شیطان کا بیٹا)

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار انداز ہیاں۔ شیطان کے پچاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہنہ شیطان کا بیٹا۔ جسے باہل اور قدیم صیفیوں میں بیت (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پار ہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پر اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتوتر ترین شخص بنانے کے لیے کروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے میٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و بر باد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی

کس طرح اس دنیا کا ماحول **دجال کی آمد** کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ **دجالیت** کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ **دجال کس طرح** اس دنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ **666** کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے **کتاب گھر** پر دستیاب ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

چنل میں کیدٹ عباد

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کچھ نہیں دنوں میں ہیلین اور شیرل کی مدد سے میں رفتہ رفتہ انگریزی زبان اور انگریزی طور و اطوار میں شدھ بدھ حاصل کرنے لگا تھا۔ سارا دن میں شام کے چار بجھنے کا انتظار کرتا رہتا اور مقررہ وقت پر اب میں خود ہی بھاگتے ہوئے چرچ کے احاطے میں جا پہنچتا۔ میرے لیے اکیڈمی کے پہلے حصے کے گیٹ پر گارڈ佐وتا کید کر دی گئی تھی اور مجھے ایک کاغذی پاس بھی بنا کر دے دیا گیا تھا۔ واپسی پر البتہ چرچ کی انتظامیہ یا جمعہ مجھے لینے کے لیے آ جاتا اور میں شیرل سے رخصت ہو کر واپس ہوٹل آ جاتا۔ ہیلین مجھے چرچ میں میری کلاس کے مضمایں کی ٹیوشن دیتی اور شیرل مجھے کبھی چرچ یا کانوٹ کے احاطے میں اور کبھی اپنے گھر پر چنل میں کیدٹ بننے کی تربیت دیتی۔ شیرل کے گھر پر میری اس کے ابا سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کا نام وُسن Wilson تھا اور شیرل کی طرح میں بھی انہیں "سر" یا وُسن سر Sir کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ بھاری بدن کے ایک فربہ اندام شخص تھے لیکن سرپرہ ہیٹ، جمائے منہ میں پاپ دبائے، بڑے گیلس والی پینٹ پہن کر جب وہ اپنے لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے اپنی آرام کری پر جھولتے تو مجھے بالکل ایک بڑے بچے کی طرح دھکائی دیتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر نے زیادہ میٹھا کھانے سے منع کیا ہوا تھا لیکن وہ شیرل سے چھپ کر اور کبھی کبھار میری مدد سے بھی کچھ نہ کچھ اپنی پسند کی میٹھا حلق سے اتارا ہی لیتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دور سے ہی فوجی انداز میں سلیوٹ کرتے اور چلا کر شیرل کو مطلع کر دیتے کہ

" ہے شیرل..... تمہارا چنل میں کیدٹ عباد آیا ہے۔ اب ہم سب مل کر خوب ہنگامہ کریں گے....."

اور پھر واقعی خوب ہنگامہ ہوتا۔ شیرل انہیں میٹھا کھانے سے روکتی رہ جاتی اور وہ بڑے مزے سے کبھی ریفریجیری سے اور کبھی باورچی خانے سے کسی بند کسی ڈبے سے کچھ نہ کچھ نکال کر منہ چلاتے رہتے۔ ہفتے کے شام ہیلین بھی اس ہنگامے میں شریک ہو جاتی کیونکہ اتوار کے روز چرچ سروں تک اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ سرو سن شیرل کے قابو میں تو کم ہی آتے لیکن ہیلین کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ وہ توباقاعدہ انہیں ڈاٹ ڈپٹ کر اپنی بات منوائی تھی۔ شیرل نے مجھے تمام بس ٹھیک طرح سے پہنے اور ان کے تمام آداب کے طور طریقے بھی سکھا دیئے تھے اور اب تو میں خود ہی نائی بھی باندھ لیتا تھا۔ ہمارے یونیفارم میں ہیٹ کہیں بھی شامل نہیں تھا لیکن وُسن سرنے مجھے یکے بعد دیگرے اپنے سارے اقسام کے ہیٹ اور ان کے پہننے کے طریقے بھی سکھا دیئے۔ میں جب بھی کوئی نیا بس پہن کر باہر آتا تو وہ جھٹ سے اپنے کوڈ کیسرے سے میری ایک تصویر بنا لیتے۔ اب مجھے میں میں بھی فیصل یا اسفر کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور میں بڑے اعتماد سے باقی سب کیڈس کی طرح چھری کانے اور لکڑی کی اسکس کی مدد سے نوڈ لے، اسٹیک اور دیگر کھانے کھا سکتا تھا۔ شیرل نے مجھے رفتہ رفتہ مختلف تعداد کے کورس کے کھانوں (ڈنر) وغیرہ کے آداب کے

بارے میں بتادیا اور ہر کھانے کے لحاظ سے، لباس کی مناسبت اور رُگوں کے امتنان کے بارے میں بھی سکھا تھا کہ کب اور کس موقع پر کون سا انگریزی لباس اور کون سارِ نگ بچے گا۔ کبھی کبھی تو میں ان انگریزی طور اطوار سے سخت آگتا جاتا اور ہیلین اور شیرل کے سامنے انگریزوں کو خوب کوستا کر کے بھی ہماری طرح سارا دن ایک ہی شلوار کرتے میں کیوں نہیں گزار سکتے تھے۔ اکیڈمی میں ہمیں صرف جمع کی نماز کے وقت ہی جناح کیپ اور کرتا پا جامہ پہننے کا موقع ملتا تھا اور نہ سارا دن ہم اسی طرح کے ”اوٹ پٹا نگ“ لباسوں میں بیٹھے رہتے جو گئے انگریزوں کی ویں تھی۔ مجھے رفتہ رفتہ اکیڈمی میں کچھ سکون آنے ہی لگتا تھا کہ ایک دن اچانک ڈائیے نے آگریٹ پر حسب معمول اپنی سائکل کی گھنٹی زور سے بجا لی اور میرا نام لپکارا۔ میں نے چوک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے خط کی جانب دیکھا کیونکہ گھر میں سے صرف ابا خط لکھتے تھے اور ان کا خط ابھی دو دن پہلے ہی تو آیا تھا جس میں انہوں نے چار سطروں میں مجھے اپنی پڑھائی پر دھیان دینے اور اپنی صحت کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ ویسے بھی ابا کے خط بہت مختصر ہوتے تھے اور سب ہی کامضیون تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے تیک ہونے لگتا تھا کہ کہیں اپنے ایک ہی خط لکھ کر اس کی بہت ساری نقولوں تو تیار نہیں کروالیں؟ جنہیں وہ ہر ہفتے مجھے پوسٹ کر دیتے تھے اور جن کا آغاز ہمیشہ پرخور دار عباد سے ہو کر اختتام ہمیشہ ”تمہاری امی، فاران اور عماراتِ تمہیں پیار کہتے ہیں“ پر ہوتا تھا۔

لیکن یہ خط ابا کی جانب سے نہیں تھا۔ یہ خط راجہ اور میرے باقی دوستوں نے مل کر مجھے لکھا تھا۔ راجہ کی تحریر دیکھتے ہی میرے اندر کا تمام دکھ اور وہ شدید اداسی جس پر میں نے اس اکیڈمی میں گزرے اپنے گزشتہ تین ہفتوں کی مٹی ڈال رکھی تھی، ایک دم سے مجھ پر یوں حاوی ہوئے کہ خط کھولتے ہی میری آنکھوں سے آنسو پڑ گرنے لگے۔ راجہ نے میرے اکیڈمی کے لیے روانہ ہونے والے دن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات خط میں تفصیل سے لکھے تھے۔ پانچ صفحوں کے اس خط کو میں نے جانے لکھی بار پڑھا اور ہر بار مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنے محلے میں، اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں۔ راجہ نے طاہر بھائی اور اُگو کے مجھڑے اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ اس کا اور میرے باقی سب دوستوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ میں جیسے ہی بڑا افرین کرو اپس اپنے محلے میں پہنچوں تو سب سے پہلے مجھے اُگو کو بعد اس کے تمام غنیمتے دوستوں کے گرفتار کروانا ہوگا۔ وہ آپ کے ذکر پر تو میری وہ حالت ہوئی کہ اس جیسے چکیاں ہی بندھ گئیں۔ یہ میرے کیڈٹ کالج آتے ہی کیا کچھ ہو گیا تھا۔ وہ لکنی پر بیشان ہوں گی وہ تو اتنی نازک ہیں کہ ان سے کسی کی سخت نظر بھی برداشت نہیں ہوتی تھی پھر اتنی سخت باتیں اور جھوٹیں ازامات انہوں نے کیسے برداشت کیے ہوں گے؟ کون نہیں دلا س دیتا ہوگا؟ جب بات کرتے کرتے اور اچانک ہستے ہوئے ان کی آنکھوں میں نئی آجائی ہو گی تو کون جا کر ان کی بھیگی پلکیں پوچھتا ہوگا؟ ایسے جانے کتنے ہی سوال میرے ذہن میں یوں گردش کرنے لگے کہ شام سے پہلے ہی مجھ کپکنی سے طاری ہو گئی اور جب پہلی پریپ کے وقت پریفیکٹ نے آکر میرا تھا چھوکر دیکھا تو اٹھ پاؤں بھاگا اور چند ہی لمحوں میں مجھے اکیڈمی کے چھوٹے سے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک ”ڈاکٹر نما“ شخص کا نوں سے آلہ لگائے نمودار ہوا۔ میرے ذہن میں بھی تیک ڈاکٹر کا خاکہ طاہر بھائی سے ملتا جلا تھا۔ کلینیشن شیو، صاف تھری پینیٹ شرٹ، سلیقے سے بال بنے ہوئے اور کپڑوں سے احتی مخصوص کلوں یا پر قوم کی خوشبو لکین یہ تو سرا جائز، منه پہاڑ ناٹپ کا کوئی ڈاکٹر تھا جو دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ابھی سیدھا سکر بستر سے اٹھا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی انہی خصوصیات کی وجہ سے کیڈٹس

نے اس کا نام ”ڈاکٹرنو“ رکھ چھوڑا ہے۔ کیونکہ وہ ہر اس بات کو ”نو“ کر دیتا تھا جس کی فرمائش کیڈٹ کرتے تھے۔ اس نے میرے دل کی دھڑکن سنی اور پھر جلدی سے کہا ”نو..... ہی از پریٹلی آل رائٹ“ He is prefectly all right. پھر میری طرف مر کر کہا ”تم بالکل ٹھیک ہو۔ میں یہ گولیاں دے رہا ہوں۔ صبح تک ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑتے پھر و گے.....“

ڈاکٹرنو نے مجھے کچھ گولیاں کھانے کو دیں اور چند گھوٹ کسی کڑوی شربت کے پلاٹے اور پھر جاتے جاتے مجھ سے کہا ”آں ہاں..... خبردار..... مجھ سے ریس لینے کی قطعی توقع نہ رکھنا۔ میں ایسے معاملوں میں بہت سڑک Strict ہوں۔“

میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا کیونکہ میں نے تو کسی ریس کی بات بھی نہیں کی تھی اور مجھ سے ریس یا آرام دوا سے مانا تھا نہ کہ ڈاکٹرنو کی ذات سے۔ تبھی میرے بٹ میں نے جو اس روز ہاؤس ڈیوٹی پر تھا اور مجھے ہسپتال لے کر آیا تھا، ڈاکٹرنو سے گزر گرا کر دخواست کی۔

”سرکیڈٹ عبادت نے تو آج تک کبھی ریس نہیں لیا لیکن آج واقعی انہیں بہت تیز بخار ہے۔ برائے مہربانی ایک دن پر یہ سے ریس لکھ دیں۔“ ڈاکٹر نے چند لمحے اس کی درخواست پر غور کیا پھر میری دواوں کی پرچی پر نیچے ”ون ڈے پریڈ ریس“ (ایک دن کے لیے پر یہ سے آرام) لکھ کر بٹ میں کے حوالے کر دی اور یہ جا اور وہ جا۔ اکرم (بٹ میں) نے پرچی میرے حوالے کی اور چمک کر بولا۔

”یہیں سرجی..... کل صبح آرام سے سوئیں اور عیش کریں..... کل آپ کو صبح سوریے پر یہ کے لیے نہیں اٹھنا پڑے گا.....“

میں نے حیرت سے اس جادوئی پرچی کی جانب دیکھا جس میں میری کل کی پر یہ سے چھٹکارے کا پروانہ تھا۔ اوہ..... تو ڈاکٹرنو اس ریس کی بات کر رہا تھا۔ مطلب کیڈٹس بیمار ہو کر اس کے پاس آتے ہوں گے اور اس سے ہاؤس گے ریس کی صدر کرتے ہوں گے تبھی وہ پہلے ہی سے مجھے انکار کر رہا تھا۔ اگلی صبح میری ساری ڈارمیٹری اس منحوس سیٹی کی آواز پر بستروں سے گر گر کر اٹھتی اور باہر کی جانب بھاگتی نظر آ رہی تھی۔ میں آرام سے اپنے گرم بستروں میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔ ناشتے سے کچھ پہلے مجھے ہاؤس بیرون جمعہ نے آ کر اٹھا دیا اور میں نے تکملہ سہولت اور آرام سے گرم پانی کے شاور سے غسل بھی کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان غسل خانوں میں کیڈٹس کی اس قدر بھیڑ ہوتی تھی کہتنی بار ایک ہی شاور کے نیچے تین تین کیڈٹ جائیگے پہنچنے نہار ہے ہوتے تھے۔ میں آرام سے تیار ہو کر اپنی کتابیں اکٹھی کر رہا تھا جب باقی کیڈٹس پر یہ کیڈٹس پر یہ گراوٹس سے بھاگتے دوڑتے اور ہانپتے کا نہیں ہاٹس آپنچے اور جلدی تو لیے باندھ کر غسل خانوں کی جانب بھاگے۔ میرا بخار تو اتر چکا تھا لیکن میری پرچی ابھی میرے پاس ہی پڑی تھی۔ سب سے پہلے نہیا کرو اپس آئے فیصل کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے پرچی اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور دھرے سے میرے کان میں کہا کہا گرہم 01 کو 07 بنا دیں تو میرا ریس سات دن کا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے چوک کر فیصل کو دیکھا.....؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ابھی ہم دونوں اسی سوچ میں تھے کہ میں میں ناشتے کی گھنٹی بیج گئی اور باہر سے سینئر کیڈٹ کی وھاڑی سنائی وی کہ تمام کیڈٹس فوراً ناشتے کے لیے میں کی جانب مارچ پا سٹ کریں۔ اسی بوکھلا ہٹ میں وہ پرچی مجھ سے اور فیصل سے ویں بیک کے فرش پر گر گئی اور جب ہم کلاس سے واپس آئے تو سوپر صفائی کے دوران وہ کاغذ بھی فرش سے اٹھا چکا تھا۔ میں نے اور فیصل نے اپنے سر پیٹے لیا۔ اتفاق سے تیسرے ہی دن اسفر کی طبیعت بھی بگر گئی اور اسے بھی ڈاکٹرنو کے پاس ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسفر کو ریس تو نہیں دیا لیکن ہسپتال کی دواوں کی پرچی اس کے ہمراہ ہم تک پہنچ گئی۔ اکیدمی کا دستور یہ تھا کہ جن

کیڈس کوڈ اکٹر ریسٹ دیا کرتا تھا ان کے نام کے آگے سینٹر کیدٹ "آن ریسٹ On Rest" لکھ کر آرام کے دن لکھ دیتا تھا۔ یہ سب کا غذی کی ایک شیٹ پر تحریر ہوتا تھا جسے "پریڈ اسٹیٹمنٹ Prade Statement" کہا جاتا تھا جس کیدٹ کوڈ اکٹر نے جتنے دن کے لیے پریڈ ریسٹ یا کلاس ریسٹ یا گیمز ریسٹ دیا ہوتا تھا وہ اپنی پرچی اپنے پریڈیکٹ کو دے دیتا جو رات کی گئتی کے وقت اسے سینٹر کیدٹ آفیسر کے پاس لے جا کر اور اسے دکھا کر اس کا اندر جو پریڈ اسٹیٹمنٹ میں کروالیتا تھا۔ یوں اگلے دن صبح پریڈ کے دوران میں اوس کی غیر حاضری نہیں لگاتا تھا اور اس کیدٹ کو سیک لیو، (یعنی بیماری کی رخصت پر شمار کیا جاتا تھا۔ فیصل کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ ہم سر شام ہی پہلی پریپ کے دوران ڈاکٹرنو کی لکھائی کو غور سے دیکھ دیکھ کر اس کی مشق کی پریکش کرتے رہے۔ اس فرات کے کھانے تک ہماری متنیں کرتا رہا کہ ہم ایسی غلطی نہ کریں اگر ڈاکٹرنو کی تحریر سے ہماری تحریر میں پائی تو ہم دونوں کا تو پہنچنیں لیکن ہاؤس ماسٹر اس فرنزوندہ نہیں چھوڑے گا لیکن فیصل کا کہنا تھا کہ ساتویں کے کیدٹ پر کسی کا شک بھی نہیں جائے گا۔ اس لیے یہ جو اکھیل لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ہم تینوں اٹھر ٹھنڈھ روم کے بجائے واپس اپنی ڈارمیٹری میں آگئے اور آخری بار ہم نے ڈاکٹرنو کی تحریر کی مشق کی۔ ڈاکٹرنو کے دستخط بہت آسان تھے لیکن میں اس کے انگریزی میں لکھے الفاظ تو نقل نہیں کر پا رہا تھا جبکہ فیصل لفظ تو لکھ لیتا لیکن دستخط کرتے وقت اس کا ہاتھ بہک جاتا تھا، لہذا اٹھے یہ پایا کہ آرام Rest کرنے کے دن فیصل لکھے گا اور میں نیچے ڈاکٹر کے دستخط کر دوں گا۔ ہم نے آخری بار اسم اللہ پڑھی اور اسی نیلی روشنائی والے پین سے فیصل نے "تین دن کے لیے پریڈ سے آرام" کا جملہ انگریزی میں پڑھیں اور اسی پین سے نیچے ڈاکٹرنو جیسے دستخط بنادیئے۔ کچھ دری تک ہم تینوں دم سادھے اسی پرچی کو دیکھتے رہے جس پر ابھی تک ہماری تحریر کی روشنائی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فیصل نے اگلے دس منٹ تک ہر طرح سے الٹا، سیدھا، دور اور نزدیک سے اس پرچی کو پکڑ کر دیکھا اور بالآخر فیصلہ دے دیا کہ ہماری اس جعل سازی کو شاید خود ڈاکٹرنو بھی نہ پکڑ پائے۔ اس فر کا بھی تک بر احوال تھا اور خوف کے مارے اسے واقعی بخار ساچھے نہ لگا تھا۔ ہم دونوں نے کسی نہ کسی طرح دلاسہ دے کر رات کی گئتی کے وقت تک اس کے حواس بحال رکھے اور نائٹ فائلن کے وقت جب سینٹر کیدٹ نے ہر جماعت کے پریڈیکٹ کو سب بیمار کیڈس کی سک رپورٹ (Sick Report) لانے کے لیے کہا تو فیصل نے تقریباً دھکا دے کر اس فرنزوندہ کو پریڈیکٹ کی جانب ڈکھیل دیا۔ ورنہ وہ تو خوف کے مارے اپنی جگہ جما ہوا کھڑا تھا۔ پریڈیکٹ نے ڈاٹ کر اس سے پوچھا "کیا ہے.....؟" اس فر نے جلدی سے تھوک اپنے حلق سے لگا اور ہاتھ میں کپڑی اپنی پرچی پریڈیکٹ کی جانب بڑھا دی۔ پریڈیکٹ نے اس فر کی پرچی کھوئی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم سب کے دل یوں دھڑک رہے تھے جیسے ابھی اچھل کر حلق سے باہر آگریں گے۔ پریڈیکٹ نے نظریں اٹھا کر اس فرنزوندہ کو دیکھا۔ اس فر کا رنگ مزید پیلا ہو گیا اور وہ لڑکھڑا کر تقریباً گرنے کو ہی تھا کہ پریڈیکٹ نے پرچی باقی پرچیوں کے ساتھ نہیں کی اور پریڈ کرتے ہوئے سینٹر کیدٹ کی جانب اپنی کلاس کی گئتی جمع کروانے چلا گیا۔ سینٹر کیدٹ آفیسر نے سرسری طور پر تمام پرچیوں کا جائزہ لیا اور اس فر کا نام پریڈ اسٹیٹمنٹ میں "تین دن کے لیے پریڈ آرام" کی گئی جمع کروانے کا تقریباً Three days rest from prade میں لکھ کر جو شہر بند کر دیا۔ میرے اور فیصل کے منڈے اسیک زور دار خوشی کا نغمہ نکلتے رہ گیا اور اس فر کی جان میں بھی جان آئی۔ اوپر ڈارمیٹری میں پہنچتے ہی ہم تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو گلے لگالیا اور اپنی اس پہلی جعل سازی کی

کامیابی پر دل کھول کر ایک دوسرے گودا اور مبارک بادوی۔

اگلے تین دن تک اس فرمزے سے صبح سوتارہ اور میں اور فیصل اسے سوتا دیکھ کر ہی خوش ہوتے رہے۔ اصل میں یہ ہمارا وہ انتقام تھا جو ہم سب جونیز کیڈٹ اس سیٹ سے لیتا چاہتے تھے جو من اندر ہیرے ہمیں زبردستی جگانے کے لیے مجاتے جاتی تھی۔ ہم سب ہی کو اس سیٹ سے اور یوں سحری کے وقت جگائے جانے سے شدید نفرت تھی لیکن ہم سبھی بے بس تھے۔ مجھے اور فیصل کو اب کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب ہمارے پاس اس بے بسی کے توڑ کے لیے ایک ہتھیار موجود تھا اور ہم تینوں نے فیصل کریا تھا کہ اس ہتھیار کو باری باری استعمال کرتے رہیں گے۔

کتاب کفر کی پیشکش تساؤ کے آدم خور

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

تساؤ کے آدم خور..... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ..... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے..... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاث اٹانے والے تساؤ کے آدم خور..... جنہوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لوگوں سے زیادہ مکارتھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم "Ghost & The Darkness" بھی بنائی گئی۔ جوں ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کا مام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo)

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش گلریا کا آدم خور گلریا کا آدم خور

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

گلریا کا آدم خور برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈ یئر جیشیدار جاسپ خان کیانی کی آپ بنتی ہے، جسے عبیدہ اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ گلریا کا آدم خور ۲۰ میکرو میٹر کی ایک شکاری ہم ہے جو ایک طرف اس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاہ ریشد دانیوں اور ان دیکھی قتوں کی پس پر دوہ سازشوں سے نقاب اٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو سی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول شکاریات سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش معصوم انتقام

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث پچا کے اس فیصلے سے کہ وہ ڈاؤ آپی کو مزید نہیں پڑھانا چاہتے، خاندان بھر میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ کہاں وہ دن تھے کہ غیاث پچا خود زمانے بھر کی لا بصر یوں سے وجہ آپی کی پسند کی کتا ہیں جن چن کر لاتے رہ تھکتے تھے اور کہاں یہ دن کہ خوانہوں نے ڈاؤ آپی پر تعلیم کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈاؤ آپی کی خلا میں، پچا، ما موں، پچھی اور پچھا سمجھی تو اپنے بھی میں تھے کہ آخر ایسا کیا ماجرا ہو گیا ہے کہ غیاث پچا نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا؟ وہ تو آپی وجہہ کو مقابلے کے امتحان کی تیاری کروانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی ڈوبی اپنے خاندان کی پہلی ایسی افسر بنے پھر اچانک یہ کا یا پلٹ کیسی.....؟

سینکھنے خالہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا اور پھر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ غصے میں یا پھر انتہائی سنجیدہ ہوتے تو ڈاؤ آپی کو ڈوبی کی بجائے ان کے پورے نام ”وجہہ“ سے پکارتے تھے۔ اس شام بھی انہوں نے صحن میں بیٹھے بیٹھے ڈاؤ آپی کو اسی انداز میں آواز دی۔

”وجہہ.....میری بات سنئی جاؤ۔“

ڈاؤ آپی جونے جانے کب سے اندر آپنے کمرے میں بیٹھیں، رورو کراپی آنکھیں سرخ کرچکی تھیں، جلدی سے اٹھ کر باہر آگئیں۔ غیاث پچا نے غور سے ان کی سوچی ہوئی آنکھوں اور بھیگی پلکوں کی جانب دیکھا اور یوں بولے جیسے کوئی گھرے کنویں سے دور سے بول رہا ہو۔

”سیا تمہیں میرے فیصلے سے کوئی اختلاف ہے.....؟“

”نہیں البا.....آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے میری ہی بھلانی کی خاطر کیا ہوگا.....؟“

غیاث ابا کے چہرے پر چھایا تکدر کسی حد تک کم ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں پڑھنے کا کس قدر جنون ہے۔ تم چاہو تو امتحانات کا وقت آنے پر پرانیویں امیدوار کی حیثیت سے بی اے کے پرچے دے سکتی ہوں۔ لیکن اب ان حالات میں میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تم روزانہ کالج کے لیے نکلا کرو۔ فضلو بایا بھی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور میں تمہیں خود روزانہ کالج چھوڑنے اور لینے کے لیے آبھی جاؤں تب بھی سارا دن میرا وہیان تمہاری جانب ہی لگا رہے گا اور پھر دیر سویر تو زندگی کے ساتھ ہی گئی ہے اور اس الجھن میں نہ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دے پاؤ گی اور نہ ہی میں ٹھیک طرح سے اپنا کوئی کام کر پاؤں گا۔ لہذا بہتر سبھی ہے کہ تمہاری ریگولر پڑھائی ختم کر دی جائے۔ تم گھر میں ہی بیٹھ کر بی اے کرو پھر بعد میں آگے کی سوچیں گے کہ کیا کرتا ہے۔ ڈاؤ آپی نے پھر وہی جملہ دہرا�ا کہ انہیں غیاث

پچا کی ہربات ہر حکم دل و جان سے منظور ہے۔ غیاث پچانے اٹھ کر ہو آپی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کی اپنی آنکھیں بھی نہ ہو گئیں۔ سینہ خالہ جو دور برآمدے میں بیٹھیں یہ سارا ماجرا چپ چاپ دیکھ رہی تھیں انہوں نے جب باپ بیٹی کو یوں ایک دوسرے سے اپنے آنسو پچانے دیکھا تو خود بھی اپنے پلوکی اوٹ میں روپریں لیکن کاش کوئی ان باپ بیٹی اور مان کو بتا پاتا تاکہ آنسوؤں سے بھی مقدر کی کالک نہیں دھل پاتی اور مقدار کے گھرے کا لے عفیت کا سایہ اب دھیرے دھیرے اس گھرانے کے حصے کی وحوب کوچانے لگ پاتا تھا۔

اگلے دن راجح صبح سوریے پہرے پہی موجود تھا جب کرمونا نگے والے نے صبح کا لج کے وقت حسب معمول اپنا بھونپو بجا یا، وہ اسی وقت چوک پڑا تھا جب اس نے وزانہ کی طرح فضلو بابا کو ہو آپی کا بیگ لیے باہر نکلتے تھیں دیکھا اور ان کی جگہ خود غیاث پچا گھر سے باہر نکل آئے۔ راجھ کا ماتھا ٹھنکا اور وہ جلدی سے گھوڑے کے گلے میں بندھے گھنگھر دیکھنے کے لیے تا نگے کے قریب جا پہنچا۔ غیاث پچا کرمو کو بتا رہے تھے کہ آج سے خوبی کا لجنیں جائیں گی لہذا کل سے اسے تا نگہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ آنے والی پہلی پر آ کر اپنا حساب کتاب کر جائے۔ کرموفوراً بوکھلا گیا اور اس نے غیاث پچا سے کہا کہ پیسوں کی اسے کوئی پرواہ نہیں پر خدا نخواستہ خوبی کی طبیعت تو خراب نہیں۔ سب ”خیری صلا“ تو ہے نا۔ غیاث پچانے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ایسی دلیکی کوئی بات نہیں۔ اس آج کل کا لج میں پڑھائی برائے نام ہی ہوتی ہے اس لیے ہو آپی نے گھر پر ہی بیٹھ کر اپنی مزید تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کرمونا نگے والے کو غیاث پچا کی بات سےطمیان ہوا نہیں، راجھ یہ تو نہیں جان پایا لیکن وہ اپنے مخصوص دیہاتی لجھ میں ہو آپی کو ڈھیروں دعا کیں دیتا ہوا وہاں سے واپس لوٹ گیا لیکن جاتے جاتے غیاث پچا سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ جب کبھی نہیں کرم دین کی ضرورت پڑی تو وہ اسے ضرور یاد کریں گے۔ اس کی اداسی بھی اپنی جگ جگا تھی کیونکہ ہو آپی جب خوبی بھی نہیں بنی تھیں اور نہیں ہو تھیں تب سے کرمونا نگے والا ہی انہیں اپنے تا نگے میں بھاکر نز سری سے لے کر اب تک اسکوں اور کا لج لاتا لے جاتا رہا تھا اور ہو آپی بالکل اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پیاری تھیں۔ تا نگے والا تو چلا گیا اور غیاث پچا بھی واپس اپنے گھر جا چکے تھے لیکن راجھ کے ذہن میں ان گنت سوال کلبانے لگے تھے۔ آخر اچانک ایسی کیا بات ہو گئی کہ ہو آپی نے کا لج جانا ترک کر دیا تھا۔ اسے غیاث پچا کی اس بات پر بھی بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ خود ہو آپی نے اپنی تعلیم ترک کر کے گھر پر بیٹھ جانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ بات ضرور کچھ اور ہی تھی..... لیکن کیا؟ اسی بات کا پتہ اب راجھ کو لگا تھا۔ شام کو جب باقی سارے دوست بھی جمع ہوئے تو مسلسل ایک گھنٹے کی بحث کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچ کے ہونے ہو یہ شکورن بو اکی لگائی بھائی اور کڑوی زبان ہی کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے غیاث پچانے آخر تھا۔ اکر ہو آپی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کروادیا۔ والے نے اسی وقت غصے کے مارے شکورن بو اسے ”انتقام“ لینے کا اعلان کر دیا تھا اور اب سارے سر جوڑے بیٹھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ آخر شکورن بو اکی لگائی بھائی اور کڑوی زبان ہی کا لیکن پھر وہ خود بھی انہیں رو بھی کرتے گئے مثلاً خونے کہا کہ ان کی ساری مرغیوں کا صفائیا کر دینا چاہیے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اتنی بہت سی مرغیوں کے لشکر کو مکمل ہضم کرنے تک چھپا کر کہاں رکھیں گے؟ پوچھنے مشورہ دیا کہ ان کے دودھ کی قیمتی میں بھرے دودھ کے اندر مردہ چھپکی ڈال دی جائے لیکن اتنی بڑی خطکے لیے اتنی چھوٹی سزا نہیں نہیں..... پھر کیا کریں؟ والے نے تجویز دی کہ محلے کے بردگے پیڑ پر غیل لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے ان کے گھر تمام شیشے توڑا لتے ہیں لیکن اس میں بھی رنگ ہاتھ پکڑے جانے کا شدید خدش تھا کیونکہ راجھ پہلے بھی کئی مرتبہ اسی بردگے کے پیڑ

سے نشانہ بازی کرتے ہوئے دھرا جا چکا تھا۔

یہاں راجہ گینگ بیٹھا یہ منصوبے بنا رہا تھا اور وہاں سامنے بڑے میدان میں ان سے چھوٹے بچوں کی "نی نسل" آنے والی شب برات کے استقبال کے لیے ابھی پٹائیے بجانے اور رسمی کی سوتروا لے "بم" بچوں نے میں مشغول تھی۔ سوترا بم ایک ایسی ٹکلی رسمی سے جزا ہوتا تھا جسے عام فہم میں سُننی یا نوٹر کہا جاتا تھا لبی سوترا کے آخری سرے پر ایک بڑا سا گینڈ نما گول پٹا خدا جزا ہوتا تھا جس میں بچوں کے پٹاخوں والا مصالحہ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھی خاصی گونج دار ہوتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ لمبی سوتروا لے حصے کو کوئی بچہ آگ لگا کر بھاگ جاتا اور باقی بچے دور کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے۔ سوترا کے آخری حصے پر لگی آگ پلک جبکہتے میں صائمے والے حصے تک پہنچ جاتی اور بم ایک زور دار آواز کے ساتھ پھٹ جاتا۔ ایسے ہی منصوبے بنا تے بنا تے اچانک بے خیالی میں راجہ کی نظر سامنے میدان میں بچوں کے اس پسندیدہ شغل پر پڑی اور اچانک اس کے دماغ میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہوئے۔ اس نے فوراً نشکو کا پتی جیب میں پڑا آٹھ آنے کا سکد دیا اور اس سے کہا کہ وہ بھاگ کر محلے میں ہی ٹکلر پر موجود مجید پر چون والے سے ایسے چند بم اٹھالائے۔ کچھ ہی دیر میں نخواہی تھے تین سوترا بم اٹھائے بھاگتا ہوا اپس آگیا۔ راجہ نے جلدی جلدی تینوں بھوں کی سوترا کو کاٹ کر ایک لمبی سے رسی بنا لی اور اسے تیسرے بم کی سوترا سے جوڑ دیا۔ یوں ایک لمبی سی سوترا والا بم بن گیا جس کا پھٹنے والا حصہ، اس لمبی سوترا سے بہت فاصلے پر تھا اتنا فاصلہ کہ سوترا کو سلاگ نے والا بچہ تین چار گز دور پڑھ کر بھی یہ فریضہ "سر انجام" دے سکتا تھا۔ ٹکلورن بواروزانہ عصر کے وقت روزمرہ کی اشیاء ضرورت لینے کے لیے بازار اور سبزی منڈی جایا کرتی تھیں اور مغرب سے کچھ پہلے یا پھر مغرب کے وقت واپس لوٹا کرتی تھیں۔ یہ ان کی واپسی کا وقت تھا۔ راجہ نے سب دوستوں کو منصوبہ سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور سبھی اپنے اپنے سورپے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ٹکلورن بوا کا سائکل رکشہ محلے کے پھاٹک پر آ کر رکا اور اس میں سے حسب معمول لدی پھندی ہی ٹکلورن بوا اپنے خیمہ نماشیں کا ک بر قع سمیت برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں سبزی کی الگ اور دوسرے سامان کی الگ تو کریاں موجود تھیں۔ عام حالات میں محلے کے سارے بچے انہیں محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر فرو رکھیں رفوچکر ہو جاتے تھے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ اپنا سارا سامان بچوں کے حوالے کر دیتیں اور انہیں قلیوں کی طرح اپنے سامان کی ڈھلانی پر لگا کر خود مزے سے ستائی ہوئی گھر تک جایا کرتیں اور جو بچہ ذرا سی آنا کافی کرتا تو اسے وہیں کھڑے کھڑے خوب صلوٰتیں سنایا کرتی تھیں۔ لہذا بچے اپنی عافیت اسی میں جانتے کہ ان کے محلے میں گھٹتے ہی سمجھی جس کا جس طرف منہ ہوتا، بھاگ اٹھتے لیکن اس دن راجہ اور اس کے دوست و کھاؤے کے لیے اپنے کھیل میں مشغول رہے۔ ٹکلورن بوا نے بھی موقع غنیمت جانا اور جلدی سے راجہ اور بالے کو آواز لگائی کہ ذرا اس کا ہاتھ تو بٹاتے جائیں۔ منصوبے کے مطابق بالے اور راجہ سے پہلے ہی پوچھو نبھا گتے ہوئے گئے اور ٹکلورن بوا کے ہاتھ سے تو کریاں لے کر اس کے آگے چل پڑے۔ بڑے میدان کے وسط میں آتے ہی نھویوں لڑکھڑا یا جیسے اسے ٹکلورن بگلی ہوا اور دوسرے ہی لمحے سبزی کی توکری میں سے آلوٹماڑیز میں پر لڑھکتے نظر آئے۔ ٹکلورن بوا ہیں سے چلا گئیں۔

"اے ہے کم بخت..... یہ کیا کر دیا.....؟ دیکھ کر نہیں چلا جاتا تجھے سے۔"

پوچھو جلدی سے توکریاں زمین پر رکھ کر سامان چلنے میں مصروف ہو گئے۔ ٹکلورن بوا خود بھی اپنا بر قع پھیلایا کر وہیں بیٹھ گئیں اور سبزی اٹھا

انھا کرو اپس توکری میں ڈالنے لگ گئیں۔ اب منصوبے کے آخری حصے کو انجام دینے کا وقت آگیا تھا۔ بالے نے نہایت آہنگ سے سوتہ بم کا گیند نما حصان کے شش کاک خیمے میں رکھ دیا۔ راجہ جو چند گز دور بیٹھا تھا اس نے آہنگ سے ری کی سوتہ کو تیلی دکھاوی۔ شکورن بوا پنے ہی وھیان میں غرق پوپ اور نخوکو کو تی ہوئی اپنی بزری مجع کرنے میں مشغول تھیں۔ دفعتہ راجہ نے ایک، دو، تین کہا اور پوپ، نخو، گلد، راجہ اور بالے سر پڑت وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شکورن بوانے سرا ٹھاکر جہر سے انہیں دیکھا لیکن ان کی یہ حرمت صرف چند بھوکوں کی ہی ثابت ہوئی۔ اچاک ایک ایک زور دھاما کہ ہوا اور یوں لگا جیسے شکورن بوا کے شش کاک بر قعے میں کوئی بھونچاں آگیا ہو۔ شکورن بوا زور سے چلا کر چھلیں اور دوڑ پڑیں۔ ان کے بر قعے میں آگ لگ گئی تھی اور وہ بڑے میدان میں یوں گول چکر میں دوڑ رہیں تھیں جیسے کوئی آگ کا گولہ سرس میں گول دائرے میں لڑھلتا پھرتا ہے۔ وہ دوڑے جاتیں اور چلا چلا کر لوگوں کو اپنی مد کے لیے پکارے جاتیں۔ کچھ ہی دیر میں سامنے والے مکان سے غور پچا جلدی سے پانی کی بھری بالائی لیے دوڑتے نظر آئے اور انہوں نے پوری بالائی شکورن بوا پر بلکہ ان کے شش کاک بر قعے پر اٹھیں دی۔ شکورن بوا کے بر قعے کی آگ تو بھج گئی لیکن ان کی زبان نے جوشعلے اگنا شروع کیے تو ان کی پیش کمی ہفتون تک مختنی نہیں ہو پائی۔ ان کا سفید شش کاک بر قعہ جلد جگہ سے جل کر چلنی ہو چکا تھا اور اس کا رنگ بھی دھویں کی وجہ سے سفید سے گہر ایسا ہی مائل ہو گیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بکتی جھکتی سب سے پہلے راجہ اور پھر بالے، پوپ، نخو اور گلد و کھنکی کے گھروں میں فریاد لے کر گئیں اور سب ہی گھروں سے انہوں نے نئے بر قعے کی رقم وصول کی۔ راجہ کے گھروں والوں سمیت باقی بھی بجھوں کے گھر والے رات گئے تک اپنے "ملزمان" کو تلاش کرتے رہے اور رات کو جب آخر کار وہ سڑک پار پان والے کے کیمین کے عقب میں بچھے بجھوں پر چھپ کر بیٹھل گئے تو ان سب کو گھر لا کر فرد افراد اسکی کے والدین نے اپنے اپنے گھروں میں ان کے جسموں کی وہ سینکائی کی کہنی دن تک وہ بھی اپنے اگل سہلات رہے لیکن اس کے باوجود وہ سب خوش تھے کیونکہ انہوں نے شکورن بوا سے اپنی قتو آپی کا بدلو لے لیا تھا۔ اس کے بعد تین چار دن تک شکورن بوا گھر سے نکلتی کی کو دکھائی نہ دیں۔ پانچویں دن جب وہ گھر سے برآمد ہوئیں تو ان کے تن پروہی پرانا، مگر دھلا ہوا شش کاک بر قعہ موجود تھا البتہ اب اس میں بڑے بڑے اور بالشت بھر سفید اور میا لے رنگ کے پیوند جزو نظر آ رہے تھے۔ شاید شکورن بوانے اس "عظیم سانچے" کی یاد کو اپنے دل میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اس بر قعے کو خود سے بھی جدائے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

قصہ نصف صدی کا

لائقوں والوں کی دھڑکن محبی الدین نواب کے جاؤ قلم سے ایک خوبصورت ناول۔ تقسیم ہند (قیام پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے ناظر میں لکھی گئی ایک پر اثر تحریر۔ آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان..... جہاں حالات اور مسائل ویسے ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی جیت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے جب اس "سامنہ بر قعہ" کی تمام واردات رجہ کے اگلے خط میں پڑھی توہن بس کریم بر احوال ہو گیا۔ میں نے شام کو ہیں اور شیرل کو بھی اپنے دوستوں کی اس انتقامی واردات کے بارے میں بتایا اور وہ دونوں بھی بہت مخطوظ ہوئیں۔ شیرل تو اس قدر بُھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس دن میں نے انہیں دخواپی کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بتایا۔ ہیں نے بہت غور سے دخواپی کے بارے میں میری ساری باتیں سیں اور جب میں نے شیرل کو یہ بتایا کہ مجھے اصل میں کیڈٹ کالج جانے پر ارضی کرنے والی دخواپی ہی تھیں اور میں نے یہ دن یہاں اسی لیے گزارے ہیں کیونکہ میں واپس جانے سے پہلے ساری انگریزی سیکھ لینا چاہتا ہوں تاکہ مستقبل میں میری انگریزی ان کے کام آسکے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ شیرل اور ہیں دونوں نے اس شام مجھے مزید محنت کرنے کی بصیرت کی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جانب سے ذرا سی بھی کسر نہیں رکھ چھوڑیں گی اور واقعی ان دونوں نے میری تربیت اور تعلیم میں کبھی کوئی رتی برابر کر سمجھی نہیں چھوڑی اور چند ہفتوں کے بعد ہی ساری کلاس اس وقت دنگ رہ گئی جب انگلش ریڈنگ کی کلاس کے دوران جب انوار صاحب نے Tense (حامل) پڑھاتے ہوئے بچوں سے ایک سوال پوچھا تو سب ہی چپ بیٹھے رہے۔ تب میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھا دیا۔ اتنے ہفتوں میں نہ تو مجھ سے کلاس میں کسی نہ کچھ پوچھا تھا نہ ہی میں نے کبھی خود سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں پرپل صاحب کی ہدایت کے مطابق کلاس میں آ تو جاتا تھا لیکن چپ چاپ بیٹھے کر اپنے آس پاس ہوتے سوال جواب منتار ہتا یا پھر فیصل اور اسفر کے ساتھ کر خالی پیریڈیز میں کاغذ کے جہاز بنا کر اڑا تھا اس لیے پوری کلاس کے علاوہ خود انوار صاحب کو بھی قطعی مجھ سے یہ امید نہ تھی کہ میں اس مشکل سوال کا جواب دے پاں گے لیکن ہیں نے مجھے پیچھے ڈیڑھ میں تمام Tenses اتنی اچھی طرح از بر کروادیے تھے کہ میں نے جھٹ سے ایک لمحے میں انوار صاحب کے سوال کا جواب دے دیا۔ ساری کلاس پہلے توہا بکا ہی رہ گئی اور پھر سب انھا اٹھ کر مجھے یوں مبارکباد دینے لگے جیسے میں کوئی حج کر کے آیا ہوں۔ انوار صاحب نے سب کوڈا اٹ کر اپنی جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے مجھ سے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام نئیں کیے بعد دیگرے سنے۔ میں نے فرق انہیں سارے سنادیے۔ ان کا حیرت کے مارے اتنا بر احوال تھا کہ پیریڈیٹم ہونے کی گھنی بھی انہیں نہیں سنائی دی۔ اس پیریڈ کے بعد آدمی چھٹی یعنی Mid Break کی طرف تھی اور تمام کیڈٹس بریک فوڈ کھانے کے لیے کینٹین کی دوڑ جاتے تھے لیکن انوار صاحب مجھے لے کر پرپل صاحب کے دفتر کی جانب بڑھ گئے اور حاضری کا پروانہ ملتے ہی انہوں نے پرپل کو انتہائی حیرت کے ساتھ میری بہتری کے بارے میں بتایا۔ پرپل صاحب نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے ان کے اس "انکشاف" کو سنائے کہ میں نے آج کلاس میں اس سوال کا جواب خود اپنی مرضی سے ہاتھ اٹھا کر دیا ہے جس سوال پر ساری کلاس خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔ پرپل صاحب نے مسکرا کر انوار

صاحب کوشابا شد وی کہ یہ سب ان کی ہی "محنت" کا نتیجہ ہے۔ انوار صاحب حیرت اور غرر کے ملے جلے تاثرات لیے دفتر سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد کمانڈر صاحب نے میری پیشکش کی اور نہ کر بولے۔

"ویری ویل کیڈٹ عباد..... تم واقعی اپنی ذہن کے پکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آنے والے مذہم امتحان جو اگلے مہینے شروع ہو رہے ہیں اس میں تم سب کو دکھا دو کہ اردو میڈیم اسکول سے تعلق رکھنا کوئی شرم کی بات نہیں ہے اور اردو میڈیم اسکول کے بچے بھی اتنے ہی ہونہا رہا اور ذہین ہوتے ہیں جتنے کسی بھی بڑے انگلش میڈیم اسکول سے تعلق رکھنے والے بچھو ہو سکتے ہیں۔"

میرا دل ان کی بات سن کر کچھ بھجو سا گیا کیونکہ میرا تو خیال تھا کہ آج وہ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے کیونکہ میں نے ان کی اور ابا کی شرط پوری کر دی تھی لیکن وہ تو مزید پورا ایک مہینہ مجھے یہاں رکھنے پر مصروف نہ آتے تھے۔ کمانڈر صاحب نے میرے اندر چلنے والی جنگ شاید میرے چہرے سے پڑھ لی تھی اسی لیے انہوں نے مجھے آرام سے بیٹھ جانے کو کہا اور پھر مجھے سمجھایا کہ یہ بھی اصل میں میرے ابا کی ہی خواہش تھی کہ میں کیڈٹ کالج سے ایک امتحان پاس کر کے اس کا شفیقیت اپنے ساتھ لے کر آؤں کیونکہ میرے شہر میں تواب سالانہ امتحانات سرپرستے اور جب تک میں یہاں سے واپس جاتا تب تک میرے ہم جماعت آٹھویں کلاس میں جا چکے ہوتے، لہذا ضروری تھا کہ میرے پاس یہاں کی "پاس شدہ" والی سند موجود ہوتا کہ وہاں مجھے داخلے میں آسانی رہے۔ مجھے پرنسپل صاحب کی بات سمجھ میں آگئی اور میں نے بادول خواستہ مزید دو مہینے اس "قید خانے" میں رہنا منتظر کر لیا تاکہ امتحان کے بعد اپنا نتیجہ لے کر ہی گھر جاؤ۔

کتاب گھر کی پیشکش

اس وقت میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی اور نہ ہی میں پرنسپل صاحب سے یہ پوچھ سکا کہ ان کی میرے ابا سے اس دن پہلی مرتبہ میرے سامنے اور بعد میں میری غیر موجودگی میں آخر کس فون نمبر پر بات ہوتی ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں تو بھی ٹیلی فون تھا ہی نہیں..... نہ ہی ابا کے دفتر میں ان کی میز یا اس کے آس پاس کوئی ٹیلی فون میں نے پڑا دیکھا تھا.....؟ پھر آخر پر پرنسپل صاحب کو پہلی ہی گھنٹی پر ابا کیسے فون کی دوسری جانب جواب دینے کے لیے حاضر مل جاتے تھے؟

اس وقت میرے چھوٹے سے ذہن کے لیے یہی بات کافی تھی کہ پرنسپل صاحب لگاتار میرے ابا سے رابطے میں ہیں اور میری رفتار سے میرے ابا مطمئن ہیں۔ ہاں البتہ مجھ کو اس بات پر حیرت ضرور ہوتی تھی کہ اب انے کبھی اپنے خطوں میں بھی پرنسپل صاحب سے اپنے رابطے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی توجیہ اپنے دل میں کچھ یوں سوچ رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے اب انے گھر میں امی اور بھیا وغیرہ کو اس بات سے آگاہ نہ کیا ہو اور وہ نہ چاہتے ہوں کہ ان کے خط میں لکھی ہوئی کوئی بات کوئی دوسرا پڑھ لے یا بات خاندان میں پھیل جائے؟ اسی لیے انہوں نے بھی اپنے اور کمانڈر صاحب کے رابطوں کا ذکر بھی اپنے کسی خط میں نہیں کیا تھا۔

دن گزر تے گئے اور ہم سب ہی جو نیز کیڈٹ پیرا کی اور گھر سواری میں ماہر ہوتے گئے۔ ہماری پریڈ بھی اب اس قابل ہو گئی تھی کہ ہم باقی پورے ہاؤس کے سینز کیڈٹس کے ساتھ کر پریڈ کرنے لگے تھے۔ پہلا مذہم امتحان بھی گز گیا اور میں نے کسی نہ کسی طور سے پاس بھی کر لیا تھا لیکن بقول پرنسپل صاحب میرا راز لاث اس قدر "قابل غیر" نہ تھا کہ جس کے بل پر میں دوبارہ اپنے اسکول جا کر "باعزت" داخلہ لے سکتا۔ واقعی نمبر تو اتنے

خاص نہ تھے لیکن میں کبھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر میں اول یادوں میں آ جاتا تو کمانڈر صاحب پھر بھی کسی نہ کسی بہانے مجھے روک ہی لیتے۔ جیسا کہ انہوں نے اب ”میرے ابا کے ساتھ مل کر“ یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اب ساتویں جماعت کے مزید تین مینے ہی تو رہ گئے ہیں تو پھر کیوں نہ میں سالانہ امتحانات دے کر ایک ہی مرتبہ گرمیوں کی لمبی چھٹیوں میں ”بھیشہ“ کے لیے گھروپاں چلا جاؤں۔

اسی اثناء میں ایک دن فیصل کی سزا کے طور پر ”ایکسٹراؤنل“ آگئی۔ پہلے تو میں اور اس فڑو رہی گئے کہ شاید ہماری ”پرچی“ کپڑی گئی ہے کیونکہ ابھی پچھلے ہی ہفتہ فیصل دو دن کے لیے آرام پر تھا لیکن پھر پتہ چلا کہ یہ کوئی اور ہی بات ہے۔ اس روز ہم سب کو طالب پی اونے پریث کے دوران مسلسل دو گھنٹے رائفل اٹھا کر دوڑا یا تھا لہذا دو پھر کو ہم سب ہی کھانے کے بعد اپنے اپنے بستوں پر یوں گرے کہ پھر ہمیں اٹھانے کے لیے پریشیکٹ کو باقاعدہ دھمکیاں دینی پڑیں تھیں۔ ہم سب تو اٹھ کر اور کھیل کا بابس پہن کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل ہی گئے لیکن نہ جانے فیصل نیند میں تھا یا پھر اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی کہ وہ دوبارہ آ کر اپنے بست کے نیچے لیٹ کر لمبی تان کر سو گیا۔ وہاں کھیل کے میدان میں جب کتنی ہوئی تو فیصل عائد تھا لہذا اس کی غیر حاضری لگ گئی اور اگلے دن ”ڈیلی آرڈر“ Daily Order کی روپر ٹھیک شام 5 پانچ بجے بخشوپی اوکے ہاتھوں سے اسے ”وصول“ کیا کیونکہ فیصل کی حالت ایسی تھی ہی نہیں تھا۔ یہ ڈرل سزا کے طور پر دو پھر کو ان کیڈیس کو دی جاتی تھی جو کسی روشن سے غیر حاضر ہتے یا پھر کوئی غلطی کرتے تھے۔ ہماری یہ رک میں فیصل پہلا کیڈٹ تھا جسے یا اعزاز حاصل ہوا تھا ورنہ عام طور پر گیارہ ہویں اور بارہویں جماعت کے کیڈیس کو یہ سزا ملتی تھی۔ ہم سب نے پورے اعزاز کے ساتھ دو پھر تین بجے فیصل کو رخصت کیا اور ٹھیک شام 5 پانچ بجے بخشوپی اوکے ہاتھوں سے اسے ”وصول“ کیا کیونکہ فیصل کی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر اپنے بست تک جا سکتا تھا۔ فیصل نے حواس درست ہونے کے بعد بتایا کہ ان طالبوں نے تپتی دو پھر میں اسے ہزار بار ڈنڈلگوائے، فرنٹ روں دیئے۔ رائفل اٹھا کر ایک پاؤں پر کھڑا رکھا اور گور کھا پوزیشن جس میں پاؤں دیوار پر اور جسم دو بازوؤں کے سہارے زمین پر نکارہتا ہے پورے آدمی گھنٹے تک ناگے رکھا۔ ہم فیصل کی زبانی یہ سب سن کر دل ہی دل میں لرزتے رہے لیکن پھر یکے بعد دیگرے پہلے اسٹر اور پھر مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوئی گیا۔ ہم دونوں کے جوتے اور بیٹل اسپلی کے وقت ٹھیک طرح سے چکتے ہوئے نہیں پائے گئے تھے لہذا ہمیں بھی اس ”کالا پانی“ کی یاترا کرنی ہی پڑی۔ ایکسٹراؤنل کے لیے اکیڈمی میں ہی موجود وسری جگ ڈیمیں میں استعمال شدہ ایک رن وے کو بطور گراوٹڈ استعمال کیا جاتا تھا اور وہیں پر کیڈیس کو سزا دینے کے تمام اوازمات موجود تھے۔

عجیب بے ہودہ اور ہولناک قسم کی جگہ تھی۔ اور پر سے بخشو (سی۔ پی۔ او) کے ہولناک نعرے اور کاشن..... آدمی گھنٹے میں ہی میرا جسم پسینے سے شرابوڑ ہو گیا اور ٹانگیں لرزنے لگ گئی تھیں لیکن بخشو نے پورے دو گھنٹے مجھ سیت باقی کیڈیس کے جسم کا سارا تیل نکل جانے کے بعد ہی ہمیں وہاں سے جانے دیا۔ واقعی پہلی ایکسٹراؤنل کی سزا کے بعد انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ”اسٹر پیچ“ کہلاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب بات اور بھی ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہمارے دلوں سے اس سزا کا خوف بھی جاتا رہا۔ شاید انسان کو جس چیز سے جتنا ڈرایا جائے اس چیز کا سامنا ہو جانے کے بعد اس کا خوف اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ بھی بھی میں سوچتا ہوں کہ اکیڈمی کی انتظامیہ ہمیں سزا دینے کے بجائے صرف سزا کا ڈر ہمارے دل میں بنائے رکھتی تو شاید ہم کبھی اپنی حدیں پار نہ کر تے۔ جو نیز کیڈیس میں سے جو بھی ایکسٹراؤنل کی سزا کا

تم خدستینے پر سجائے گرتا پڑتا ڈار میثیری میں داخل ہوتا، وہ دیکر کیلئے اس کی نظر میں ہیرہ بن جاتا۔ ہیرہ کے درجے پر قائم رہنے کے لیے اس کیلئے کو زیاد ایک شراؤں جھیلی پڑتی اور یوں رفتہ رفتہ اس کی کھال خست اور اتنی موئی ہوتی جاتی کہ اس پر کسی سزا، کسی تکلیف کا کوئی اثر بھی نہ ہو پاتا۔ میری کھال بھی موئی ہوتی ہے جاہی تھی اور سزا کا خوف میرے دل سے بھی نکلتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں ہمارے ٹرینیٹ ایگزام بھی گزر گئے اور ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔ جب میں ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر آئیں تو میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آجائے گا۔ مجھے ہو آپی کو دیکھئے اور ان سے ملے ہوئے پورے آٹھ مینی گز رچکے تھے۔

کتاب گھر کی پیشکش سونا گھاث کا پجاري

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

سونا گھاث کا پجاري بے پناہ پراسرار قوتون اور کالی طاقتون کا مالک جوانپی موت کے بعد بھی زندہ تھا۔ افضل بیگ ایک

مسلمان فارسٹ آفیسر جو سونا گھاث کے قہر کا نشانہ بنا پھر وہ انتقام لینے کے جوش میں انداھا ہو گیا اور اپنا نامہ بہتر کر کے جادو ٹوٹنے کے اندر ہیروں میں ڈوب گیا۔ ایک ایسا ناول جو پراسرار کہانیوں کے شاکنین کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ **سونا گھاث کا پجاري**

اپنے انجام تک کیسے پہنچا۔ افضل بیگ گناہ اور غلاظت کی ذمیا سے کیسے لوٹا؟ ہندو دھرم، دیوی دیوتاؤں، کالے جادو، ہیروں کے خوفناک تصادم میں یہ داستان آپ **کتاب گھر کے پراسرار خوفناک ناول** سیکھ میں پڑھ سکتے ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش اقبالاً کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اقبالاً تاریک اور پراسرار بہ اعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد ایک غیر مہذب قبیلہ جو اقبالانامی دیوی کے پجاري

تھے۔ جری جہاز کی تباہی کے بعد مہذب ذمیا کے چدرا فراد اس قبیلے کے چنگل میں جا پھنسے۔ شوالا..... جنگلی قبیلے کا ایک سردار جسے دیوی اقبالاً نے تمام حشرات الارض کا مختار بنا دیا تھا۔ کالاری..... جنگلی قبیلے کا دوسرا سردار جس کی تمام درندوں پر حکمرانی تھی۔ کیا مہذب انسانوں کی اس جنگلی خونخوار قبیلے سے واپسی ممکن ہو سکی؟ انور صدیقی کے جادوں بیال قلم کی یہ طویل اور لوچپ داستان آپ جلد ہی **کتاب**

گھر کے ایکش ایڈونچر ناول سیکھ میں پڑھ سکتے گے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی محبت کی جو نک

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

مجھے کا لوئی میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سارے پاگل ہی تو ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے بالے کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ محلے کے نکڑ پر کھڑا شکا پوری قلفی والے کے ٹھیلے سے قلفیاں لے کر کھا رہا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ ہمیشہ جلدی قلدی قلفیاں ٹھکر رہتا اور ایک وقت آتا کہ قلفی والے کو یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ اس نے بارہ قلفیاں کھائی تھیں یا پندرہ؟ پھر ایک بی بحث ہوتی جس میں آخر کار قلفی والے کو بالے کی تصدیق کرو گئی تھی پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ بالا پہلے بھاگ کر میری طرف آیا اور اس نے مجھے ٹھوٹ ٹھوٹ کر میرے ہونے کا یقین کیا اور پھر بھاگ کر اس نے باقی سب کو بھی اطلاع کر دی اور میرے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی راجہ، گڈو، نخو، پو اور مشی نے مجھے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے ان سب کو یقین دلایا کہ امی اور باقی گھروالوں سے مل کر میں خود ہی بر گد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاؤں گا۔

میں نے دھیرے سے دروازہ ٹھکولا تو پہلی نظر صحن میں بیٹھی امی اور عمارہ پر پڑی جو بڑی سی نگلوں والی پرات میں رکھے چاول صاف کر رہی تھیں۔ پاس ہی بہت سا گڈو بھی پڑا ہوا تھا جسے ابھی پیسانا باقی تھا جنی گڈو والے چاول پکانے کی تیاری تھی لیکن امی کو کیسے پڑے چلا کہ میں آ رہا ہوں۔ گڈو والے چاول تو ہمیشہ امی فرمائش پر پکاتی تھیں اور میرے آنے کی تیباہ کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے دھیرے سے اپنائیگ دروازے پر چھوڑ اور بھاگ کر دیے ہی امی سے ان کی بخبری میں لپٹ گیا جیسے میں پہلے اپنے اسکول سے آ کر اور اپنا بستہ دروازے پر ہی چینک کر ان سے چھٹ جاتا تھا۔ ان کے مندے سے بھی اتفاقاً وہی جملہ لکھا جو وہ ایسے موقعوں پر مجھے ڈانٹے کے لیے کہتی تھیں۔

”آدمی اب ہٹ بھی جا..... ماں کی ہڈیاں توڑے گا کیا.....؟ پورا گدھا ہو گیا ہے تو بھی.....“

پھر وہ اچانک چونکیں کیونکہ انہوں نے میری گرفت کو محبوس کر لیا تھا۔ عمارہ بھی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ امی کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ میں ہی ہو۔ وہ میرے چہرے اور باقی جسم کو چھو کر اپنا شک دور کرتی رہیں اور ان کی آنکھیں نہ ہوتی گئیں۔ یہ ماں میں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے خود ہی اپنے آپ سے دور جانے کا کہتی ہیں اور پھر خود ہی چھپ چھپ کر روتی رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ابا اور بڑے بھیا بھی آگئے اور سبھی مجھے گھر میں یوں اچانک پا کر بے حد خوش ہوئے۔ میں نے ابا کو بتایا کہ دو دروازے کے کیدیں کو انتظامیہ خصوصی طور پر ٹرین کے گارڈ کے حوالے کر دیتی ہے تاکہ وہ لمبے سفر کے دوران ان کا خیال رکھ سکیں اور حفاظت سے انہیں گھر پہنچا دیں۔ میں بھی اسی طریقے سے یہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ ابا نے میرے رزلٹ کا پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے نیچجہ گھر بھجوادیا جائے گا۔ صرف انہی کیدیں کو واپس بلا یا جاتا تھا جو سالانہ امتحانات میں کامیابی حاصل کر پاتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ابا کے دل میں ابھی تک میرے فیل ہو جانے کا خوف موجود ہے اسی لیے وہ پہل صاحب

سے ہوئے اپنے معاهدے کا ذکر میرے یاد گیر گھروالوں کے سامنے نہیں کر رہے تھے۔ بہر حال میں نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ نتیجہ آنے پر سب کچھ خود بخوبی واضح ہو جانا تھا۔

عمارہ اور بڑے بھیجا جواب میٹرک کا امتحان دے پکے تھے، بہت دیر تک مجھ سے اکیڈمی کی باتیں پوچھتے رہے اور امی مجھے دیکھ دیکھ کر یہ غم کھانے جاتی رہیں کہ میں کس قدر کم زور ہو گیا ہوں۔ انہوں نے فوراً میری گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے ایک ”منصوبہ صحت“ (Health Plan) تشکیل دے دیا اور اسی اثناء میں شام بھی ڈھلنے لگ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میرے دوستوں کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا اور باہر گلی سے ان کی سیٹیوں کی آواز چھوٹے چھوٹے چھوٹے چھوٹے وغیرہ سے مستقل نائی دینے لگی۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ امی کو بھی ان سیٹیوں کی حقیقت معلوم ہے کیونکہ کچھ دیر تک وہ میری بے چینی کو نوٹ کرتی رہیں پھر دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

”آدمی..... جا کر مل آں لفٹنگوں سے ورنہ یونہی سر کھاتے رہیں گے گلی میں کھڑے کھڑے پر جلدی آ جانا میں تیرے لیے گووالے چاؤں بنا رہی ہوں.....“

میں فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جانے ان ماڈل کو ہم بچوں کی ہربات، ہر راز کا بن بولے ہی کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ بر گد کے پیڑتک پنچتھے پنچتھے تقریباً سارے محلے کو ہی میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی لہذا سب ہی سے فرد افراد املنا پڑا جبکہ راجہ اور میرے باقی دوست بار بار یوں کسی کے راہ میں روک لینے سے چڑ کر برے برے منہ بناتے رہے اور مجھے اشارے کرتے رہے کہ میں جلدی ان سب سے جان چھڑاؤں۔

تباہی ملتے ہی راجہ نے مجھ سے پہلا سوال سمجھی کیا کہ میری فوجی ورثی اور ڈرامیور والی گاڑی کہاں ہے؟ اور میرے سلیح محافظ کہاں ہیں اور یہ کہ میری ڈیوٹی کہاں لگی ہے.....؟

میں اس کی باتیں سن کر نہیں پڑا اور اسے بتایا کہ ابھی وہ مرحلہ آنے میں کافی سال باقی ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب میں ”بخیریت“ اکیڈمی سے بارہویں کر کے پاس آؤٹ ہو جاؤں اور فوج میں بھرتی ہو جاؤں تب جب کہ میرا تو فی الحال واپس جانے کا ہی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہم سب بہت دیر تک صد یوں سے پچھڑے دوستوں کی طرح جانے کوں کوں ہی بھولی بسری باتیں یاد کر کے ہنتے رہے۔ مغرب کا وقت سر پر تھا۔ اتنے میں میری نظر محلے کے چھانک سے اندر داخل ہوتی ایک جانی پچھانی سی صورت پر پڑی۔ قریب آنے پر میں حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ ارے..... یہ تو اپنے طاہر بھائی تھے..... انہیں کیا ہو گیا تھا۔ چند ہنہیں میں ہی وہ اتنے کم زور اور مذہ حال سے کیوں دکھنے لگے تھے؟ انہوں نے مجھے دیکھا تو پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ارے..... آدمی آیا ہے..... کیسے ہو میرے چھوٹے فوجی آفیسر؟“

”اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں..... تو آپ کیسی ہیں.....؟“

میرے منہ سے اچانک ہی قوآپی کا نام کل گیا اور پھر بعد میں طاہر بھائی کے چہرے پر چھایا ساید دیکھ کر میں خود ہی پچھتا نے لگا۔ انہوں

نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ سب اچھے ہیں اور ہوآپی بھیشہ مجھے بہت یاد کرتی ہیں۔ میں پہلی فرصت میں ان سے جا کر مل لوں۔ طاہر بھائی مجھے پیار کر کے آگے بڑھ گئے اور میں نے سوالیے نظروں سے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے بتایا کہ طاہر بھائی کی شوغی اور مسکراہٹ تو اسی دن ان کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی جس دن انہیں پتہ چلا تھا کہ غیاث پچانے و جوآپی کی کالج کی پڑھائی بند کروادی ہے۔ ”لیکن پھر بھی..... انہیں ہو کیا گیا ہے؟“ میں نے زور دے کر راجہ سے پوچھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجہ نے بتایا کہ اس دن وہ اور باے فضلو بابا کے ساتھ مل کر ہوآپی کے کبوتروں کا ذر برنگ کروار ہے تھے کہ شام چار بجے کے قریب طاہر بھائی یہ خیر کر کہ ہوآپی کا کالج تختہ کروادیا گیا ہے، غیاث پچانے کے لئے جانب دوڑے چلے آئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ راجہ نے ہی قریب ہونے کی وجہ سے کھولا تھا۔ ابھی راجہ طاہر بھائی سے بات کرہی رہتا تھا کہ اس کے پیچھے یقیناً غیاث پچانے کی وجہ سے دروازے پر آگئے۔ راجہ اندر چلا گیا اور دوڑے کے لیے مزید برنگ کھولنے لگا لیکن دروازے کی ادھ کھلی جھری سے اسے غیاث پچانے اور طاہر بھائی کی باتوں کی اواز ڈھیسی سی سنائی دے رہی تھی۔ طاہر بھائی کو تبدیلی کا پہلا احساس تو اسی وقت ہو گیا تھا جب غیاث پچانے حسب معمول انہیں گرم جوشی سے اندر مددوکرنے کے بجائے وہیں گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنے کو ترجیح دی تھی۔ طاہر بھائی نے غیاث پچانے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ یوں اچانک ہو گئی کا کالج جانا بند کروادیا گیا؟

غیاث پچانے بھیشہ سے بہت صاف اور کھلی بات کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کو ایسی ایج اور کی زبانی ملنے والے پیغام کی ساری تفصیل بتا دی کہ کس طرح انہوں نے کو طاہر بھائی کے نام کے ساتھ جوڑ کر بدنام کرنے کے لیے سارے شہر میں افسانے جوڑتا پھر رہا ہے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ طاہر ایک بہت شریف اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ انہوں کی پھیلائی ہوئی بے سروپا قسم کی بکواس کا حقیقت سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ ہوآپی کے نام پر کوئی وہبہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی ایک ہی ایک بیٹی تھی جس کے لیے انہوں نے جانے کتنے پسند دیکھ رکھے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہوں نے کسی فضول غذے یا کسی بھی اور وجہ سے ان کے پسند تعبیر پانے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو جائیں اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ فی الحال ہو کو کالج سے اٹھا لیں۔

<http://kitaabghar.com>

طاہر بھائی سر جھکائے غیاث پچانے کی ساری بات سنتے رہے اور آخر میں صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ ”جیسی غیاث پچانے کی منشاء..... کیونکہ یہ سب بھلا برادی بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔“ طاہر بھائی واپس پلٹنے لگے تو غیاث پچانے انہیں آواز دے کر روک لیا۔ طاہر بھائی نے چوک کر انہیں دیکھا۔ غیاث پچانے بھاری قدموں سے طاہر بھائی کے قریب پہنچا اور چند لمحے رک کر بولے۔

”طاہر میاں..... میں نے تمام باتیں اتنی تفصیل سے تمہیں اس لیے بتا دی ہیں کہ تم میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ جاؤ اور اپنے دل پر کوئی بو جھ لے کر واپس نہ جاؤ۔ تمہارے ہو پر ہی نہیں میرے پورے گھرانے پر بہت سے احسانات ہیں اور ہو اپنے تعلیمی میدان میں اتنی آگے تھاہری مدد کی بدولت ہی پہنچ پائی ہے لیکن میری تم سے اب یہی درخواست ہے کہ ہو کی آئندہ زندگی کی خاطر اس سے دوبارہ بھی نہ ملنا۔ لوگوں کی زبانیں کوئی

نبیس روک سکتا لیکن تم اپنے قدم تو روک سکتے ہو۔ امید ہے تم ہمیشہ کی طرح اپنے غیاث پچا کی یہ درخواست بھی رہنیں کرو گے....."

غیاث پچا تو اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئے لیکن ظاہر بھائی کے چہرے سے اڑتے رنگ شاید انہیں نظر نہیں آئے لیکن راجہ دروازے کی جھری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ظاہر بھائی نے جلدی سے اپنے اندر چلنے والے طوفانوں پر پردہ ڈال کر غیاث پچا سے وعدہ کیا کہ وہ تو کی عزت انہیں غیاث پچا کی طرح ہی عزیز ہے اور یہ کہ غیاث پچا اس بات کا اطمینان رکھیں کہ ظاہر بھائی کی وجہ سے کبھی وجوہ کی جانب کوئی گندی انگلی اٹھانے کی وجہ تلاش نہیں کر پائے گا۔ ظاہر بھائی غیاث پچا سے رخصت ہو کر اس دن دروازے سے ایسے پلٹے کہ پھر اس کے بعد آج تک ان کے قدم غلطی سے بھی اس درکی جانب نہیں اٹھے لیکن راجہ کے بقول غیاث پچا اور ظاہر بھائی دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ آپی جو اس وقت چھٹ پر اپنے کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں انہوں نے غیاث پچا اور ظاہر بھائی کی ساری گفتگوں لی تھی۔ راجہ نے اپنی آنکھوں سے ان کا پلوپلہ رہا تھے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بات کو تواب تین ماہ سے بھی زیادہ ہونے کو آئے تھے لیکن اس عرصے میں نہ تو کبھی وہ آپی گھر سے باہر نکلیں نہ ہی ظاہر بھائی کو کسی نے بلا ضرورت محلے میں پھرتے دیکھا تھا۔ ان کا ہاؤس جا ب شروع ہو چکا تھا اور وہ صحن اپنی ڈوٹوٹی پر جاتے اور رات گئے واپس لوٹا کرتے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً اگلو کے لیے سوال کالبایا لیکن میرے پوچھنے سے پہلے ہی بالے نے بتایا کہ اگلو کو تو پولیس نے اس کی ایسی اتیج او سے ڈبھیز کے تیرے دن ہی گرفتار کر لیا تھا کیونکہ اگلو نے کسی فرنچیز کے شوروم کے گلے سے پیسے چڑائے تھے۔ مالک دوکان نے چند دن پہلے ہی اگلو کو مزدوری پر رکھا تھا اور اگلو نے موقع ملتے ہی شوروم کی تجویز سے پانچ ہزار کے بڑے نوٹ اڑایے۔ وہ شہر چھوڑنے کے لیے ٹرین پکڑنے ہی والا تھا کہ ملک ریشم کے آہنی پنجے کی گرفت میں آگیا۔ اگلو ابھی تک جیل میں ہی تھا اور عدالت کی پیشیاں بھگت رہا تھا۔

ابھی ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ فضلو بابا مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئے کہ ”چلو میاں، قوبی ناراض ہو رہی ہیں کہ آدمی اب تک ان سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آیا.....“

جانے کیوں میرا دل وہ آپی کے نام سے ہی بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے ان سب سے رات کے کھانے کے بعد پان والے کے کیبین کے سامنے ملنے کے لیے کہا اور خود فضلو بابا کے پیچے پیچھے چل پڑا۔

وہ آپی ہمیں میں ہی اپنے پھول پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ہمیں میں قدم رکھا تو وہ پانی کا فوارہ پھینک کر جلدی سے میری جانب دوڑی آئیں۔ ان کے لبھ میں اب بھی وہی کھنک تھی جو میرے آس پاس کے تمام شور کو میری ساعت سے متاثر تھی۔

”ارے آدمی..... کہاں ہو بھی..... کتنی بری بات ہے نا..... دوپھر سے آئے ہوئے ہوا اپنی وہ آپی کے پاس آنے کی اب فرصت می ہے تمہیں۔“

میں سر جھکائے ان کے سارے ٹکلوے سنتا رہا۔ جانے کیوں ان کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں جھاپڑا تھا میں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کے اندر کمرے میں لے گئیں جہاں غیاث پچا اور سکینہ خالہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ غیاث پچا نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور سکینہ خالہ نے ڈھیروں دعا کیں دے ڈالیں۔ غیاث پچا نے اسی دن میرے آرمی کٹ بال دیکھ کر میرا نام ”سو بجر“ رکھ چھوڑا۔ وہ آپی نے کچھ ہی دیر میں میرے سامنے میری پسند کی

کھانے کی چیزوں کے انبار لگادیا۔ میں چور نظروں سے غیاث چچا کو اکیدمی کے بارے میں بتاتے ہوئے و تو آپی کو یہ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان کے گلابی رنگ میں ہلدی جیسی پیلا ہٹ کی آمیزش مجھے دور ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ غیاث چچا کافی دریمیرے ساتھ بیٹھنے کے بعد کسی کام سے باہر نکل گئے اور سینہ خالہ بھی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں تو وہ جو آپی نے وہ شکوہ کر رہی ڈالا جس سے میں اب تک اپنا آپ پھر ارہاتا۔ ”اچھا آدمی صاحب..... اب آپ یہ بتائیں کہ جاتے ہوئے مجھ سے مل کر کیوں نہیں گئے تھے..... تمہیں پتہ ہے کہ تاروئی تھی میں اس دن پلیٹ فارم پر وہیں بیٹھ کر.....“

میں چپ رہا پھر انہوں نے اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر میری نظروں کے سامنے لہرائی۔ میں زور سے چوک گیا۔ یہ تو وہی کارڈ تھا جو اس شام میں کیدھٹ کا لج جانے سے پہلے تو آپی کو دینے کے لیے ان کے گھر آیا تھا لیکن یہ کارڈ..... یہ تو..... پھر تو آپی نے خود میری بھجن دو کر دی کہ انہیں تیرے دن سیرھیوں کے نیچے صفائی کے دوران یہ کارڈ پر املا تھا۔ مطلب اس دن جب میں روٹے ہوئے سیرھیاں اتر کر بھاگا تھا تو میرے ہاتھوں سے یہ کارڈ وہیں سیرھیوں کے نیچے گر گیا تھا۔ تو آپی نے مجھے بتایا کہ وہ یہ کارڈ دیکھ کر بہت حیران ہوئیں تھیں کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ میں اس دن ان سے ملنے کے لیے آیا تھا تو پھر ملے ہنا ہی کیوں واپس چلا گیا تھا؟ میں نے تو آپی کو مزید اندر ہیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں بتا دیا کہ میں آیا تو تھا لیکن جب میں نے طاہر بھائی کو بھی چھٹ پر دیکھا تو میں کارڈ وہیں رکھ کر واپس چلا آیا تھا۔ طاہر بھائی کے نام پر تو آپی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور میں نے فو رہی ان کی آنکھوں میں نبی کی ایک بکلی سی چک دیکھی جسے تو آپی نے دوسرے ہی لمحے بڑی خوب صورتی سے چھرہ دوسری جانب کر کے چھپا لیا پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ کچھ بھج گئیں تھیں کہ میں شاید طاہر بھائی کی وجہ سے اسی چھٹ پر نہیں آیا لیکن وہ پھر بھی مجھ سے ناراض تھیں کہ طاہر بھائی تھے تو بھی کیا تھا۔ مجھے ان سے مل کر جانا چاہیے تھا پھر انہوں نے خود ہی مجھے بتایا کہ طاہر بھائی اب یہاں نہیں آتے کیوں کہ اٹو کی وجہ سے غیاث چچا نے ان کا کا لج جانا بند کروادیا ہے لہذا اب طاہر بھائی کے یہاں آنے کا بھی کوئی جواہر نہیں ہے۔ تب ہی بے اختیار ان سے ایک عجیب سوال پوچھ بیٹھا۔

”تو کیا آپ اسی وجہ سے اتنی اداں ہیں کیونکہ اب طاہر بھائی یہاں نہیں آتے.....؟“

تو آپی نے چوک کر مجھے دیکھا پھر شاید انہیں سیرے چہرے پر وہ جواب بھی نظر آگیا جسے سن کر میں خوش ہو سکتا تھا وہ دھیرے سے بہت دیں اور حسب معمول انہوں نے میری ناک دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں اس لیے اداں تھی کہ میرا بیمارا دوست آدمی جو یہاں نہیں تھا اب تم آ گئے ہو نا..... تو دیکھو کیسے کھلکھلا کر بہس رہی ہوں.....“

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

اور پھر واقعی ہم دونوں کھلکھلا کر بہس پڑے۔

اس شام تو تو آپی نے پس کربات نال دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اداں کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے راجہ کے ساتھ آج تک جتنی فلمیں بھی چھپ کر دیکھی تھیں ان سب میں ہیر و ہیر وَن ”محبت“ نامی چیز کے ہوتے ہی اچانک ہر طرف سے دکھوں، پریشانیوں اور مختلف قسم

کی مصیبتوں میں گھر جاتے تھے۔ دوست دشمن بن جاتے تھے اور وہ باقی فلم میں پھر اسی طرح اس رہتے تھے جیسے اس شام میں نے طاہر بھائی اور وہ جو آپی کو دیکھا تھا۔ تو کیا ان دونوں پر بھی اسی ”محبت“ نامی بلا کا سایہ آن پڑا تھا.....؟ اور اگر یہ محبت ہی تھی تو پھر اس عذاب میں اپنی جان پہنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھے یوں لگا جیسے محبت کسی بہت بڑی سی ایک جو نک کا نام ہو گا جو مخصوص انسانوں کا خون چوتی ہو گی۔ اس کے پیاسے ہونٹ اس وقت تک ان مخصوص انسانوں کی شرگ سے پوست رہتے ہوں گے جب تک ان کے جسم کا آخری قطرہ بھی نہ نکل جاتا ہو تھی تو وہ آپی اور طاہر بھائی کے پھرے اتنے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ محبت کی جو نک دھیرے دھیرے ان کا خون چوس رہی تھی اور وہ دونوں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔

یتّی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے اکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جانے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک **یتّی (برفانی انسان)** کی انہیں طلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے ایکشن ایڈو نیچناؤل سیکیشن میں دستیاب ہے۔

دوسری فصل

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اکثر خواب بچے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو نیند میں اس کی بھولے ہوئے ماضی بلکہ مستقبل کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ خواب میں وہ ماضی میں گم شدہ اپنی شخصیت کی شناخت بھی کر سکتا ہے۔ قدرت کبھی کبھی انسان کو ایسے موقع فراہم کرتی ہے۔ علیم الحق حقی نے ایک بار پھر ایک نہایت منفرد موضوع پر قلم آٹھا اور تحقیق پائی یہ کہاں..... دوسری فصل، جسکی پہیا درہندوؤں کے عقیدہ آواگوں (دوسراءجم) پر رکھی گئی ہے۔ ناول **دوسری فصل کو ناول سیکیشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔**

کتاب گھر کی پیشکش پہلی قیامت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میری چھیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ ہم سب کا پسندیدہ مشغله سارا دن آوارہ گردی اور شرارتیں کرتا تھا۔ ایسے میں محلے کی مخصوص فضا میں تھوڑی بہت تبدیلی اس وقت پیدا ہوتی جب محلے میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی۔ اس شام بھی غفور چچا کی بھٹکی بیٹی شنوکی منگنی کی تقریب تھی اور غفور چچا خود جا کر اور بہت اصرار کے ساتھ سکینہ خالہ اور جو آپی کوڈھوک کی تقریب میں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ورنہ جو آپی نے تو بالکل ہی گھر سے نکلا چھوڑ دیا تھا۔ جو آپی تو آج بھی گھر میں ہی چھپی بیٹھی رہتیں اگر غیاث چچا خودان کے کمرے میں جا کر ان سے تیار ہونے کا نہ کہتے۔ غفور چچا محلے کے سبھی دکھ درد میں بیمہ سب سے آگے ہوتے تھے پھر ایسے خوشی کے موقع پر انہیں نہ کہنا غیاث چچا کو بالکل بھلانہ لگا اور یوں سکینہ خالہ کے ساتھ مہینوں بعد جو آپی بھی گھر سے نکل آئیں۔

اب یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی..... لیکن سب سے پہلی ملاقات ہی لڑکے والوں کے استقبال کے لیے دروازے پر دہاں کھڑے، اجڑے اجڑے سے طاہر بھائی سے ہو گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سکینہ خالہ کو آداب کہا سکینہ خالہ نے حسب معمول ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعا میں دے ڈالیں۔ جو آپی سکری سکمی سی سکینہ خالہ کے پیچھے کھڑی تھیں۔ طاہر بھائی نے اخلاق ان سے بھی ان کا حال پوچھا۔ میں اور راجہ اس وقت شتو کے دینے ہوئے موتی کے گھرے پانی کی پراتوں میں ڈالنے کے لیے دروازے سے نکل ہی رہے تھے۔ طاہر بھائی کے حال پوچھنے پر جو آپی نے اپنی رُخی نگاہیں اٹھائیں۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی دلوگوں کی نظر ملتے ہی چنگاریاں ہی اڑتی محسوس کی تھیں۔ ہاں یہ بچ ہے کہ ان چنگاریوں کو شاید میرے، طاہر بھائی اور جو آپی کے علاوہ اور کوئی نہیں دیکھ پایا۔ چند لمحوں کے لیے میرے قدم ویس زمین میں گز کر رہ گئے۔ یا خدا یہ کیا ماجرا تھا۔ اس پاس پھرتے ہی سبھی لوگ اس آگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اگر انہیں یہ سب کچھ نظر نہیں آ رہا تو پھر ان دونوں کے درمیان اس سلگتی تپش کا صرف مجھے کیوں احساس ہو رہا تھا.....

دوسرے ہی لمحے راجہ نے میرا ہاتھ کھینچا اور مجھے دہاں سے دور لے گیا لیکن ساری تقریب میں میرا دھیان انہی دونوں کی جانب ہی رہا۔ طاہر بھائی کو غفور چچا نے کچھ ایسے کام سونپ رکھے تھے کہ انہیں بار بار زنانے کی طرف آنا جانا پڑتا تھا اور جتنی بار بھی وہ اس جانب گئے ان کی نظر، آنکھیں جھکائے بیٹھی جو آپی پر ضرور پڑ جاتی تھی۔ اس شام جو آپی کا روپ بھی کچھ ہایسا ہی تھا کہ اس پر کسی کی بھی نظر شہر سکتی تھی۔ وہ کا لے دو پڑے اور کا لے سفید مکس رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس تھیں۔ لڑکے والوں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی لیکن جب وہ لوگ آگئے تو ان کی ہر عورت ایک دوسرے سے جو آپی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ یہ پری کون ہے۔ لڑکے والوں کے ساتھ مہندی لے کر آئے لڑکے بھی کسی نہ کسی بہانے جو آپی کی

ایک جھلک دیکھنے کے لیے آس پاس منڈلار ہے تھے۔ ہم سب ہی دوست تقریب میں ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ صرف بالا ہی نہیں تھا جو گزشتہ شام اپنی اماں کے ساتھ اپنی خالہ کی طرف رات رہنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ کاش اس روز بالا اپنی خالہ کے گھر نہ جاتا تو ہمیں یہ پتہ چل جاتا کہ اگو گزشتہ رات ہی جیل سے چھوٹ کر گھر آچکا ہے۔ بالے کے اب اس کاری دورے پر افسروں کے ساتھ تین دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ورنہ وہ کبھی اگو کو گھر میں قدم نہ دھرنے دیتے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے، الہذا بالے کی اماں کا دل بھی اگو کی برباد حالت، بڑھی ہوئی شیوا مر میلے کپڑے دیکھ کر چھیج گیا اور انہوں نے اگو کو گھر میں بلا لیا۔ اکوکل سے اپنے گھر میں ہی پڑا تھا اور ہم سب دوست اس آفت ناگہانی سے بے خبر تھے۔ رات کے جانے کس پہر ڈھول ڈھماکے اور موسمی کی آواز سن کر اگو بھی گھر سے باہر نکل آیا اور اس نے دور سے ہی کھڑے کھڑے غفور چچا کے گھر کی تقریب کا جائزہ لیا۔ تبھی شاید اس کی نظر پار بار گھر کے اندر جاتے طاہر بھائی پر بھی پڑ گئی ہوگی۔ میں اندھیرے میں ٹھیک طرح سے پچان تو نہیں کا لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے بالے کی چھپت پر کسی کوتیزی سے منڈری کی طرف آتے اور پھر غفور چچا کے گھون کی جانب جھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ بالے کے ابا ہیں جو چھپت پر کھڑے مغلیقی کی تقریب کا ناظراہ کر رہے ہیں لیکن مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ اگو ہے۔ کاش..... کاش مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتا کہ وہ اگو تھا جو اپنی چھپت پر کھڑا اندر اس وقت صحن میں بیٹھی وجہ آپی پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور بار بار صحن میں آتے جاتے طاہر بھائی کو دیکھ کر اس کے اندر کا خون جانے کتنے اباں لکھا رہا تھا۔

تقریب ختم ہوتے ہوتے بہت دیر ہو گئی، سیکنڈ خالہ اور ہو آپی غفور چچا سے اجازت لے کر گھر لوٹنے لگیں تو غفور چچا نے انہیں پیش کش کی کہ رات کافی بیتھ چکی ہے، وہ کہیں تو غفور چچا خود انہیں گھر کے دروازے تک چھوڑ آئیں لیکن سیکنڈ خالہ نے انہیں روک دیا کہ اپنا محلہ ہی تو ہے اور پھر انہیں کون ساسات کوں پار جانا ہے۔ اس سبھی دو گلیاں تو پار کرنی ہیں الہذا وہ دونوں خود ہی چلی جائیں گی لیکن غفور چچا نے باہر گھرے نوجوانوں کو آواز دی کہ ان میں سے کوئی بھی سیکنڈ خالہ کو گھر تک چھوڑ آئے۔ طاہر بھائی دانتہ چیخپھے ہٹ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا جانا قطعی مناسب نہیں ہو گا میں اور راجہ بھی دور کھڑے پنجی کچھی شرشریوں کے فیتے کو آگ دکھار رہے تھے ورنہ ہم میں سے ہی کوئی ان کے ساتھ چلا جاتا الہذا اسامنے کھڑے مولوی سعید کے بڑے بیٹے کمال نے ہامی بھر لی۔ کمال بڑے بھیا کا کلاس فیلو تھا اور اس نے بھی ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بھیا کے ساتھ ہی میڑک پاس کیا تھا الہذا اس کا شمار محلے کے نوجوانوں میں کیا جا سکتا تھا۔ کمال ہو آپی اور سیکنڈ خالہ کے ساتھ ہی آگے گئے بڑھ گیا۔ باقی سب لوگ بھی غفور چچا سے رخصت ہو کر پہلے ہی اپنے گھروں کو پلت چکے تھے۔ میں اور راجہ بھی آخری فیتے کو آگ دکھا کر پلتے اور پھر اچانک ہی فضا میں ایک دخراش جیخ گوئی۔ میں لاکھوں آوازوں میں یہ آواز پچان سکتا تھا۔ یہ ہو آپی کی آواز تھی لیکن میرے علاوہ وہاں ایک شخص اور بھی تھا جس کی نبض اسی آواز کی لے پر دھرم تھی..... ہاں..... طاہر بھائی..... جیسے ہی جیخ کی آواز گوئی طاہر بھائی نے سر ایسید ہو کر سر اٹھایا اور پھر مجھ سے اور راجہ سے بھی پہلے اس طرف دوڑ پڑے جہاں سے آواز آئی تھی۔ دوسرے نمبر پر میں اور راجہ بھاگے لیکن ہم ایک تو پہلے ہی ان سے بہت پیچھے کھڑے تھے اور پھر طاہر بھائی کی رفتار بھی ہم سے سو گناہ یادہ تھی الہذا وہ چند ہی جھوٹے میں اندھیرے میں ہماری نظروں سے او جھل ہو چکے تھے اور پھر ہم ابھی آدھے راستے میں ہی تھے کہ وہ آپی اور سیکنڈ خالہ کی ہدیانی چیزوں نے آسمان سر پاٹھالیا۔ محلے کے ہر گھر کا دروازہ کھلا اور کوئی نہ کوئی اس میں سے نکل کر چیزوں کی آواز کی جانب دوڑا لیکن

سب سے پہلے میں اور راجا اس گلی کے گلزار پر پہنچے جہاں طاہر بھائی سینے سے الٹتے خون کے فوارے کو ہاتھوں سے دبا کر روکنے کی کوشش میں اوندھے منہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پہلی جھلک میں ہی ڈھو آپی کو آخری چیخ مارتے اور پھر چکدا کر بے ہوش ہو کر گرتے دیکھا۔ سکینہ خالہ ابھی تک ہندیانی انداز میں چیخ رہی تھیں اور لوگوں کو بلا رہی تھیں تاکہ کوئی آگے بڑھ کر طاہر بھائی کی مدد کرے۔ چند ہی لمحوں میں یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں اور راجہ سخت سر ایسیدہ ہو گئے اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی آس پاس قریب کے مکانوں سے قدوسی صاحب، شاکر چچا اور جانے کتنے اور لوگ جائے قوام پر پہنچ گئے۔ چند ہی لمحوں میں طاہر بھائی کو مہندی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئی اس آخری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا جو چند لمحوں کی مزید تاخیر کی صورت میں محلے کے چھانک کو کراس کر گئی ہو گی۔ ڈھو آپی کو بھی محلے کی عروتوں کی مدد سے اسی بے ہوشی کے عالم میں ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ جب میں اور راجہ وہاں بھاگتے ہوئے پہنچتے تھے تو ہمیں کمال بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لوگ ہانپتے کا نپتے کمال کو بھی نہ جانے کس گلی سے اٹھا لائے۔ تب اس پہلی کی پہلی گردھ کھلی کہ کمال سکینہ خالہ اور ڈھو آپی کو لیے ہوئے جیسے ہی بڑے میدان کو نکلتی گلی کے گلزار پہنچا تو اچاک ہی کسی نقاب پوش نے گلی کے کونے سے نکل کر ڈھو آپی کا ہاتھ اس تیزی سے چھپت کر پکڑا کہ بے اختیار خوف کے مارے ڈھو آپی کے منہ سے چیخ نکل گئی کیونکہ نقاب پوش نے انہیں باقاعدہ کھینچ کر انہی رے میں غائب ہونے کی کوشش کی تھی۔ کمال بھرا کر پلٹا اور اس نے چلا کر نقاب پوش کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نقاب پوش میں کچھ ایسی بجلی بھری تھی کہ اس نے دوسرے ہی لمحے کمال کا سر پکڑ کر اس زور سے دیوار میں مارا کہ چند لمحوں کے لیے تو کمال زمین پر پڑا ہی رہ گیا اور جب اس کے حواس سنبھلے تو اس نے اسی شخص کا ہیولہ انہی ری گلی کے کونے پر غائب ہوتے دیکھا، دوسری نظر اس کی زمین پر پڑے تڑپتے طاہر بھائی پر پڑی اور وہ بدھواں ہو کر چلاتے ہوئے اس نقاب پوش کے پیچھے بجا گا جس کا نقاب اسی گلی کے کونے پر پڑا رہ گیا اور جب کمال نے لاکھ کو شش کی لیکن سرکی چوٹ کی وجہ سے وہ پہلے ہی چکدار ہاتھا لہذا چند ہی لمحوں میں حملہ آور کسی چھلاوے کی طرح محلے کی انہی ری گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

درمیان کی کہانی سکینہ خالہ نے یوں بتائی کہ جیسے ہی نقاب پوش نے ڈھو آپی کو اپنی جانب کھینچتا تو ڈھو آپی اس زور سے سکینہ خالہ سے ٹکرائیں کہ خالہ کی نظر کا چشمہ زمین پر گر کر دوکھلا ہو گیا۔ دھنڈلی نظر سے انہیں رات کے انہی رے میں بس اتنا ہی نظر آیا کہ ڈھو آپی کوئی اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے اور پہلے تو کمال اس سے بھڑکا ہے لیکن پھر انہوں نے کمال کو چلا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ اس اثنائیں حملہ آور کی ڈھو آپی کے ساتھ کھینچاتا نی جاری تھی اور ڈھو آپی زور زور سے چلا رہی تھیں۔ حملہ آور نے سکینہ خالہ کو بھی زور سے دھکا دیا اور وہ ڈھو آپی پر قابو پانے میں تقریباً کامیاب ہوئی چکا تھا کہ دور سے طاہر بھائی للاکارتے اور چلاتے ہوئے دوڑتے نظر آئے۔ انہوں نے آتے ہی حملہ آور نقاب پوش پر دھاوا بول دیا۔ شاید انہی کے ساتھ دھیگا مشتی میں حملہ آور کا نقاب اس کے چہرے سے کھل کر گر گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں کوئی دھار پل بھر کو چکی اور اگلے ہی سکینہ طاہر بھائی سینہ تھامے زمین پر گر کر تڑپتے نظر آئے۔ نجمر عین ان کے سینے میں دستے تک گڑچ کا تھا اور ڈھو آپی کی چینوں نے آسان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اتنی دیر میں آس پاس کے لوگوں کے بیمار ہونے کے شور اور شاید پہچان لیے جانے کے خوف نے حملہ آور کو ڈھو آپی کا ہاتھ چھوڑ کر انہی رے میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے کمال کو بھی ہوش آگیا اور وہ بھاگتے ہوئے حملہ آور کے تعاقب میں سر پٹ دوڑ پڑا لیکن اسے پکڑنے میں کامیابی حاصل نہ کر

سکا۔ چند ہی لمحوں میں ہمارا وہ محلہ جہاں کچھ دیر پہلے خوشی کے شادیا نے نجگر ہے تھے اب وہاں چاروں جانب سوگ نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ سمجھی کے ذہنوں میں بس ایک ہی سوال ڈنک مار رہا تھا کہ آخر ایسی گھناوٹی واردات کا ارتکاب کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور واردات بھی کیسی.....؟ چاقو گھوپنے کی.....؟ اور وہ بھی ہمارے محلے میں.....؟ جہاں گزشتہ میں پہنچتیں سالوں سے سمجھی محلے دار ایک جوے ہوئے گھرانے کی طرح رہ رہے تھے۔ جہاں آپس میں اس قدر لگاؤ اور اپنا پین تھا کہ ہم پچھے رات پڑنے پر کسی بھی آنکن میں پڑ کرسوجاتے تھے اور ہمارے ماں باپ کو ذرہ برا بر بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ان کے پچھے سارا دن اور ساری رات کس گھر کے صحن میں وحاص چوکڑی مچاتے رہے ہیں.....

ڈاکٹروں نے طاہر بھائی کو فوراً آپریشن تھیز میں منتقل کروادیا۔ یہاں وہ جو آپی ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ بڑی لیدی ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ انہیں خوف اور دہشت کے مارے شدید صدمہ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ شاک میں چل گئی ہیں۔ طاہر بھائی کے گھاٹک ہونے کی خبر ان کے ڈاکٹر دوستوں اور باقی ہسپتال کے عملے میں جگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سینٹر اور جونیئر ڈاکٹروں اور میڈیکل کالج کے طالب علموں کا ہجوم پورے ہسپتال میں جمع ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کی جیپ بھی محلے میں نقشیں کے لیے پہنچ گئی اور انہوں نے سب سے پہلے کمال کا بیان لیا۔ ملک ریشم ایس ایج اونے معمول کی کارروائی اور روز نامچ تیار کروا یا۔ اسی اشامیں صبح کی اذانیں بھی شروع ہو گئیں۔ وہاں آپریشن تھیز میں ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے کی سروڑ کو شکر رہے تھے اور یہاں پورا محلہ ان کی جان کی سلامتی مانگنے کے لیے سجدے میں پڑا ہوا تھا لیکن شاید کچھ سجدے ہمیشہ رایگاں ہی جاتے ہیں۔ یہاں وہ جو آپی نے پوری رات کی بے ہوشی کے بعد چند لمحوں کے لیے پلکنیں کھولیں اور وہاں طاہر بھائی نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ ہم سب کو یہ خبر سن کر جیسے سکتے سا ہو گیا۔ طاہر بھائی کی امام، خالہ عزیزہ یہ سنتے ہی آپریشن تھیز کے باہر یوں گریں کہ انہیں دل کے دورے سے بچانے کے لاء پڑ گئے۔ طاہر بھائی کے ابا، پچھاٹکور نے وہیں اپنا سردی یوار میں دے مارا۔ پورے ہسپتال پر چند لمحوں کے لیے سنا تا چھا گیا جیسے سمجھی کی روح چند لمحوں کے لیے قبض ہو گئی ہو۔ محلے کی مسجد سے اعلان نشر ہوا۔ ”ان اللہ وانا الیہ راجعون.....“ اور پھر چند لمحوں بعد ہی ہسپتال عملے اور ڈاکٹروں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کچھ ہی دیر میں سارے شہر کے ڈاکٹر ہسپتال کے سامنے والی بڑی سڑک پر مجمع ہو چکے تھے اور ان کے نعروں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ وہ سب قاتل کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے ورنہ اڑتا لیس گھنٹے بعد انہوں نے شہر کے ہر ہسپتال میں ہڑتاں کرنے کی حکمی بھی دے دی تھی۔ محلے داروں کو سمجھنہیں آرہا کہ وہ طاہر بھائی کا ماتم کریں، خالہ عزیزہ کی دل کے وارڈ میں دیکھ بھال کریں یا پھر ٹکور پچھا کو قابو میں رکھیں جو پہلے ہی دیواروں سے سرکل کر کر ہوا ہاں ہو چکے تھے۔ غیاث پچا بھی ایک جانب یوں گم سے بیٹھے تھے جیسے ان کی قوت گویاں عرصہ قلص چھن چکی ہو۔ اب یہ ایک باقاعدہ قاتل کا کیس تھا جس کی شتوائی کے لیے ان کی لاڈلی بیٹی اور فیض حیات کی گواہی اور بیان بھی لازمی بتاتھا کیونکہ کمال کے مطابق اس نے قاتل کو پہلے نقاب میں اور پھر بھاگتے ہوئے پشت کی جانب سے دیکھا تھا۔ سکینہ خالہ کا بیان ہو بھی جاتا، تب بھی ان کی گواہی کافی نہ ہوتی کیونکہ وہ بھی قاتل کا چہرہ تھیک سے نہیں دیکھ پا تھیں۔ سواب لے دے کر آخر میں وہ آپی ہی پختی تھیں جن کی گواہی پر سارا دار و مدار تھا۔

لیکن اس سے پہلے ابھی اور بہت سے عذاب ہم سب کو اپنی جان پر جھیلنے تھے۔ طاہر بھائی کی میت محلے میں پہنچا دی گئی تھی۔ ان کے ماں

باپ میں سے کوئی بھی اس وقت اس قابل نہیں تھا کہ وہ ان کے کفن فن کے انتظامات کرو سکتا، آس پاس کے قریبی رشتہ داروں اور خالو خالاؤں نے یہ فریضہ سنچال لیا۔ شام تک قبر کشانی کے علاوہ دیگر انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے لیکن اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جب تک ماں باپ طاہر بھائی کا آخری دیدار نہ کر لیں انہیں منوں مٹی تسلی کیسے فن کیا جائے؟

پھر اچاکہ ہی خبر ملی کہ طاہر بھائی کی اماں نے بے ہوشی سے آنکھیں کھول دی ہیں، جانے یہ ماں کی ماہتہ کے کرہتی سحر کا اثر تھا لیکن کچھ اور جس نے اس بے ہوشی میں بھی انہیں یہ احساس دلا دیا کہ ان کا لاڈلا پینا ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کے انتظار میں ان کے صحن میں سفید لباس میں پٹا پڑا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہپتال کی ہی گاڑی میں شکور پچا، عزیزہ خالہ کو یہ کاونی میں داخل ہوئے۔ دونوں بدنصیبوں نے آخری بار بیٹے کے ماتھے پرالودا یہ بوس دیا اور طاہر بھائی کا کارروائی انہیں اپنے کندھوں پر اٹھائے چل پڑا۔ میرے ہوش و حواس میں آنے کے بعد ہمارے محلے میں یہ کسی کی پہلی موت تھی اور ہم سب دوستوں نے اس موت کو پل پل خود پر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس دن مجھے یہ پتہ چلا کہ سوال کی خوشی پر ایک دن کاغذ زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ شاید ہم انسانوں کے غیر میں ہی غم کی مٹی شامل ہوتی ہے تجھی غم پٹ پٹ کر ہمارے پاس آتا ہے۔ طاہر بھائی کی موت والے دن سے ہی میری غم سے دوستی ہو گئی تھی۔ خوشی مجھے بے چین کر دیتی تھی جبکہ غم میں مجھے سکون کا احساس ہوتا تھا۔

لوگ جب طاہر بھائی کو دفاتر کرو اپس لوٹے تو رات بیت پچھی تھی۔ پورے محلے کے کسی بھی گھر میں چولہائیں جلا تھا پھر سب سے پہلے غافور چچا کو ہی حسب معمول دنیا داری کی رسم یاد آئی اور رات گئے نہ جانے کہاں سے وہ نمکین اور میٹھے چاولوں کی چند دلکشیں اٹھالائے لیکن اس وقت کسی کو کچھ کھانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ غافور چچا کے بے حد اصرار پر مشکل سمجھی نے ایک آدھو والی اور ساری دلکشیں بتیں خانے کو بھیج دی گئیں۔ وہ آپی ابھی تک مکمل ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ملک ریشم دو مرتبہ غیاث چچا کے گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا معاملہ نگینہ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ صح کے اخبارات اس واردات کی خبروں سے بھرے پڑے تھے اور ہر خبر میں ڈاکٹروں کے الٹی میٹم کا ذکر تھا جو انہوں نے ہڑتال کے لیے دے رکھا تھا۔ معاملہ حکومت کے بڑوں تک پہنچ گیا تھا اور پولیس کے اعلیٰ حکام کو خصوصی طور پر جلدی اور نہایت اختیاط سے تفتیش مکمل کرنے کی پدایت کر دی گئی۔ ایس ایج اوکی پریشانی کی وجہ بھی بھی تھی کہ گھوم پھر کر سارا دباؤ اس کے اوپر آ رہا تھا کیونکہ علاقہ برہ راست اس کے زیر انتظام تھا اور وہی تفتیشی افر بھی تھا لیکن طاہر ہے جب تک وہ آپی کو مکمل ہوش نہیں آ جاتا تب تک علاقہ ایس ایج ابھی مکمل بے اس تھا۔

غیاث چچا مسلسل کل رات سے وہ آپی کے سرہانے میٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اور کسی کو بھی وہ کو کمرے میں آنے سے منع کر رکھا تھا اور بھیڑ بھاڑ کو بھی ان کے کمرے سے بہت دور روک رکھا تھا۔ اسی لیے جب وہ آپی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر دوسرا مرتبہ ہوش و حواس کا دامن تھا مگر تو صرف وہاں غیاث چچا ہی تھے جن کو یہ خبر تھی کہ وہ آپی مکمل ہوش میں آچکی ہیں۔ انہوں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور خوف سے آنکھیں پٹ پٹاتی وہ کوپانی کا گلاس تمہار کرتلی دی کہ وہ محفوظ ہیں اور اپنے ہی گھر میں ہیں۔

وہ آپی نے ایک ہی سانس میں سارا پانی طلق سے نیچے اتار لیا اور گھبرا کر غیاث چچا کی جانب دیکھا اور ایک دم اٹھ بیٹھیں۔

”ابا..... وہ طاہر بھائی وہ ٹھیک تو ہیں نا.....“

غیاث چچا نے دھیرے سے انہیں بتایا۔

”اس کی حالت کچھ تھیک نہیں ہے..... ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں تم مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا.....؟“

فہوآپی نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دو آنسو ان کی بھیچی ہوئی آنکھوں سے نکل کر پک گئے۔ انہوں نے زیریب ہی کوئی دعا پڑھی لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ وہ جس کے لیے یہ دعا پڑھ رہی ہی ہیں انہیں اب زندگی دینے والی کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی۔ غیاث چچا غور سے فہوآپی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے گزر جانے کی اطلاع فہوآپی کو اسی لیے ایک دم سے نہیں سنائی تھی کیونکہ اس طرح سے فہوآپی کی حالت دوبارہ بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ فہوآپی کو اپنا آپ سمجھنے میں بہت دریگی۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے غیاث چچا کو اس منحوس رات میں ہوئی اس گھنٹائی واردات کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ اس طرح کمال انہیں لیے ان کے آگے آگے چل رہا تھا کہ اچاکنگلی کے مکلو سے ایک نقاب پوش کو دکران کے سامنے آگیا اور آتے ہی اس نے فہوآپی کی کلامی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کمال تو پچھے ہی تھا۔ بھی، اس نے روکنے کی کوشش کی تو ایک ہی وار میں نقاب پوش نے اس کا سرد یو ار میں دے مارا اور اسی انشاء میں طاہر بھائی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی نقاب پوش ایک دم ہی پھر گیا اور وہ دونوں گھنائم گھتا ہو گئے۔ دفعتہ چھینا جبھی میں نقاب پوش کے چہرے سے نقاب اتر گیا۔ بچچا لیے جانے کے خوف اور طیش نے حملہ اور کو دیوانہ کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے نینے سے اپنا چمکدار دھار والا چاقو نکالا اور طاہر بھائی کے سینے میں گھوپ دیا اور اپنا آپ چھڑا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

فہوآپی اتنا ساہی سنانے کے بعد یوں ہاتھنے گئی تھیں جیسے جانے کتنے میل کا فاصلہ بھاگ کر طے کر کے آئی تھیں۔

غیاث چچا کی آواز بھی بیٹھنے لگی تھی۔ انہوں نے فہوآپی سے یوں پوچھا جیسے انہیں اپنے سوال کا جواب پہلے ہی معلوم ہو۔

”کون تھا وہ نقاب پوش؟“

فہوآپی کے منہ سے سکتی ہوئی آواز لگلی۔

”اُگو.....“

اور غیاث چچا نے یوں سرخاہم لیا جیسے ڈوبتے کا آخری سہارا تک بھی اس کی نظر وہ کے سامنے بہہ جائے۔ ساری صورت حال سمجھ لینے کے باوجود ان کے دل میں ابھی تک کہیں نہ کہیں امید کی بلکی سی کرن باقی تھی کہ شاید حملہ اور اٹو نہ ہو۔ یا پھر..... یا پھر جو فہوآپی ہی نے کم از کم اسے نہ دیکھا ہو۔ ان کے اندر کا باپ اپنی لاڈلی بیٹی کو مزید مشکلات سے بچانے کے لئے ایسی باتیں سوچ رہا تھا تو اس میں کوئی اچنہ بھی کی بات بھی نہیں تھی۔ فہوآپی نے پھر بے قراری سے غیاث چچا سے سوال کیا۔

”ابا..... طاہر تو تھیک ہیں نا..... اُگو کے وار سے وہ بری طرح زخمی ہو گئے تھے..... ان کا تو بہت سارا خون بہہ گیا ہوگا..... آپ انہیں دیکھنے پہنچاں گئے تھے؟“ غیاث چچا نے پھر ٹوٹے دل سے وہ فہوآپی کو تسلی دی کہ انہیں امید ہے کہ ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے وہ فہوآپی کے سرہانے بیٹھ کر بڑی مشکل سے ٹوٹے لفظوں میں فہوآپی کو یہ بتایا کہ شاید کچھ دری میں ایسی ایج او ان کا بیان لینے کے لیے آجائے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ فہوآپی ایسی ایج او کے سامنے اپنے بیان میں اُگو کا ذکر نہ کریں، اس اتنا ہی کہہ دیں کہ انہیں کی وجہ

سے وہ حملہ آور کو پیچان نہیں سکیں اور ویسے بھی ان کے بے ہوش ہونے تک حملہ اور رقاب کی اوٹ میں تھا لہذا وہ کچھ نہیں بتا سکتیں کہ طاہر بھائی پر حملہ کرنے والا رقاب پوش کون تھا۔

فہم آپی جیرت سے اپنے ابا کو دیکھتی رہیں کیونکہ آج تک غیاث چچا نے ہمیشہ اور زندگی کی ہر مشکل میں انہیں سچ بولنے کا ہی درس دیا تھا پھر وہی باپ آج اچاک اپنیں تھوڑتھوڑے کیوں دے رہا ہے؟ اور پھر جھوٹ بھی ایک ایسے معاملے کے بارے میں جس میں ان کا گھسن اپنی زندگی اور موت کے درمیان سرحد پر پڑا اپنی سانسوں کی جگہ لڑ رہا تھا۔

غیاث چچا نے فہم آپی کے اندر ائمۃ سوالوں کے طوفان کو محروس کر لیا اور سر جھکائے فہم آپی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ پولیس کیس ہے اور معاملہ جانے آگے کہ بتک کوئٹ کپھری اور وکیلوں کی بحث میں کچھ گا۔ بات اگر ان کی اپنی ہوتی یا پھر فہم آپی کی جگہ اگر ان کا کوئی بینا ہوتا تو وہ خود جا کر پولیس میں اگلوں کے خلاف رپٹ درج کرو آتے تھے لیکن فہم آپی ان کی بیٹی تھیں اور کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو عدالت کے چکر لگاتا نہیں دیکھ سکتا اور خاص طور پر قبض جب بیٹی کتواری بھی ہو۔

پتہ نہیں فہم آپی کو غیاث چچا کی بات پوری طرح سمجھتی ہے ایسا نہیں لیکن وہ اپنے پیارے ابا کے چہرے پر پریشانی کی ایک لکیر بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں لہذا انہوں نے غیاث چچا کی خاطر ہائی بھرپوری اور جب تک ملک ریشم اور ان کے مشی کی آہیں برآمدے میں گونجیں تب تک وہ اپنے آپ کو ہفتی طور پر اس جھوٹ کے لیے تیار کر پچھلی تھیں۔ غیاث چچا نے پہلے ہی ایس ایج اوسے درخواست کر رکھی تھی کہ فہم آپی کی حالت کے پیش نظر فی الحال انہیں طاہر کی موت کے بارے میں نہیں بتایا گیا ہے لہذا وہ بھی اگر اپنے سوالات کی ترتیب یوں رکھیں کہ جس سے طاہر کی موت کا ذکر نہ لکھتے ان پر بڑا احسان ہوگا کیونکہ وہ جو فہم آپی کو اس حالت میں مزید صدمہ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے۔

ملک ریشم کمرے میں داخل ہوا تو فہم آپی نے جلدی سے انہیں سلام کر کے سر پر دو پسہ درست کیا۔ ملک کی نظریں و جو فہم آپی کے مطلع سراپے سے ہوتی ہوئی ان کے ملٹھ چہرے پر جنم گئیں۔ وہ پولیس والا تھا لیکن ایک باپ بھی تو تھا۔ اس کے گھر میں بھی ایسی ہی ایک نازک اور کافی کی گزاریا جیسی وجہ پیشی ہوئی تھی۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے۔ اپنی توکری بچانے کے لیے اس لڑکی پر تھنی کرے اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجرم کا نام لگوائے اور اپنی توکری بچانے کے لیے جو گزشتہ چوبیں گھنٹوں کے دوران اعلیٰ حکام کے بے انتہا باؤ کی وجہ سے شدید خطرے میں پڑ پچھلی یا پھر چپ چاپ اپنی طرح کے ایک دوسرے باپ کی کی ہوئی درخواست پر عمل کرتے ہوئے لڑکی کا سیدھا سادھا بیان لے کر معاملہ داخل دفتر کر دے۔ اس کی زندگی ایسے مقتدماں کی تفتیش میں گزری تھی اور وہ غیاث چچا کی پریشانی دیکھ کر بھی سمجھ گیا تھا کہ ان کی بیٹی نے اصل مجرم کو پیچان لیا تھا لیکن ایک باپ نے اپنی بیٹی کو رسوانی سے بچانے کے لیے اسے غلط بیانی پر مجبور کر دیا ہے۔

ایس ایج او کے اندر کا پولیس افسر جاگ چکا تھا لیکن وہ اس کے اندر موجود ایک باپ کی روح سے زیادہ بیدار نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کی ہی سنی اور چپ چاپ فہم آپی سے بیان لے کر اور چند ضعی سوالات کر کے کاغذ کے نیچے فہم آپی کے دستخط لے لیے۔ فرشی محمر نے جیرت سے اپنے سخت گیر افسر کو دیکھا جو ایسے معاملات میں بال کی کھال نکالنے کے لیے مشہور تھا لیکن اس دھان پان سی لڑکی کے سامنے یوں سر جھکائے بیان لے رہا تھا

جیسے اسے تفتیش کی الف، ب سے بھی واقفیت نہ ہو۔

ملک ریشم و جو آپی کے کمرے سے باہر نکلا تو غیاث پچانے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ لئے۔ ملک نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور انہیں کہا کہ بہتر ہو گا کہ وہ اپنی بیٹی کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ کیونکہ آج نہیں تو کل اسے یہ حقیقت پڑیہ چل ہی جائے گی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ محکمہ یہ تفتیش صرف علاقہ ایس ایج اور برہی چھوڑ دے۔ ان کی ناکامی کی صورت میں معاملہ کسی دوسرا سے افسر کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے جو شاید ان کی طرح نہیں نہ برتے۔

ایس ایج او چلا گیا لیکن اپنے بیچھے غیاث پچا کے لیے ان گنت سوچیں چھوڑ گیا۔ آنے والے دنوں کا تصور ہی ان کا سارا سکھ جیہن الوٹ لینے کے لیے کافی تھا۔ شام تک وجوہ آپی کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی اور ان کی آنکھوں کی بے چینی سے صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ سکینہ خالہ یا خود غیاث پچا انہیں طاہر بھائی کے گھر پہنچنے کے لیے چلنے کا کہیں تو وہ جلدی سے اپنی چادر اوڑھ کر ان کے ساتھ کل پڑیں کیونکہ اگر ہمتان نہیں تو کم از کم انہیں طاہر بھائی کے گھر تو جانا ہی چاہیے تھا لیکن ان کی توقعات کے بر عکس شام سے رات ہو گئی لیکن ان کے ماں باپ میں سے کسی نے بھی انہیں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے اماں ابا کے عجیب سے رو یہ نے بھی شدیداً بھجن میں ڈال رکھا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنوں ہی وجوہ آپی سے کچھ چھپا رہے ہوں۔ نظریں نہ ملایا رہے ہوں۔ دوسرا طرف ملک ریشم نے وجوہ آپی کا پہلا بیان شامل تفتیش تو کر لیا تھا لیکن اس نے احتیاطاً شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کروادی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے پر بھی پولیس کے اہل کار سادہ لباس میں تعینات کروادیے تھے کیونکہ اس کی پولیس والی حس کسی بھی قسم کے حالات میں اپنے فرض سے غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس واردات کے بیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لہذا وہ ایسے میں کسی قسم کی بھی کوتاہی مول نہیں لے سکتا تھا۔

آخر دوسری صبح وجوہ آپی کا صبر جواب دے ہی گیا اور انہوں نے خود سکینہ خالہ سے طاہر بھائی کے گھر چلنے کے لیے کہہ دیا۔ انہیں کیا پڑھتا تھا کہ جس کی مزاج پری اور عیادت کے لیے چلنے کو کہہ رہی ہیں اس بدنصیب کے گھر میں آج اس کا سوم ہو گا اور اس کے قل پڑھے جا رہے ہوں گے۔ سکینہ خالہ نے بمشکل اپنی آنکھوں کو وجوہ آپی کے سامنے بھیگنے سے روکے رکھا اور انہیں سہہ پہر تک کے لیے نال دیا کیونکہ وہ غیاث پچا کی غیر موجودگی میں خود کچھ بھی کہنے سے بالکل قاصر ہی تو تھیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کچھ فضلے تقدیر، مدیر سے پہلے ہی کردھتی ہے۔ ابھی دو پھر کا سورج سوانیزے پر ہی تھا کہ اچانک دھڑ سے صحن کا دروازہ کھلا اور شکورن بواہر بڑائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں اور آتے ہی بنا سوچے سمجھے وہیں صحن میں کھڑے کھڑے سکینہ خالہ کو آوازیں دیتی لگیں۔

”اے بہو..... سنت ہو..... چنانہیں ہے کیا اپنی عزیزیہ کی طرف.....؟ پچھلے دو دنوں سے سمجھی تمہارا پوچھ رہی ہیں..... ائے میں تو کہتی ہوں کہ انسان شادی بیاہ میں کسی کی خوشی میں شریک ہو یا نہ ہو پرموت کے غم میں اس سے سب سے پہلے پہنچنا چاہے..... اور پھر آج تو سوم بھی ہے تا اپنے طاہر میاں کا.....“

شکورن بواحش معمول نان اٹاپ ٹرین کی طرح بولتی جا رہی تھیں اور سکینہ خالہ کے دوڑ کر ان تک پہنچنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھنے سے قبل

ہی وہ اتنا کچھ بول چکی تھیں کہ برآمدے میں سے کچھ چاولوں کی چھلتی ہاتھ میں لیے گزرتی و جو آپی کے کانوں میں پکھلا سیسے انڈیل گئیں۔ و جو آپی نے صرف ایک لمحے میں موت کا تذکرہ اور سینہ خالہ کو شکورن بوا کے ہاتھ جوڑ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے دیکھا اور دوسرا ہے ہی لمحے ان کی دنیا اندر ہیر ہو گئی۔ ان کے ہاتھ سے چاولوں کی پرات چھوٹی اور وہ خود بھی کسی کچھ چاول ہی کی طرح اہر اکر زمین پر گر گئیں۔ سینہ خالہ اور شکورن بوا دنوں ہی بوكھلا کر ان کی طرف دوڑیں لیکن و جو آپی اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ سینہ خالہ تو بالکل ہی حواس باختیہ ہو کر دھاڑیں مار کر رونے لگیں لیکن شکورن بوانے اپنے ہوش و حواس کا دامن تھامے رکھا اور بھاگ کر باہر موجود کسی محلے دار کو بڑے ہسپتال کے لیے رکھلانے کا کہا۔ جانے ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ خود انہوں نے ہی آپی کو اٹھا کر کر کشے میں ڈالا اور ہسپتال کی ایم بی جسی تک پہنچا کر ہی دم لیا، ورنہ ڈاکٹروں کے بقول کچھ دیر مزید ہو جاتی تو و جو آپی کو مدد میں چلی جاتی۔ تین دن اور تین راتیں ڈاکٹر صح شام ان کے سرہانے کھڑے انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے سروڑ کو شکش کرتے رہے جب شکورن بوا وجہ آپی کو لے کر ہسپتال کی جانب دوڑ پڑیں تھیں تھی بھی غیاث پچا کے لیے بھی پیغام بر دوڑا دیا گیا تھا اور چند ہی لمحوں میں غیاث پچا بھی ایم بی جسی میں آن موجود ہوئے تھے اورتب سے لے کر اگلے تین دن تک وہ اور سینہ خالہ بنا پلک جھکپے ان کے کمرے کے باہر بیٹھ رہے۔ میں اور راجا اپنے تمام دوستوں سمیت تینوں دن صبح سے شام تک وہیں ان کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر بھاگ کر کوئی کام کر سکیں۔ ایک وقت درمیان میں ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا کہ اب کوئی دو اثر نہیں کر سکتی لیکن جہاں دو اکابر ختم ہو رہا ہوتا ہے وہیں سے دعا اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے اور پھر و جو آپی کے لیے دعاوں کی کون ہی کی تھی۔ محلے کے ہر گھر میں چھوٹے، بڑے، بوڑھے بھی ان کے لیے جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے اور آخر کار اس بار تقدیر کو ہماری بے بُسی پر حرم آہی گیا، تیری رات ساری ہے گیارہ بجے و جو آپی نے آنکھیں کھول دیں پر لگتا تھا کہ سکتے نے ان کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی ہے۔ ان کے منہ سے صرف ایک ہی جملہ کلا کہ وہ پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروانا چاہتی ہیں اور اس مرتبہ ان کے لبھے میں اور لفظوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ غیاث پچا بھی صرف ایک لمبی ہی سانس لے کر رہ گئے۔ ویسے بھی پچھلے پورے ایک بفتے سے ان کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ جتنی مرتبہ بھی انہوں نے ظاہر بھائی کے بوڑھے باپ کی مزید جبکی ہوئی کردیکھی یا بوڑھی ماں کی آہیں اور سکیاں سیشیں، ہر بار انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ ظاہر بھائی کے ان بے اس والدین کے مجرم ہیں، ایک ایسا مجرم جو آپی اولاد کی بہتری کے لیے خود غرض بن چکا ہو۔ اتنے دن سے وہ ٹھیک طرح سے ظاہر بھائی کے ابا سے نظر بھی نہیں ملا پائے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ملک ریشم اپنے عملے سمیت ہسپتال میں موجود تھا۔ اس نے غیاث پچا کو بتایا کہ کل صبح سے اعلیٰ حکام کے سامنے اپنی فائل رپورٹ اور اس جواب طلبی کا جواب داخل کروانا ہے جو اتنے دن تک تفتیش آگئے بڑھنے کے سبب محلے کی طرف سے اسے جاری کی گئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کل محلہ دباو کے تحت اسے ملازمت سے عارضی طور پر معطل بھی کر دے۔ غیاث پچا نے انہیں بتایا کہ اس بات کی نوبت نہیں آئے گی۔ ان کی بیٹی اپنا بیان دوبارہ سے ریکارڈ کروانا چاہتی ہے، انہوں نے ملک ریشم سے اس بات کی معافی بھی مانگی کہ اس سے پہلے انہوں نے خود تو کو پولیس کو ٹھیک بیان دینے سے منع کیا تھا۔ ملک ریشم نے ان کے کامنے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی کہ وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ گیا تھا لیکن اگر وہ بھی غیاث پچا کی جگہ ہوتا تو بالکل وہی کرتا جو غیاث پچا نے کیا تھا۔

اس نے فوراً ہی مشی کو اشارہ کیا کہ ڈاؤ آپی کے بیان سے پہلے چند سطیر احتیاطاً مزید جوڑ لے کہ پہلا والا بیان چونکہ صدمے کی حالت میں دیا گیا تھا لہذا اس وقت ہنی دباؤ کے تحت کچھا ہم با تین رہ گئی تھیں جن کا اندر اراج بے حد ضروری تھا لہذا جواں دوسرا بے بیان میں شامل کی جائی ہیں۔ ملک ریشم نے اپنی نظر و کارزار کی وجہ پر ایسا رکھا کہ ڈاؤ آپی کو اپنی گزشتہ غلط بیانی پر زیادہ شرم دیگئی نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں بیان درج ہو گیا اور ملک ریشم نے وہ پوری رات اگو کے مکمل ملکہ کا نوں پر چھاپے مارتے ہوئے گزاری۔

<http://kitaabghar.com>

ڈاؤ آپی کا وہ بیان شاید ان کی زندگی میں آخری ایسا موقع تھا جب انہوں نے ایک ساتھ اتنی ساری باتیں کرنے کے لیے اپنے لب کھولے تھے۔ اس کے بعد ڈاؤ آپی کو ایسی چپ لگی کہ لوگ ان کی آواز سننے کو ترس بھی جاتے تب بھی ان کے منہ سے ہاں بانہ کے علاوہ کچھ نہ لکھتا۔ غیاث چچا اور سکین خالہ یوں جوان اور اکلوتی بیٹی کو دھیرے دھیرے اور پل پل مرتب دیکھی، خون کے گھونٹ پیتے لیکن کچھ کرہ پاتے۔

ڈاؤ آپی کے بیان کے اڑتا لیس لکھنوں کے اندر ہی ملک ریشم نے اٹو کوریلوے اسٹیشن کے ڈاکیارڈ میں پرانی اور متروکہ بیوگیوں کے گودام میں ایک پرانی بوجی میں چھپے ہوئے گرفتار کر لیا۔ اس جگہ کی مجری اگو کے پرانے فرنچ پر کی دوکان والے ایک کارگیر نے کی تھی۔ آگے کی کہانی بہت سیدھی تھی۔ پولیس نے کیس مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا اور جس روز ڈاؤ آپی کی گواہی تھی اس روز پورا محلہ عدالت کے کھچا بھی بھرے ہوئے احاطے میں موجود تھا۔ اگو نے حوالات اور جیل کے درمیانی عرصے میں بھی غیاث چچا کو دھمکانے کے لیے کچھ حرکے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور گمنام خلوط وغیرہ کے ذریعے اس نے غیاث چچا کو سیگام بھجوایا تھا کہ اگر وہ جو ڈاؤ آپی نے اسے عدالت میں شناخت کرنے کی قابلیتی، کی توان کے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتا پڑے گا لیکن غیاث چچا نے اس کی بکار پر مزید کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ بے ہی جو کچھ بھگت رہے تھے اس سے زیادہ قسمت کی ان پر مزید ستم ظریفی کیا ہو سکتی تھی۔ ان کی سات پر دوں میں پلی بڑھی، لاڑی شہزادی آج عدالتوں کی خاک چھانتی پھر رہی تھی وہ جس کی جھلک جوان ہونے کے بعد کسی غیر نہیں دیکھی تھی آج اس کی خبریں شہر کے سارے اخبارات میں چھپ رہی تھیں۔ عدالت کے احاطے میں بھی اخباری فونوگرافروں اور پورٹرزوں کا ہجوم موجود تھا۔ ایک جانب ڈاکٹروں کا جلوں کیس کی شفتوں کے لئے نظرے لگاتا عدالت کی جانب بڑھ رہا تھا اور دوسری جانب اگو کو قیدیوں کی گاڑی میں سے احاطے میں اتارا جا رہا تھا۔ اگو نے گاڑی سے قدم باہر رکھ کے تو اس کی پکلی نظر دور برآمدے میں کھڑی ڈاؤ آپی اور غیاث چچا پر پڑی جو ہم سب دیگر محلے داروں کے ساتھ ہی عدالت آئے تھے۔ اگو کی نظر و کارزار کے تھے عدالت کے احاطے میں ہورہے تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک ڈاؤ آپی کو گھر نہیں پایا کیونکہ سنتری نے اس کی ہتھڑی کو ایک زوردار جھنکا دیا اور اسے کھینچتے ہوئے عدالت کے اندر لے گئے۔ کچھ ہی دیر میں کیس لگ گیا اور دفتری نے عدالت کے دروازے سے دربان کو آواز لگانے کا اشارہ کر دیا۔

ڈاؤ آپی عدالت میں داخل ہوئیں تو وہ لڑکھڑا رہی تھیں اور غیاث چچا نے انہیں تھام رکھا تھا۔ غیاث چچا کا کوئی بھی سگایار شستہ دار عدالت ان کی بہت بندھانے نہیں آیا تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان کی "عزت" کو یوں عدالتوں میں پیشیاں بھجتے اور رلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے لہذا انہوں نے اپنی بیٹیوں کا "مستقبل" بچانے کے لیے غیاث چچا کے گھر انے کابینکاٹ کر دیا تھا۔

مخالف وکیل نے جرج شروع کی تو ڈاؤ آپی نے بڑےطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب دیا۔ وکیل نے انہیں پریشان کرنے کے لیے

ان پر کچھ غلیظ تم کے الزامات بھی لگائے کہ ان کا دراصل پہلے ہی سے طاہر بھائی سے کوئی چکر پل رہا تھا جبکہ ساتھی انبہوں نے اُنہوں سے بھی ”دستی“ گاندھر کی تھی لہذا اس بات پر دونوں کا پہلے بھی جھگڑا ہوا تھا اور پھر دوسرے جھگڑے میں بات اتنی بڑھ گئی کہ اُنہوں نے طیش میں آ کر چاقو نکال لیا اور پھر جو کچھ بھی ہوا وہ ایکاتفاقی حادثہ تھا۔

مجھے اس اُنہوں کی دم وکیل پر اس کی یہ سب بکواس سن کر شدید غصہ آیا۔ میں اور راجہ ہجوم کی وجہ سے اندر عدالت کے ہاں میں گھس نہیں پائے تھے لہذا ہم دونوں دروازے پر ہی لوگوں کی ٹانگوں میں سے سڑکا لے کھڑے تھے۔ میں نے راجہ کو دھیرے سے کہا کہ اس وکیل کے پیچے کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا پڑے گا جو انہوں نے شکورن بوا کے ساتھ کیا تھا لہذا اُنگلی پیشی پر وہ نہ سوے کہ کرسی بم ساتھی ہی لیتا آئے۔

اس سے پہلے وکیل نے ڈاؤپی کو اس طرح گھیرنے کی کوشش کی تھی کہ دراصل اُن تو اس رات وہاں تھا ہی نہیں اور انہیں اندر ہیرے کی وجہ سے مخالف ہوا ہو گا کہ وہ اُنہوں ہے لیکن ڈاؤپی نے بڑے سکون اور اعتقاد سے بھری عدالت میں اُنہوں کی طرف ہاتھا کر چنج کو بتا دیا تھا کہ وہ جملہ آور کے اتنے نزدیک ہٹری تھیں کہ رات کے اندر ہیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اُنکو طاہر بھائی پر جملہ کرتے دیکھا تھا۔ لہذا عدالت کو مانتا ہی پڑا کیونکہ چشم دید گواہ کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مخالف وکیل نے جب یہ پیشتر اچلتے نہیں دیکھا تو پھر اس نے بھری عدالت میں ڈاؤپی کے کردار پر کچھ اچھا کر عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ غیاث پچا کی آنکھوں سے آنسو شپ پر گرتے رہے اور وہ اپنی لاڈلی کی رسوانی کا تماشہ دیکھتے رہے لیکن ڈاؤپی کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ بڑی ہمت سے وکیل کے ہر جملے کا جواب دیتی رہیں۔ بعد میں پڑتے چلا کہ اُنہوں کے لفظے دوستوں نے اپنی اور اُنہوں کی حرام کی کمائی سے یہ بولڑھا ”گدھ نما“ وکیل کیا تھا جس کی وجہ شہرت ہی اس کی بد نامی تھی۔

اس وکیل نے محلے میں گھوم پھر کر کہیں نہ کہیں سے اپنی سیدھی خبریں بھی جمع کر لی تھیں اور اس نے اُنگلی پیشی پر شکورن بوا کو بھی گواہی کے کشہرے میں بلا لیا۔ سارے محلے دار حیرت سے اچھل ہی تو پڑے کیونکہ سب جانتے تھے کہ شکورن بوا کی زبان پر خود ان کا اپنا کنٹرول نہیں رہتا لہذا اب تو کیس بگرا کہ بگرا..... گیدھ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ اُنہوں نے اپنے بھائی ایک لڑائی ڈاؤپی کی وجہ سے ہو چکی تھی، جس میں طاہر اور اُنہوں ہی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ وہ جانتا چاہتا ہے کہ اس وقت قریب سے گزرتے ہوئے شکورن بوانے ان کی کیا باتیں سنتی تھیں۔ ہم سب دم سارے ہی شکورن بوا کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ شکورن بوا کی ذرہ بھی غلطی سے پورے کیس کا رخ پلٹ سکتا تھا۔

شکورن بوانے اطمینان سے کلے میں رکھا پان لگا اور پھر جو انہوں نے گدھ وکیل کے لئے لینے شروع کیے تو جبھی انہیں خاموش نہیں کروا سکا۔ انہوں نے وکیل سے کہا کہ اسے شرم آئی چاہیے ایک شریف زادی پر یوں کچھ اچھاتے ہوئے۔ کیا اس کے گھر میں اس کی اپنی ماں بہنیں نہیں ہیں؟ جو وہ دوسروں کی بیٹیوں کے لیے ایسی باتیں کرتا پھرتا ہے.....؟ بوانے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہ سنی نہ دیکھی کیونکہ ڈاؤپی کی پاکیزگی کی گواہی تو میں تو کیا سورج، چاند، ستارے بھی دے سکتے ہیں اور ہمیں بات اُنہوں کی تو وہ ڈاؤپی کے علاوہ محلے کے ہر آتی جاتی لڑکی اور عورت کی تمیز کیے بغیر ان پر فقرے کستار ہتا تھا اور اس کی وجہ سے محلے کی ہر شریف زادی کا جینا محال ہو چکا تھا۔ انہوں نے نجح سے درخواست کی بلکہ

اسے حکم دیا کر اٹو جیسے مودی جانور کو تو ایک بار نہیں، سو بار پھاتی کی سزادی تی چاہیے۔

بڑی مشکل سے بچ کے اشارے پر عدالت کے ہر کارے انہیں گواہی کے کثیرے سے اتار کر نیچے لے گئے ورنہ شکورن بوانے تو طے کرہی لیا تھا کہ آج ہی بچ سے فیصلہ لے کر واپس گھر جائیں گی۔ سارے محلے کی آنکھوں میں شکورن بوا کے لیے محبت کے آنسو تھے۔ جانے ان کی کیا یا پلٹ کب کیوں اور کیسے ہو گئی تھی لیکن یہ بھی تھا ہے کہ ان کے اس ایک بیان پر محلے والوں نے ان کی پچھلی ساری زندگی کی خطا نہیں معاف کرو ڈی تھیں۔ چند پیشیاں اور چلیں، گدھ و کیل نے اپنی جانب سے پورا زور لگایا لیکن آخر کار عدالت نے اپنا فیصلہ اٹو کے خلاف سنادیا۔ اٹو کو عدالت کی جانب سے موت کی سزا نہادی گئی۔ آخری دن تک اٹو عدالت میں اکثرے کھڑا رہا تھا لیکن بچ کے منہ سے اپنے لیے موت کی سزا کے الفاظ سن کر آخر کار اس کے قدم بھی ڈگ گا ہی گئے۔ اسے شاید ڈھوآپی کی جانب سے اتنی ہمت اور بہادری کی توقع نہیں تھی نہ ہی بھی اس نے محلے داروں کی جانب سے اس قدر استقامت کی امید کی ہو گی۔ بہر حال عدالت نے انصاف کے پڑائے میں اس کی موت ڈال کر طاہر کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا جب تک یہ کیس عدالت میں چلتا رہا اور ڈھوآپی کی عدالت میں پیشیاں ہوتی رہیں وہ ایک چمن کی طرح ڈھی رہیں اور کسی نے کبھی انہیں پریشان یا افسوس کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جس دن عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اس دن گھر آتے ہی وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رہیں کہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہ روئی ہوں گی۔ سینئر خالہ، شکورن بوا، میری امی خالہ عزیزہ اور استانی خالہ بھی انہیں تسلی دیتے دیتے خود بھی ایک ساتھ ہی روپڑیں۔ ہم باہر کھڑے بچوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے طاہر بھائی کی آج ہی موت ہوئی ہو۔

کتاب گھر کی پیشکش

اس کے بعد ہم سب نے ڈھوآپی کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ میری چھٹیاں ختم ہونے میں بس چند دن ہی رہ گئے تھے، میں گھنٹوں ان کے پاس ان کے کمرے میں یا شام کو چھپت پر زبردستی اپنے ساتھ لے جا کر بیٹھا رہتا۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اکیڈمی کے جھوٹے پچھے ساتا رہتا اور وہ خلااؤں میں گھورتی ہوئی ہوں ہاں کرتی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ میں انہیں بتا پاتا کہ اس دفعہ میرا واپس اکیڈمی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اب میں ان کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اور سے اب انے بھی جیسے چپ رہنے کی قسم ہی تو کھارکھی تھی۔ بھول کر بھی انہوں نے اپنے اور پرنسپل صاحب کے درمیان مجھے گھرو اپس بھجوانے کے معاملہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے نتیجے کو دیکھ کر وہ پھسل گئے تھے جو گزشتہ ہفتے ہی بند لفافے میں اکیڈمی سے موصول ہوا تھا۔ میں تھیک شناخت نمبروں سے پاس ہو گیا تھا اور کوئی موقع ہوتا تو میں اپنی اس کامیابی پر اپنا سرپیٹ لیتا کیونکہ مجھے پوری امید تھی کہ میں فیل ہو جاؤں گا اور اکیڈمی سے ایک سرخ لفافہ ابا کے نام آئے گا جس میں درخواست کی گئی ہو گی کہ خدا کے لیے اپنے لاڑلے کو وہیں گھر پر روک لیں کیونکہ آپ کا صاحب زادہ کلاس میں فیل ہو گیا ہے لیکن میری امیدوں کے بر عکس میں پاس ہو گیا تھا البتہ اسیں اب اگلی کلاس میں جانے کا حق دار تھا اور میرے پاس اکیڈمی والیں نہ جانے کا کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ اس وقت مجھے پرنسپل صاحب کی ”تمام سازش“ سمجھ میں آئے گئی تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے مجھے ایک سال اکیڈمی میں گزارنے پر نہ صرف راضی کیے رکھا تھا بلکہ ہیلین اور شیرل کی مدد سے مجھے اس قابل بھی بنا دیا تھا کہ اس چھوٹے سے شہر کے ایک اردو میڈیم سکول کا طالب علم اکیڈمی کے آس فورڈ شینڈر روکے مشکل ترین کورس کے امتحان کو نہ صرف پاس کر گیا تھا بلکہ اس نے اپنے پہلے ہڑے امتحان میں اچھے خاصے کیڈیس کو پچھے بھی چھوڑ دیا تھا۔ میرے

رزٹ کے ساتھ پہل صاحب کی طرف سے ابا کے لیے ایک مبارکباد کا خط بھی تھا۔ جس کے بارے میں ابا نے مجھے اس وقت نہیں بتایا تھا۔ بہر حال اس وقت جب ابا نے میرا رزلٹ مجھے لا کر دیا تو میرے ذہن میں تب یہ ساری کچھڑی پکنا شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور رزلٹ ملتے ہی میرے ذہن میں صرف ایک ہی دھن سوار ہو گئی تھی کہ کس طرح جلد از جلد جا کر ہو آپی کو اپنے پاس ہونے کی خبر سناسکوں اور انہیں اپنارزلٹ کا رڈ دکھا کر ان کے چہرے سے صدیوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کی ایک جھلک پانے میں کامیاب ہو سکوں۔

<http://kitaabghar.com>

لہذا دوسرا ہی لمحے میں اپنے رزلٹ سمیت ہو آپی کے گھران کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ اپنی پرانی کتابوں میں سے کوئی رجسٹر کاں کر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ ہی تاریخی رنگ کا بڑا سارہ جھٹر تھا جس میں طاہر بھائی انہیں ٹوٹن دیتے وقت مختلف نوٹس لکھا کرتے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے رجسٹر دوبارہ اپنے ٹکنے کے نیچے رکھ دیا اور مجھے اندر واٹل ہونے میں جھجکتا دیکھ کر انہوں نے خود اواترے کر مجھے اپنے پاس بالایا۔ میں نے جلدی سے اپنارزلٹ کا رڈ گھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور پھر واقعی قدرت نے اپنا کرشمہ کر دکھایا۔ ہفتوں بعد میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کی بہلی سی چمک دیکھی اور انہوں نے رزلٹ پڑھتے ہی مجھے ڈھیروں مبارکباد بھی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اکیدیٰ می کی ایک سال کی سختیاں اور صعبوتوں جھیلنے کا صد قدرت نے مجھے ایک پل میں ہی دے دیا ہو۔ اس لمحے انہوں نے مجھے سے ایک ایسی فرمائش بھی کر دی ای جس نے میرے اکیدیٰ واپس جانے پر ہمیشہ کے لیے مہر ہی ثبت کر دی۔ وہ جو آپی نے میرا رزلٹ کا رڈ بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولیں۔

”آدمی..... میرے لیے اکیدیٰ سے اپنی یونیفارم میں سلامی والی بڑی سی تصویر کھیجو گے نا.....“

میں نے جلدی سے یوں سرہلا یا جیسے مجھے اگر کچھ دیر ہو گئی تو جو آپی پھر سے بولنا بھول جائیں گی۔ جانے کتنے ہفتوں بعد آج ان کے منہ سے میں نے کوئی بات کوئی فرمائش نہیں میرے لس میں ہوتا تو وہیں محلے میں ہی یونیفارم میں تصویر کھوکھا کر انہیں دے جاتا۔

اگلے ہی ہفتے جب میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں تین میں بیٹھا ایک مرتبہ پھر اپنے شہر اپنے صوبے سے ہزاروں میل دور واقع اکیدیٰ جوانان کرنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ ہم انسان اپنے آنے والے دنوں اور مستقبل کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنارکھتے ہیں، صدیوں کی منصوبہ بنندی کر کے بیٹھے رہتے ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے اگلے پل کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے ہمارا اٹھنے والا قدم ہمیں کس جانب لے کر جائے گا۔ میں نے کیا سوچا تھا کہ اکیدیٰ کا دوبارہ کبھی رخ بھی نہیں کروں گا لیکن آج میں اپنی مرضی سے گازی میں بیٹھا یہ سفر طے کر رہا تھا۔ کس کے لیے.....؟ جی ہا۔..... پھر اپنی ہو آپی کے لیے جنہیں اکیدیٰ کے ماحول میں میری یونیفارم میں سلامی والی ایک بڑی سی تصویر چاہیے تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی بغاوت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اکیڈمی میں میرا پہلا سال جتنا مشکل اور دھیمی رفتار سے گزرا تھا، اگلا سال اسی قدر تیزی کیکن ہل گزرا تھا۔ اب ہم سب کیڈس ایک کلاس سینئر ہو گئے تھے اور ہم نے کورس میں رونا چھوڑ دیا تھا لیکن اسکیلے میں بھی بھی ”دل“ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ میرے اندر بغاوت کے جراشیم پلانا شروع ہو گئے تھے۔ ہر لمحے و جو آپی کا دھیان لگا رہتا تھا کہ وہ کیسی ہوں گی؟ کیا کر رہی ہوں گی؟ ایسے میں کیڈٹ کا لمحہ کی روشنیں اور ڈسپلن مجھے بہت گھلتا تھا، ایک ایسی ہی اوس شام میں ڈارمیٹری میں بیٹھا اپنے لانگ پر یہ شور پاش کر رہا تھا کہ مجھ سے ایک جماعت سینئر، نویں جماعت کا ایک کیڈٹ وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے اپنے جوتے پاش کرتے دیکھا تو پکھھا ہی دیر میں اپنے پر یہ شور بھی اٹھالا یا اور میرے سامنے پھینک دیئے کہ ان پر بھی دو با تھے مار دوں۔ پچھلے سال ہم سب نے ایسی بہت سی مشقیں ہنسی خوشی سرانجام دی تھیں لیکن اس وقت ایک تو میرا مودہ بہت خراب تھا اور میں وجوہ آپی کی یاد میں اوس بھی بہت تھا لہذا میں نے اسے جواب دیا کہ میں اس وقت اپنے جوتے ہی پاش کروں تو میرے لیے بہت ہو گا لیکن وہ اپنے جوتے چھوڑ جائے میں شام تک انہیں بھی پاش کر دوں گا لیکن ان جناب کا تو پارہ ہی آسمان پر چڑھ گیا۔ فوراً ترک کر بولا۔

”How dare you refuse me?“ اور بڑی نخوت سے اپنے سینئر ہونے کا رب جھاڑتے ہوئے یہ کہتے ہوئے مڑ گیا کہ دس منٹ میں اگر اس کے جوتے پاش نہ ہوئے تو پھر میں خود ہی باہر میدان میں فلابازیاں کھانے کے لیے حاضر ہو جاؤں۔ جانے اس ایک لمحے میں مجھے کیا ہوا۔ میرا خود پر سے قابو ایک دم سے ختم ہو گیا۔ وہ لڑکا ابھی ڈارمیٹری کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا۔ میرے ہاتھ میں جوتے پاش کرنے کا جو برش پکڑا ہوا تھا میں نے پوری قوت سے وہی برش اس کا نشانہ لے کر ہوا میں اچھا دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک زور دار ”کھٹ“ کی آواز سنائی دی اور برش سیدھا جا کر اس کی گدی پر لگا اور دوسرا لمحے ہی وہ کیڈٹ بھائیں کر کے روتا ہوا ہاؤس ماسٹر کے گھر کی جانب بھاگ رہا تھا۔

اسفر اور فیصل جو باہر اہدراہی میں ٹیبل ٹیس کھیل رہے تھے، اس نویں جماعت کے کیڈٹ کو یوں روئے ہوئے بھاگتے دیکھ کر جلدی سے اندر میری جانب بھاگے اور مجھ سے ماجرا پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اسے برش دے ما را ہے۔ فیصل اور اس فرکار گل اڑ گیا اور انہوں نے فوراً مجھے مشورہ دیا کہ میں اس ”قاتلانہ جملے“ کے اثرات سے بچنہیں پاؤں گا لہذا بہتر یہی ہو گا کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن بھاگ کر جاتا کہاں؟ چاروں طرف تو ان کے پھرے لگے ہوئے تھے۔ ابھی میں فرار کے امکانی طریقوں پر غور کر رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں ہاؤس ماسٹر صاحب سینئر کیڈٹ سمیت بدھوں سے ڈارمیٹری میں داخل ہوئے۔ نویں جماعت کے کیڈٹ نے دور ہی مجھے دیکھ کر یوں اپنی انگلی اٹھائی جیسے کہہ رہا ہو کہ ”یہی ہے مجھ پر قاتلانہ جملے کا ملزم.....“ کچھ ہی دیر میں مجھ پر فرد جرم لگائی جا چکی تھی اور میری سزا بھی سنا دی گئی۔ رات کو ناٹ فائلن کے وقت تمام

ہاؤس کے سامنے مجھے تین بار کیجگ Caning کی سزا نئی گئی۔ ہاؤس ماسٹر کے جانے کے بعد میری ساری ڈارمیٹری نے فرد افراد مجھ سے تعزیت کی۔ رات کو نایٹ فالن کے وقت ہاؤس ماسٹر صاحب ایک نازک ساید اٹھائے تشریف لے آئے۔ ایسے یہد میں نے اور رابجے نے پرائزری اسکول میں شرارتوں پر بہت بار کھائے تھے۔ یہ یہد تو ان یہدوں کی ”بہن“ لگ رہا تھا۔ تمام ہاؤس کے سامنے عبرت کے لیے میری فرد جرم پڑھ کر سنا تھی اور پھر ہاؤس ماسٹر صاحب نے میری پشت کے نیچے تین پید رسید کیے اور میری سالانہ روپورٹ میں بھی میری اس ”کھلی بدمعاشی“ کا ذکر کرنے کا حکم صادر کیا۔

اس تمام ”تقریب“ کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ نویں جماعت کے کیدیٹس نے مجھ پر رب جمانے کی کوششیں بالکل ہی ترک کر دیں۔

جو نیز نے اور میری کلاس نے مجھے ”بھائی“ کیدیٹ کا خطاب دے دیا۔ ”بھائی“ ان کیدیٹس کو اعزازی طور پر کہا جاتا تھا جو اس قسم کے کارنائے سرانجام دے کر پی۔ اُنی آفسرز کی بلیک لسٹ میں شامل ہو جاتے تھے۔ ایسے کیدیٹس کے لیے خاصی مراعات بھی غیر اعلانیہ طور پر میسر کر دی جاتی تھیں مثلاً کلاس کی مدد بریک میں کوئی دوسرا کیدیٹ ان کے لیے لائن میں لگ کر بریک فوڈ لے آتا۔ میں کی لائن میں بھی اس کے ہم جماعت اسے جہاں وہ کھڑا ہونا چاہتا تھا اسے جگہ فراہم کر دیتے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہیلین کو جب میری اس حرکت کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور اس نے مجھے اس سینکڑیڈٹ سے سوری کرنے کا بھی کہا۔ شیرل نے کہا ”بہت اچھا کیا.....“ حالانکہ اب میری کانونت کے احاطے والی تربیت ختم ہو گئی تھی لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی بہانے سے بختم میں ایک بار اپنی ان دونوں ”سہیلیوں“ سے ملنے چلا ہی جاتا تھا۔ ہیلین اور شیرل کو میں نے وہ آپی پر بنیتے والی آفت کی ساری تفصیلات بھی بتائی تھیں جسے سن کر وہ دونوں بہت افسر دہ ہو گئی تھیں۔ ہیلین کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا۔ وہ بہت دریک اپنے روماں سے اپنی بھیگیں پلکیں پوچھتی رہی۔

اکیدیٹی آتے ہی دوسرے روز میں نے سب سے پہلا کام بھی کیا تھا کہ اپنے ہاؤس کے فنوگر افر سے کہہ کر اپنی پریڈ کی سلامی کے دوران ایک تصویر کھپو کر اسے خوب بڑا کروایا اور کیدیٹ کالج کے چھوٹے سے پوٹ آفس میں جا کر اپنے ہاتھوں سے پوٹ کر آیا۔ دوسرا خط اسی دن میں نے راجہ اور اپنے دوستوں کے نام پوٹ کیا جس میں میں نے انہیں بختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ہر لمحے وہ آپی کا دھیان رکھیں گے اور پل پل کی خبر مجھے خطوط کے ذریعے پہنچاتے رہیں گے۔ راجہ کے خطوط آتے رہتے تھے جن سے وہ آپی کے بارے میں صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا ہے اُنکو جس دن عدالت نے چنانی کی سزا نئی تھی اس دن کے بعد سے کسی نے بھی وہ آپی کو گھر کے باہر کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور ان کی وہ مدھری مسکان بھی طاہر بھائی کے ساتھ ہی شاید منوں مٹی تلے دفن ہو گئی تھی۔ اب ہر لمحے ان کی پلکیں بھیگیں بھیگیں رہتی تھیں اور انہوں نے بول چال بھی تقریباً ترک کر دی تھی۔ بس سارا دن اپنے کمرے میں خود کو بند رکھتی تھیں اور گھر آنے والے مہماں سے بھی ملنے سے احتراز کرتی تھیں۔ راجہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ پورے محلے میں اس بات کے چھے بھی ہو رہے ہیں کہ اُنکے وکیل نے اس کی سزا کے خلاف بڑی عدالت میں اپیل دائر کر دی ہے۔ اُنکو کے گھر والوں نے خصوصی طور پر طاہر بھائی کے گھر جا کر ان کے ماں باپ سے اپنے بیٹے کے گناہ عظیم کی معافی مانگی اور غیاث پچا کے گھر بھی گئے تھے اور پھر انہوں نے ہمارا محلہ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ لوگ شہر کی پری جانب چھاؤنی کی آخری حد کے قریب بنے ہوئے کوارٹر میں رہتے تھے لیکن بالا بھی روزانہ شام کو اپنے دوستوں سے ملنے اپنے ابا کی پرانی سائیکل پر آتا تھا۔ بالے نے بتایا کہ اس کی

ماں بھی اب مستقل بستر سے لگ چکی تھی اور اس کی بہن کا رشتہ بھی انگو کی سزا کی وجہ سے نٹ گیا تھا۔ اس کے سرال والوں نے ایک غنڈے اور قاتل کی بہن سے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ پڑھ کر مجھے بالے کی بہن گذی پر بے حد ترس آیا۔ وہ قواؤپی ہی کی ہم عمر اور ہم جماعت بھی تھی اور ہم سب دوستوں کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ ان کے گھر میں جب بھی لوگ بھتی تھی تو وہ ہمیشہ میرے لیے سلوک کا ایک بہت بڑا سا گلاں بالے سے بھی چھاپ کر رکھ دیتی تھی اور جب میں شام کو بالے کو کھیل کے لیے بلانے جاتا تو بہ مجھے چکے سے وہ گلاں پکڑا دیتی۔ جانے اتنے اچھے گھرانے میں انگو جیسا شیطان صفت انسان کیسے پیدا ہو گیا تھا جس کے کرمون کا پھل اس کے تمام گھر والوں کو بھگلتا پڑ رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ آصف بھٹی جسے ہم ”پیٹ کی بھٹی“ بھی کہتے تھے کیونکہ اس کا پیٹ بھٹی نہیں بھرتا تھا، منہ لکائے ہوئے ڈار میٹری میں داخل ہوا۔ فیصل نے اس سے تکلیف پوچھی تو پورہ چلا کہ آج چونکہ منگل ہے اور گوشت کا ناغدہ ہے لہذا ہمیں رات کو میں میں میں بزری اور دال کھانے کو ملے گی۔ بھٹی کو دونوں چیزوں سخت ناپسند تھیں اور اس سے رات کو بھوک بھی بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس فوج دوسرے بیٹھا اس کی ساری رام کہانی سن رہا تھا اس نے چکلی بجا کر کہا کہ اس کے پاس اس پر بیٹھانی کا ایک حل موجود تھا ہے لیکن اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ بھٹی نے کہا کہ وہ بہتر کھانا کھانے کے لیے بڑی سے بڑی سے ہمت دکھانے کے لیے تیار ہے، تب اس فرنے سر گوشیوں میں ہمیں بتایا کہ اکیدمی سے باہر مرکزی گیٹ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھپر ہوٹل موجود ہے جو کچھ ہی دیر میں تازہ مرغی ذبح کر کے چند منشوں میں اسے فرائی کر کے دے سکتا ہے۔ اس فرنے اس مرتبہ چھیتوں سے واپسی پر اپنی گاڑی میں آتے ہوئے چند لمحے وہاں رک کر رخشد آپنے کے بہانے ہوٹل والے سے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ چھپر ہوٹل کے مالک نے ہمیں اس فرنے کی سینکڑیں کیے تھیں۔ بھٹی کو بھار چھپ چھاپ کر رات کو وہاں کھانا کھانے آ جاتے ہیں۔ مرغی فرائی کا نام سنتے ہی بھٹی کے منہ سے لگاتا رہا۔ بہنا شروع ہو چکی تھی اور وہ ہم سب کو ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ہم سب بھی ہناؤ ذبح کیے ہوئے مرغے ہوں لیکن واقعی اس کام کے لیے بے حد ہمت کی ضرورت تھی کیونکہ چاروں طرف بیہی آفسرز اور خانقاہی عملے کا پیرا لگا ہوتا تھا اور پھر رات کو اکیدمی سے نکلنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں ہم سب کے ہاتھوں میں ہمارے بیگ ہوتے اور ہمیں باعزت طور پر گھر کے لیے خصی کا پروانہ ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا۔

لیکن اس فرنے کے نہیں اور چیت پیٹی مرغی فرائی کا نقشہ کچھ اس خوب صورتی سے اور مرچ مصالحے لگا کر ہمارے سامنے پیش کیا تھا کہ ہم چاروں ہی کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ بالآخر فرض اور محبت میں جیت مرغی کی محبت کی ہوئی اور ہم نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس کل ایک گھنٹہ بیس منٹ کا وقت تھا۔ اگر ہم رات کے کھانے پر میں کی طرف جانے کی بجائے چھپر ہوٹل کی جانب دوڑ لگاتے تو رات کے کھانے کے بیس منٹ اور پھر اس کے بعد رات کی دوسری پریپ کی سیٹی بجھنے تک اور رات کے کھانے کے بعد کار میانی وی وقت جوئی۔ وی وغیرہ دیکھنے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ بنتا تھا۔ اس وقت کے ختم ہونے سے پہلے ہمیں ہر حال میں واپس اپنے کمرے میں موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ پریپ کی سیٹی بجھنے تھی ہاؤس ماسٹر صاحب بذات خود ہر بیک کا دورہ کرتے تھے اور کیڈیس کو پڑھتے ہوئے دیکھ کر ہی واپس جاتے تھے۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ وہاں بیٹھ کر کھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم مرغی ”پارسل“ کروالیں گے اور رات کو لائب آف کے بعد اپنا ”ڈریز“ کریں گے۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی اپنی جگہ قائم تھا یعنی چار دیواری کا پہرہ..... اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ تھا کہ دو گاڑیاں جن میں ڈیوٹی پی۔ اواخر دوسرا عملہ سوار ہوتا ہے۔ مغرب کے بعد سے ہی کیڈٹ کالج کی چار دیواری کے گروگشت (Petroling) شروع کر دیتی ہیں، چار دیواری کے گرد کھڑے محافظوں کے علاوہ ہمیں ان گاڑیوں کی روشنی کے دائرے میں آنے سے بھی پچھا تھا لیکن اس وقت آصف بھٹی کے ساتھ ساتھ ہمارے پیٹوں کی بھٹی بھی صرف بھٹی ہوئی مرغی مانگ رہی تھی اور ہمارے وہاں کسی بھی قسم کے خطرے کو محسوس کرنے سے قاصر تھے۔

<http://kitaabghar.com>

آخر خدا خدا کر کے پہلی پریپ ختم ہونے کی سیٹی بھی اور کیڈٹ اپنے ہائلز سے نکل کر قطاروں میں میں کی جانب روان ہو گئے۔ ہم چاروں دانستہ پیچھے رہ گئے۔ میں میں ماشاء اللہ اس قدر ”رونق“ اور بھیڑ ہوتی تھی کہ کسی کا ہم چاروں کی غیر حاضری کو نوش کرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ویسے بھی کیڈٹ اور کہیں غیر حاضر ہوں تو ہوں پر میں سے غیر حاضر ہونے کی غلطی کوئی نہیں کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں میں کے سامنے والے گھاس کے بڑے سے قبال گراڈنڈ میں صرف میں، اسفر، فیصل اور آصف بھٹی کھڑے رہ گئے۔ ہم چاروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر پوری رفتار سے پر یہ گراڈنڈ کی جانب دوڑ لگا دی۔ فیصل نے بتایا تھا کہ پر یہ گراڈنڈ کے گردگی اونچی خاردار تاراں نے چند جگہوں سے اندر کی جانب مڑی ہوئی دیکھی ہے اور ایک آدھ جگہ تو باقاعدہ ایسا لگتا ہے کہ وہاں پر ہم سے پہلے بھی کیڈٹ نے قسمت آزمائی کی ہے، کچھ ہی دیر بعد ہم کیمپس کی جگہ گاتی روشنیوں سے دور نکل آئے اور اب پہلی مرتبہ ہمیں آنے والے خطرے کے خوف نے چونکا رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی ہم اندر ہیرے میں کچھ دوڑ ہی چلے تھے کہ اچانک ہی بھٹی زور سے چالیا۔ ”کون ہے؟“ ہم تینوں بھی خوف سے اچھل پڑے۔ پتہ چلا کہ بھٹی اپنے ہی سامنے کے اچانک سامنے آنے سے ڈر گیا تھا۔ فیصل نے ایک زوردار چپت بھٹی کے سر پر سید کی اور اسے چپ چاپ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں ہم خاردار تار کے قریب گلی بڑی بڑی جهاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے چند لمحے اپنا سانس درست کیا۔ اسفر جس نے بھٹی ہوئی مرغی کا سپنا سب سے پہلے ہمیں دکھایا تھا، اس مرحلے پر خود اس کے اپنے حواس جواب دے گئے اور وہ ممننا تی ہوئی آواز میں بولا ”یا میری تو ساری بھوک ہی اڑ گئی ہے، میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں۔“ اس بار چپت کھانے کی باری اسفر کی تھی اور مارنے والا ہاتھ میرا تھا۔ کچھ دیر ہم چاروں دم سادھے بیٹھے حالات کا جائزہ لیتے رہے، چند لمحوں بعد پہلے واہیں جانب سے اور پھر باہمیں جانب سے دو گاڑیاں مختلف سمتوں میں گزر گئیں۔ پہلی گاڑی کے اندر بخششوں کی۔ پی اور ہم سب نے خود اپنی آنکھوں سے بیٹھنے دیکھا اور ہمارا سہادم بھی جاتا رہا۔ اتنے میں اچانک کسی دوسری جانب سے کسی محافظ نے زوردار سیٹی بجائی اور ہم سب کی چھینی نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ میں نے اس وقت پر اور اس گھڑی پر لعنت بھیجی جب ہم نے اسفر کی باتوں میں آکر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر یہکہ ہم اندر ہیرے میں آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر دیکھتے رہے کہ آس پاس کوئی محافظ تو نظر نہیں آ رہا۔ کافی درستک ہم دور گھڑے حصہ ہیوں کے کو گاڑ بھج کر دیکھ رہے بعد میں وہ کسی سوکھے درخت کا تنا لگا۔ وقت دیر ہے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا لہذا ہم نے نام اللہ پڑھی اور سب سے پہلے فیصل نے خاردار تار کا پل صراط اس کے نیچے سے گزر کر پار کر لیا۔ ہم میں سے ایک نے تار کو کھینچ کر پکڑے رکھا اور باقی تین دوسری جانب سرک آئے۔ اب اس جانب صرف آصف بھٹی رہ گیا تھا۔ اس نے جب تار کے نیچے سے سر کنے کی کوشش کی تو درمیان میں ہی انک گیا کیونکہ وہ خود تو شاید نیچے سے نکل بھی آتا لیکن اس کی موٹی تو نہیں اس سے سر کنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہم تینوں نے کسی نہ کسی طرح سمجھنے کا بحث کرنے کے اے دوسرا جانب گھیست ہی لیا لیکن اس کوشش کے دوران ہمارے ہاتھوں میں اور بھٹی کی تو نہ میں خاردار تارکے جانے کتنے کا نہ پوست ہو گئے۔ بھٹی کو گھٹیئے کے بعد کئی منٹ ہم چاروں ہی زمین پر لیٹے ہائپتے ہوئے اپنا سانس درست کرتے رہے۔

وورکولنار کی سڑک پر رات کو گزرنے والے ٹرکوں کا قافلہ گزرتا نظر آ رہا تھا۔ ہمارا کیڈٹ کالج ایک ایسے ویرانے میں واقع تھا جہاں رات تو کیا، دن کے وقت بھی ٹرک یا بس ڈرائیور تھا گزرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ اس فر نے جس چھپر ہوٹل کا ذکر کیا تھا وہ دوسروں کو آگے چل کر ملانے والی اسی مرکزی شاہراہ پر کہیں واقع تھا۔

کچھ دیر تک تو ہمیں خود بھی یقین نہیں آیا کہ ہم چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ سہی لیکن کیمپس کی سخت گیر فضائے باہر کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ اس سرشاری کے نئے میں ہم چند لمحوں کے لیے تمام خطرات کو بھلا بیٹھے اور ہم نے آس پاس کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتے ہوئے سڑک کی جانب سر پٹ دوز لگادی کچھ دیر بعد ہم روڑ پر تو پہنچ گئے لیکن یہ کیا؟ وہاں تو وورکولنک نے تو کوئی چھپر تھا اور وہ ہوٹل۔ ہم سب نے قہر آلو نظرؤں سے اسفر کی جانب دیکھا۔ اس فر کو تمیں کھانے لگا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے وہ ہوٹل بیٹھیں کہیں دیکھا تھا۔ قریب تھا کہ ہم تینوں اپنے جوتے اتار کر اس کی تواضع شروع کر دیتے کہ اچانک کہیں دور سے ریڈ یوپر گانے بختے کی آواز سنائی دی۔ ہم چاروں کے کان کھڑے ہو گئے اور ہم نے آواز کی جانب نظریں دوزائیں۔ پہلے ہوابند تھی اور اب اس سمت میں چلنے لگی تھی شاید اسی لیے ہمیں دور بخت ریڈ یوکی آواز سنائی دے گئی۔ ڈور بلکی سی روشنی چھکتی نظر آرہی تھی جیسے کسی نے کسی بانس وغیرہ کے اوپر لاثین ٹانگ رکھی ہو۔ ہم نے اس طرف چلنا شروع کر دیا لیکن ہم مرکزی سڑک سے ہٹ کر کچھ میں چلتے رہے کیونکہ سڑک پر کوئی بھی کیمپس کی طرف جاتی ہوئی گاڑی سے ہمیں دیکھ لکھتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں جب ہم روشنی کے قریب پہنچنے تو اسفر کی جان میں جان آئی۔ یہی وہ چھپر ہوٹل تھا جس کے بارے میں اس فر نے ہمیں بتایا تھا۔ ہوٹل کے مالک کا نام جاؤ تھا اور ہم نے اسی دن اس چھپر ہوٹل کا نام ”جانو شیرشن“ رکھ دیا تھا۔ جانو نے ہمیں دیکھ کر ریڈ یوکی آواز کم کی اور چھپر کے باہر بچھی ہوئی چار پائی سے اتر آیا۔ ریڈ یوپر نیزہ نور دعوے کر رہی تھی کہ

”اے جذبہ دل گرمیں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے“

لیکن شاید ہمارے جذبوں میں ہی کچھ کمی تھی۔ جانو نے ہمیں بتایا کہ آج تو شہر سے مرغیاں سپلائی کرنے والے ٹرک ہی نہیں آیا لہذا اس کے ہوٹل کے برتن خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک پل میں ہمیں یوں لگا کہ ہمارے سارے پنے کرچی کرچی ہو گئے ہیں۔ ہمارے لئے چھرے دیکھ کر جانو سے رہا نہیں گیا اور وہ جلدی سے بولا۔

”لیکن کیڈٹ سائیں اندھے تو پڑے ہیں، آپ کہو تو ابھی پیاز غماڑاں کر زبردست کالی مرچ والے تین چار آمیٹ بنادوں؟“ ہم سب کے چھرے کھل اشے۔ چلو مرغی نہ سہی، مرغی کے اندھے ہی سہی۔ کچھ ہی دیر میں جانو نے آمیٹ تیار کر کے فر انگک پین (فرائی پان) ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں تندور والا تندور گرم کر کے گرم گرم چکلے نالانا شروع کر چکا تھا۔ ہم نے جانو سے کہا کہ ہمارے پاس یہاں

کھانے کا وقت نہیں ہے لہذا وہ ہمارا کھانا ”پارسل“ میں بنا دے۔ پہلے تو جانو نے وہی انکار کر دیا کہ اس کے اس پارسل ناٹی کوئی ڈش ہے ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کسی چیز میں کھانے دے دے جسے ہم اپنے ساتھ کیمپس لے جائیں لیکن اس نے کہا۔

”سائیں.....ابھی تم ادھر سے اتنی دور یہ اندھہ فراہی لے کر جائے گا تو اس کا تو سارا مزہ کر کر ہو جائیں گا۔ ورنہ ادھری بیٹھ کر ”مفت“ کرو۔ ہم نے توروئی بھی لگوادیا ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس کے کہنے کی دیری ہی تھی کہ اگلے ہی لمحے ہم چاروں چار پائی پر بیٹھے آملیٹ پر ٹوٹ پڑے تھے، کیونکہ خود ہمارا بھوک سے بے حد بر حال تھا۔ جانو نے ہمیں ساتھ کھانے کے لیے اچار اور دو پھر کی بھی ہوئی لسی بھی دی۔ ہم کھانے پر اس طرح ٹوٹے ہوئے تھے کہ ہمیں آس پاس کا بھی کوئی ہوش نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں بھٹی نے اپنے آخری نواں سے پورا فراہی پین صاف کرتے ہوئے وہیں چار پائی پر اپنی نائلگیں سیدھی کر لیں۔ وہ اتنا کھا چکا تھا کہ اب اس سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پیٹ کی بھوک مٹی تو ہمیں کیمپس کا خیال آیا۔ ہم نے جانو کو پیسے پکڑائے اور اپنے کیمپس کی چار دیواری کی جانب دوڑ لگائی۔ بھٹی بار بار پیچھے رہ جاتا اور ہمیں آوازیں دے کر رکنے کی وحایاں دیتا لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اس کے بوجھ کو بھی اپنے ساتھ ڈھوتے ہوئے خاردار تاریک پیش ہی گئے لیکن اندر ہیرے میں ہم سے اندازہ غلط ہو گیا تھا اور یہاں جس جگہ ہم پہنچے تھے، تاریخی طرح آپس میں جزوی ہوئی تھی جس کے اندر سے ہمارا پاکر جانا ناممکن تھا۔ ہم چاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم نے جلدی سے خاردار تاریکی باڑھ کے ساتھ ساتھ دوڑ لگا دی تاکہ کہیں سے تھوڑی ہی بھی اندر جانے کی گنجائش نظر آئے تو ہم کراس کر جائیں۔ اتنی دیر میں دوسرے پھرے والی گاڑی کی ہیڈ لائنس چمکتی نظر آئیں اور پیچھی جانب سے دو کہیں اندر ہیرے میں دوسری جانب کے گاڑے نے شاید گاڑی کی روشنی دیکھ کر زوردار سیئی بجائی۔ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ اب ہمارا گاڑی کی روشنی سے پچانا ناممکن تھا۔ اس پاس کوئی اوٹ بھی نہیں تھی اور اگر پیچھی جانب بھاگتے تو وہاں کے گاڑے بھی روشنی دیکھ کر چوکے تھے لہذا ان کی ہم پر نظر پڑنا لازمی تھی۔ بھاگ کر میدان کی پری جانب بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ درمیانی فاصلے کو پار کرنے سے پہلے ہی ہم کوئی آڑھنے ہونے کی وجہ سے پھرے والی گاڑی کی روشنی تیز پھر پیچھے دو کہیں موجود گاڑوں کی نظروں میں آ جاتے۔ ہمارے پیسے بری طرح سے چھوٹ رہے تھے اور اپنی گرفتاری ہمیں صاف نظر آ رہی تھی کہ اتنے میں اچاک فیصل زور سے چلا یا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”وہ رہا باڑھ کا سوراخ.....“
در اصل کثی ہوئی باڑھ کے آگے پیچھے کسی نے اسے عملے کی نظر سے بچانے کے لیے جہاڑیاں اس طرح کاٹ کر کھی ہوئی تھیں کہ پہلے ہم اس کے سامنے سے ہی گزر گئے تھے لیکن ہماری اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا تااؤ اور سب سے پہلے بھٹی کو اس کی توند سیست پار کر کر دیا، دوسرے ہی لمحے اس فر پھر میں اور آخر میں فیصل باڑھ کی دوسری جانب سرک چکے تھے اور جیسے ہی بھٹی نے تارا پسے ہاتھ سے چھوڑی اس لمحے پھرے والی گاڑی (جسے بعد میں ہم نے ”چاند گاڑی“ کا خطاب دے دیا تھا) ہمارے سامنے سے دھیرے دھیرے سیٹیاں بجائی گز رگی۔ ہم چاروں بنا وقت ضائع کیے اگلے ہی لمحے کیمپس کی جانب اڑے جا رہے تھے اور جس وقت ہم کیمپس کی کھبوں سے چھکلتی روشنیوں کے پیچے آئے تب ہم نے اپنی رفتار دھیسی کر لی۔ اسی وقت دو کہیں رات کی دوسری پریپ شروع ہونے کی سیٹی سنائی دی۔ ہم سر ایسے ہو کر ہوش کی جانب دوڑے اور یہ دیکھ کر ہماری تو جان ہی نکل گئی کہ ہمارے

ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کھڑے کسی بات پر چند سینٹر کیڈس کو ڈانٹ رہے تھے۔ ہم چاروں نے ایک ایک کر کے ان کی پشت سے اندر رکھنے کی کوشش کی۔ اس سفر اور فیصل تو کامیاب ہو گئے لیکن تیرے نمبر پر جب بھی گزرنے کی کوشش میں تھا تو وہ ہائل کے گرد بنے ہنگلے کے اوپر کھے گملے سے نکلا گیا اور اس کے پیچھے میں جو سر جھکائے اپنی جھوک میں بڑھا چلا آ رہا تھا، بذات خود بھی سے زور سے نکل رکا۔ فہد صاحب چونکہ کر پلے اور غصے میں گرجے۔

"یہ کیا جو کروں والی حرکتیں کر رہے ہو تو تم دونوں اور اتنی دیر ہاوس سے باہر کر کیا رہے ہو ادھر آؤ فوراً " میں نے قہر آلو نظروں سے اس موٹے بھٹی کو دیکھا جس کی وجہ سے ہم دونوں کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ ہم دونوں سر جھکائے ہم صومعی صورت بنائے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

کتاب گھر کی پیشکش

"کہاں سے آ رہے ہو اس وقت اور یہ کیا حیلہ بنارکھا ہے ؟"

بھٹی کے مند سے کچھ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ "جی وہ دراصل شیرن وہ جانو "

میں نے دل ہی دل میں اللہ پڑھی۔ اس موٹے نے تو ایک ہی جھاڑ میں سارے کاسارا بھاٹا اپھوڑ دینے کی مخان لی تھی۔ فہد صاحب زور سے گرجے۔

"کیا اول فول بک رہے ہو یہ جانو کون ہے ؟"

کتاب گھر کی پیشکش

"مرہم جائیں "

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

فہد صاحب ہمیں بھول کر ان کی جانب پلے۔

"ہاں جاؤ لیکن یاد رکھو کہ خبردار آئندہ اگر کسی نے گیز نام میں دیر سے پہنچ کی کوشش بھی کی تو ایجاد نہ سے کہہ کر سات دن کے لیے گرم دھوپ میں مرغا بنوادوں گا۔ چلو اندر جا کر پڑھو "

سینٹر کیڈٹ دم دبا کر اندر بھاگ گئے۔ فہد صاحب ہماری جانب پلے، ہمارا خون رگوں میں مخدود ہونے لگا۔ وہ زور سے گرجے۔

"اور تم دونوں بھی تک یہاں کیا کرو رہے ہو چلو اندر جاؤ پر یہ پرشروع ہو چکی ہے اور خبردار جو آئندہ کسی جانو کے ساتھ اتنی دیری۔ وہی روم میں بیٹھے میں تم لوگوں کاٹی۔ وہی دیکھنا بند کروادوں گا "

ہم دونوں جو جانے کب سے دل میں جل تو جلال تو کا اور دکر رہے تھے اس تیزی سے اندر کو دوڑے جیسے ریس میں گھوڑے فائر کی آواز پر دوڑتے ہیں اور اپنی اپنی کرسیوں پر ہی بیٹھ کر ہم نے دوسرا دم لیا۔

یہ ہماری زندگی کا پہلا "بنک" Bunk تھا۔ اس بنک نے ہمیں زندگی کی تلخ حقیقوں سے فرار کے چند ایسے گرتا دیے تھے جو زندگی میں ہمیشہ ہمیں دال بزری سے نظریں چڑک رہائی مرغی کی آس میں بنک پر مجبور کرتے رہے۔ ہمارے یہ بنک آج بھی جاری ہیں اور شاید ہم چاروں ہی آج تک زندگی کی حقیقت سے نظریں چڑک رہے ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش اپل

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

طاہر بھائی کے قتل کو چھ مینے گز رکھتے تھے لیکن راجہ کو ابھی کل کی بات ہی لگتی تھی۔ ایسے لگتا تھا اس ایک موت کے ساتھ ہی سارے محلے کی خوشیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں۔ آدمی بھی اپنے فوجی کالج جا کر پھنس ہی گیا تھا۔ راجہ اسے ہر بہتے لمبے خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ بلکا کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی جب بوجھ زیادہ ہی بڑھ جاتا تو وہ ریگل سینما جا کر کوئی انگلش فلم دیکھ آتا یا پھر بالے کے ساتھ کل کراپنی یا اس کے گھر کی چھت پر بیٹھ کر کسی نئے برانڈ کا کوئی سگریٹ آزمایتا۔ لیکن عادی کے بغیر اسے کہیں بھی مزہ نہیں آتا تھا۔ اس دن بھی اس نے وقت گزاری کے لیے اپنے گھر کے گودام سے وہ سارے لکڑی کے بڑے بڑے ڈبے نکال کر صحن میں لا کر رکھ دیئے جس میں وہ اور آدمی مل کر سرد یوں کی چھیبوں میں کہانیاں خرید خرید کر مجمع کرتے تھے تاکہ پھر سارا سال وہ دونوں مل کر وہ کہانیاں پڑھ سکیں۔ ان لکڑی کے بکسوں میں ان دونوں کی پہلی جماعت سے لے کر اب تک کی تمام جم جمع کردہ کہانیاں پڑھی ہوئی تھیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

راجہ سب بکس ایک کر کے کھول رہا تھا اور پرانے دن یاد کر رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دھیان اپنے پیچھے برآمدے میں بیٹھیں سکینہ خالہ اور اپنی اماں کی باتوں کی جانب بنتا چلا گیا۔ سکینہ خالہ آج پورے تین مینے بعد اس کی اماں کے بے حد اصرار پر چند لمحوں کے لیے اپنے گھر سے نکل کر راجہ کے ہاں آئیں تھیں اور راجہ کی اماں کو بتا رہی تھیں کہ وہ تو آپی کی پڑھائی تقریباً بالکل ہی چھوٹ پچکی ہے، لاکھ پڑھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن پچھے پڑھانہ نہیں جاتا۔ یہاں پڑھنے بیٹھتی ہیں اور وہ آنسو شپ پاں کی آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ غیاث چچا کے سارے خواب ایک ایک کر کے مٹی میں ملتے جا رہے ہیں۔ اب تو انہوں نے بھی باقی ہر آس چھوڑ دی ہے۔ ان کی اب بس ایک ہی حسرت ہے کہ ان کی بیٹی خوش رہے۔ سکینہ خالہ نے یہ بھی بتایا کہ خاندان واؤں نے ابھی تک ان کے گھر انے کا بیکاٹ ختم نہیں کیا۔ وہ اس سارے واقعے کا ذمہ دار تو آپی کی ذات کو سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے اس پورے خاندان کی عزت عدالتوں میں اچھائی لگتی تھی۔

اٹو کا کیس ابھی تک عدالت میں اپل کے لیے لگا ہوا تھا۔ سکینہ خالہ دراصل آج راجہ کی اماں کے پاس غیاث چچا اور وہ آپی سے چھپ کر کچھ اور درخواست کرنے بھی آئی تھیں۔ انہوں نے راجہ کی اماں سے کہا کہ اب انہیں خاندان سے ڈھوآپی کے لیے کسی مناسب رشتے کے آنے کی امید رکھا کم ہے رہ گئی تھی۔ لہذا وہ چاہتی تھیں کہ اگر راجہ کی اماں کی نظر سے کوئی بھی اچھا خاندان یا اچھا لڑکا گزرے تو وہ آپی کو ضرور اپنے دھیان میں رکھیں۔ یہ سب کہتے ہوئے سکینہ خالہ کی آنکھیں بیگنگیں۔ راجہ کی اماں نے جلدی سے اٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں تسلی دی کہ وہ صرف خالہ کی ہی نہیں، ان کی بھی بیٹی ہے۔ لہذا سکینہ خالہ کو یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سکینہ خالہ کو اس بات کا بھی بے حد حق تھا کہ عدالت اٹو

کے کیس میں نہ جانے ایلوں پر اتنا وقت کیوں لگا رہی تھی۔ کیونکہ ہر پیشی پر افواہوں کا ایک طوفان پھر سے برپا ہو جاتا تھا اور اخبارات اس کیس کو پھر سے اس طرح اچھا لئے تھے کہ پہلے سے ہی رستے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ عدالت نے جو بھی فیصلہ دینا ہے اب دے دے تاکہ یہ روزہ کی سولی جس پر ان کے پورے خاندان کو ہر پیشی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اُس سے تو ان کی جان چھوٹے۔ لیکن افسوس قدرت کے فیصلے صرف انسانوں کے چاہنے اور نہ چاہنے کی بیانوں پر ہی ہونے لگتے تو پھر رونا ہی کس بات کا رہ جاتا؟

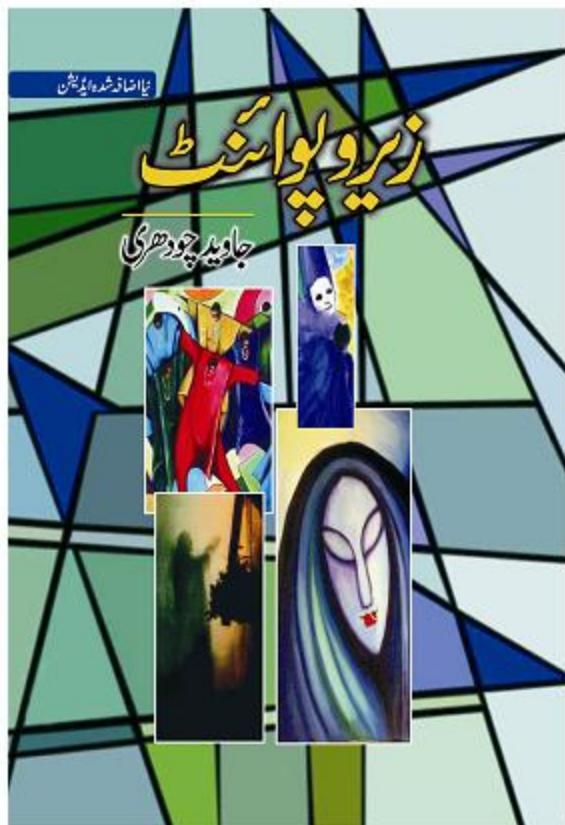
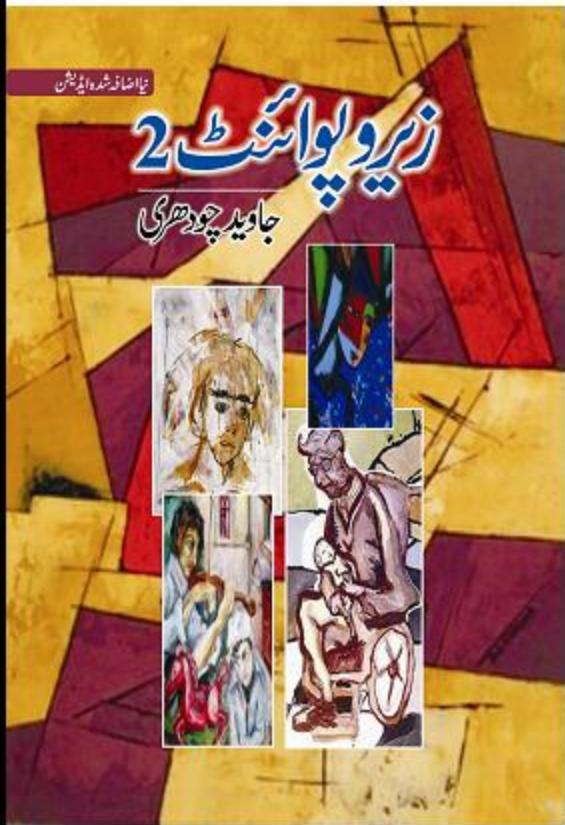
<http://kitaabghar.com>

فوقاًپی کے رشتے کی تلاش کی بات سن کر راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اُس نے سوچا کہ آج رات ہی بینچ کروہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھے گا کہ فوقاًپی کی اماں کے کیا ارادے ہیں۔

شام ہوتے ہی تمام دوستوں کی برگد کے پیڑ کے نیچے ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں مستقبل کے لائچ عمل طے کیا گیا اور سب نے یہی طے کیا کہ پہلی فرصت میں راجہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھ کر تمام صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔ لہذا رات ہوتے ہی راجہ نے کانڈ قلم سنبھالا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔

<http://kitaabghar.com>

.....”پیارے آدی۔“



کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چھاپ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے بیٹے جب راجہ کا خط مجھے ملا جس میں اس نے قوآپی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے والی بات لکھی تھی تو نہ جانے کیوں میرا دل ڈوب سا گیا۔ تو کیا ب وہ آپی ہمیشہ کے لیے ہمارے محلے سے وورچلی جائیں گی۔ کیا ان پر میرا ”حق“ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ نہ جانے ان کا ہونے والا میاں کیا شخص ہو.....؟ جانے وہ مجھے ان سے ملنے دے یا نہیں.....؟ اس طرح کے جانے کتنے سوال اور جانے کتنے خیال میرے دل و دماغ میں پھیتے رہے اور پھر اس کے بعد راجہ کا جب بھی کوئی نیا خط آتا تو اسے کھولتے ہوئے میرے ہاتھ لرزنے لگتے کہ اس میں کہیں قوآپی کی شادی کی خبر نہ ہو۔

لیکن وہ خبر کبھی نہ آئی ہم آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات سے گزر کر نویں جماعت میں آچکے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر کی بجائے ہماری پوری کلاس کو شماں علاقہ جات کی سیر کے لیے بھیج دیا گیا۔ نویں جماعت کے پہلے چھ مہینے مضمایں ایک دن سے بدلتے کی وجہ سے مجھے بہت مشکل ہوئی لیکن اس بار میں اکیلانیں تھا۔ پوری جماعت ہی فریکس، کیمسٹری اور بائیکی، زد لو جی کے پھرسرے میں پڑی ہوئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ مضمایں بھی ہماری گرفت میں آتے گئے۔ درمیان میں ہمارے احکاڑا ”بک“ اور ڈاکٹرنوگی جعلی پر پچھی خیریت سے ہی چل رہی تھی، لیکن وہ کسی نے کہا ہے تاکہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ”لہذا ہمارے بُرے دن بھی قریب تھے۔ اور ایک بار پھر ہمارا بھانڈا پھوڑنے والوں میں بھٹی سرفہرست تھا۔

ہماری پرچی اس وقت تک کرارے نوٹ کی طرح چلتی رہی جب تک یہ راز میرے، اسفو اور فیصل کے درمیان رہا۔ ہم سب اس دن کو کوستے تھے جب اس فیصل اور مجھے پوچھنے بنا آصف بھٹی پر ”رس“ کھا کر اسے اپنے راز میں صرف مبلغ دس روپے کے عوض شامل کر لیا تھا۔ اس شام میں اس فیصل، گیمز Games کے بعد ہاٹل کی پہلی منزل پر واقع اپنی ڈارمیٹری کے باہر راہداری میں کھڑے ہو کر نیچے سڑک پر آتے جاتے کیڈس کو پیر کھا کر اس کی گلکنیں مار رہے تھے۔ اتنے میں ہماری نظر نیچے سے لنگڑا کر گزرتے بھٹی پر پڑی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ فٹ بال کھیلتے ہوئے پیروں میں موج آگئی ہے اس لیے ڈاکٹرنو کے پاس گیا تھا لیکن اس ظالم ڈاکٹر نے صرف درد کی دو گولیاں دے کر بھٹی کو تر خادیا تھا۔ بھٹی اس بات کو رہا تھا کہ صبح وہ پریڈ پر کیسے جا پائے گا؟؟

اس فر نے بھٹی کو پیش کش کی کہا اگر وہ دس روپے ابھی نقد نہیں ادا کرے اور کیشین لے جا کر چائے سمو سے سے ہماری تواضع کرے تو ہم اس کی یہ مشکل پل بھر میں ختم کر سکتے ہیں۔ فیصل نے اس فر کو گھنی مار کر کئی مرتبہ چپ کروانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہماری ایک نہیں سنی اور آخر کار

ہم پندرہ منٹ بعد کینٹین میں بیٹھے سو سے اور چائے "زہر ماڑ" کر رہے تھے۔ اور اگلے دن موٹا بھٹی پر یڈ پر جانے کی بجائے اپنے بستر پر پڑا خڑائے لے رہا تھا۔ اس فر کے دل میں لاٹھ سما گیا تھا۔ اگلے تین دن میں اس نے ایک دن کے ریسٹ Rest کا بھاؤ دس روپے مقرر کر دیا۔ ہماری نویں جماعت کے کیڈٹ "جوئی درجوق" ہمارے عطاں کیلینک سے پر یڈ ریسٹ، یگم ریسٹ اور کلاس ریسٹ کی پرچی لینے کے لیے آنا شروع ہو چکے تھے اور ہماری شہرت ہمارے ہائل سے نکل کر باقی ہاؤسز میں بھی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ فیصل کوڈاکٹرنو کی تحریر اور مجھے اس کے وسخنط کی اتنی پرکشیں ہو چکی تھیں کہ اب ہم آنکھیں بند کر کے ریسٹ (آرام) کی پرچی بنا سکتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ہم "مالا مال" ہو چکے تھے اور اب ہم شیرٹن والے جانو سے اُدھار مرغیاں کھانے کے بجائے اس کے پاس اپنا باقاعدہ اکاؤنٹ کھلوا چکے تھے جس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پیسے ضرورت سے زیادہ ہی پڑے رہتے تھے۔ زندگی کتنے چین سے کٹ رہی تھی لیکن پھر ایک دن اچانک ہماری "خوشیوں" کو کسی کی نظر لگتی ہی گئی۔

ہم نے شروع میں ہی طے کر لیا تھا کہ ایک وقت میں پانچ پرچیوں سے زیادہ نہیں بنا سکیں گے تاکہ پہنچ آفسرز کو شکنہ نہ ہو، کیونکہ پر یڈ پر گلتی کر کے رپورٹ سی۔ پی۔ اس کے پاس جمع کروانا پی۔ او کی بھی ڈیوٹی میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن جب ہماری جیبیں دس روپے کے نوٹوں سے بھرنے لگیں اور آس پاس کے دیگر ہائلز کے کیڈٹس بھی ہم سے "تعویذ" لینے آنے لگے تو ہماری احتیاط بھی دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھوں سے اپنا دامن چھڑانے لگی۔ اور رفتہ رفتہ ہم نے گفتی یاد رکھنا بھی چھوڑ دی کہ ایک دن میں کتنا تعویز بانٹے تھے۔

اس فر اور بھٹی "کیس"، ڈھونڈ کر لاتے تھے اور میں اور فیصل کیلینک سے تعویز جاری کر دیتے تھے۔ اپنے چلتے پھرتے کیلینک کا نام ہم نے "دلدار کیلینک" رکھ لیا تھا اور یہ ان کیڈٹس کی دلداری کے لیے تھا جنہیں ڈاکٹرنو کی چوکھت سے ہمیشہ ڈھنکا رہی ملتی تھی۔

جس صبح چھاپ پڑا، اس دن صرف ہماری بیرک میں ہی مجھ سمتی چار اور کیڈٹس خڑائے لے رہے تھے۔ جن میں موٹے بھٹی کے علاوہ اس فر، مجید چھوٹو اور شاروندو بھی شامل تھے۔ اچانک ہی ایسا لگا جیسے ہائل میں بھونچاں آگیا ہو، دروازے کھلنے لگے، شور جی گیا۔ فہد صاحب کے چینچنے چلانے اور دروازے دھڑ دھڑانے کی مخصوص آوازوں سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ اس فر نے آؤ دیکھا نتا و اور بستر سے کوکڑا ریمیٹری کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا اسی لمحے دروازہ کھلا اور دروازے کے پیچوں نیچ فہد صاحب اور سی۔ پی۔ اونکھو چند دیگر پی۔ اوز کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔

ہم سب سے پوچھا گیا کہ ہم پر یڈ پر کیوں نہیں گئے۔ ہم سب نے بیک وقت اور بیک زبان بتا دیا کہ ہمیں ڈاکٹرنے ریسٹ دیا ہے۔ ہم سب کی پرچیاں ضبط کر کے ہمیں پر یڈ گراڈنڈ پکنچنے کا حکم دیا گیا۔ فہد صاحب جس دروازے کے سامنے کھڑے احکامات صادر کر رہے تھے، یعنی اسی کے پیچھے اس فر چھپا ہوا تھا۔ فہد صاحب پلٹ کر نکلے ہی واٹے تھے کہ اس فر کے دامن نزلے نے کام دکھایا، اس نے اپنی چھینک کو تو کسی نہ کسی طرح گھونٹ دیا لیکن اس کوشش میں دروازہ ہلکا سامنے گیا۔ فہد صاحب کے بائیوک کان فوراً کھڑے ہو گئے اور انہوں نے چلا کر کہا کہ دروازے کے پیچھے جو بھٹی چھپا ہے فوراً بہر نکل آئے لیکن کوئی ہلکی نہیں ہوئی۔ فہد صاحب دوسرا بار چلا آئے لیکن اس فر پھر بھی اپنی جگہ سے لس سے مس نہ ہوا، فہد صاحب شدید غصے میں آگے بڑھے اور انہوں نے دروازہ کھولے بغیر اسے اسی جانب زور سے دھکا دیا جہاں پیچھے اس فر چھپا ہوا تھا اور تین چار مرتبہ دروازے کو زور سے دبا کر ایک دم سے اپنی جانب کھولا تو اس فر دروازے کے پیچھے سے یوں سیدھے میدھے زمین پر گرا جیسے کوئی درخت لٹنے کے بعد زمین پر گرتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں ہمیں پریڈ گراونڈ پہنچا دیا گیا جہاں ہم سے پہلے ہی ہماری ہی پرچی دیے ہوئے تقریباً اٹھارہ کیڈٹ موجود سر جھکائے کھڑے تھے۔ ڈاکٹرنو کو ایک جانب ایجمنٹ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہمارے ہوش پہلے ہی اڑ چکے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ہماری ”کارگیری“ کپڑی گئی ہے۔ ڈاکٹرنو کو اپنی میڈیکل سلیپس Medical Slips کی تصدیق کے لیے بلایا گیا تھا۔

پہتہ یہ چلا کہ جب اچا کنک ہی کچھ دنوں سے کیڈٹس کچھ زیادہ ہی پیارہ بننے لگے اور خاص طور پر نویں جماعت کے بیک وقت دو دو روز جن کیڈٹ پریڈریسٹ، پر جانے لگے تو انتظامیہ کو تشویش ہوئی اور ڈاکٹر سے دریافت کیا گیا کہ نویں جماعت کے کیڈٹس کے اتنے زیادہ کیڈٹس کو ریسٹ دینے کی وجہ کیا ہے تو ڈاکٹرنو نے بڑی حیرت سے جواب دیا کہ اس نے تو صرف تین کیڈٹس کو پچھلے ایک بھتی میں پریڈ سے ریسٹ Rest دیا ہے اور ان کے نام بھی ڈاکٹر کے اپنے رجسٹر کے ریکارڈ میں درج تھے۔ انتظامیہ نے اسی وقت ڈاکٹر کو پریڈ گراونڈ پہنچنے کا حکم دیا اور تمام چھ کے چھ ہائلز سے نویں جماعت کے تمام بیمار کیڈٹس کو اٹھا کر شناخت پریڈ کے لیے پریڈ گراونڈ پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہماری پرچیاں ڈاکٹرنو کے سامنے رکھ دی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو ڈاکٹرنو خود بھی چکرا کر رہا گیا کہ یہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرچیاں میں یا پھر کسی کی بنائی ہوئی نقل۔ وہ کافی دیر تک محبد عدے کی مدد سے ہماری بنائی ہوئی اور اپنے ہاتھ کی تازہ لکھی ہوئی تحریر کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے اپنا سراپنے دنوں ہاتھوں میں قائم لیا اور چکرائے ہوئے لمحے میں بولا کہ اگر اس کے اپنے ریکارڈ کے رجسٹر میں اندر اج نہ ہوتا تو وہ ان سب پرچیوں کو ہی اصلی قرار دیتا، لیکن بھر حال اس کے اپنے ریکارڈ کے حساب سے جناح کے دو اور لیاقت ہاؤس کے ایک کیڈٹ کے علاوہ باقی تمام نویں جماعت کے کیڈٹس کے ریسٹ کی پرچیاں جعلی ہیں۔ ہماری فوجی تربیت کے حصے کا تمام تر کنشول آری کے کسی سینزر پکستان یا مجمھر یونک کے افسر کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ جسے ایجمنٹ Adjutent کہا جاتا تھا اور جس کے نیچے سی پی او اور پھر مزید نیچے پی او ز (SOP) کی ایک فوج ہوتی تھی جو فوجی تربیت مثلاً پریڈ پی ائی، ایکسراڈرل، پریڈ یونیفارم، رائیڈنگ، سوئنگ اور دیگر روٹین کی غرائب کرتے تھے۔ عام طور پر کوئی معاملہ سی پی او تک بھی بہشکل ہی پہنچتا تھا کیونکہ پیئی آفیسر خود ہی کیڈٹ سے نسبت لیتے تھے لہذا ایجمنٹ کے پاس تو کوئی شکایت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہمارا معاملہ سیدھے سمجھا ایجمنٹ کی عدالت میں بھیج دیا گیا کیونکہ سی۔ پی۔ او اور پی۔ او ز کی عقل نے ہی جواب دے دیا تھا۔ لہذا اس وقت ہم 23 نومبر نویں جماعت کے کیڈٹ ایجمنٹ کے سامنے کھڑے تھے اور وہ ہم پر بڑی طرح برس رہا تھا کہ اگر ہم نے اگلے پانچ منٹ میں یہ نہیں بتایا کہ یہ کس کی کارگیری ہے تو وہ ہم سب کو آٹھاٹنگ دے گا جہاں سے پھر ہمارے گھروالے ہی آکر ہمیں نیچے آتائیں گے۔ ہم سب خاموش کھڑے اس کی دھمکیاں سنتے رہے۔

پھر اس نے ہم سب کے ہاتھ میں ایک ایک کانٹا اور قلم کپڑا دیا اور ہم سب سے کچھ لکھنے کو کہا۔ سی۔ پی۔ او نے ایجمنٹ کے کان میں کچھ کہا۔ ایجمنٹ نے سرہلا یا۔ سی۔ پی۔ او نے جھڑک کر ہم سے کہا کہ ہم تیزی سے دس دس مرتبہ اپنے کاغذ پر یہ جملہ لکھ کر اس کے حوالے کرویں۔ جملہ تھا۔

”کیڈٹ..... کو یہاں کی وجہ سے 3 دن کا پریڈریسٹ دیا جاتا ہے۔“ ہم سب نے فوراً یہ جملہ لکھ کر کی۔ سی۔ پی۔ او کے حوالے کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ہماری تحریر کا جائزہ لینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے فیصل اس چھاپے میں نہیں کپڑا گیا تھا جس کے ہاتھ کی یہ تحریر ہر پرچی پر موجود تھی۔ میں تو ڈاکٹرنو کے دستخط ثابت کرنے میں ماہر تھا اور اس وقت ان لوگوں کا سارا دھیان صرف تحریر کی جانب تھا۔ کچھ دیر تک

ایم جو ٹینٹ اور سی۔ پی۔ او ہماری تحریروں کا جائزہ لیتے رہے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ایم جو ٹینٹ کو غصہ آگیا اور اُس نے سی۔ پی۔ او کو حکم دیا گیا کہ ہم ساروں کو روزانہ دو پہر تین سے پانچ بجے تک تھی دھوپ میں اسی پر یہ گراڈنڈ میں رائق اور کمر پر بندھے بوجھ کے ساتھ اس وقت تک دوڑایا جائے جب تک ہم یہ بتانے دیں کہ یہ پر چیان کس نے جاری کی ہیں۔ اس نے ہمیں یہ لالج بھی دی کہ جس کیڈٹ نے یہ اطلاع دے دی اس کی سزا معاف کر دی جائے گی۔ کیڈٹس میں سے اگر کوئی چاہے تو وہ خفیہ طور پر سی۔ پی۔ او کے دفتر میں آ کر خبری کر سکتا ہے۔

اگلے تین بھت شاید ہماری زندگی کے سخت ترین مشقت بھرے دن تھے، ہم سب کوچ کے بعد ایک شڑاڑل کی ڈانگریاں پہنچا کر پر یہ گراڈنڈ کے سخت پھر لیے گراڈنڈ میں پہنچا دیا جاتا جو بچا سڑگری گرم دھوپ سے تپ کر تندور بن چکا ہوتا تھا۔ چینی آفسرز کی فوج ہمیں ”رگڑا“ دینے کے لیے وہاں موجود ہوتی، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی سخت سزاوں کے باوجود تمام کیڈٹس میں سے کسی نے بھی اپنی زبان نہیں کھوئی۔ ہمارے رنگ دوسرا ہی بھت پک کر کردن، ہوچکے تھے اور پھر لیے فرش پر قلا بازیاں کھانے کی وجہ سے جنم کا کوئی حصہ باقی نہیں بچا تھا جہاں پھرلوں کے ریزے پھٹھنے کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہنے والے نہ بنے ہوں۔ میں نے اور اسفر نے دوسرے بھت فیصلہ کر لیا کہ ہم خود ہی جا کر ایم جو ٹینٹ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ ساری کارست انی صرف ہم دونوں کی تھی، الہذا باقی کیڈٹس کو ہمارے جنم کی سزا نہیں جائے لیکن جب ہم جانے لگے تو موٹے بھٹنے نے باقی کیڈٹس کو بتا دیا کہ ہم جنم کا اقرار کر کے سزا اپنے سر لینے جا رہے ہیں تو ان سب نے ہم دونوں کو گھیر لیا اور یہ وعدہ لے کر ہی چھوٹا کہ چھوٹیں گے تو سب ایک ہی ساتھ چھوٹیں گے ورنہ جب تک یہ سزا ملتی رہے گی سب ایک ساتھ ہی برداشت کریں گے۔ تیرے بھت کالج انتظامیہ کو ہم پر رحم آہی گیا اور ایک سخت وارنگ کے بعد ہماری سزا ختم کر دی گئی۔ لیکن ان تین ہفتوں نے ہم 23 تیس کیڈٹس کو دوستی کے ایک ایسے اٹوٹ رشتے میں پاندھ دیا کہ آئندہ آنے والی زندگی میں جب بھی ہم میں سے کسی پر بھی کوئی مشکل وقت آیا تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی دوسرا اس کی مدد و ضرور پہنچا۔ ان تین ہفتوں میں ہم نے اپنی کمر پر اتنا بوجھ اٹھایا اور بھاری رائقوں سے ہاتھ اور پرائھا کر ہم اتنا بھاگے کہ آئندہ زندگی میں ہم آپس میں کسی بھی بھاری سے بھاری بوجھ کو بانٹنے کے لیے تیار ہوچکے تھے۔ اس سزا نے کیڈٹ کالج میں دی جانے والی ہر سزا کا خوف ہمارے دلوں سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

رشتوں کے ریشم

رُفت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ..... رشتوں کے ریشم جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر درستیاب ہے، جسے افسانے یکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

رشته

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

بالآخر انہوں کی آخری اپیل بھی سب سے بڑی عدالت سے مسترد ہو گئی۔ یہ برس سے پہلے غور پچانے آکر محلے میں سب کو سنائی۔ صدقیق

صاحب نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے ”چلو چھا ہوا..... خس کم جہاں پاک“.....

یہ سن کر قریب کھڑے راجہ اور گندہ کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اپنا کرکٹ کا کھیل چھوڑ کر سر کتے ہوئے بڑوں کے جمگھے کے قریب ہو

گئے۔ غور پچانے لمبی سی سانس بھری ”ہاں..... برا ظالم کیا اس کم بجنت نے..... لیکن ابھی اس کی چند سنائیں باقی ہیں۔ کیونکہ آخری عدالت کے بعد

اب صرف صدر مملکت صاحب ہی اس کی سزا معاف کر سکتے ہیں۔ انہوں اپیل لگوانے کی درخواست ضرور دے گا..... لیکن ایسے مجرموں کو صدر بھی کبھی

معاف نہیں کرتے..... ہاں البتہ کچھ دن مزید میل جائیں گے.....“ بڑے اپنی بحث میں مصروف ہو گئے۔ راجہ اور گندہ وہاں سے دور چلے آئے۔

راجہ کسی گھری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، ابھی کل رات ہی اس کی اماں راجہ کے ابا کو بتاری تھیں کہ وہ تو آپ کے خاندان سے تو خیر کی کوئی امید تھی

بھی نہیں..... البتہ باہر سے جو دو چار رشتے آئے تھے وہ بھی طاہر بھائی کی موت کی کہانی سن کر باہر ہی سے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ وہ تو آپ کے

ماں باپ اندر ہی اندر دن بدن گھلتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کی کوئی تدبیر کا رگرنہیں ہو پا رہی تھی۔ آج کل محلے کی رشتے کروانے والی خالہ اپنی سر توڑ

کوشش میں مصروف تھیں کہ کسی نہ کسی طرح کوئی اچھا برہاتھ آئے تو اس خاندان کی مشکلات کا کچھ ازالہ ہو۔ اسی رشتے والی خالہ نے آج کل کسی

دوسری رشتے کروانے والی عورت کی نشان دہی پر کسی لڑکے سے بات چلائی تھی۔ سنا تھا کہ لڑکا بالکل اکیلا تھا اور بہت بڑے کار و بار کا مالک بھی۔ سب

کچھ اپنی محنت سے بنا یا تھا اس نے۔ ماں باپ بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے لہذا گیرا جوں میں صح شام محنت کر کر کے اس نے اپنی پڑھائی جاری

رکھی اور آہستہ آہستہ اپنے بچپن کو کھڑا ہو ہی گیا۔ اب تو سنا ہے کہ کاروں کا بہت بڑا شوروم کھول رکھا ہے اس نے شہر کے مرکزی علاقے میں اور صبح

شام نئی گاڑی میں گھومتا پھرتا ہے۔ رشتے والی خالہ نے سینہ خالہ سے کہا ہے کہ غیاث پچا کے کان میں بات ڈالیں تو بات بڑھے، لیکن سینہ خالہ نے فی

حال رشتے والی خالہ سے کہا ہے کہ کچھ بخت مزید میل جائیں، پہلے یا انہوں کا الامالہ تو کسی صورت میل جائے پھر غیاث پچا سے کسی مناسب موقع پر

بات کر کے لڑکے کو دکھانے کے لیے کچھ ترکیب بھی ڈھونڈ دی لیں گی۔ لیکن رشتے والی خالہ نے جو عذر پیش کیا وہ بھی بے جانیں تھا جھلانا اچھا رشتہ

ہنا کسی وجہ کے کیونکر ان کی بیٹی کے انتظار میں نہ ہمارا ہے گا۔ اور آج کل تو ویسے بھی اچھے لڑکوں کا سمجھو کاں ہی پڑ گیا ہے۔ لہذا لڑکے کو روکنے کے لیے

کچھ آسرا تو دینا ہی ہو گا۔ سینہ خالہ کو اور تو کچھ سوچنا نہیں، بس وہ اور غیاث پچا سے چھپ کر تو کی ایک تصویر رشتے والی خالہ کو دے دی کہ کسی بھانے

لڑکے کو دکھاویں۔ رشتے والی خالہ نے واپس آکر بتایا کہ لڑکے کی تو نظریں ہی تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور اس نے خود رشتے والی خالہ کے

پاؤں پکڑ لیئے کہ کسی طرح سے بھی یہیں بات چلوادیں تو وہ ان کامنہ موتیوں سے بھروسے گا۔ مطلب یہ کہ لڑکا تواب سال بھرا نظار کرنے کے لیے بھی تیار تھا لیکن مسئلہ غیاث پچھا اور قوکی آمادگی کا بھی تو تھا۔
لیکن خالد نے رشتے والی خالد کو یقین دلا یا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ معرکہ بھی سر کرہی نہیں گی، اتنے دن بعد خالد سکون نے کچھ مل کے لیے رات کو سکون سے آنکھیں موندھی تھیں۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

لیکن خالد کو تو چین آگیا تھا لیکن راجہ کی نیند یہ سب کچھ سن کر ایک مرتبہ پھر اڑ چکی تھی۔ ایک مصیبت ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسرا اس کی جگہ لینے کو تیار کھڑی ملتی تھی۔ اوپر سے یہ آدمی کی فوجی پڑھائی، جانے کہ ختم ہو گی۔ راجہ نے اس رات آنکھیں بند کر کے اللہ سے خوب گزگرا کر دعا مانگی کہ راجہ جلد از جلد فوجی کا لج سے کامیاب ہو کر اپنے محلے میں واپس آجائے کیونکہ وحاظ آپی کی حفاظت اب اس کے لئے کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

آپریشن بلیو ستار

نو جوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا دوسرا ناول آپریشن بلیو ستار

کہانی ہے ایسے سر پھرے آزادی کے متواطے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سائنس کے بدله اپنا سب کچھ داکو پر لگانے کو تیار ہیں۔ ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کو کچلنے کے لیے کیا گیا بدنام زمانہ فوجی ایکشن ہے آپریشن بلیو ستار کا نام دیا گیا تھا، اسی آپریشن کے بعد ہندوستان کی سابق وزیر اعظم اندر اگندھی کو اسکے اپنے سکھ بادھی گارڈز نے گولیوں سے اڑا دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی باہمی چیقلش اور کٹکش کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

عشق کا شین (I)

کتاب گھر پر عشق کا عین پیش کرنے کے بعد اب پیش کرتے ہیں عشق کا شین۔ عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گزاروں تک کے سفر کی رواداں... علیم الحق حقیقی کی لازوال تحریر۔ عشق کا شین کتاب گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی دیر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

دو سویں جماعت میں آتے ہی ہمارا شمار سینٹر کیڈس میں ہونے لگ گیا تھا۔ ہماری ڈارمیٹری بھی اب اوپر گیا رہوں اور بارہوں جماعت کے سینٹر کیڈس کے ساتھ دوسرا منزل پر شفت ہو گئی تھی، لیکن اس ”اونجائی“ کا نہیں بے حد فقصان ہوا تھا۔ جب تک ہم زمینی منزل پر تھے، تب تک رات کو جانو کے شیرٹ ہول آنے جانے میں ہمیں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ہم کھڑکی کی جالی ہٹا کر بھی یہ رک کے پیچے کو وجہتے تھے اور اگر زیادہ دیر ہو جاتی تو اسی راستے سے واپس بھی آسکتے تھے لیکن اب دوسرا منزل پر ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے کھڑکی سے کو دنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور پھر دوسرا مصیبت اوپر کی منزل پر باقی تمام سینٹر کیڈس کا ہونا بھی تھا۔ ہر وقت بے۔ یو۔ او۔ (U.O.) کی پہرے دار نگاہوں کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن آصف بھٹی کی پیٹ کی بھٹی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور و بھتی تھی الہذا نہیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی تھا۔

دو سویں جماعت میں کالج کے اندر موجود سینما گھر بھی کیڈس کے لیے کھول دیا گیا تھا جس میں ہر ویک اینڈ پر رات کو اردو اور اگلے چھٹی کے دن صحائف قلم و کھائی جاتی تھی۔ جس رات ہم پہلی مرتبہ کالج کے آڈیوریم میں فلم دیکھنے کے لیے قطاروں میں اندر داخل ہو رہے تھے تو مجھے راجہ اور اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے شہر میں دیکھی پہلی فلم یاد آگئی۔

اس سینما کے باحول میں اور کیمپس کے اس آڈیوریم میں کس قدر فرق تھا۔ یہاں تو مجھے اس نظم و ضبط اور خاموشی سے یوں لگنے لگا تھا کہ جیسے ہم فلم دیکھنے کے لیے نہیں کسی کے ”فل“ پڑھنے کے لیے اس ہال میں جمع ہوئے تھے۔ نہی گاؤں پر سیٹیاں بجانے کی اجازت تھی اور نہ ہی ہیر و ڈن کے رقص پر سلے سکرین کی جانب اچھا لے جاسکتے تھے۔ اور تو اندر ہال میں نتو گندیریاں کھائی جا سکتی تھیں اور نہ ہی پھیری لگانے والے بوائز آس کریم اور سوڈا بیچتے دکھائی دے رہے تھے۔ سارے کیڈس یوں اٹینش بیٹھے ہوئے تھے جیسے ابھی کاشن ملتے ہی ہال کے اندر ہی پر یہ شروع کر دیں گے۔ جو پوچھیں تو مجھے اس طرح فلم دیکھنے سے شدیداً بھسن محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس فرما و فیصل مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ گھیٹ کر لے ہی جاتے تھے۔

ہیلن اور شیرل سے اب بمشکل ہی ملاقات ہو پاتی تھی کیونکہ سینٹر کیڈس کا رہائشی علاقے میں جانا بہت سختی سے منع تھا۔ لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی طور بنا کر کے ہیلن اور شیرل سے مل ہی آتا۔ ہیلن مجھے بُک کرنے پر بہت ڈامنی تھی اور شیرل مجھے اس بہادری پر بہت شاباش دیتی۔ مجھے چرچ کے بڑے سے ہال میں پڑے اس پیانو کی کشش بھی ہر ہفتہ کھینچ کر چرچ لے ہی جاتی تھی جسے ہیلن بہت سو زیں بجا لیا کرتی تھی۔ مجھے پیانو سیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن میری کیمپس کی روٹین اس قدر سخت تھی کہ میں بمشکل آدھ گھنٹے کے بُک Bunk کاہی متحمل ہو سکتا تھا اور اتنی دیر میں بھی کئی مرتبہ ہاؤس مائسر صاحب ہائل میں میری تلاش اور پوچھ چکے کرچکے ہوتے تھے۔ الہذا اتنی سی دیر میں میں صرف ہیلن سے فرمائش کر کے اسے پیانو

بجاتے ہوئے ہی سن سکتا تھا لیکن میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ زندگی میں جب کبھی بھی مجھے موقع ملائیں پیانا فوجا ضرور سیکھوں گا۔
وسویں جماعت کے امتحانات بورڈ لیتا تھا اور وہ جلدی ہو جاتے تھے۔ باقی جماعتیں سمجھی اور جوں میں سالانہ امتحان میں پیٹھی تھیں لیکن
وسویں جماعت مارچ میں ہی بورڈ کے امتحان سے فارغ ہو کر پانچ ماہ کی چھٹی پر چلی جاتی تھی۔ کالج کی انتظامیہ ان پانچ ماہ میں وسویں جماعت کے
کیڈیس کو تمام ملک کے کیڈیٹ کالج کے دورے پر بھجوائی تھی لہذا ہمارے دورے کے انتظامات بھی کمل کئے جا رہے تھے۔ لیکن جانے کیوں پچھلے چند
ہفتوں سے راجہ کے جتنے بھی خط مجھے آتے تھے ان میں اس کی بس ایک ہی رث ہوتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں۔ حالانکہ میں بیسوں بار اسے
جواب دے پکا تھا کہ ہمیں چاروں صوبوں کے کیڈیٹ کالج کو دیکھنے جانا ہے لہذا چھٹیاں شروع ہونے کے بعد تقریباً ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا کیونکہ
یہ ٹورنامنٹ وسویں جماعت کے کیڈیٹ کے لیے لازمی ہوتا تھا اور کالج کی بڑی والی بس میں تمام کیڈیٹ کو پورے ملک میں گھایا جاتا تھا۔

آخر امتحانات ختم ہو گئے اور اگلے ہی دن صحیح سوریرے کی پس کے بڑے گھاس کے میدان میں بڑی والی سرخ بس کا ہارن بنجنے لگا۔ ہم سب
اپنے اپنے بیگ اٹھائے بھاگ بھاگ بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں بس چل پڑی اور اگلے ایک ماہ کے لیے ہمارا رابطہ ساری دنیا سے کٹ گیا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد جب میں نے ٹرین سے اتر کر اپنے شہر کے ریلوے پلیٹ فارم پر قدم رکھئے تو خلافِ معمول مجھے گھر سے کوئی بھی لینے
نہیں آیا ہوا تھا۔ شاید ٹرین کے پانچ چھ گھنٹے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگ واپس چلے گئے ہوں۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا لہذا میں نے انتظار
کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ اشیش کے باہر سے تانگہ کپڑا کر خود ہی گھر پہنچ جاؤ۔
میں جب محلے کے چھانک سے اندر داخل ہوا تو ایک عجیب سانتا میرے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ ڈور کہیں سے ڈھوکی بخت کی
آواز آرہی تھی لیکن آس پاس کوئی دھکائی نہیں دے رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو ابا صحیح میں بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر مجھے گلے گالیا۔
ای اور عمارہ کا پوچھا تو بولے ”بھسکی وہ تو تقریب میں گئی ہوئی ہیں تمہارے بڑے بھیا کے ساتھ، تم نہادھولو تو وہیں جا کر ان سے مل لینا۔“

میں نے بیگ رکھا ”کیسی تقریب.....؟“

”بھسکی وہ اپنی وجہہ ہے نا..... آج اُس کی مہندی کی رسم ہے..... اچھا ہوا تم بھی آگئے، جا کر مل آنا اپنی ہو گئے..... ہمیشہ تمہارا پوچھتی
رہتی ہے.....“

ابا اپنی بات ختم کر کے اٹھ چکے تھے لیکن میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ زمین اور آسمان ایک ساتھ گھوم رہے
ہوں۔ اُسی وقت چند لمحوں کے لیے محلے کی بجلی بھی چلی گئی، اور یہ اچھا ہی ہوا اور نہ روشنی رہتی تو ابا میرے چہرے پر چھائے ہیری تقدیر کے اس
اندھیرے کو دیکھ لیتے جئے میں باوجود بسیار کوشش اس وقت چھپا نہیں پا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں بجلی تو واپس آگئی لیکن میرے اندر بڑھتے ہوئے
اندھیرے کو روشن نہ کر پائی۔

میں کافی دیر وہیں بیٹھا اس حقیقت پر یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آج ہوا اپنی کی مہندی ہے۔ اور ایک دن بعد وہ ہمیشہ کے لیے اس
 محلے سے رخصت ہو جائیں گی، لیکن جتنا میں سوچتا، اتنا ہی میرے اندر کا طوفان بڑھتا جاتا۔ اتنے میں ابا کسی کام سے کمرے سے باہر نکلے اور مجھے

ابھی تک یوں صحن میں گم بیٹھا دیکھ کر چوکے۔

”ارے... تم ابھی تک گئے نہیں.... من نہیں چاہ رہا تو صلح لینا..... تمہارے غیاث چجا بھی نہیں بہت پوچھتے ہیں۔“

میں ابا سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ تھوڑا سا ستانے کے لیے رُک گیا تھا۔ اس اب جاہی رہا ہوں۔ میں ٹوٹے ہوئے قدموں کے ساتھ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

باسکروولی کا آتشی کتا

کتاب گھر آپ کے لئے لایا ہے مشہور سراغ رسال شرلاک ہومز کا ناول ”باسکروولی کا آتشی کتا“۔ یہ ناول مشہور رائٹر سر آر تھر کونن ڈائل کی شہر آفاق کتاب ”The Hound of Baskervilles“ کا روشن ترجمہ ہے۔ ۲۰۹۱ء میں تحریر کئے گئے اس ناول پر اب تک ہالی وڈ کی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ سر آر تھر نے شرلاک ہومز کا کردار انھاروی صدی میں متعارف کروایا تھا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کر لیں کے ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار جا سوئی ناول پڑھنے والوں میں آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس ناول کو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سلیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہم سفر

ہم سفر..... فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر کھمی جانے والی تحریر..... زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور غلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتماد لگا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفروں کو پچھڑ نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے..... اولاد..... ہم سفر کتاب گھر کے ناول سلیکشن میں دستیاب ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

دوسرا الوداع

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

فوا آپی کا گھر اسی طرح سجا ہوا تھا جیسے کسی بھی ڈولی اٹھنے والے گھر کو سجا ہونا چاہیے۔ ڈھونکی بجھنے کی وہ آواز جو میں نے چھانک سے اندر داخل ہوتے ہوئے سنی تھی وہ دراصل یہیں فوا آپی کے گھر سے ہی آ رہی تھی۔ سب سے پہلے میری نظر غفور چاپ پر پڑی جو گھر کے باہر میدان میں لگے شامیانے کے پاس کھڑے، محلے کے چھوٹے بچوں کو شامیانے کے سوراخوں سے اندر سڑاں کر جھانکنے سے منع کر رہے تھے اور انہیں وہاں سے بھگا رہے تھے۔ میں آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکا اور وہیں دوسرے کھڑا ہو کر یہ سب پچھوڑ دیکھتا رہا۔ ایک آدھ بار غیاث چاپ پر بھی نظر پڑی جو، بہت جلدی میں اور پچھ بوكھلائے سے اندر آتے جاتے دکھائی دیئے۔ پھر میری نظر راجہ اور غور پر پڑی جو خشک میوے کے ہڑے ہڑے تھاں اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔

اچانک غفور چاپ کی مجھ پر اندر ہیرے میں نظر پڑی اور وہ مجھے محلے کا کوئی دوسرا لڑکا سمجھ کر چلائے۔

”اوے لڑکے..... وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ اندر جا کر پوچھو کر شیشے کے چار درجن گلاں کہے تھے، لیکن یہاں مردانے میں تو صرف دو درجن ہی بھجوائے ہیں..... اتنے سے تو کام نہیں چلے گا.....“ میں اندر ہیرے سے نکل کر روشنی میں آیا تب مجھے پہچان کروہ وہیں سے چلائے۔

”ارے..... یہ تو اپنا آدمی ہے..... اچھا ہوا تو بھی آ گیا..... تیری سکیلی تھے بہت پوچھتی تھی..... رخصتی سے پہلے مل ضرور لینا اس سے.....“ غفور چاہمیشہ فوا آپی کو میری سکیلی کہتے تھے کیونکہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو جب بھی وہ مجھے وہ آپی کے کام بھاگ بھاگ کر کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو مجھے چھیڑنے کے لیے پوچھتے کہ ”ہاں بھی..... کس کے لیے برف کے میٹھے گولے بنوائے جا رہے ہیں۔“..... میں جلدی جلدی گولے گندے والے کے ہاتھ میں پیسے تھما تے ہوئے کہا ”فوا آپی کے لیے.....“ وہ پھر مجھے چھیڑتے ”بھی یہ فوا آپی کون ہے.....؟“ میں جلدی سے جواب دیتا ”میری سکیلی..... اور میرا جواب سُن کروہ دیریکٹ ہنسنے رہتے۔

آج میری وہی سکیلی اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے، مجھ سے..... ہم سب سے رخصت ہونے کے لیے تیار بنتی ہوئی تھی اور میں اسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اندر گھر میں بھی کو میری آمد کی خبر ہو گئی اور سب سے پہلے راجہ اندر سے بھاگتا ہوا نکلا اور آ کر میرے گلے گلے گیا۔ اسے میری اندر وہی حالت کا اچھی طرح پتہ تھا اور وہ بار بار مجھ سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کہ میں نے گذشتہ ایک مینے کے دوران اس کے لکھنے ہوئے خطوط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ راجہ کا لکھا ہر خط واپس اسی کوں چکا تھا اور ان خطوط کا پلندہ ابھی تک اس کی جیب میں موجود تھا جس میں راجنے والے جو آپی کے اس ہونے والے رشتے کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ لیکن چونکہ میں اپنی جماعت کے ساتھ نو تر پر تھا اس لیے

میرے پتے پس خط کو وصول کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا لہذا اک والوں نے سب ہی خط کیے بعد مگرے راجہ کو واپس لوٹا دیئے تھے۔ میرے پاس راجہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور پھر اگر مجھے وقت سے پہلے ہی و جو آپ کے اس رشتے کے بارے میں پتے چل جاتا تو بھی میں کیا کر سکتا تھا؟؟ میں، امی اور باقی گھر والوں سے ہوا آپ کے صحن میں مل کر واپس باہر آگیا کیونکہ ہوا آپ کو جس کمرے میں بھایا گیا تھا وہاں جانے کی بھی میں ذرا ہ برا بر بھی ہمت نہیں تھی لیکن کچھ ہی دیر میں عمارہ اندر سے عجلت میں باہر نکلی اور کہا کہ ہوا آپ مجھے بلا رہی ہیں۔ میں بیخارہا لیکن راجہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دیا اور زبردستی اندر دھکیل آیا۔ ہوا آپ پیلے جوڑے میں ملبوس، سر جھکائے اپنی سہیلوں اور رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں یوں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کے چہرے کے رنگ اور اس پیلے دوپٹے میں فرق کرنا ممکن تھا، جو اس وقت ان کے سر پر ڈالا ہوا تھا۔ میں دروازے میں ہی رُک گیا۔ چھپے کا نس پر میری یوں نیفارم والی تصویر اب تک اپنی اسی پرانی جگہ پر بھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عورتوں نے دعا کیں دیں اور وہ ہوا آپ کی کسی سہیلی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ وہ ہوا آپ نے نظر اٹھائی اور مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرا کیں۔ ان کی اس زخمی سکراہٹ کے پیچے کتنے درجھپے تھے یہ صرف میں ہی محسوں کر سکتا تھا۔ جانے کیوں اس پل مجھے طاہر بھائی کی بہت شدت سے یاد آئی، اور ایک پل کے لیے میرے دل نے سب کچھ بھلا کر خدا سے یہ شکوہ کر دا کہ اگر اس شہزادی کو کسی کے ساتھ رخصت ہونا ہی تھا تو پھر طاہر بھائی ہی کیوں نہیں.....؟ کیوں خدا نے اتنی جلدی انہیں اپنے پاس بولا یا۔ ہوا آپ اگر آج ان کے ساتھ رخصت ہو رہی ہوتیں تو ان کے چہرے پر اس پیلاہٹ کی جگہ کیسی چاندنی بکھری ہوئی ہوتی؟..... دنیا میں ہمیشہ سب کچھ دیساہی کیوں ہوتا ہے جیسا ہم نہیں چلتے؟؟

کتاب گھر کی پیشکش

میں پلکیں جھپکے ہا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے شوراٹا کا لڑکے والے ہندی لے کر آگئے ہیں۔ سبھی عورتیں اور لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر باہر کی جانب پلکیں اور کچھ ہی دیر میں، میں اور و جو آپ کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا یا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اندر آن سے ملنے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اوس سامیخراہا انہوں نے حسب معمول اپنی انگلی سے میری ناک کو پھسا دیا، لیکن آج میرے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ان کے بنا بہت اداں ہو جاؤں گا۔ وہ کیوں ہم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جواب میں انہوں نے اپنی آنکھوں کو بھینگنے سے ہوئی مشکل سے روکا اور مجھے تسلی دی کہ ایک دن تو انہیں اس محلے سے جانا ہی تھا، اور پھر وہ کون سا سوکوں ڈور یہ شہر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ انہیں تو اسی شہر میں ہی رہنا تھا اور یہ کہ میں جب چاہوں ان سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں۔ و جو آپ نہ جانے کتنی دیر تک ایسی ہی کئی تسلیاں دے کر مجھے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے خوب دل لگا کر پڑھنے کی بھی تلقین کی اور اپنی الماری کی دراز میں سے مجھے وہ سب چیزیں بھی اٹھانے کو کہا جو وہ ہمیشہ کی طرح میرے لیے، میری غیر موجودگی میں جمع کر کے رکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج ان سے جی بھر کر باتیں کروں کیونکہ کل سے تو وہ پرانی ہونے والی تھیں لیکن یہ خواہش بھی میرے دل میں حرست بن کر ہی رہ گئی اور کچھ ہی دیر میں لڑکے والیاں ہندی لے کر اندر کمرے میں آ گئیں اور انبارش ہو گیا کہ مجھے مجبوراً کمرے سے باہر نکلا پڑا۔ باہر راجہ پہلے سے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں ہندی کے گیتوں کے اس شور شرابے سے دوڑھٹ کر بیٹھ گئے اور راجہ نے مجھے شروع سے ساری بات بتائی کہ کس طرح رشتے کرانے والی خالدے سینہ خالدہ کو یہ رشتہ بتایا تھا اور پھر جواب میں ہوا آپ کی تصویر اس لڑکے کو دکھائی تھی

جو تصویر دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس گنو بیٹھا تھا۔

لڑکے کا نام ظفر تھا اور وہ گاڑیوں کے شوروم کا کاروبار کرتا تھا۔ بقول رشتے والی خالہ ”ظفر میاں تو ہر روز ایک گاڑی بیچتے اور دوسرا خریدتے ہیں۔“..... اس وقت بھی مہندی لگانے والی خاتمی نے ماڈل کی تین چار کاروں اور ایک بڑی بس میں بھر کر آئی تھیں۔

ظفر کو اب خود اس رشتے کی اس قدر جلدی تھی کہ وہ جلد از جلد اس معاملے کو نینپا ناچاہتا تھا۔ وہاں اٹو کا معاملہ بھی دن بدن لمبا ہوتا کھائی دے رہا تھا اور صدر کی جانب سے اُس کی درخواست کا کوئی جواب بھی تین ماہ گزرنے کے باوجود ادب تک نہیں آیا تھا البتہ دشمنی کے اصرار پر کہڑا کاب مرید انقا نہیں کر سکتا۔ سینکڑہ خالدے سر ہتھیلی پر رکھ رغیاث پچا کے سامنے رشتے کی بات چھیڑی دی۔ شروع میں تو غیاث پچا نے اپنی سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال انہیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے اور یہ کہ ان کی بیٹی ان پر بوجھ تو نہیں کہ اُسے یوں جلد بازی میں گھر سے رخصت کر دیں لیکن پھر دھیرے دھیرے جیسے جیسے دن ہفتوں میں اور ہفتہ مہینے میں بدلتے گئے تو فترتہ رفتہ رغیاث پچا کے لبجکی تھی بھی دم توڑنے لگی البتہ ہوا آپی کا جواب اب بھی وہی پہلے دن والا ہی تھا اور انہوں نے ایسے کسی موضوع پر بات کرنے سے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

سینکڑہ خالدے نے ہزار روکشتوں کے بعد رغیاث پچا کو کم از کم اس بات پر تو راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ ایک بار لڑکے سے مل تو لیں۔ اس کی چھان پچک کروالیں کیونکہ آج نہیں تو کل، آخر بھی نہ کبھی تو انہیں اپنی بیٹی سے رخصت کرنا ہی ہو گا تو پھر اس کام کی ابتداء کرنے میں کیا حرج ہے؟؟ اٹو کے کیس کی وجہ سے جو بدنامی ہو چکی تھی اس کے بعد تو اتنے اچھے رشتے کا آنا ہی کسی غصی امداد سے کم نہیں تھا البتہ سینکڑہ خالدے کی نظر میں اب مرید دیر کرنا خود اپنی جاگی قسم کو سلا نے کے متراوف ہوتا۔ آخر کار چوتھے ماہ جا کر رغیاث پچا نے اس بات پر آنادگی ظاہر کر دی کہ وہ خود کسی بہانے بازار سے گزرتے ہوئے لڑکے کے شوروم پر دو گھنٹی رُک کر اس کا آگاہ بھیجا کیا ہے اُسیں گے اور اگر انہیں لڑکا مناسب لگا تو پھر اس کے بعد آس پاس سے اس کے متعلق خبر لینے کی کوشش بھی کریں گے کیونکہ لڑکے کا اپنا کوئی بزرگ تو ہانہ نہیں جس سے بات کی جاسکتی ہو۔

وراصل رغیاث پچا معاملے کو اتنے دن تک اس لیے بھی لٹکاتے آرہے تھے کیونکہ انہیں اب بھی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے جاوید کی طرف سے کچھ امید تھی۔ جاوید دواؤں کی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور رغیاث پچا کی عزت بھی بہت کرتا تھا لیکن جب انہوں نے اپنے بھائی محمود سے وہ جو کے لیے آئے رشتے کا سرسری ساتز کر کیا تاکہ وہ محمود اور جاوید کی مرضی جان سکیں تو دونوں نے بیک وقت رغیاث پچا کو مشورہ دیا کہ اگر رشتہ مناسب ہے تو دیرنہ کریں۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ ان کے بھائی کا گھرانہ قوآپی کو اپانے کی مزید کوئی خواہ نہیں رکھتا، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب اسی بھائی کے رغیاث پچا کے گھر چکر لگاتے ہوئے جوتے نہ گھستے تھے۔ لیکن اب وہی قوآپی ان کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ اتنے واضح اشارے کے بعد رغیاث پچا کی کمر بھی ٹوٹ ہی گئی اور انہوں نے سینکڑہ خالدے کو اختیار دے دیا کہ وہ جیسے مناسب بھیں، پیش رفت کر گز ریں البتہ واحد شرط انہوں نے قوآپی کی رضا مندی سے مشروط رکھی کیونکہ وہ اپنی لاڈی بیٹی کی مرضی کے خلاف اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔

قوآپی کچھ عرصہ تو خون کے گھونٹ پی پی کر اپنی ماں کی پریشانی اور باپ کی دن بدن جھکتی ہوئی کمر کو دیکھتی رہیں لیکن پھر ایک دن جب انہوں نے اپنے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں وہ نہیں دیکھ لی جس کا باعث وہ صرف اپنی ذات کو ہی سمجھتی تھیں تو اسی لمحے انہوں نے تھیارڈ انکے فیصلہ

کر لیا اور چپ چاپ سینہ خالہ سے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ غیاث چچا نے اپنے طور پر لڑکے کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل کرنا تھیں وہ پہلے ہی کر چکے تھے اور بظاہر لڑکے کے بارے میں سب اچھا ہی کی روپرٹ تھی۔ لہذا اب مزید دیر کرنے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی جواز۔ لڑکے کو ہری جھنڈی دکھادی گئی اور ظفر نے اگلے ہی مینے بارات لانے کی خواہش ظاہر کر دی اور یوں جس کے نتیجے میں آج اس کے نام کی مہندی ہو آپی کے ہاتھوں میں رج رہی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجہ یہ تمام داستان سنانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ آس پاس بھی منظر، ہر ذی روح ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہو۔

اگلے دن بارات بھی اپنے وقت پر آگئی۔ میں نے ڈوری سے ظفر کو دیکھا۔ کوئی بات بھی تو خاص نہیں تھی اس کی، عامیں شکل و صورت کا ایک تیز طار سامنہ..... ہے وہاں سب ”لڑکا“، قرار دینے کی اپنی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی بڑی ہی لگنی مونچھوں نے اسے میرے نزدیک مزید پہ اسرار بنا دیا تھا۔ لیکن جانے وہاں سب عورتیں اس کے واری صدقے کیوں ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر ہو آپی کے مقابلے میں تو بالکل ہی چمار دکھائی دیتا تھا۔ کہاں ہو آپی کا چاند سا کھڑا اور کھلتا گلا بی رنگ اور کہاں یہ گھرے سانوں لے رنگ کا کاروباری سماں شخص.....؟

بہر حال ہو آپی کی قست کا دھاگہ اب ظفر سے بندھ چکا تھا اور رخصتی کے وقت پورے محلے نے فرداؤ فرداً ہو آپی کو دعا کیں دے کر رخصت کیا۔ سیکھ خالہ قرآن شریف سے نیچے گزارتے وقت ہو آپی سے مل کر جو پھوٹ پھوٹ کر دیکھیں تو سارے محلے کو آبدیدہ کر گئیں۔ غیاث چچا و ہجھو آپی کو تھامے دے لیے کیا گاڑی تک یوں چلتے ہوئے گئے کہ مجھے خود ان کے گرجانے کا دھڑ کا لگا رہا۔ میں ڈور کھڑا رہا کیونکہ اس الوداع کی ہمت میرے اندر بھی بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ ہو آپی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر ہم سب کی طرف دیکھا۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ گیا۔ ہو آپی کی مجھ سے نظر نکل رہی۔ میں نے رو تے رو تے اپنی ناک کو اپنی انگلی سے دبادیا۔ آنسوؤں کا ایک فوارہ ہو آپی کی آنکھوں سے بہہ کر ان کے پورے چہرے کو بھگو گیا۔ دوسرا ہی لمحے وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ گاڑی چل پڑی، اندر عورتوں کے درمیان بیٹھی ہو آپی نے اپنا ہاتھ ہلا کیا۔ یہ میری زندگی کا دوسرا الوداع تھا جو مجھے خون کے آنسوؤں لارہا تھا۔ میں نے دھیرے سے دل میں کہا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اک دیا جلانے رکھنا

کتاب گھر کی بیشکش

جو چلے تو جاں سے گزر گئے اور میرے خواب ریزہ ریزہ جیسے خوبصورت ناولوں کی مصنفوں مابا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ شہرہ آفاق ناول ایک دیا جلانے رکھنا کتاب گھر پرستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی ٹرافی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اسفر جو فل بیک پر کھڑا تھا، اس کی زور دار ٹک نے فٹ بال کو ہوا میں سنتکڑوں فٹ اڑاتے ہوئے میرے قدموں میں لا پھینکا۔ میں سنتر آؤٹ کی جگہ سے فٹ بال کو لیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ پیچھے سے ہمارے گول کیپر موٹے آصف بھٹی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ”آؤی..... دامیں کو پھینک دے..... جلدی کر۔“ دامیں پر مجید چھوٹو چیخ کر آگے بڑھا، میں نے لیفت آؤٹ پر فیصل کی طرف بال پھینکنے کا جھا کا دیا اور جب مخالف ٹیم کا سنتر آؤٹ فیصل کی جانب لپکا تو میں نے فٹ بال مجید چھوٹو کی جانب پھینک دیا۔ مجید چھوٹو نے بال سنبھالا اور تیزی سے ڈی کی طرف دوڑا۔ میں نے چلا کر اسے بال دوبارہ سنتر کی طرف پھینکنے کا کھالا لیکن اتنے میں لیاقت ہاؤس کے فل بیک نے تاک کر فٹ بال کی جگہ مجید چھوٹو کو گھما کر پوری قوت سے لات ماری اور مجید چھوٹو اگلے ہی لمحے فضا میں کسی جہاز کی طرح اڑتے ہوئے گراونڈ سے ہی باہر جا گرا۔ ہم نے چلا کر ریفری سے احتجاج کیا۔ یہ تیرا موقع تھا کہ ہمارا کوئی بھی کھلاڑی گیند گول پوسٹ کے قریب لے کر پہنچتا تو لیاقت ہاؤس کے کیڈیس کوئی نہ کوئی فاؤل کر کے ہمارے کھلاڑی کو روک لیتے تھے۔ مجید چھوٹو پھوٹو ساگر آؤٹ کے باہر پڑا ہوا تھا۔ ہمارے کیپشن صدر نے اسے مسل کراور ماش کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور کھلیل پھر سے شروع ہو گیا۔

آج بارہویں جماعت کے کیڈیس کے درمیان انتہا ہاؤس فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل اور فائنل میں محمد بن قاسم ہاؤس کی بارہویں جماعت یعنی ہماری ٹیم اور لیاقت ہاؤس کی ٹیم کے درمیان آخری معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پہلے پندرہ منٹ میں ہی لیاقت ہاؤس کی ٹیم نے ہمارے تین کھلاڑی رُخْمی کر کے گراونڈ سے باہر بھیج دیئے تھے۔ ہمارا کیپشن صدر ان کا چوتھا شکار بنا اور اب ہم بنا کیپشن کے گراونڈ میں موجود تھے۔ صدر کی گھٹنے سے نیچ کی ہڈی چیخ گئی تھی اور سو جن کے مارے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ گراونڈ کے باہر کیڈیس کی بھیڑ میں قاسم ہاؤس کے کیڈیس کے چہرے پر مایوسی چھارہ ہی تھی میں، فیصل اور اسٹریپنے فل بیک خالد لے اور ثار وندو کے پاس بھاگتے ہوئے آئے۔ ہم پانچوں نے سر جوڑے اور میں نے دیہرے سے فیصلہ دے دیا۔ یہ میرا یعنی واکس کپتان کا حصی فیصلہ تھا۔ ”اب لیاقت ہاؤس کی ٹیم میں سے کوئی بھی ہماری ڈی تک صحیح سلامت نہیں پہنچنا چاہیے۔ مارو یا مر جاؤ۔“

ریفری نے تیزی سے یہیاں بجا کر ہمیں اپنی اپنی گلکے پر واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹے بھٹی کو الگ مار کر گول پوسٹ میں ڈالے رہنے کا اشارہ کیا اور کھلیل ایک بار پھر سے شروع ہو گیا۔ لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی۔ اب لیاقت ہاؤس کے کھلاڑی اڑتے ہوئے گراونڈ سے باہر جاتے دکھائی دے رہے تھے، کچھ ہی دیر میں ان کا کپتان میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا نام باہر تھا اور ایک زمانے میں وہ بھی ان 23 تیس کیڈیس

میں شامل تھا جو ”ڈاکٹرنو پرچی کیس“ میں ہمارے ساتھ تین ہفتے تک گڑا کھاتے رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے سرگوشی میں کہا۔

” ہے آدمی..... کیا ہماری ساری ٹیم کو آج کی ڈاکٹرنو کے ہسپتال پہنچانے کا ارادہ کر کے آئے ہو..... اب بس کر دو یا ر.....“

”ٹھیک ہے..... اپنی ٹیم سے بھی کہہ دو کہ یہ فٹ بال کو ماریں..... میرے کھلاڑیوں کو نہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://KitabGhar.com>

” رائٹ..... سیز فار.....“ میں نے بھی انگوٹھا انھا کرا شاہرا کر دیا۔ اگلے ہاف میں صاف کھیل ہوا اور بات پناٹی لکس تک پہنچ گئی۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا گول کیپر بھٹی سب سے آگئے تھا۔ اس نے پانچ میں سے تین پناٹی لکس روک لیں اور دوسری جانب میری، فیصل، اسٹف اور شار روندو کی پناٹی سیدھی ان کے گول میں گئی۔ ہم نے ایک گول کے مار جن سے فائل جیت لیا تھا اور قسم ہاؤس کی پچھلے دس سال میں یہ پہلی فٹ بال فائل کی ٹرانسیچی جو آج ہم اپنے ہاتھوں میں انھائے پورے گراڈنڈ کا چکر لگا رہے تھے۔

صرف فٹ بال ہی نہیں بلکہ ہم جب سے بارہویں جماعت میں آئے تھے ہم نے رائیڈنگ، سومنگ، بیس بال، باسٹ بال، چیلوں تھرو اور نہ جانے کون کون سی ٹرانسی سے فہد صاحب کا آفس بھر دیا تھا۔ ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کو ہمیشہ ہم سے شکایت رہی تھی کہ ہمارا چیز ان کے ہاؤس میں آنے والا سب سے زیادہ شرارتی اور نظم و ضبط توڑنے والا بینگ (Badge) تھا لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم نے نظم و ضبط میں اور ڈسپلن میں نہ ہی، لیکن دیگر ہر شبیہ میں وہ کار کردگی و کھائی کے جو پچھلے کئی سالوں میں ہمارے سینئر نہیں دکھا سکے تھے۔ اب ہم ساتویں جماعت کے لاغر اور کم زور بدن والے ڈرے سبھے کیڈس نہیں تھے بلکہ اوپنے، لمبے اور مضبوط جسموں والے کیڈٹ آفیسرز تھے۔ جن کے بدن ایک شراؤرل کی مشقتوں اور مہینوں تک بوجھا انھا کر جھانگئی کی وجہ سے پک کر فولاد بن چکے تھے۔ گیارہویں جماعت تک ہم سزا میں کھا کھا کر اس حد تک ماہر ہو چکے تھے کہ اب پہلی آفیسرز (پی۔ اوز) کو ہمیں سزادیت دیتے پہنچنا آتا تھا۔

کئی مرتبہ ہماری شکایت کمانڈر صاحب تک بھی پہنچ لیکن ان کا ایسے معاملوں میں ایک بہت سیدھا اور واضح اصول تھا کہ چاہے شرارت کیسی بھی کیوں نہ ہو، وہ صرف ہماری پڑھائی کے رزلٹ اور کلاس ٹیسٹ کے نتیجے کو سامنے رکھ کر کسی بھی سزا کا فیصلہ کرتے تھے۔ ویسے بھی فوجی تربیت کے معاملات انہوں نے ایجاد کیتے ہوئے تھے۔ انہیں صرف ہماری پڑھائی سے غرض ہوتی تھی اور ہماری پوری ڈار میٹری میں سے صرف ایک بار موٹا بھٹی دسویں کے مژرم ٹیسٹ میں یہاری کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پوری کلاس کا رزلٹ ہمیشہ ہترین آتا تھا، لہذا کمانڈر صاحب کو بھی ہمارے خلاف حصی فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ پہل صاحب کا لج سے باہر بیک کے شدید مخالف تھے اور ایسی غلطی وہ بھی معاف نہیں کرتے تھے لہذا اب تک یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم بھی جانو کے شیرٹ ہوٹ سے رنگ ہاتھ نہیں پکڑے گئے تھے، حالانکہ سی۔ پی۔ او کو پاک یقین تھا کہ ہم ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت اڑانے کے لیے کیمپس سے بک Bunk ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے درجنوں چھاپوں کے باوجود ہم کبھی اس کے ہتھ نہیں چڑھے اور کمی بار تو بال بال بچ۔

(گیارہویں) فرست ائیر کے دوران زندگی اپنے معاملوں پر ہی رہی تھی اور سوائے شیرل کی شادی کے، دیگر کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔

شیرل، ہیری کے ساتھ بیاہ کر پیا دلیں سدھا رگئی۔ مجھے شیرل کے خاندان کی طرف سے شادی میں شرکت کی خاص دعوت تھی اور میں چرچ میں سوت

میں ملبوس ہیری کو دیکھ کر جیران ہی تو رہ گیا تھا۔ اس لڑکے کو تو میں نے کئی مرتبہ بیٹوں کے دوران آتے جاتے چرچ کے احاطے کے پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ وہ گیٹ پر آ کر کسی دوسری نن (سستر) کے ذریعے ہیلین کو پیغام بھی بھجوایا کرتا تھا لیکن ہیلین اس سے ملنے نہیں جاتی تھی، کبھی کبھی جب میں ہاؤس مائسر سے نظر بچا کر اتوار کے روز چرچ سروس میں ہیلین سے ملنے جایا کرتا تو تب بھی بھی لڑکا ہمیشہ مجھے پیانو کے قریب سب سے پہلی روس میں بیٹھا نظر آتا تھا اور جب کبھی ہیلین کو اتوار سروس، Quire Service کے دوران پیانو، بجاتی تو وہ نہایت انہاک سے ہیلین کو دیکھا کرتا تھا۔ شیرل ہمیشہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی اور کئی مرتبہ وہ دونوں ساتھی ہی وہ اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے لیکن جاتے جاتے بھی ہیری کی نظریں ہیلین ہی کا طوف کرتی رہتی تھیں۔ اسی لئے جب میں نے اسے چرچ کے ڈاکس پر سفید ڈینہوں والے لباس میں ملبوس شیرل کے ساتھ کھڑے اور شیرل کو انگوٹھی پہناتے دیکھا تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ہیلین نے میری آنکھوں میں جھاٹکتے سوال کو محسوس کر لیا اور نظروں ہی نظروں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رات کو جو زفاف نے ہیری اور شیرل کے اعزاز میں ایک بہت شاندار پارٹی کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ خوب ہلہ گلا ہوا اور سب ہی نے جو زفاف کے بجائے ہوئے افسکن اور پھر اکارڈین کی دُھن پر خوب رقص کیا۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب سب ہی شور شرابے اور حکانے پینے میں مشغول تھے، میں ہیلین کوہاں میں موجودہ پا کر خود بھی اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر با غصے کی جانب چلا آیا جہاں ہیلین ٹکڑے کے پیڑوں کے پاس بچپے جھوٹے کے قریب خاموش ہی کھڑی آسمان کو تک رہی تھی۔ شاید وہ بھی ان ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہی ہو گی۔ میری آہٹ پا کر وہ چونک کر مردی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”کوئی سوال ملت کرنا آؤ۔۔۔ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے.....“
<http://kitaabghar.com>
 میں چپ ہی رہا اور ہیلین کے قریب ہی جھوٹے پر بیٹھ گیا اور میں نے ہیلین کو آسمان پر اپنا ستارہ دکھایا، سب سے واضح اور چکدار۔۔۔ اور ہیلین سے اس کے ستارے کے بارے میں پوچھا۔ ہیلین کچھ دیر آسمان کو دیکھتی رہی اور پھر اس نے ڈکھرے لجھے میں بتایا کہ اس کا ستارہ کہیں کھو گیا ہے۔ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پا رہا۔ اس رات، ہم دونوں چپ چاپ آسمان کو دیکھتے رہے۔ شیرل بیاہ کر ہیری کے ساتھ کینڈا چل گئی اور پھر بہت دنوں بعد ایک دن ہیلین نے اپنے لب کھول ہی دیئے.....

ہیری بہت عرصے سے ہیلین کو چاہتا تھا۔ لیکن ہیلین نے اپنے لیے خدائی راہ اور مذہب کا راستہ اس کی چاہت سے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا۔ ہیری نے بہت پاپڑ بنیلے اور بہت سر پتھے لیکن ہیلین کے دل کا پتھر پکھلانا تھا نہ پکھلا۔ ہاں البتہ شیرل ہر اتوار چرچ سروس کے بعد ہیری کے ساتھ گھر آتے جاتے اس کی باتوں میں اس قدر کھوئی کہ کچھ ہی ہفتلوں میں اسے چاروں طرف صرف ہیری ہی ہیری دکھائی دینے لگا۔ اور حبِ معمول اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے یہ راز اپنی سب سے بڑی راز داں ہیلین کو ہی بتایا۔ ہیلین نے نہایت سکون سے اپنی ہم نفس اور پیاری بہن کی بات سنی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے وعدہ کیا کہ ہیری اگر دنیا میں کسی کا ہو گا تو صرف شیرل ہی کا ہو گا۔ بھی وہ دن تھا، جب ہیلین نے پہلی مرتبہ ہیری کو شام کے وقت چرچ کے احاطے کے باہر گھومتے ہوئے خود گیٹ پر بلایا۔ پہلے تو ہیری کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت آج خود اس پر اتنی مہربان ہے، لیکن جب ہیلین نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ ہیری سے یہ پوچھتے کہ وہ اس کے لیے اپنی کسی قیمتی چیز کی قربانی دے سکتا ہے تو ہیری کا

جواب کیا ہو گا؟

ہیری نے جواب کہا کہ اس کی ملکیت میں اس کی سانسوں سمیت جو کچھ بھی ہے وہ ہیلین ہی کا تو ہے، لہذا یہ سوال ہی قطعی مے معنی ہے۔ لیکن ہیلین نے اس سے پھر کہا کہ جواب دینے سے پہلے وہ ایک بار پھر اچھی طرح سے سوچ لے کہ بعض دعوے صرف دعوے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہیری نے پھر یہی کہا کہ آزمائش شرط ہے۔ تب ہیلین نے اسے شیرل کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تمام یعنی کی استدعا کی تو کچھ دیر تک تو ہیری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔ ہیلین نے اسے خاموش دیکھ کر کہا کہ اگر ہیری چاہے تو وہ اپنا سوال واپس لے سکتی ہے کیونکہ یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ لیکن ہاں کرنے کی صورت میں ہیری کو ساری عمر کے لیے شیرل کو خوشیاں دینے کا وعدہ بھی نہجانا پڑے گا البتہ ”نہ“ کرنے کی صورت میں ہیلین اور ہیری کو وہاں سے اٹھنے کے بعد اس ملاقات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہو گا۔

ہیری کے لیے شاید یہ زندگی کا سب سے بڑا امتحان تھا لیکن وہ بھی اپنے لفظوں کا پکا نکلا۔ اس وقت تو وہ پچ چاپ انھ کروہاں سے چلا گیا لیکن اگلے ہی ہفتے شیرل اپنے چہرے پر قوس و قزح کے سارے رنگ لے بھاگتی ہوئی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور آتے ہی ہیلین سے لپٹ گئی۔ ہیری کے گھروالے اسی شام اس کا ہاتھ مانگنے آرہے تھے۔ شیرل جانتی تھی کہ اس مجرے کے پیچھے ہیلین ہی کا ہاتھ ہو گا لیکن وہ یہ بھی نہیں جان پائی کہ ہیری نے ہیلین کی محبت کے سلکھاں پر شیرل کی نورت خود ہیلین ہی کے کہنے پر سجائی تھی۔

میں ہیلین کی زبانی یہ ساری کہانی سن کر بہت حیران تھا۔ یہ محبت آخر کس بلکہ نام تھا۔ یہ انسان سے کیا کچھ کروالیتی ہے۔ شیرل چلی گئی۔ ہم گیارہویں سے بارہویں جماعت میں آگئے۔ اب ہم سینکریٹ آفسر بن چکے تھے اور اکیڈمی میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔ راجہ کے خطاب بھی باقاعدگی سے مجھے آتے تھے لیکن میرا دل ہواپی کی رخصتی کے بعد کبھی محلے میں نہیں لگ پایا۔ بات صرف ہواپی کی رخصتی تک ہی رہتی تو شاید مجھے دھیرے دھیرے صبر آہی جاتا۔ لیکن ایسے لگتا تھا جیسے تقدیر کو ابھی ہواپی اور ان کے خاندان کے مزید کچھ امتحان لیتا مقصود تھے۔ ہواپی کی رخصتی کو ابھی تیسا رہی دن تھا کہ صبح سوریے ایک نئی اقتداں کے گھر کے آنکن میں ڈریہ ڈال چکی تھی۔

آتش پرست

<http://kitaabghar.com>

وجہہ سحر کے ہد مشرق قلم سے ایک اور سنتی خیڑا اور دلپس ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی تمی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوٹ کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی تمی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی ذیما کو اس منحوں می سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جانے کے لیے پڑھیے..... آتش پرست
جنے جلد ہی اتاب گھر پر ایکشن ایڈونچر مضم جوئی ناول سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔
<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش دھوکہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

قوآپی کی رخصتی کو آج تیرا دن تھا اور تیرے دن تو ویسے بھی ڈلہن کو دیئے کے بعد رات کو گھر چھوڑنے کے لیے ظفر کو خود آنا تھا لیکن وہ صبح سویرے ہی ڈکووان کے گھر چھوڑ کر باہر سے ہی واپس لوٹ گیا۔ لڑکی کو یوں اکیلا گھر کے صحن میں کھڑے دیکھ کر ماں باپ کے تو حواس ہی گم ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں عقدہ یہ کھلا کہ ظفر میاں نے ویسے کا سارا بندوبست تو کر رکھا تھا اور انہیں اب صرف اپنی ایک بڑی رقم کی وصولی کا انتظار تھا جو ایک سودے کے سلسلے میں انہیں آج تھی ہوئی تھی، لیکن ”اتفاق“ سے آج پارٹی نے کچھ ایسی مجبوری اور عذر پیش کر دیا تھا کہ خود ظفر بھی ان کے سامنے لا جواب ہو گیا تھا۔ لیکن بہر حال ولیمہ تو کرنا تھا۔ ظفر کے تمام دوست، برادری اور خود قوہ کے تمام خاندان کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے۔ اب ایسے وقت میں ولیمہ منسون خ بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا، لہذا ظفر نے قوآپی کو غیاث پچا کے پاس جانے کا کہتا کہ وہ غیاث پچا سے ولیمہ کی رقم ”اوھار“ دلوائے۔ ظفر نے قوآپی سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے سودے کی رقم ملی وہ غیاث پچا کے پیسے لوٹا دے گا۔ قوآپی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا سو اسے اس کے کوہ جا کر اپنے ابا کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیں۔ قوآپی جیسی خوددار لڑکی کے لیے یہ سب کچھ کس قدر مشکل ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ میں خوب لگا سکتا تھا۔

غیاث پچا نے بنا کوئی دوسرا سوال کیے رقم قوآپی کے ہاتھ پر رکھ دی اور فضلو بابا سے کہہ کرتا گئے مغلوایا اور قوآپی کو فضلو بابا کے ساتھ ان کے گھر واپس بھجوادیا۔ یوں قوآپی کا ولیمہ تو خوب شان و شوکت سے ہو گیا لیکن غیاث پچا کا ماتھا اسی دن ٹھنک گیا کہ شاید اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں ان سے کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔ ظفر کے چہرے پر ولیمہ والی رات بھی کسی قسم کے خجالت کے کوئی آثار نہ تھے جیسے اس بات کی ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ ہوئی ہو کہ اس کے ولیمہ کی دعوت کا خرچ بھی اس کے سُر اکال کو ہی اٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا قیچیہ لگاتا رہا اور وولیمہ کے شاندار ”انتظام“ پر سب کی مبارکباد اور داد و صول کرتا رہا۔ رات گئے جب دعوت ختم ہوئی تو اس نے خود اپنے دوستوں کے ساتھ رکنے کا فذر کر کے وجہ کو ہیں سے ان کے ماں باپ کے ساتھ مکاواے پر تین دن کے لیے گھر بھیج دیا۔

اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ ظفر میاں کی اتفاقاً پڑنے والی مجبور یوں کی فہرست لمبی ہی ہوتی گئی، اور غیاث پچا سے ہر بار قرض کے نام پر بھوری گئی رقم کبھی واپس نہ ملی۔ بلکہ کچھ عرصے بعد تو ظفر نے یہ قرض نام کی ذمہ لگانے کا لکھ فی ختم کر دیا اور اب تو وہ اپنے حق کے طور پر قوآپی کے ذریعے یا پھر خود ہی با توں با توں میں رقم مانگ لیا کرتا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ قوآپی مان باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ آخران کے پاس جو کچھ بھی ہے، ان کی بیٹی کا ہی تو ہے بھلا وہ یہ سب اپنے ساتھ تو لے کر نہیں جائیں گے نا.....؟

غیاث پچا ایک وضع دار شخص تھے اور چپ چاپ اپنے غلط فیصلے کی قیمت چکاتے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ظفر کے کاروبار کی اصلاحیت بھی کھل کر سامنے آگئی۔ گاڑیوں کا وہ شوروم اس کی ملکیت نہیں تھا بلکہ اس کا ایک دوست جو سال ڈیڑھ کے لیے اپنی قسمت آزمانے دوئی گیا ہوا تھا، وہ اس شوروم کا مالک تھا۔ اس کی قسمت دوئی میں نہیں کھلی اور وہ جلد ہی یہاں باقی سب کی قسمت پھوٹنے کے لیے واپس آن موجود ہوا۔ ظفر اس کے شوروم پر صرف ایک ڈیلر کا کام کرتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں وہ شوروم کا انتظام سنبھالتا تھا۔ انتظام سنبھالتے سنبھالتے ظفر میاں نے یہاں بھی اپنے ہاتھ دکھانی دیئے تھے لہذا دوست نے آ کر جب حساب کتاب کیا تو تقریباً چچا س ہزار روپے کا گھلائکا۔ ظفر کی ملازمت تو جانی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیاث پچا نے اچھے دتفوں میں زمین کا ایک ٹکڑا جو اپنے بڑھاپے کے لیے کر سنبھال رکھا تھا وہ بھی پک گیا کیونکہ اب غیاث پچا کے پاس ظفر کو دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

اب ظفر بے روزگار تھا لیکن خٹاٹ اس کے اب بھی وہی شاہزاد تھے۔ محنت کر کے روزی کمانا اس نے بھی سیکھا نہیں تھا اور اسے بھیش سے شارت کٹ استعمال کر کے ایک ہی رات میں لکھ پتی بننے کا جتوں تھا۔ اسی ڈہن کے خناس کی وجہ سے وہ مختلف جگہوں پر قسمت آزماتا رہتا تھا اور جو کچھ کمانا تا اس سے زیادہ لگا دیتا تھا۔ مثلاً بھی پر انس زبانڈ کی پرچیوں کے نمبر کا دھنہ شروع کیا تو کبھی مختلف لاٹریوں کے ٹکٹ اس کے گھر میں بکھرے نظر آتے۔ کبھی خلیج کے ممالک کے بروکرز سے مل کر ویزے کا کام شروع کیا تو کبھی چیولز کے ساتھ مل کر سونے کے بھاؤ لگاتا نظر آتا۔ غرض دنیا کا ایسا کوئی مختصر راستہ باقی نہیں بچا تھا، جو ظفر نے جلد دوست حاصل کرنے کے لیے نہ آزمایا ہو۔ لیکن ظاہر ہے، ایسے طریقوں سے اگر کوئی دوست مند بن سکتا تو دنیا اس وقت اُس جیسے کنگلوں سے خالی ہوتی۔ اس بے روزگاری نے اُسے مزید چیز اکر دیا تھا اور اب وہ باقاعدہ قواؤپی پر چلا نے بھی لگا تھا۔ قواؤ نغم کی پلی ہوئی ایک ایسی لڑکی تھیں، جن کی پروش میں تہذیب اور ادب و آداب کا لامعاڑ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ظفر کے اس روئے سے سہم جاتیں اور چپ کر کے گھر کے کسی کو نہیں میں سکری کمٹی یعنی رہتیں۔ لیکن ظفر کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلتی اور تیرے دن پھر وہ غیاث پچا کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی ہوتیں۔ گیارہویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد میں جب چند دن کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ان دنوں انہیں وہاں آتے جاتے اکثر دیکھتا رہتا۔ اب ہم بڑے ہو چکے تھے لہذا اب ہمارا اس بے تکلفی سے سبھی کے گھروں میں گھس جانا، خود ہمیں ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن، ہم سب محلے کے بڑے میدان میں وکیل گاڑی کے کرٹ کھیل رہے تھے، میں پینگ کر رہا تھا جب میں نے قواؤپی کو فضلو بابا سمیت تانگے پر سورا محلے کے پھانک سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ قواؤپی تانگے سے اتریں تو نہ جانے کیوں مجھے بہت کم زور دکھائی دیں۔ میں نے دُور ہی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا تو وہ ہلکے سے مُسکرا دیں۔ وہی گلابی مسکراہٹ، جس کا میں بچپن سے ہی دیوانہ تھا۔

ان کے گھر میں جاتے ہی رہجنے، جو کوٹ کیپنگ کر رہا تھا، ظفر کو ایک موٹی سی گالی دی اور مجھ سے کہا کہ ضرور اُس ظفر نے کوئی نیا مطالبہ دے کر انہیں گھر بھیجا ہوگا۔ قواؤپی کی ساری گہانی اب کوئی راز نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ ایک آدھ بار جب غیاث پچا و قوت پر ظفر کو پیسے نہیں ادا کر پائے تھے تو اس نے ان کے دروازے پر آ کر انہیں بہت بُرا جھلا کرہا تھا۔ اور بہت سی الٹی سیدھی باتیں اس زور دار آواز میں کی تھیں کہ پورے محلے کو پیچہ چل گیا کہ غیاث پچا جیسا شریف انسان کس غلط انسان کے چنگل میں پھنس چکا ہے۔

کچھ ہی دیر میں فضلو بابا اندر سے لاٹھی لیکتے تک اور مجھے آ کر کہا کہ ”وجیہہ بی کہتی ہیں کہ آدمی شام کی چائے ہمارے ہاں پینے گے۔“
 یہ فضلو بابا کا مخصوص انداز تھا، وہ وجیہہ بی کی بات کو باقاعدہ حکم کی طرح آ کر سنا جاتے اور جواب کا انتظار کیے بنا ہی پلت بھی جاتے۔ نخوان کی بہت اچھی نقای کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر فضلو بابا ہوتے تو وہ لاٹھی لے کر خونکے پیچھے بھاگتے اور ہم سب نہیں کروٹ پوت ہو جاتے تھے۔
 میں ہوا آپی کے گھر میں داخل ہوا تو وہ صحن میں ہی چائے کی میرجاۓ پیشی تھیں، ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جسے وہ بڑے انہاک سے پڑھ رہی تھیں۔ میرے دل میں درود کی ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ تقدیر نے اس میرکی غزل اور خیام کی رباعی جیسی گل اندازمڑکی کو یہ کس جاہل جلاڈ کے کھونٹ سے باندھ دیا تھا۔ اسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ دردار غالب شاعر تھے یا کسی لاڑکی کپنی کے لئک فروخت کرنے والے بردا کر۔
 پہنچنے والی کی نشر اور شاعری کی کتابیں بھی باقی رہنے والی تھیں یا پھر انہیں بھی بچ کر کھا گیا تھا؟
 ہوا آپی نے مجھے دروازے میں کھڑے دیکھا تو آواز دی۔
 ”اندر آ جاؤ آدمی..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....؟“

<http://kitaabghar.com>

میں کچھ جھکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا انہوں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
 ”مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اتنے دن سے ہوا آپی کی یاد نہیں آتی اب کیا.....؟“
 ”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے آپ سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، پر کچھ جھجک سی ہوتی ہے۔“
 وہ حیرت سے نظر میں اٹھا کر بولیں۔
 ”جھجک کیسی جھجک؟“

”وہ میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا..... اس لیے“
 میرا جواب سن کر ہوا آپی زور سے ٹکلٹکا کر پڑیں۔
 ”اوہ..... تو یہ بات ہے ہمارا آدمی اب بڑا ہو گیا ہے واقعی بھی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اماں اماں بات سنیں نا..... آدمی کیا کہہ رہا ہے۔“
<http://kitaabghar.com>

انہوں نے آوازیں دے کر سینہ خال کو بھی باور پیچی خانے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور ہنستے ہنستے انہیں بھی میری کہی ہوئی بات بتائی۔ سینہ خالہ بھی زور سے پس پڑیں۔ میں دم بہ خود انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔ کتنے دنوں کے بعد اس گھر میں ہوا آپی کی آواز گونجی تھی۔ مجھے انہیں ہنستے دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا اور میں نے اسی لمحے اپنے دل میں خدا سے گلوگڑا کر دعا کی کہ یا میرے مولا! اس موصوم ہڑکی کے ہونوں پر یہی سدا کے لیے داں کر دے۔

اس شام انہوں نے بہت دیکھ مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ کیڈٹ کالج کے بارے میں بھی پوچھتی رہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگلا سال ہمارا اکیڈمی کا آخری سال ہو گا اور میری بہت خواہش ہے کہ کاش وہ بھی میری پاسنگ آؤٹ پر یہ دیکھنے کے لیے میرے کالج آئیں۔ اس دن میں

نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں صرف انہی کے کہنے پر واپس کیڈٹ کا لج گیا تھا لہذا میری پاس گ آؤٹ سلامی پر یہ کی اصل حق وار بھی وہی ہوں گی۔
 یہ سن کر ان کے ملٹچرے پر اوسی کا ایک بلکا سا باول چھایا پھر وہ جلدی سے مسکرا کر بولیں کہ وہ پوری کوشش کریں گی کہ کسی طرح وہاں آ سکیں۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ان کا میری پاس گ آؤٹ پر اتنی ڈور آنا ناممکن ہے۔ لیکن وہ ہوا آپی ہی کیا جو کسی کا دل توڑ دیں.....؟ یہ ہنر تو انہوں نے ساری زندگی سیکھا ہی نہ تھا۔ سو اس لمحے میرے دل کو بھی انہوں نے اُسی خوبصورتی سے بھلا دیا۔
<http://kitaabghar.com>

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں کانج چلا آیا۔ لیکن ہوا آپی کی اس شام کی باتیں اور بارہوںیں جماعت کے بارے میں کی ہوئی صحیحیں بھی میرے سنگ سنگ تھیں۔ جب کبھی میں ذرا سی دیر کے لیے بھی تھکن ڈور کرنے کے لیے آنکھیں موندھ لیتا تھا وہی گلابی شام کی ملاقات میرے ذہن کے کسی گوشے سے چھم سے چھم سے میری آنکھوں میں اتر آتی تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش

ریشمی خطہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوی و سراغرسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغرساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریغتہ ہو گیا تھا۔ ان کی مکانہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ شخصی خیز ناول۔ سراغرساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جانے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطہ**..... جو کتاب گھر کے جاسوی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوی دنیا جیسے بہترین جاسوی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اردو مصنف انہی صفائی کے شری قلم کی کاث دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیا اور مزاجیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر طنز و مزاج سیکشن میں پڑھا جاستا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

"آخری بنک"

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

فہد صاحب کو بیک ہو گیا تھا کہ ہم رات کو ہمیں نہ کہیں نہ کہیں غائب ضرور ہو جاتے ہیں۔ لہذا انہوں نے ہائل کے یہ دنی جنگلے کے تالے بد دیے تھے۔ ہم ویے بھی اوپر والی منزل پر تھے اور اس کی راہداری کے آخری جنگلے کی، ہم نے جمع بیرے کی مدد سے چاہیوں کی نقل ہنا کھی تھی۔ لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم پر یہ روح فرسا اکٹشاٹ ہوا کہ وہ جنگلہ ہی ختم کر کے وہاں مستقل دروازہ لگا کر گارڈ بھاڑایا گیا ہے۔ اب ہمارے پاس واحد راستہ چھٹ سے نیچے اترتے ہوئے پانی کے پائپ تھے، جن سے لٹک کر ہم رات کو ناٹ فالن کے بعد نیچے اتر آتے اور جلوے شیرین ہوٹل سے کبھی کھانا، کبھی چائے اور کبھی کھارٹی کے گاس غنا غاث چڑھا کروا پس انہی پاؤں کے ذریعے چھٹ تک پہنچ جاتے اور چھٹ کی سیڑھیوں سے اندر دوسرا ہمی منزل کی راہداری تک پہنچ کر سو جاتے۔

ہمارے سالانہ امتحانات قریب آرہے تھے اور ہم آج کل رات کو بہت دیر بیک پڑھتے تھے کیونکہ بارہویں جماعت کے لیے لائٹ آف کی پابندی ان کے امتحانات کے قریب ختم کر دی جاتی تھی۔ ایسے میں موٹے بھٹی کو رات بارہ بجے کے بعد بھوک کا ایک آدھ دوڑہ ضرور پڑتا تھا، اور وہ ہماری جان کے درپے ہو جاتا کہ کچھ کھانے کے لیے چلا جائے۔

اس رات بھی میں اسٹر اور فیصل کیمپری کے فارمولے رٹ کر ایک دوسرے کو سوار ہے تھے۔ ساڑھے بارہ بج پہنچے تھے کہ اچانک بھٹی کے پیٹ کی بھٹی اگڑائی لے کر جاگ آئی اور وہ ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا کہ اسے فوراً مرغ چھو لے کھانے کو چاہیں۔ کچھ دیر تو ہم اس کی بک بک نظر انداز کرتے رہے پھر اسٹر نے بچ کر کتاب پڑھ دی۔

”یار پہلے اس موٹے کا کچھ کرو..... اس کی باتیں سن کر تو مجھے بھی بھوک لگنے لگ گئی ہے۔“

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اصل میں ہم سب کا دل بنک کے لیے مچل رہا ہوتا تھا لیکن ہم سب بھٹی کے بولنے کا انتظار کرتے رہے تاکہ کسی مصیبت کی صورت میں ہمیں الزام دینے کے لیے کسی کا کندھا دستیاب ہو۔

ہم نے مجید چھوٹ سے بھی پوچھا کہ کیا ارادہ ہے۔ وہ پہلے ہی سے چھٹ پر بیٹھا چاند کی روشنی میں ریاضی کے تھیورم اپنی موٹی کھوپڑی میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فوراً کتاب دور پھینک دی کہ جب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں جائے گا، وہ کچھ بھی رٹ نہیں پائے گا۔

ہمارا اصول یہ تھا کہ ہم ایک ایک کر کے چھٹ سے نیچے اترتے تھے۔ سب سے پہلا لڑکا اتنے کے بعد کچھ دیر آس پاس کا جائزہ لیتا اور پھر ہمکی سیٹی بجا کر اشارہ کرتا تب دوسرا اور پھر اسی طرح تیرا اور چوتھا لڑکا پائپ سے لٹکتے ہوئے نیچے اتر جاتا۔ سب سے پہلے مجید چھوٹ نے

آستینیں اور کیس اور چھت کی منڈیر پر پاؤں نیچے لٹکا کر پائپ ہاتھوں سے تھام لیا اور نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم کافی دری تک اُس کے سکھل کا منتظر کرتے رہے لیکن نیچے سے سوائے ایک دھپ کی آواز جو شاید مجید چھوٹو کے کوئے کی آواز تھی، دوسری کوئی آواز نہیں آئی۔ آصف بھی جس کا بھوک کے مارے رہا حال ہو رہا تھا اس نے مجید کوئی صلوٰتیں نہیں کیتے ہوئے کہا کہ وہ پھر سیئی مجانا بھول گیا ہو گا لہذا بھی نے پائپ تھاما اور وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم نے پھر چند ہی لمحوں میں بھی کہ اترنے کی آواز تو سنی لیکن اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اب میں، فیصل اور اس فر چھت پر رہ گئے تھے۔ ہم شدیداً بھجن میں تھے کیونکہ اگر نیچے کسی بیٹی آفیسر وغیرہ نے انہیں بھاگتے ہوئے کپڑا بھی لیا ہوتا تو شور شراہ تھا۔ یہ دونوں تو نیچے جا کر بالکل ہی چپ ہو گئے تھے۔ اب فیصل کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ضرور یہ دونوں کسی شرارت کے چکر میں ہیں۔ لہذا وہ خود جا کر دیکھتا ہے۔ فیصل اڑا اور پھر وہی خاموشی..... میں اور اس فر اور پھر چند لمحے منتظر کرتے رہے اور پھر میں نے اس فر سے کہا کہ اب میرے صبر کا پیانا لبریز ہو گیا ہے۔ میں نیچے جا رہا ہوں لیکن اگر اگلے پانچ منٹ تک میری سیئی کی آواز اُسے سنائی نہ دے تو وہ نیچے نہ اترے بلکہ وہیں چھت پر رہا منتظر کرے یا پھر نیچے اڑیسہری میں جا کر ہمارے لیے ”مگک“ کا بندوبست کرے۔

میں نے دل ہی دل میں ان تینوں کو سخت نہیں کیتے ہوئے پائپ کو تھاما اور چھت کی منڈیر سے نیچے اتر کر پائپ سے لکھتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ ابھی تین چار فٹ ہی نیچے اڑا ہوں گا کہ اچاک بھجے یوں لگا کہ جیسے میں خالی میں تیر رہا ہوں۔ پائپ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں کسی نرم اور بچھی سی چیز پر آکر گرا، زور دار دھپ کی آواز آئی اور کسی کی نہایت کی آواز کے ساتھ ہی میراڑا ہنڑوں کی دوب گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے اور کوئی بوری آکر گری اور اس بارہ بارہ بارہ کی باری میری تھی۔ کچھ دریتک ہمیں کچھ کچھ میں نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ میرے بازو میں، جو نیچے نکل رہا تھا شدید درد ہو رہا تھا۔

پھر سب سے پہلے میرے حواس اس وقت بیکجا ہوئے جب بھی نے زور سے ہائے مر گیا، کافریادی نعرہ لگایا۔

ہم پانچوں نیچے زمین پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے اور میرے اوپر گرنے والا بوجھ کسی بوری کا نہیں تھا بلکہ اس حقیقی اس فر کا تھا جو میری ہدایت کے باوجود چھت سے اترنے کی حقیقت کر بیٹھا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ پائپ جس سے لٹک کر ہم نیچے اترتے تھے، چھت سے تین فٹ کی لمبائی تک نیچے آنے کے بعد یک دم ہی غائب ہو چکا تھا، لہذا خلاء میں تیرنے کا جو تجربہ ابھی کچھ دری پہلے ہم سب ہی کو ہوا تھا وہ اسی پائپ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ ہم پانچوں دوسری منزل سے پائپ ختم ہونے کے بعد ہوا میں قابازیاں کھاتے ہوئے سیدھے نیچے زمین پر ”دھپ دھپ“ گرتے رہے اور ہم سب میں سب سے زیادہ بُری حالت مجید چھوٹو کی تھی۔ جو سب سے پہلے چھت سے اترتا تھا۔ اُترا کیا تھا کسی ٹوٹے جہاز کی طرح رن وے پر گرا تھا۔ ہم نے بمشکل اور ہرا ہر کو رکھنے نیچے سے مجید چھوٹو کو ڈھونڈ کر نکالا۔ وہ بالکل ہی بے سعد ہڑا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم سب نیچے گھنڈی ہوئی کیا ریوں میں سے ایک کے اندر آکر گرے تھے، ورنہ اگر زمین سخت ہوتی تو شاید ہماری بُری چھٹی ایک ہو جاتی۔ لیکن اس وقت بھی ہم سب کی حالت انتہائی مندوش تھی۔ مجید چھوٹو اور بھی تو باقاعدہ ہے جو شو ہو چکے تھے۔ جنہیں ہم بُری مشکل سے گھیٹ گھیٹ کر کیا ریوں کو پانی دینے والے فوارے سے منہ پر پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لائے۔

امہی ہم اپنے ہوں جمال بھی نہ کر پائے تھے کہ اچانک ہی چاند گاڑی کی روشنی برہ راست ہمارے اوپر آ کر پڑی۔ ہم میں اس وقت اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ انھ کر بھاگ ہی جاتے یا کسی درخت یا جہاڑی کے پیچھے چھپ جاتے۔ کچھ ہی ویر میں بخشوی۔ پی۔ اوہ ہمارے سر پر ثارچ تانے کھڑا ہیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ یہ آدھی رات ہم پانچوں ان کیا ریوں میں لیٹ کر کون سی با غبانی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اسے بہت سمجھا نے کی کوشش کی کہ رات کو سبزے میں لیٹ کر پڑھنے سے سبق جلدی ذہن نشین ہوتا ہے لیکن اس نے ہماری ایک نہیں سنی اور ہمیں انھ کر اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم انھ کر چل سکتے تو اب تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے جہاں سی۔ پی۔ اوکے فرشتے بھی ہماری خبر نہ پا سکتے۔ سب سے پہلے اس نے انھ کر ”چلنے“ کی کوشش کی اور دوسرا ہی لمحہ لڑکھا کر دوسرا کیا ری میں زمین بوس ہو گیا۔ اب بخشو کو حالات کی سگنی کا احساس ہوا اور کچھ ہی لمحوں بعد ہم سب کو چاند گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹرنو کے ہسپتال کی جانب یجا یا جارہا تھا۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اگلے دن ہم پانچوں ہاتھوں اور پیروں پر پلا سڑچڑھائے ہسپتال کے وارڈ میں ایک لائن سے بستروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ پلاسٹر اگلے چار ہفتے کے لیے ہمارے جسموں پر منڈھا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ گزشتہ شام ہی مزدوروں نے فہد صاحب کے کہنے پر وہ پاسپ کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ دوسری جانب نئے پاسپ ڈال دیئے گئے تھے اور اب وہ پرانے پاسپ متروک ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ ہمارا آخری بیک ثابت ہوا کیونکہ چار ہفتے بعد جب وہ پلٹر ہمارے جسموں سے اتراتا دو دن بعد ہمارے سالانہ امتحانات کے پرچے شروع ہونے کی تاریخ تھی اور سالانہ امتحان کے بعد ہماری آخری پاسپ آؤٹ پر یہ ہونا تھی۔ اس رات کے زخموں کے نشان ایک میٹھی یاد ہن کرہیں کے لیے ہمارے جسموں پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے، جو ہمیشہ ہم پانچوں کو اس آخری اور ناکمل بیک کی یاد دلاتے رہے۔

کتاب گھر کی پیشکش آراء ہسنے اور ہسنے کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

حسنہ اور ہسنہ آراء اور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کی 4 تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ایک کہانی حسنہ اور ہسنہ آراء پہلی بار آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ عمیرہ احمد کا TV کے لئے یہ پہلا منی سیریل بھی تھا اور یہ TV کی تاریخ کے مبنی ترین منی سیریل میں سے ایک تھا..... اپنی قصیم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متازع ملے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ جیران گن اور متازع ہے۔

حسنہ اور ہسنہ آراء کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے ناول سکش میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش رشتوں کی سولی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

و جو آپی کے غنوں کی داستان ظفر کی بے روزگاری سے شروع ہوئی تھی یا پھر یہ ان کے درد کی آخری صورتی۔ اس کا فینڈل سمجھی کوئی نہیں کر پایا۔ تابوت میں آخری کیل اسی روز ٹھونک دی گئی تھی جب ظفر نے جوئے کی پہلی بازی دوستوں کے کہنے پر اس امید پر کھیل کر شاید جس دولت کے انبار کی کھونج وہ باہر بازار میں کر رہا تھا، وہ یہاں اس بند کرے کے دھوئیں بھرے ماحول میں لگی اس بازی کے ذریعے اس کے قدموں میں اپنا ماتھا ایک دے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا ”جواء..... کسی کامہ ہوا..... تو پھر وہی جواء ظفر پر کیسے مہربان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ لکلا کر جو کچھ جیب میں تھا وہ باتھ کی گھڑی اور سرال کی جانب سے پہنانی گئی انکوٹھی سمیت وہیں کمرے کی میز پر چھوڑ کر لکھنا پڑا، ساتھ ہی ساتھ گلے میں اچھے خاصے قرض کا طوق بھی پڑھ کتا تھا۔

ظفر نے حبِ معمول یہ سارا بوجھ گھر آ کر جو آپی کے نازک کندھوں پر دے ڈالا اور پھر سے انہیں ایک لمبی رقم کی وصوی کے لیے غیاث پچاکے پاس جانے کے لیے کہا، لیکن جو آپی جانتی تھیں کہ اب ان کے میکے کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اپنا زیور اور چند قیمتی چیزیں جو دوہا اپنے جہیز میں لائی تھیں، وہ سب کا سب پہلے ہی ظفر کے حوالے کر چکی تھیں۔ لہذا پہلی بار انہیں ظفر کو ناں کہنا پڑا اور یہی ناں ظفر کو آگ بگول کرنے کا باعث بن گئی۔ اس نازک سی چھٹا نک بھر لڑکی کی یہ مجال کہ وہ اس کو ناں کہے۔ وحشی پن میں وہ رشتوں کا احترام بھی بھلا بیٹھا اور اس کا انہا ہوا باتھ وہ کے چہرے پر اپنانشان چھوڑ گیا۔

راجہ کے خط مجھے اب بھی اُسی تسلیم سے آتے تھے۔ اور وہ آس پاس کی سنی سنائی اور اپنی آنکھوں دیکھی ہراہم خبر کی تفصیل مجھے لکھ کر پہچانتا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ایک خط نے میرے بہت سے پرانے زخم اور ہیڈر کر کھو دیئے۔ راجہ نے لکھا تھا کہ بالآخر طاہر بھائی کے قتل کے پانچ سال بعد اُشو کی پچانی کی تاریخ مقرر ہو ہی گئی اور اس بار یہ تھی تاریخ تھی۔ کیونکہ اس کی تمام اپلیں مسترد ہو چکی تھیں۔ جمارے سالانہ انتخابات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل یعنی بائیس (22) اپریل اس کی پچانی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔

حالانکہ محلے کے ہر فرد نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا لیکن کوئی ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کا چین اور سکون اس خبر نے لوٹ لیا تھا۔ اور وہ بد نصیب تھی اُشو کی ماں..... جب تک کیس چلتارہا اور لوگ اس کے بیٹے کے ظلم کی داستانیں بیان کرتے رہے، وہ خود جھوٹی آسمان کی جانب اٹھا اٹھا کر اُگو کو بددعا کیں دیتی رہی، لیکن جب حکومت نے اس کی موت کی تاریخ مقرر کر دی تو ماں کا صبر و قرار اچا نک ہی لٹ گیا۔ کچھ بھی ہو..... ماں آخر مار ہی تو ہوتی ہے اُس نے جس اُگو کو نو ماہ پیٹ میں اور پھر اپنے ہاتھوں کے پالنے میں جھولا جھلا کر بڑا کیا تھا، اسے سُولی پر لکھتا کیسے دیکھ سکتی تھی؟.....

بالے نے راجہ کو بتایا تھا کہ جس دن سے اس کی ماں کو اٹو کی پھانسی کا پتہ چلا تھا، اس دن سے وہ راتوں کو اچانک ہی جاگ آئتی اور سجن کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس کے اندر کا اضطراب اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اور کوئی اس سے بات کرنے تو وہ یوں پھونک پڑتی تھی، جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہرگز رتنا دن اٹو کی پھانسی کی تاریخ کو قریب لاتا جا رہا تھا اور اٹو کی ماں کے چہرے سے خون کا رنگ متاثرا جاتا اور وہ روز بروز پیلی پڑتی جاتی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اور پھر آخر کار وہی ہوا جس کے لیے مائیں مشہور ہیں، اٹو کی ماں بھی اپنے دل سے ہار گئی اور اس نے بچوں کو بھوت کروتے ہوئے بالے کے باکے سامنے باتھ جوڑ دیئے کہ وہ اس کے ساتھ طاہر بھائی کے اماں ابا کے گھر جا کر ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیں کہ ان کے بیٹے کے اس گناہ عظیم کو بخش دیا جائے۔ اٹو کے باپ نے یکسر انکار کر دیا کہ آخر وہ کس منہ سے ایک مقتول بیٹے کے غم زدہ ماں باپ کے زخمیوں پر مزید نمک چھڑ کنے جائے گا۔ ماں نے وہاں بات بنتی نہ دیکھی تو خود ہی اپنی بیٹی کو لیکر عزیزہ خالہ کے در پر جا کر بیٹھ گئی، اس روز سارا محلہ اس کی آہ و بکا سے لرزتا رہا، بھی محلے داروں کو اٹو کی ماں سے ہمدردی بھی تھی لیکن اٹو کا جرم ہی ایسا تھا کہ اس قلم کے آگے ہر ہمدردی یعنی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اٹو کی ماں نے اب اپنا یہ وظیرہ بتایا تھا کہ وہ صبح سوریے طاہر بھائی کے گھر کے باہر آ کر بیٹھ جاتی اور رات گئے تک چپ چاپ بنا کچھ کھائے پینے وہاں پڑی رہتی اور گھر سے باہر آتے جاتے ہر شخص سے اٹو کو معافی دلوانے کی فریاد کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کی اپنی حالت بھی لمبے فاصلوں کی وجہ سے گہلانے لگ گئی تھی اور کئی مرتبہ وہ ہیں دروازے کے پاس بے ہوش پڑی ملتی۔ تب اٹو کے ابا یا کوئی اور ہمدردا سے اٹو کا گھر بھجوادیتے۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ پھر اسی در پر ماتھا لیجئے ہوئی نظر آتی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ طاہر بھائی کے باہلکور چچا خود ایک روز اس پر غصے سے برستے برستے روپڑے کہ وہ کیوں روزانہ ان کے خاندان کے خذی دلوں کو مزید گھائل کرنے کے لیے یہاں آ جاتی ہے۔ جب ایک بار اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی صورت اٹو کو معاف نہیں کر سکتے اور اسے پھندے پر لٹاتا دیکھ کر ہی ان کے زخم کچھ مندل ہو سکتے ہیں تو پھر روزانہ کی اس بحث سے کیا حاصل ہے؟

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

لیکن یہاں مسئلہ صرف اٹو کی سولی کا نہ تھا۔ وہ تو سولی پر لٹک کر ہمیشہ کے لیے نجات پا جاتا اور اگلے جہاں میں اپنے گناہوں کا حساب دیتا پھرتا لیکن اس کے پھندے پر لٹکنے کے بعد یہاں دنیا میں اس کے اپنوں کو مرتے دم تک جس سولی پر شکار ہنا تھا اس کا حساب دینے والا کوئی نہ تھا۔ بھی جانتے تھے کہ اٹو کے ماں باپ کس قدر بھلے لوگ تھے اور سمجھی کا دل ان کی اس اذیت سے کٹا جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی جس نے جرم کیا تھا وہ تو چند لمحے پھندے پر جھولنے کے بعد بڑی ہو جائے گا لیکن جو بے قصور ہیں وہ ساری عمر اسی سولی پر جھولتے رہیں گے۔ یہ کیا انصاف تھا؟؟

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پھر سب سے پہلے یہ بات طاہر بھائی کے ابا کی سمجھی میں آگئی کہ پھندہ صرف اٹو کے گلے میں نہیں، بلکہ نہ جانے اور کتنی جانوں کو لگے گا، اور شاید ان میں اٹو کے خاندان کو عمر بھر پھانسی پر لٹکتے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی الہذا ایک ڈھلتی شام جب اٹو کی ماں اپنی دیران آنکھیں لئے ان کے دروازے کے سامنے مٹی میں خاک ہوئی پڑی تھی، انہوں نے گھر سے چادر لا کر اس پر ڈال دی اور اسے اٹھا کر اپنے گھر کے محجن میں لے آئے۔ عزیزہ خالہ نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور اپنے میاں کو ڈھکی دے دی کہ اگر انہوں نے ان کے بیٹے کے قاتل کو معاف کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو وہ ان کا مرہ ہوا منہ دیکھیں گے۔ اٹو کی ماں عزیزہ خالہ کے کمرے کے دروازے سے سرخ پختہ کر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

لہو لہاں ہو گئی تین وہ دروازہ اُس پر کھٹکی نہ کھلا۔

شکور پچانے والے کے ابا کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے اپنے خدا کے لیے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا ہے لیکن وہ اُس کی ماں کے ہاتھوں مجبور ہیں، جس کا دل اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھنے کے بعد پتھر ہو چکا ہے۔ لہذا وہ اس دوسری ماں کو آکر سننگا لیں جو اپنے بیٹے کی جان پچانے کے لیے خود اپنا آپ گنوائے دے رہی ہے، اور وہ چاہ کر بھی اُس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے کیونکہ اگر وہ دوسری ماں کا ساتھ دیتے ہیں تو اپنی آخری عمر کے سہارے یعنی اپنی شریک حیات کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔

والے کے ابا والے کے ساتھ آئے اور نہم بے ہوشی اُٹو کی ماں کو وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ یہ بھی انہی کا ظرف ہے کہ اپنے بیٹے کے قاتل کی ماں کو انہوں نے اس قدر رعزت دی۔ اگلی صبح اُٹو کی پھانسی کی تاریخ مقرر تھی اور وہ رات والے کے گھرانے پر کس قیامت کی طرح اتری تھی، شاید اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اگلی صبح چار بجے جیل کے معمول کے مطابق، گاڑی طاہر بھائی کے دروازے پر ان کے اماں ابا کو بطور وارث پھانسی گھاث پر پھانسی کی شہادت کے لیے لینے آچکی تھی۔ خالہ عزیزہ اور شکور پچاچاپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر جیل کی جانب روانہ ہو گئے جیل کے باہر انہیں اُٹو کے ماں باپ بھی کھڑے نظر آئے جو اپنے بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے وہاں خود لاش بنے کھڑے تھے۔ اُٹو کی ماں کے آنسو شک ہو چکے تھے اور اب وہ خالی آنکھوں سے خلامیں گھور رہی تھی۔ جیلر شکور پچا اور خالہ کو لے کر پھانسی گھاث پہنچ گیا تھا اور ڈاکٹر، مجسٹریٹ اور جلا دبھی اپنی ڈبوٹی پر موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں اُٹو کو کمر پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ دو حافظتے آئے۔ اُٹو کے پیروں میں جان بالکل بھی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنے محفوظوں کے کانہ دھوں پر بوجھ دا لے تقریباً لٹکتا ہوا پھانسی گھاث تک لا گیا تھا۔ اس کا سذہ جسم سوکھ کر کا نشا ہو چکا تھا اور آنکھوں کی روشنی بچھ چکی تھی۔

شکور پچا اور خالہ عزیزہ پتھر ای ہوئی آنکھوں سے جلا دکو اُٹو کے چہرے پر سیاہ کپڑا اڑھانپتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھانسی کا پھنڈہ اس کے گلے میں ڈال کر جلا دبھی کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے اپنی جگہ پر جا پہنچا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر ان کی گھٹی پر تھی تاکہ وہ ایک سینڈ کی بھی جلدی یا تاخیر کیے بنا جلا دکو لیور کھینچنے کا اشارہ کریں۔

جلیر نے آخری مرتبہ عزیزہ خالہ اور شکور پچا کی طرف دیکھ کر قصد اپنے چاہتی اور دونوں کی خاموشی کو رضا مندی سمجھتے ہوئے مجسٹریٹ سے اجازت کی درخواست کی۔ مجسٹریٹ نے وقت پورا ہوتے ہی جلا دکو اشارہ کیا اور جلا دنے لیور کھینچنے کے لیے اپنی طاقت مجتع کر کے لیور کپڑا لیا۔ مجسٹریٹ نے اپنارو مال ہلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فضائیں ایک کرب ناک چیخ اُبھری اور دم توڑ گئی۔

عزیزہ خالہ کو آخری لمحے میں جیسے کسی نے نیند سے نیندھے برف پانی کی پوری بالٹی پھینک کر جگا دیا ہو۔ وہ ایک جھر جھری لے کر جا گئیں اور زور سے چیخ پڑی تھیں۔

”معاف کر دیا..... میں نے اسے معاف کر دیا..... میں نے اسے اللہ کے واسطے اور اپنے طاہر کے صدقے معاف کر دیا..... معاف کر دیا.....“

عزیزہ خالہ روئی جاتیں اور یہی گروان کئے جاتیں..... جلا دنے جلدی سے اُٹو کے چہرے سے غلاف ہٹایا۔ پھانسی کا قیدی ویسے ہی ادھ مرا ہوتا ہے اور پھر جو قیدی پھانسی گھاث کی سیرھیاں چڑھ کر پھنڈہ بھی گلے میں ڈلا چکا ہو، اس کے حواس تو بالکل ہی غائب ہوتے ہیں۔ اس لیے اُٹو کو بھی ہوش میں آنے اور یہ یقین کرنے میں بہت دیر گی کہ اُسے طاہر بھائی کے ماں باپ نے بخش دیا ہے۔ چند لمحے تو وہ اجتنی اور پھیلی پھیلی ہنگا ہوں سے ان سب کو دیکھتا رہا اور پھر جو وہ پھر ٹوٹ کر روایا تو یوں برسا کر اُس نے اپنے آس پاس کی ہر آنکھ کو ڈیودیا۔ اُٹو کی فلک شگاف چیزوں سے ساری جیل گونج رہی تھی اور وہ یوں بچوں کی طرح زار و قطار رورہا تھا کہ جیسے اپنی عمر بھر کے آنسو آج ہی بہادے گا۔ اس نے اپنا سر عزیزہ خالہ کے قدموں میں رکھ دیا اور اپنا سرز میں پر ٹھیک ٹھیک کر جو بہان کر دیا۔ اُس کے اندر کا انسان جا گا لیکن بہت دیر کے بعد.....

باہر جب اُٹو کے ماں باپ کو اس کی زندگی کی نویڈی طے تو انہیں سجدہ شکرا کرنا بھی یاد نہیں رہا، وہ دونوں بھدے میں تو گرے لیکن تسبیح تک بھول گئے۔ یہ ایک ایسی شادی مرگ کی کیفیت تھی جسے انسانی لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگ سکتے ہیں جن کا اپنا کوئی چکر کا نکڑا موٹ کی دلپیڑ کو چھوکر واپس پلنا ہو۔

عزیزہ خالہ نے اُٹو کی جان بخشی کر دی، لوگ ان کی عظمت کے ایسے قائل ہوئے کہ ان کی محبت عقیدت میں بدل گئی۔ چند دن بعد اُٹو کو بھی اس راضی نامے اور معافی نامے کے بد لے جیل سے رہائی مل گئی کیونکہ اپنی قید کی سزا وہ پہلے ہی ان پانچ سالوں میں پوری کر چکا تھا، لیکن جیل سے باہر آنے والا اُٹو وہ اُٹو نہیں تھا جو اندر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایسا بدلہ ہوا انسان تھا، جس نے اسی دنیا میں اپنی ہر قلطی کے مدارے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

اُٹو کو تو قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن اُس کی کرنی کی وجہ سے ہو آپی جس قفس میں جا گری تھیں اس قید سے وہ کبھی رہائی نہیں پا سکیں۔ ظفر کے مطابق دن بہ دن بڑھتے جارہے تھے اور ان کے بوڑھے ماں باپ کے پاس اب ایسا کچھ نہیں بچا تھا جو وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی نذر کر سکتے۔ حتیٰ کہ غیاث چچا نے اپنا ہجی۔ پی فند بھی دفتر سے نکلا کر ظفر کی فرمائشوں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایک بے کار اور گھر میں چار پانی توڑتے ہوئے شخص جس کی جھوٹی شان اور دوستوں کے دکھاوے کے لیے لانا نے کی کوئی حدش ہوا س کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ہو تو کم پرستا تھا، لہذا اس کی ہو آپی سے تکرار بھی دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب تو اس کا ہاتھ بھی کھل چکا تھا لہذا وہ گاہے لگا ہے لگا ہے ہو آپی پر باتھا تھا نے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن ہو آپی کو خدا نے جس مٹی سے بنایا تھا اس میں شکایت یا افتک کرنے کا خیر شامل نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی انہوں نے اپنے ماں باپ ہی کو اس بات کی کبھی بھک بھی پڑنے دی کہ ان کی وہ بیٹی جسے اپنے گھر میں گرم ہوانے بھی کبھی نہیں بچوایا تھا اور جس کی زبان سے اُٹ نکلتے سے پہلے ہی ہر کوئی اپنی پلکیں اس کی راہ میں بچھا دیتا تھا وہ اب کس حال میں ہے۔ لیکن وہ نہ بھی بتا تیں تو کیا ہوتا؟..... غیاث چچا کی جہاندیدہ نظریں کیا ایسا ہر راز پانے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں؟ اور کیا ان کی چیختی اماں، جوماں ہونے سے زیادہ ان کی سیکھی بھی تھیں، کیا انہیں اپنی بیٹی اور سیکھی کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دکھائی نہ دیتا ہو گا؟ ظفر کی چڑچڑاہٹ بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے اب اندازہ ہو چا تھا کہ وہ جو آپی کے میکے پاس انہیں دینے کے لیے اب کچھ نہیں بچا تھا، ان تلوں میں جتنا بھی تیل تھا وہ پہلے ہی نچوڑ چکا تھا۔ اُٹو کا معاملہ اس کی پھانسی ملنے سے ایک بار پھر اٹھا تو اس کے ہاتھ و جوکو ظفر اور طعنوں سے چھلنی

کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا، اب وہ بہانے بہانے سے اٹو اور طاہر بھائی کے جھگڑے اور قتل کا ذکر چھینی دیتا اور جو کو گھائل کرنے کے لیے لفظوں کے ایسے ایسے تیر چلاتا کہ اس مخصوص اڑکی کی سانس ہی رکھنے لگتی۔ کبھی کہتا کہ غیاث پچانے اُسے دھوکے میں رکھ کر یہ شادی کروائی ہے۔ کبھی کہتا کہ اگر اُسے پہلے پہنچتا کہ وہ جو کا قصہ طاہر بھائی کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ کبھی اس گز ہے میں نہ گرتا۔ ظفر کمینگی کی اس حد تک گرچا تھا کہ اس نے اُس کے ساتھ بھی وجوہ کا نام جوڑ دیا اور اس کو عزیز ہے خالد کی طرف سے جو معافی ملی تھی، اُسے بھی اس نے وجوہ کو شوون کے کھاتے میں ڈال دیا کہ ضرور انہوں نے محلے جا کر طاہر بھائی کے ماں باپ کو مجبور کیا ہوا کہ اُس کو معاف کر دیں، تاکہ ان کا ایک عاشق تودیا میں انہیں سراہنے کو زندہ باقی رہے۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی جب ظفر نے باقاعدہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر باہر کے دروازے پر لاکھڑا کیا کہ یا تو گھر سے پکھر قدم لے کر آئیں یا پھر ہمیشہ کے لیے اُس کے گھر سے نکل جائیں۔ اور گھر بھی اس کا کہاں تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے مالک مکان روزانہ کرائے کے تقاضے کے لیے دروازے پر صحیح سوریے ہی آن موجود ہوتا۔ ظفر خود تو اُس سے جان چھڑانے کے لیے اب باہر نکلتا ہی نہیں تھا اور بے چاری و جو گوشہ مندہ ہونے کے لیے دروازے پر صحیح دینا۔ تو نے بھلا آج تک اپنی پوری زندگی میں ایسے معاملات کہاں جھیلے تھے۔ انہیں تو کسی غیر مرد سے بات کرنے کا بھی کوئی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ گھر میں تو فضلو بابا اور ان کے ابا ساری بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کا ذریعہ تھے اور پھر میں بھی تو تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی ٹھیکی والے سے یا سائیکل رکشہ والے سے بھی کبھی بات نہیں کرنے دی تھی۔ جہاں کہیں رابطے کی ضرورت ہوتی میں، فضلو بابا یا غیاث پچانہ ہمیشہ ان کی مدد کو موجود ہوتے۔ پنہنیں مجھے کبھی یا اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی ایرے غیرے مرد سے بات کریں۔ اس کام کے لیے ہم سب جو موجود تھے۔ خود وہ کوئی بھی میری اس عادت کا پتہ تھا اور جب کبھی رکشہ یا ہاتانے والے کو کرایہ دیا ہو تو یا پھر محلے میں پھری والے سے کچھ مٹوانا ہوتا تو وہ پہلی آواز مجھے ہی دیتیں اور اگر میں اس وقت نہ بھی ہوتا تو کسی اور بچہ یا فضلو بابا کے ذریعے کہلو چکتیں۔

اب ایسے میں جب انہیں مالک مکان کو کرایہ نہ دینے کی تاویلیں پیش کرنا پڑتی ہوں گی تو وہ کس اذیت سے گزرتی ہوں گی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ مالک مکان اچھے خاندان سے تھا اور وہ ظفر کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایک شریف گھرانے کی عفت مابینی اُس کم ظرف کے گھر آپنی ہے، اس لیے وہ جو کو دروازے پر دیکھ کر وہ زیادہ بحث کئے بناہی وہاں سے پلٹ جاتا تھا۔

لیکن گھوڑا اگر گھاس سے دوقتی کر لے تو پھر کھائے کیا.....؟ آخ کار پانچوں مینے اُسے ہوا آپی سے کہنا ہی پڑا کہ ان حالات میں تو اُس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ظفر کے نام و کیل سے کہہ کر نوش نکال دے کہاں پہلی سے مجھے مکان خالی کر دے، ورنہ معاملہ پولیس میں دے دیا جائے گا۔ پولیس کا نام سن کر ہوا آپی سرا سیمہ ہو گئیں اور انہوں نے دروازے کی اوٹ سے پہلی مرتبہ مالک مکان، جنہیں وہ سب خان صاحب کہتے تھے، سے درخواست کی کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے، پکھدن کی مزید مہلت دے دیں، وہ کو شش کریں گے کہ جلد از جلد کرایہ آتا رہیں۔ خان صاحب نے جواباً کہا کہ وہ صرف ہوا آپی کے کہنے پر ظفر کو مزید کچھ وقت دے رہا ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہے کہ ظفر بھی ان کا کرایہ نہیں پکھائے گا۔ اُس نے ہوا آپی سے کہا کہ اُسے ان پر ترس آتا ہے کہ ایک عزت دار خاندان کی لڑکی یہ

کس ذلت کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ اس نے ہوآپی کے سامنے ایک پیش کش رکھی جس سے اس کا کرایہ بھی ادا ہو جاتا اور خود ہوآپی کا ہاتھ بھی کچھ ٹکھلنے کا آسرا ہونے کی امید تھی۔ ہوآپی نے کہا کہ وہ خان صاحب کی بات غور سے سن رہی ہیں۔ وہ گھل کر بات کریں۔ خان صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک جانے والے پشاور سے اس شہر میں اپنی تعیناتی پر آئے ہیں۔ عہدے میں ریل کے بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، وہ سال کا ایک بیٹا اور آٹھ سال کی ایک بیٹی، دوسرا صوبے سے ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم درمیان میں ہی منقطع ہو گئی تھی اور جب تک انہیں اس شہر کے اسکول میں داخل کروایا گیا تو تب تک دونوں بچے اصل کورس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ خان صاحب نے ہو سے کہا کہ ان کے دوست نے انہیں کسی ٹیورٹر کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ اگر ہو مناسب سمجھیں تو ان میں دو گھنٹے ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں۔ اس طرح سے جو رقم انہیں فیس کے طور پر ملے گی اس کا آدھا وہ خان صاحب کو کرائے کے طور پر ادا کر دیا کریں اور آدمی رقم سے اپنا گھر چالایا کریں۔ خان صاحب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر ہو کا معاوضہ بھی دوسرے کسی ٹیورٹر سے کافی زیادہ متر کروادیں گے۔ شاید ماں لک مکان بہت پہلے ہی ہوآپی کے لب ولجھ اور ان کے تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے اطوار سے یہ بات جان پڑکا تھا کہ ہوآپی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ تبھی اس نے یہ پیش کش کی تھی۔ ہوآپی نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنے میاں سے بات کر کے انہیں بتائیں گی۔ خان صاحب انہیں دعاء کرو اپنی پلٹ گئے اور ہوآپی واپس پہنچنے تو ان کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ظفر جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑاں کی اور خان صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ دراصل جب ہو کچھ دری دروازے سے نہیں پہنچنے تو اس کی شکی مزاج طبیعت نے فوراً اس کے ذہن میں گھنڈ پد شروع کر دی اور وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے وجوہ کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے وجوہ کی اور ماں لک مکان کی ساری باتیں سُن لی تھیں۔ ہو کو اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، انہوں کیا چاہے؟ دو آنکھیں، اسے اور کیا چاہیے تھا۔ گھر میں پڑے پڑے یہوی کی کمائی کھانے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے ہوآپی کو حکم دیا کہ وہ کل سے ہی ٹیوشن پڑھانے کے لیے جانا شروع کر دیں اور کوشش کریں کہ دو تین ماہ کا معاوضہ ایڈو انس ہی مل جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ اگلے دن خان صاحب آئے تو ہو نے ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے اکیلے جانے سے مذدوری کا اظہار بھی کر دیا کہ انہوں نے کبھی اپنے میکے سے بھی اکیلے باہر قدم نہیں رکھا لہذا اگر ہو سکے تو بچوں کو شام نیکیں ان کے گھر بھجوادیا جائے تو بہتر ہو گا۔ خان صاحب نے بتایا کہ بچوں کا توہیاں آنا ممکن نہیں ہو گا کیونکہ وہ دونوں بہت ضدی ہیں، اور بمشکل ٹیوشن پڑھنے پر ہی رضامند ہوئے ہیں۔ اب ایسے میں ان پر مزید کوئی شرط رکھی گئی تو بالکل ہی پدک جائیں گے ہاں البتہ ریحان صاحب (خان صاحب کے دوست) ہر روز شام چار بجے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت بھجوادیا کریں گے جو دو گھنٹے بعد انہیں گھر واپس چھوڑ جایا کرے گی۔ ہوآپی کیا کہہ سکتی تھیں۔ ایک مختلہ آہ بھر کے چپ ہو رہیں۔

غیاث چچا اور سینہ خالہ کو جب ہوآپی کی نوکری کا پتہ چلا تو ان دونوں کے دل میں جیسے تیر سا گڑھ گیا۔ غیاث چچا تو وہ یہ بھی تقریباً بستر ہی سے لگ چلے تھے اور اب ان کی طبیعت زیادہ تر نہ ہاں ہی رہتی تھی۔ سینہ خالہ بھی بہت دن تک چھپ کر روئی رہیں۔ جانے ان کی وجہہ کی قسمت میں انہی مزید کلتے عذاب جھیلے کئے تھے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا انقلاب

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

چار بیتے بعد ہم پانچوں کے پلٹر کھل گئے اور دو دن کے بعد ہمارے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ یہ ہمارے اس کالج میں آخری امتحانات تھے۔ آج سے چھ سال پہلے جب میں اس کالج میں داخل ہوا تھا اس وقت کے پہلے امتحانات میں اور بارہویں جماعت کے ان امتحانوں میں کس قدر فرق تھا۔ اس وقت مجھے ٹھیک طرح سے یہ پاکر قلم بھی پکڑنا نہیں آتا تھا اور آج چھ سال بعد میں ہر مضمون کے سادہ جوابی پر چوں کی نہ جانے کتنی فاضل کا پیاس بھرتا جا رہا ہوتا تھا کہ بھی کبھی تو میری سیٹ کے ارد گرد کاغذوں کا اتنا بڑا انبار مچ ہو جاتا ہے پرچہ ختم ہونے کے بعد باندھنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا اور ہم متحن کی منتیں کر کرے اپنی فاضل کا پیاس (extra sheets) جلدی جلدی دھاگے سے باندھ کر اس کے حوالے کر دیتے۔ ہماری ساری ڈاری میٹری پڑھائی میں بجت پچھی تھی، اور تو اور موٹے بھئی کو بھی کھانے کی سدھ بندھ تک نہیں رہتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہمارے پرچہ ختم ہو رہے تھے، امتحانات کے بعد پریکٹیکل ہونا تھے اور اس کے بعد آخر میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ، جس کے لیے ابھی سے کالج کی انتظامیہ نے ہمارے والدین اور گھروالوں کو دعویٰ کا روز بھیجا شروع کر دیئے تھے۔ صوبے کے گورنر صاحب مہماں خصوصی کے طور پر تشریف لارہے تھے، اور ہماری آخری پریڈ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

پر چوں کے بعد ہمیں حبِ معمول چھوٹی کاسوں نے الوداعی رات کے کھانے دینا شروع کر دیئے۔ چھ سال پہلے جب ہم نے ساتویں جماعت کی طرف سے اس وقت کی بارہویں جماعت کے کیدیٹس کو الوداعی ڈنزدیا تھا تو ہم سب چوں کے دل میں کتنی حرمت تھی کہ جانے یہ دن ہماری زندگیوں میں کب آئے گا جب ہمیں بھی کوئی الوداعی ڈنزدے کر رخصت کرے گا۔ کیدیٹ کالج کی ایک ریٹ یہ بھی تھی کہ الوداعی کھانے کی رات جونیئر کیدیٹس بن جاتے اور کچھ دری کے لیے سینٹر کیدیٹ جونیئر بن کر ان کا ہر حکم مانتے تھے۔ جاہے وہ کچھ بھی کہیں۔ آصف بھٹی کو کہا گیا کہ ایک وقت میں چار روٹیاں اکٹھی کھا کر دکھائے۔ مجید چھوٹو کو ہمیں والے جوتے پہن کر ڈالس کا کہا گیا۔ ثاروند کو اس طرح رونے کا کہا گیا جیسے وہ سی پی او کے سامنے ایک مشاذرل کے دوران سوے بھایا کرتا تھا۔ مجھے اور فیصل کو چھت پر چڑھ کر اس طرح اترنے کا کہا گیا، جیسے ہم بک کرتے وقت اڑتا کرتے تھے، اس فر کو وہ مخصوص سیئی بجانے کا کہا گیا جو ہم خطرے کے وقت بھایا کرتے تھے۔ ہم نے جونیئر کیدیٹس کی یہ ساری باتیں کسی حکم کی طرح بجا لائیں۔ تقریب ختم ہوئی تو سارے جونیئر کیدیٹ ہمارے گلے لگ گئے۔ سب ہی نے ایک ہی بات کہی کہ ہماری کلاس ان کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے یہاں جیئنے کا طریقہ ہم سے ہی سیکھا ہے۔ ہم نے سینٹر ہونے کے باوجود کبھی جونیئر زکوٹگ نہیں کیا تھا۔ ہمیں اپنے ہی دھندوں سے فرصت کھا لیتی کہ کسی مظلوم جونیئر کیدیٹ کو ٹنگ کرتے۔ لیکن اس دن ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے جونیئر کیدیٹس کو ہم سے

کس قدر عقیدت تھی۔ فیصل اشیج پر آخری تقریر کے لیے آیا تو کچھ بولنے سے پہلے ہی روپڑا۔ اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اپنی الوداعی تقریر نہیں کر سکا۔ وہ اتراتومیں بھی بھیگل آنکھیں لیے اشیج پر آیا اور کچھ ہی دیر میں ہمارا پورا ہاؤس روا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی جب ہم یہاں آئے تھے تو بھی رو رہے تھے اور اب جو جانے کا وقت آیا تھا بھی ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے دو مرتبہ اپنی بھلی روک کر بات جوڑنے کی کوشش کی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ڈیر فیلو کیڈٹس Dear Fellow Cadet's“ 2b I feel proud آئی فیل پر اوڈُوبی آئی ان فیکٹ“ لیکن پھر اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں تیزی سے اشیج سے اتر آیا راستے میں فرست ائر کے کیڈٹ نے مجھ روک لیا اور سبھی میری آنکھیں پوچھتے پوچھتے خود بھی رونے لگ گئے۔ یہ کیسا رشتہ تھا جو آنسوؤں سے شروع ہوا تھا اور آج آنسوؤں پر ہی ایک نئے موڑ پر جدا ہو رہا تھا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیڈٹ کا جنگ کے ان چھ سالوں میں میں نے پایا یادہ تھا یا پھر کھویا یادہ؟ میرا بچپن انہی راہدار یوں میں، گھاس کے میدانوں میں اور پریڈ گراونڈ کے پتھر لیے فرش پر بھاگتے دوڑتے گزر گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو ایک چھوٹا پکھ تھا اور آج جب میں یہاں سے واپس جانے کے قریب تھا تو ایک نوجیز اور نوجوان تھا، جسے اپنے بھلے بڑے کا اچھی طرح پڑتا تھا۔

پوشل صاحب نے بھی ہمارے اعزاز میں الوداعی کھانا دیا اور اس میں انہوں نے اشیج پر آکر خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا جب ساتویں جماعت میں انہیں مجھے روکنے کے لیے مختلف ڈرامے کرتا پڑے تھے۔ ہماری شرائون پر انہوں نے اس رات ہم سب کے کان بھی کھینچے ہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہر وہ بات جو ہم اپنے تیئیں یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے مجھ پالی ہے، انہیں اس ہربات کا پتہ تھا۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے اسٹر کی جانب اپنے سگار کا پیکٹ بڑھایا۔ اسٹرنے کسی نظر سے کام لیا۔

”No Sir I don't smoke“

انہوں نے مسکرا کر بخشنوی پی او کواشارہ کیا جو کھانے کی میز کی پرلی طرف کھڑا تھا۔ اس نے جیب سے گولڈ لیف کا آدھا پیکٹ نکال کر اسٹر کے حوالے کر دیا جو شاید کسی چھاپے میں اسٹر کی ماری سے نکلا ہوگا۔ انہوں نے آہتہ سے اسٹر سے کہا۔

”سگریٹ پینا بڑی بات نہیں۔ صرف عمر اور برائنا کا دھیان رکھنا چاہیے۔“

اسٹر کا کندھا ٹھوک کر وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسری جانب ان کی نظر مجھ پر ہڑی۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور دیرے سے بولے۔

”کیڈٹ عباد..... تمہارے جو نیر سیکشن کی ٹیچر شریل آج کل چھبوٹوں پر اپنے گھر آئی ہوئی ہے..... تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ ناؤں گرل شی از“ غرض اس دن ہم میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جسے کمانڈر صاحب نے اپنے مخصوص شوخ لجھے میں چھپرا نہ ہو۔ اس دن ہم سب کو احساس ہوا کہ ہم سب کیڈٹ کی ٹریننگ میں کمانڈر صاحب کی خاموش تربیت کا کس قدر بڑا اور مرکزی حصہ شامل تھا۔ اس رات

میں نے کمائڈر صاحب سے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا سبق سیکھا اور وہ یہ کہ تربیت صرف چیختنے چلانے اور سزا دینے یا سزا کا خوف دل میں پیدا کرنے کا نام نہیں ہوتا۔ تربیت تو ایک خاموش انقلاب کا نام ہوتی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو آپ کی روح سے شروع ہو کر آپ کے جسم پر ختم ہوتی ہے، نہ کہ اسے جسم کے روئیں کے ذریعے روح میں ٹھونٹے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کمائڈر صاحب نے یہ خاموش انقلاب ہماری روحوں کے ذریعے ہمارے جسموں پر لاگو کر دیا تھا۔ اب اگر ہمارے فانی جسم مث بھی جاتے تو یہ انقلاب ہماری روحوں سے آگے منتقل ہو جاتا۔

ہمارے پر کیئیکل ختم ہو چکے تھے اور دودن کے آرام کے بعد ہماری پائیں آؤٹ پر یہ تھی۔ ہماری آخری پریڈ۔۔۔۔۔

کتاب گفر کی پیشکش

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/ مصنف/ مؤلف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز "علم و عرفان پبلشرز" کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفوں اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت ویدہ زیب نائل اور اگلاط سے پاک کپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجیتی اور کتاب لیجے۔۔۔۔۔ خواتین کے لیے سنہری موقع۔۔۔۔۔ سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق۔۔۔۔۔

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/ مصنفوں کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

عمریرہ احمد	مالک	فرحت اشتیاق	رخانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	امجمُم انصار
نازیہ کنوں نازی	نگہت عبد اللہ	رفعت سراج	تنزیلہ ریاض	نگہت سیما	میمون خورشید علی
وصی شاہ	سعید و اُثُن	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحجۃ حقی	جادید چوہدری	المیں۔ ایم۔ اے۔	ظفر	امجد جاوید

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، 40۔ الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور (042-37352332 & 0300-9450911)

کتاب گھر کی پیشکش دیر ہو جاتی ہے.....

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن سے ڈاؤپی کو حب و عذر ریحان صاحب کا ڈرائیور مقررہ وقت پر اپنی بھی سی موڑ کار میں لینے کے لیے آنے لگا۔ پہلے دن تو ڈاؤپی کو یوں اکیلے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ظفر سے کہا بھی کہ پہلے دن وہ ان کے ساتھ چلے چلیں لیکن ظفر نے ایک ٹکا سا جواب دے دیا کہ اس کے سر میں صبح سے درد ہے لہذا وہ نہیں جا سکتا۔ البتہ اس نے اپنا دوسرا فریضہ یعنی طفر کے تیر چلانے کا کام بخوبی انجام دیا اور ڈاؤپی کو سینکڑوں مرتبہ یہ جتالیا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کی نظریں ڈاؤپی کا تعاقب نہیں کر رہیں اور ڈاؤپی اس کی غیر موجودگی کا کوئی "غلط فائدہ" اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور سیدھے ٹیوشن پڑھا کر گھر واپس آ جائیں۔ وجہ آپی سر جھکائے ظفر کی بدایات سنتی رہیں۔ ظفر نے سختی سے انہیں منع کیا کہ کسی بھی مرد سے گھر یا باہر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی دو گھنٹے سے ایک لمحہ بھی زیادہ باہر گزارنے کی انہیں اجازت ہے۔ جاتے جاتے اس نے یہ ڈرانا بھی ضروری سمجھا کہ ڈاؤپی کو آج ہی اپنے معاوضے اور ایڈوانس کی بات بھی بچوں کے گھروالوں سے حصی طور پر طے کرنی ہے۔ اس کی بک بک ابھی جاری ہی تھی کہ باہر گلی میں تیسری بار گاڑی کا ہارن بجتنے کی آواز آئی اور مجبوراً ظفر کو اپنا ہدایت نامہ ختم کر کے وجہ کو جانے کی اجازت دیتی پڑی۔

ریحان صاحب کا بنگلہ ریلوے افسران کے بنگلوں کی قطار میں تیسرا تھا اور اُس کی بھی سی روٹ سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک بڑے سے پورچ میں رُک گئی۔ ڈاؤپی کو تو کرنے ڈرائیکٹ روم میں بٹھا دیا اور کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب جو ایک پکی عمر کے سنجیدہ سے مرد تھے، اپنے دونوں بچوں شارق اور فائزہ سمیت آن موجود ہوئے، ڈاؤکوڈ کیچھ کر انہیں کچھ جیرت سی ہوئی کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھ بیٹھے تھے کہ خان صاحب نے کسی عمر سیدہ یا پھر کم از کم کسی تجربہ کار اسٹانی کا بندوبست کیا ہو گا لیکن یہاں تو دھان پان سی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جسے اگر کانٹ کا یوں نیفارم پہندا دیا جاتا تو وہ خود بھی اسٹوڈنٹ ہی تھی۔ ریحان صاحب نے اپنا اور دونوں بچوں کا تعارف کروایا اور پھر جب ڈاؤپی نے اپنے مخصوص شخص سے بھرے ہوئے لجئے میں ریحان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کریں گی کہ ہتنی جلدی ہو سکے، دونوں بچوں کو ان کی باقی کلاس کے بر ایک لکھڑا کریں، تو ان کے لفظوں کے چنان اور ان کی تہذیب و شاشکی نے ریحان صاحب کا ڈکھ کے بارے میں پہلا تاثر یکسر اکل کر دیا۔ خان صاحب نے شاید اشارہ ریحان صاحب کو ڈکھ کے گھر میلوپس منظر کے بارے میں بھی بتا کر کھاتا، اسی لیے انہوں نے پہلے سے دو چیک کاٹ کر لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چیک خان صاحب کے نام تھا اور دوسرا ڈاؤپی کے نام، ڈکھا طالب علمی کے دور کا وظیفوں والا بینک کا کھاتا اب بھی چل رہا تھا اور غیاث چچا ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم اپنی تنخواہ میں سے اس کھاتے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شادی کے بعد ظفر نے کبھی ان کے کاملے گئے چیزوں کے

بدلے ایک دمڑی بھی ان کی ہتھیلی پلا کرنیں رکھی تھی۔ ظفر نے جب آدمی رقم کا چیک خان صاحب کے نام پر دیکھا تو وہ بہت تملما لایا اور اس نے مالک مکان کو اس کی غیر موجودگی میں سخت سست نہائیں لیکن شام کو جب خان صاحب کرائے کے تقاضے کے لیے آئے تو اس نے چپ چاپ چیک ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

یوں ہو کی گلی بندھی زندگی میں دو گھنٹے کی یہ تدبیی ایسی آئی کہ انہیں بھی دو گھنٹے کے لیے اس زندگان سے چھکا راں جاتا، بچے تو دو دن میں ہی ان سے یوں گھل مل گئے جیسے ان کی برسوں سے ہو سے دوستی ہو۔ دراصل بچے ان کے آنے سے پہلے اس لیے بھی سبھے ہوئے تھے کہ انہیں کسی عمر سیدہ، موٹی موٹی یعنی والی کسی ایسی سخت گیر استانی کی آمد متوقع تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی یا لکڑی کا فٹ (اسکیل) دکھائی دیتا ہوگا، لیکن جب انہوں نے اس من موہنی سی، نازک سراپے والی ٹیچر کو دیکھا تو خود بہ خود اس کی جانب کچھ چلتے چلے آئے۔ اور پھر ہو آپ کے پڑھانے کا انداز بھی تو کچھ ایسا تھا کہ اب دونوں بچے خود یثوشن کے وقت کا انتظار کرتے رہتے اور ایک اتوار کی چھٹی بھی انہیں اس قدر گراں گزرتی کہ وہ سوال کر کر کے اپنے پاپا کی ناک میں دم کر دیتے۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

ظفر کی جیب میں ہو کی تو کری سے پھر سے پیے آنے لگے تو اس نے بھی پھر سے اپنے پر پڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ ہو آپ کو واپسی میں ڈرای بھی دیر ہو جاتی تو وہ باہر گلی میں نکل کر ٹھلانا شروع کر دیتا اور جیسے ہی ریحان صاحب کی گاڑی گلی میں داخل ہوتی وہ ہو آپ کے گاڑی میں سے اتنے سے پہلے ہی لپک کر قریب جا پہنچتا اور ڈرائیور اور آس پاس سے گزرتے راہ گیروں اور ہماسیوں کی پرواکیے بناتے اپنے ذہن کا گند اپنی زبان کے زہر کے ذریعے الگنا شروع کر دیتا۔ ”کہاں رہ گئی تھی.....؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ گھر واپس آنے کو تمہارا دل نہیں کرتا؟ کس کے ساتھ گپ لگانے کے لیے رُک گئی تھیں؟“ اور جب ڈرائیور گاڑی موزیلیتا تو اس کے جاتے جاتے اس پر بھی فقرہ چست ہو جاتا۔

”کہیں یہ حضرت ڈرائیور ہی تو لمبے راستے سے گھمائے لیے نہیں پھرتے تمہیں.....؟ اسی لیے ہو آپ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی وہ گھر واپس پہنچ جائیں چاہے اس کے لیے انہیں یثوشن کچھ دیر پہلے ہی ختم کیوں نہ کرنی پڑے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ریحان صاحب کو بھی کہلوا بھیجا تھا کہ ان کے میان کو ان کے دیر سے گھر پہنچنے پر تشویش ہوتی ہے لہذا اگر وہ چاہیں تو پیسوں میں سے کچھ کٹوئی کر لیا کریں لیکن انہیں گھر وہ پندرہ منٹ پہلے ہی جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ریحان صاحب خود بھی صورت شناس تھے اور کچھ ڈرائیور نے بھی انہیں وفترا لاتے لے جاتے ظفر کے اس بُرے روئی کی شکایت اپنے مالک سے کر رکھی تھی لہذا خود ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈرائیور وہ ہو کو گھر واپس پہنچا آئے۔ حالانکہ بعض مرتبہ بچوں کی صورتیں ان کے یوں بیچ میں چلے جانے سے رومنی سی، بن جاتیں کیونکہ وہ اپنی معصومی خوشنیوں میں اپنی ٹیچر کو بھی شامل کرنا چاہرہ ہے ہوتے لیکن ان کی ٹیچر تو لپکتے جھپکتے آتیں اور ان کی پڑھائی ختم کرو کر پلک جھپکتے میں ہی واپس چلی جاتیں۔ اس دن بھی جب فائزہ کی سال گرہ تھی تو ان کو سب نے کتناز کرنے کا کہا لیکن وہ نہیں رکیں اور چند دن پہلے جب شارق کو اسکول میں اس کے مضمون پر پہلا انعام ملا تھا، جس کی تیاری اس کی وجہہ ٹیچر نے ہی کروائی تھی، تو ان دونوں نے کس طرح منہ ب سور کر ٹیچر کو بھی اپنے ساتھ اپنے پاپا کی جانب سے انعام میں دی گئی آس کریم پارٹی میں چلنے کی منیں کی تھیں، لیکن پھر بھی وہ مسکرا کر اور دونوں کے گال پر پیار کر کے واپس چلی گئی تھیں۔

لیکن اتنی احتیاط کے باوجود قدرت کی جانب سے آئی ہوئی رکاوٹیں تو پانی جگہ موجود تھیں، کبھی تریک کا رش، کبھی موسم کی خرابی، کبھی میشین کے کل پرزوں کی مجبوری، اس دن بھی بھری دوپہر میں ہی اچاک کا لے بادل یوں آنا فانا آسان پر چھائے کہ چند ہی لمحوں میں دن میں اندر ہمرا سا چھا گیا۔ ٹواؤپی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کسی طرح آج ڈرائیور سے کھلوا دیں کہ آج انہیں لینے نہ آئے، لیکن اسی لمحے میں گاڑی کا ہارن ستائی دے گیا۔ ڈرائیور نے دونوں بچوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی ٹواؤپی کو تھامدی جس میں ان دونوں نے اپنے کل کے ثیہت کے بارے میں لکھا تھا، جس کی تیاری آج ضروری تھی۔ مجبوراً ٹواؤپی کو گھر سے نکلا ہی پڑا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، راستے میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور ٹواؤپی کے ریحان کے گھر سے نکلتے نکلتے سڑکیں ندیاں بن چکی تھیں۔ ڈرائیور بیچارہ نہ جانے کن گلیوں کے نیچے اور آڑھے تیرھے راستوں سے گاڑی نکالتا ہوا کسی نہ کسی طرح انہیں گھر تک پہنچا تو لایا لیکن اس اثناء میں وجہ کے مقررہ وقت سے تقریباً آدھا گھنٹہ زیادہ ہو چکا تھا اور ظفر اپنے لال بھجوکا چہرے سمیت گلی میں ہی برستی بارش میں ٹہل رہا تھا۔ پہلے تو اس نے ڈرائیور کو ہی روک لیا اور اس پر برس پڑا کہ وہ ان کی بیوی کو لے کر کہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور ٹواؤپی نے ظفر کے لاکھ ہاتھ جوڑے، متین کیس کے یوں گلی میں سر بازار تماشہ بنائے لیکن اس دن ظفر بھی اپنی کرنی پر آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو تو اس نے بیار کوشش کے بعد جانے دیا لیکن ٹواؤپی کے ساتھ اس نے اس شام جو بتاؤ کیا اُس کے نشان ان کی روح سے تاعمر نہیں مٹ پائے۔

مصیبت یہ بھی تو تھی کہ اگر ٹواؤپی ظفر کی خوشی کے لیے ٹیوشن چھوڑنا بھی چاہتیں تو یہ بھی ظفر کو گوارہ نہیں تھا کیونکہ اسے گھر بیٹھے ہر مہینے ایک معقول رقم سے جو ہاتھ دھونا پڑ جاتے، اور وہ یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو اسے مالک مکان کی دھمکیوں کا بھی روزانہ سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ ٹوکی تجوہ میں سے مکان کا کرایہ بھی آسانی سے، چاہے قسطوں میں ہی کسی، پر ادا ہو رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے ٹواؤ نے مزید احتیاط شروع کر دی اور موسم ڈر بھی خراب ہونے کا احتمال ہوتا وہ یکسر جانے سے ہی انکار کر دیتی تھیں۔ لیکن ظفر کے پاس انہیں ستانے کے لیے بہانے اور بہت تھے۔ دراصل ظفر کے اندر کا انسان ایک ایسی عجیب احساسِ کمتری کا شکار تھا، جس میں انسان اپنے مخالف کی خاموشی کو بھی طریقہ سمجھتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس تو پہلے دن ہی سے تھا کہ ٹواؤپی شکل و صورت، تعلیم و تہذیب اور آداب و اطوار میں اس سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن ٹواؤپی نے آج تک کبھی اس کے سامنے کبھی کوئی ایسی حرکت یا بات نہیں کی تھی جس سے ظفر کو اپنی کم مانگی کی احساس ہوتا ہو۔ لیکن ظفر کے اندر کے ختناں نے اسے ٹواؤپی کی اس خاموشی کو بھی کچھ اور ہی معنی دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یوں چپ رہ کر ٹواؤ سے یا احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ جیسے اس کے وجود کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اس بات سے اور اس احساس سے اس کی انا کو مزید ٹھیس لگتی اور وہ تملکا کر مزید انتقامی کا رواہیاں کر کے اپنی رخچی انا کو سہلانے کی کوشش کرتا۔

دن یوئی گزرتے جا رہے تھے اور زندگی دن بدن یوئی ٹواؤپی پر تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ نیچے میں ایک آدھ مرتبہ ظفر نے ایک اور عجیب حرکت بھی کی۔ ٹواؤپی کے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہی وہ بنا تائے خود ہی کچھ دیر بذریحان صاحب کے بیگلے پر آن دھمکا۔ ایک مرتبہ تو گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا اور صرف مالی ہی باہر کے باعث پیسے میں کام کر رہا تھا جس سے اس نے نوہ لے لی کہ ٹواؤپیں اندر ہیں اور بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ ایک آدھ

مرتبہ ڈرائیور نے خود اسے بیٹکے کے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا لیکن ڈرائیور کے باہر نکلنے سے پہلے ہی ظفر ادھر ادھر ہو گیا۔ جبکہ ایک مرتبہ اس کے گھنٹی بجانے پر خود ریحان صاحب گیٹ پر آگئے کیونکہ وہ قریب ہی لان میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ظفر انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا لیکن جب اس نے ڈاؤآپی کے شوہر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا تو ریحان صاحب نے بڑی عزت سے انہیں اندر بیکا کر بٹھایا اور چائے وغیرہ کا پوچھا۔ ظفر کو اور تو کچھ سوچنا نہیں لبذا اس نے بہانہ یہ بتایا کہ وہ بیہاں سے گزر رہا تھا تو اس نے سوچا کہ ڈاؤکو ساتھ ہی لیتا جائے۔ ریحان صاحب نے ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر واپس بھجوایا اور نہ صرف یہ بلکہ جاتے ہوئے گھر کی ملازمت کو یہ تاکید بھی کی کہ انہیں خالی ہاتھ نہ جانے دے اور فرنج میں پڑا تازہ سیک بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

اس دن ظفر کو ڈاؤآپی باری یہ پتہ چلا کہ ریحان صاحب کی بیوی تو انہیں پانچ سال پہلے ہی داغ مفارقت دے چلی ہیں اور اب اس گھر میں ڈرائیور اور مالی کی بیوی کے علاوہ تیسری کوئی عورت نہیں رہتی۔ ظفر نے گھر آ کر اس بات پر بھی بے حد ہنگامہ کیا کہ ڈاؤنے یہ بات انہیں پہلے کیوں نہیں بتائی۔ ڈاؤآپی نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھلا اس بات سے ان کا کیا تعلق کہ بچوں کی ماں زندہ اور گھر میں ہے یا نہیں۔ ان کی تو ریحان صاحب سے بھی شاذ و نادر ہی بھی ملاقات ہوتی تھی ورنہ ان کا تعلق تو اصل میں ان کے بچوں کے ساتھ تھا، لیکن وہ ظفر ہی کیا جو ڈاؤآپی کی سُن لے..... کمی دن تک یہ تکرار چلتی رہی اور کئی دن تک روزانہ ڈاؤآپی کو ایک نئی سولی پر منتظر پڑتا۔

اور پھر آخر کار ایک دن اس تکرار کی جلتی پر تسلی چھڑ کنے کا موقع قدرت نے خود ہی ظفر کو فراہم کر دیا۔ ڈاؤآپی بچوں کو پڑھا کر اپنے مقررہ وقت ساڑھے پانچ بجے پورچ میں لٹکنیں تاکہ جب معمول ڈرائیور انہیں چھ بجھنے تک گھر پہنچا دے تو یہ دیکھ کر ان کے بیرون کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی کہ پورچ میں نہ تو ڈرائیور تھا اور نہ گاڑی کا کچھ ایسا پتھ تھا۔ مالی اور گھر کے دوسرا نوکروں کو ادھر ادھر دوڑایا گیا تاکہ وہ ڈرائیور کی کچھ خبر نکال کر لائیں لیکن ڈرائیور کا دوڑ دوڑ تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈکارنگ پیلا پڑتا گیا۔ بالآخر شام چھ بجے کے قریب ڈرائیور تو نہیں پلنا لیکن ریحان صاحب اپنی سرکاری جیپ میں دوسرے ڈرائیور سمیت گیٹ سے اندر واپس ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظر راہداری میں بے چین اور ٹھہرائی ہلکی ڈوپر پڑی۔ اسی اثنامیں ڈرائیور بھی نہ جانے کہاں سے ہڑ بڑایا ہوا سا گولی کی سی تیزی سے گھر میں واپس ہوا۔ ریحان صاحب سارا معاملہ خود ہی سمجھ گئے اور انہوں نے ڈرائیور کو سخت جھاڑا کہ جب اسے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جب تک بچوں کی ٹیچکرو واپس اپنے گھر نہ پہنچا دیا جائے تب تک وہ بھول کر بھی ادھر ادھر ہونے کی کوشش نہ کرے پھر وہ کار لے کر باہر کیوں گیا۔ ڈرائیور وہیں ریحان صاحب کے بیرون میں گر گیا کہ اچاک ہی اسے خربلی کر اس کی بہن کا بینا پنگ لوئتے ہوئے سڑک پر کسی موڑ سائکل سوار سے کھلا گیا ہے اور اس کے سر سے تیزی سے خون بہر رہا ہے تو وہ رُک نہیں پایا اور بہن کے گھر کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قریبی ہسپتال سے بچے کی پٹی کرو اکرساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے گا لیکن اس کا اندازہ غلط لکھا اور بچے کے سر میں ناکے لکنے کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی۔

بہر حال وجہ جو بھی تھی، دریو تو ہوئی گئی تھی۔ ریحان صاحب نے ڈرائیور کا معاملہ تو بعد پر اٹھا کر کھا، فی الحال انہیں ڈاؤآپی کو گھر پہنچانے کی جلدی تھی۔ سوانہوں نے ڈرائیور کو جلدی سے فوراً گاڑی لکانے کا کہا اور خود بھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آگے بیٹھ گئے کیوں کہ انہیں معاملے کی ٹکنیکی کا

احساس تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ خود جا کر ظفر کو اس صورت حال سے آگاہ کریں تاکہ وہ ہواپی پر برہم نہ ہو۔ وہیں بے چاری ہواپی تو ان کے جسم کا خون تو ویسے ہی خشک ہو چکا تھا لہذا چپ چاپ بیٹھی اپنے مقدر کا سامنا کرنے کی تیاری کرتی رہیں۔

جب ریحان صاحب کی گاڑی ظفر کی گلی میں مڑی تو اس وقت شام کے سات سے کچھ اوپر ہی وقت ہوا ہوگا۔ گلی سنان پڑی تھی اور سرد یوں کے دن ہونے کی وجہ سے شام بھی گہری رات ہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہواپی کو درود شریف سمیت اور جتنی بھی دعا کیں آتی تھیں، انہیں وہ سینکڑوں مرتبہ دل میں دُھرا چکی تھیں۔ ریحان صاحب نے ان سے کہا کہ وہ یہیں باہر گلی میں گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں، تب تک وہ جا کر اندر سے اپنے میاں کو باہر بیٹھ دیں۔ ہواپی نے ایک مرتبہ پھر ان سے اصرار کیا کہ انہوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے، یہی بہت ہے، اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ اپنے گھر خیریت سے بیٹھ گئی ہیں۔ دراصل ہواپی کے ذہن میں یہ خوف بھی کہیں نہ کہیں پل ربا تھا کہ ظفر ریحان صاحب کے سامنے ہی کوئی اٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے لہذا اس لیے بھی وہ ان دونوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن ریحان صاحب نے پگا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ظفر سے مل کر ہی گھر واپس جائیں گے۔ انہیں اس پریشان ہی کوئی اٹی کی کیلے چھوڑ کر واپس جانا کسی طور بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

محبورو جو آپی ہی کو ہمارا ناپڑی اور وہ گاڑی سے اتر کر اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئیں، لیکن یہ کیا.....؟ دروازے پر ایک موٹا ساتالا پہلے سے لٹکا وجوہ آپی کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کے توہوش ہی اڑ گئے ظفر اس وقت کہاں چلا گیا تھا؟ جبکہ اسے پہنچ بھی تھا کہ وجوہ کے پاس چاہی بھی نہیں ہے، پھر اس اندر ہیری رات میں وہ گھر کوتلا کیوں لگا گیا تھا؟ وہ جو کی پریشانی دیکھ کر ریحان صاحب بھی نیچے اڑ آئے اور وہ بھی تالاد کیکہ کر جیران تھے کہ اب کیا کریں۔ وہ جو آپی کو ظفر نے آج تک آس پاس کسی ہمسایے کے گھر بھی آنے جانے نہیں دیا تھا ہی وہ گلی میں کسی سے واقع تھیں۔ اس لیے ریحان صاحب نے طے کیا کہ ظفر کے آنے تک وہ سب یہیں گاڑی میں اس کا انتظار کریں گے، کیونکہ وجوہ آپی کویوں دروازے پر تھا بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

لیکن انہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جب مزید دکھنے کرنے کے تور ریحان صاحب نے ہو کو ان کے اپنے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی کیونکہ ظفر کا توڈ ورڈ ورٹک کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہمایوں کے ہاں رات بھر انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہی انتظار کریں بعد میں غیاث پچا خود ہی ظفر کا پتہ لگا کر انہیں گھر چھوڑ آتے۔ ہواپی کے پاس ہاں کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ لہذا وہ چپ چاپ سر جھکائے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں اور ریحان صاحب انہیں ان کے میکے چھوڑ آئے۔ غیاث پچا کو انہوں نے باہر بلا کر پوری بات سمجھا وی تھی۔ وہ بے چارے بھی کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ ساری رات ظفر کے مختلف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرتے رہے۔ وہ رات اور بہت سی راتوں کی طرح ہواپی نے آنکھوں ہی آؤٹ پریڈ کا دعوت نامہ تھا۔ کل صبح آدی کی تصویر کے نیچے رکھے کارڈ (Invitation) پران کی نظر پڑی تو انہوں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ یہ آدی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کا دعوت نامہ تھا۔ کل صبح آدی کی پاسنگ آؤٹ تھی اور کل کیا؟ صبح تو ہو ہی بچی تھی..... گھری صبح کے چار بجاء ہی تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش

تیرالوداع

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

صحیح کے چار بجتے ہی سی۔ پی۔ اونے بگل بجودیا۔ لیکن ہم سب کی آنکھوں میں نیند پہلے ہی کہاں تھی، یہ صحیح کیڈٹ کالج کی دوسری صبحوں سے کتنی مختلف اور کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ صرف ہم پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹ ہی لگاتے تھے۔ ہمارے کاف لگے گڑک خاکی یونیفارم اور ہماری کیپ پیٹس، پر گئے رنگیں پر دوں (پلوزم) کے ساتھ جو ہماری الماریوں میں رات ہی کوتانگ دی گئی تھیں، ہمارے لانگ پر یہ شوز چم چم کرتے شوریکیں پر بجے ہوئے تھے۔ باہر پر یہ گراڈ میں الوداعی ترانے بجا شروع ہو گئے تھے۔ آج ہمارا ناشت صبح چھ بجے ہی چیل کر دیا جانا تھا تاکہ ہم واپس آ کر اپنے یونیفارم پہنیں اور اپنی آخری تیاری کر کے پر یہ گراڈ میں جا پہنچیں۔ ہم سب بیک وقت اُداس بھی تھے اور خوش بھی..... ہم ایک دوسرے سے نظریں پڑھ رہے تھے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کی آنکھ میں پھیپھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا، سارے کیڈٹس ایک دوسرے کے ہائلز جا کر اپنے گھر کے پتوں اور ملی فون نمبروں کا تبادلہ کر رہے تھے تاکہ مستقبل میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارے گھروالوں میں سے کون کون ہماری پانگ پر یہ دیکھنے کے لیے گراڈ میں پہنچ چکا ہو گا کیونکہ مہمان پر یہ سے صرف دو گھنٹے پہلے ہی کالج آ سکتے تھے اور انہیں وہیں گیٹ سے ان کے کارڈز کے حساب سے باعزت طور پر پر یہ گراڈ میں ان کی کرسی تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ مجھے تو گھر سے کسی کے آنے کی پچھکم ہی امید تھی کیونکہ ابا اور امی اتنا مبارف نہیں کر سکتے تھے اور عمارہ اور فاران بھیا ا کیلئے آنہیں سکتے تھے۔ لیکن باقی کیڈٹس اور میرے دوستوں کے گھر سے بھی آرہے تھے۔ اور اب انہی کے خاندان میرے خاندان بھی تو تھے۔ چھ سال سے ویک اینڈ ز پر اور دو چار دن کی کم چھٹیوں میں میں کبھی فیصل کے گھر تو کبھی اسفر کے گھر جاتا رہا تھا، کبھی آصف موٹے کی امی کے ہاتھ کے پرانے کھائے تو کبھی شارروندو کے گھنے کے کھیتوں سے گنے توڑ کر کھاتے کھاتے میرا بچپن میرے انہی دوستوں کے گھروالوں کے ساتھ بیت گیا تھا۔ اور ان سب کی ”امیاں“ اور ابا مجھے بھی اپنا ”ریڈی میڈی“ بیٹا ہی تو سمجھتے تھے۔ اسفر کے ڈیمی سے تو میں اسفر سے بھی زیادہ جیب خرچ اینٹھے لیتا تھا اور فیصل کی می چھٹیوں میں فیصل کی نہیں بلکہ میری مرضی کا کھانا بنا لیا کرتی تھیں۔ آصف بھٹی کے ”بائے“ نے مجھے کبڈی اور داؤ لگانا سکھایا تھا اور شارروندو کے ابا سائیں نے مجھے گاؤں کے کھیتوں میں شکار کھیلنے کے جانے لکنے گرتا تھے۔ میں ان سب کا لا ڈلا آدمی تھا، جسے انہوں نے کبھی یا احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے دور ہے۔ اور میرے لیے میرے یہ رشتہ، کسی بھی خون کے رشتے سے کم نہیں تھے۔

آخری بگل بج چکا تھا اور اب ہم سارے سینٹر پانگ آؤٹ کیڈٹس لمبی لمبی قطاروں میں اپنے اپنے ہائلز سے ٹکل کر پر یہ گراڈ جانے کے لیے باہر فلان کی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ ہائلز کے دونوں طرف راستوں میں ہمارے جو نیز رہاتھوں میں پھلوں کے گلدستے اور الوداعی

کارڈ لیے ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے جانے کب سے تیار کھڑے تھے، انہی میں ساتویں جماعت کے وہ پتو، مٹو، بلو، پو، سُو، مُونو، مُونو ٹسٹ کے کیڈیں بھی تھے، جو آنکھوں میں وہی حیرت اور فخر آمیزی روشنی لیے کھڑے ہمیں تک رہے تھے جو بھی ساتویں جماعت میں ہماری آنکھوں میں اپنے سینئر زکو یوں سچے سنوارے آخری پر یہ پر جاتے ہوئے دیکھ کر لہرائی تھی۔ انہی میں سے ایک نحاساتارہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ میری طرف بڑھا دیا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

"آدمی سر..... وہ از فار یو you "This is for you

میں نے اس مخصوص تارے سے گلدتہ لے لیا اور پھر اسے ایڑیاں بجا کر ایک کڑک دار سالیوٹ کیا۔ سمجھی نئی نئی تارے کھلکھلا کر نہیں دیئے۔ اس نے اپنی آنوجراف بک آگے کر دی اور میں نے اپنی زندگی کے پہلے آنوجراف کاغذ پر ثبت کر دیئے۔

"جیتے رہو ہیش....."

ہم سب پر یہ گراڈ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ سی۔ پی۔ اونے ول بجائی اور ہم نے پر یہ کی فارمیشن ترتیب دے دی۔ مہماں اپنی نشتوں پر بیٹھے چکے تھے۔ اور بینڈ والے نے اپنے پورے 72 بہتر اوزاروں سمیت اپنی فون کوڈھن شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ بینڈ پر چوتھی لگی اور ایجوئنٹس نے سی۔ پی۔ او کو اجازت دینے کے لیے اپنی اسٹک لہرائی۔ پر یہ شروع ہو گئی۔ ہم سارے پاسنگ آؤٹ کیڈٹ اپنے اپنے ہاؤس کے جنڈے تلتے اپنے پی۔ او۔ سمیت پر یہ کرتے ہوئے اس چھوڑے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں گورنر صاحب، پرنسپل اور ایجوئنٹس سمیت کھڑے ہم سے سلامی لینے کا انتفار کر رہے تھے۔ ہم گھوم کر اب اس قطار میں چل رہے تھے جس کے بالکل سامنے مہماں کو پہنچا دتا۔ تمام کیڈٹس کے گھروالے انہیں پہچان کر ان کی جانب دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے کہ آج ان کے جگہ کا لکڑا ازندگی کے ایک بہت بڑے امتحان میں سُرخ رو ہو کر ان کا مان بڑھا رہا تھا۔ ہم نے ڈاکس کی طرف گھوم کر سلامی کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ یہ سلامی دراصل تمام کیڈٹس کی اپنے گھروالوں اور پیاروں کے لیے بھی تھی جو دُور سے انہیں دیکھ کر خوشی سے نظرے لگا رہے تھے، ان کے نام پکار رہے تھے۔ دفعتہ میرے کانوں میں بھی ایک آواز ابھری "آدمی..... آدمی....." میں نے سلامی دیتے ہوئے بھیڑ میں نظریں دوڑائیں اور کچھ پل کے لیے میرا خود اپنی آنکھوں سے اعتبار اٹھ گیا۔ دوسری قطار میں امی کھڑی تھیں۔ ہاں ہاں..... وہ میری امی ہی تھیں۔ میری پیاری امی..... جو اس وقت بھی اپنے مخصوص کالے ہرقے میں ملبوس تھیں اور اتنے بہت سارے غیر مردوں کی موجودگی کی وجہ سے صرف اپنی بھیگی آنکھوں سے پلاٹھٹائے کھڑی تھیں اور ان کا ایک ہاتھ میری جانب یوں اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ اتنی دور سے بھی اپنے راجہ بیٹے کو بھیڑ میں ٹھوک کر کھا کے گرنے سے روک لیتا چاہتی ہوں..... یا اللہ یہ کیسا مجزہ ہے۔ پھر میری نظر امی کے ساتھ کھڑے چوتھے شخص پر پڑی۔ مجھے اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ اگر میں فوراً اپنے قدم سنپھال نہ لیتا تو ضرور پوری کی پوری پر یہ کے قدم توڑ کر سب کی پر یہ برا دکر دینا۔ عمارہ کے ساتھ ابا کھڑے تھے..... ہاں ہاں..... میرے ابا..... وہ کیسے یہاں تک آپنے۔ اتنا ملباسفر، امی کی پیاری، عمارہ کے امتحانات، کوئی وجہ بھی تو ان کے قدم روک نہیں پائی تھی۔ کون کہتا ہے کہ میرے ابا مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ دیکھو..... وہ کھڑے ہیں

میرے ابا..... وہ ریس میری پیاری امی جو اپنے آدی کی سلامی لینے یہاں تک آ پچھی تھیں۔ شاید اپنی زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کر کے۔ ابا نے مجھے دیکھ کر ملکے سے ہاتھ ہلاایا۔ ان کی آنکھوں کی نئی میں یہاں سے بھی محبوس کر سکتا تھا، لیکن یہ نی خوشی کی نئی تھی۔ ان کے آدی نے آج وہ کر دکھایا تھا جو ان کا خواب تھا۔ لوگ بیٹوں سے بھلا اور کیا چاہتے ہوں گے.....؟ فخر کا یہی کچھ لمبوں کا احساس، غرور کی چند گھڑیاں..... جوان کی ساری زندگی پر بھاری ثابت ہوتی ہیں۔ میری اور ابا کی آنکھیں ملیں۔ میری آنکھوں سے صدیوں کا رکا ہوا سیلاں بہہ لکلا۔ میرے قدم پر یہی کی یہیں پر اٹھ رہے تھے، میرا ہاتھ ماتھے پر سلامی کے لیے جما ہوا تھا لیکن میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں کہ آج ہی اندر کا ہر دریا نکال کر ہی دم لیں گی۔ امی نے دور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں نہ روؤں پر وہ۔ خود بھی تو رورہی تھیں۔ عمارہ مجھے دیکھ کر منہ چڑا رہی تھی لیکن وہ بھی تو رورہی تھی۔ فاری بھیا جو ایسے موقعوں پر بہت بہادر بنتے تھے، آج تو وہ بھی بنا چہرہ چھپائے یوں رورہے تھے کہ ان کے گالوں پر بہتے آنسو مجھے اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

سی۔ نبی۔ اوزور سے چنجا ”کیڈٹ آخري سلامي دے گا۔“..... سلا ۲۶۲ آمفون۔“

ہمارے ہاتھ تیزی سے ہوا میں لہرائے، ماتھے تک گئے اور نیچے کر گئے۔ میرے دل نے سرگوشی کی۔

”الوداع اے میری رہنما..... اے میری تربیت گاہ..... الوداع.....“

اردو ٹائپنگ سروس

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

باتھ سے لکھی ہوئی تحریکیں کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے ہا

۱۰۷ اغتشاہ مکان و میل علّا کے کامن بیچوں یکم

اپنی ریروں اردو میں ناپ رکے یہ نہ دبے یا
کچھ کوں کے گھر میں نہ دبے یا

☆ اپنا مواہا پی اواز میں ریکارڈ کر لے، میں ارسال مرد تجھے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے

اردو میں تاپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اداگی

کے طریقہ کا اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

<http://kitaabghar.com> harfcomposers@yahoo.com <http://kitaabghar.com>

[ایمیل:](mailto:harfcomposers@yahoo.com)

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

دوسری قیامت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پاسنگ آؤٹ کے بعد کیڈٹ کالج کا الوداع کہہ کر جب میں اپنے گھروں سمیت اپنے شہر کے رہلوے اشیش پر اتراتو سب سے پہلی خبر جس نے میرا یوں استقبال کیا کہ میرے ہوش و حواس ہی چھین لیے، میں نے راجہ کی زبانی وہیں پلیٹ فارم پر سنی۔

”جو آپ کو طلاق ہو گئی.....

مجھے یوں لگا کہ جیسے پورا رہلوے اشیش ہی گھوم رہا ہے اور ابھی چند لمحوں میں میرے سر پر آ گرے گا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے سمجھنی نہیں آیا کہ راجہ بول کیا رہا ہے۔ اُمی بھی محلے میں داخل ہوتے ہی تانگ سے اتر کر جلدی سے غیاث پچا کے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔ اشیش پر راجہ کے ساتھ مٹھی، نخوا، گدھ، بالے اور پوچھی مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ سب ہاتھوں میں ہار لیے یوں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے جیسے میں اکیدمی سے نہیں، مکمل مدد سے جو کر کے آیا ہوں۔ بہر حال میری ساری خوشی اور دوستوں سے ملنے کی سرت اس خبر سے غائب ہو چکی تھی اور ہم سب راجہ کے گھر کی بیٹھک میں آ کر بیٹھنے گئے۔ میں بالکل خاموش تھا اس لیے وہ سارے بھی پچ تھے۔ پھر راجنے ہی پہلی کی اور مجھے تین دن پہلے کی شام کا وہ سارا قصہ بتایا جب وجہ آپ کو ریحان صاحب کے ڈرائیور کی وجہ سے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی اور ریحان صاحب خود انہیں گھر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ظفر کے گھر پر نہ ہونے اور دروازے پر تلاپڑے ہونے کی وجہ سے آخر کار دیر رات انہیں ڈکووان کے اپنے گھر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ غیاث پچار ریحان صاحب کے جاتے ہی ظفر کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رات دو بجے وہ ظفر کی گلی میں پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں سے ہو کر گزرے تھے لیکن تب دروازے پر تلاپڑا ہوا تھا۔ ظفر کے ایک آدمی ٹھکانے کا پتہ وہ جانتے تھے، لگے ہاتھوں انہوں نے اس کے پرانے شوروم کا بھی چکر لگایا لیکن سب طرف سے ایک ہی جواب ملا کہ ظفر وہاں نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹنے سے پہلے انہوں نے آخری امید کے طور پر دوبارہ ظفر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور جیسے ہی ان کا اسکوڑگلی میں مڑا انہوں نے ظفر کا دروازہ کھلا کیکھلایا۔

غیاث پچا جلدی سے اسکوڑ لاک کر کے اترے اور دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد ظفر نے اندر سے دروازہ کھولا اور سر نکال کر باہر جھانا کا اور غیاث پچا کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں بنا کسی سلام دعا کے بولا۔

”اوہ..... تو آپ ہیں..... کیا آپ بھی اپنی لاڈی بیٹی کی تلاش میں بھک رہے ہیں..... میرے خیال میں تو اسے اب تک آپ کے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

غیاث پچا کچھ تیران بھی ہوئے کہ جب ظفر کو پتہ بھی ہے کہ وہ جو اپنے گھر میں ہیں تو یہ انہیں لینے کیوں نہیں آیا۔

”ہاں بیٹا..... وہ تو کب سے گھر بیٹھی تھا را انتظار کر رہی ہے۔ دراصل ٹیوشن سے واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی۔ یہاں کچھ تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، اس لیے ریحان صاحب اسے ہماری جانب چھوڑے چلے آئے..... چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں..... وجبہ تھا را انتظار کر رہی ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

ظفر کے چہرے پر ایک زہر خندی مسکراہٹ ابھری

”اوہ..... ریحان صاحب..... تو وجہہ کو لانے لی جانے کا فریضہ اب بڑے صاحب نے خود سنجھا لیا ہے..... بہتر ہوتا وہ اسے آپ کے گھر چھوڑنے کے بجائے واپس اپنے گھر ہی لیجاتے.....“

<http://kitaabghar.com>

غیاث پچا کا صبرا ب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے گر جے۔

”ظفر..... تمہیں شرم آئی چاہیے خود اپنی بیوی کے متعلق ایسی بات کرتے ہوئے وہ بے چاری تو.....“

<http://kitaabghar.com>

ظفر نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”بس..... بہت ہو چکا یہ ڈرامہ..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے افسر کے ساتھ یہاں آتے اور واپس جاتے دیکھا ہے۔ کیا شریفزادیوں کے بھی پھر ہوتے ہیں کہ شام ڈھلنے دیر تک اندر ہمراہ ہونے کے بعد بھی گاڑیوں میں افسروں کے ساتھ گھومتی پھریں.....؟“ غیاث

<http://kitaabghar.com>

چھانے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ ظفر پر اٹھنے سے روکا، لیکن اپنی زبان کا کوڑا ہبرانے سے خود کو نہ روک سکے۔

”شریفزادیاں ایسا کرنے پر تباہ مجبور ہو جاتی ہیں جب ان کے میاں گھر میں چارپائی پر پڑ کر بیوی کی کمائی کی روئیاں توڑنے لگیں..... ایسے میں انہیں خود اپنا اور میاں کا پیٹ پانے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

ظفر کے تن بدن میں غیاث پچا کی یہ بات ایسی آگ لگائی کہ وہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھا اور اس کی زبان سے غیاث پچا اور قواؤ آپی کے لیے مغلظات کا ایک ایسا ریلا بہہ لکلا کہ جس کے آگے بند باند ہے والا کوئی نہ تھا۔ دراصل ظفر کو موقع یہ تھی کہ غیاث پچا قواؤ آپی کی وجہ سے اس کے سامنے گز گڑا کیسی گے، فریاد کریں گے کہ وہ آ کر ان کی بیٹی کو ان کے گھر سے واپس لے جائے اور وہ ان کی بات مان تو لے گا لیکن کچھ نہ کچھ نہ مزید غیاث پچا سے اٹھنے کے بعد۔ کافی دنوں سے اس کی نظر غیاث پچا کے لبریٹا (Lumbrita) اسکوٹر پر تھی اور وہ دو تین مرتبہ د جو کے سامنے اس بات کا عذر بھی پیش کر چکا تھا کہ شہر کے فاسطے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بندہ گھر سے کام کی تلاش میں لکھی بھی تو کیسے۔ آدھا دن تو بس یاتا نگے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سواری ہوتی تو کم از کم اسے لوگوں کے پاس کام مانگنے کے لیے جانے میں تو آسانی ہو جاتی۔

قواؤ آپی نے اس سے جواباً کہا بھی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ٹیوشن کے پیوں سے کچھ رقم جوڑ کر قسطوں پر ظفر کے لیے اپنے ابا سے کہہ کر کوئی سواری دلوادیں گی لیکن ظفر کو بھلا اتنا صبر کہا سے آتا.....؟

وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے اپنی سواری کی ضرورت کہاں سے پوری کرنی ہے اور وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا کہ جب اسے وجوہ آپی کے گھر والوں پر دباؤ ڈالنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آ جائے اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر کے ان سے اپنی بات منو سکے۔ اور پھر قدرت نے

اُسے وہ موقع فراہم کریں گے جو کوئی بھی دیا اور بدستی سے فوکو ٹیوشن سے واپسی پر دری ہو گئی۔ جس وقت ریحان صاحب و جو گولے کرگی میں داخل ہوئے تھے، تب ظفر وہیں گلی کے نگار پر ہی کھڑا چھپ کر یہ سارا ما جرا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اس وقت بھی آگے پڑھ کرتا لاکھوں کر دھو آپی کو گھر میں بلا سکتا تھا لیکن اذیت پسندی کا مارا، یہ شخص ایسے کھیل کھینے میں بہت اطف حاصل کرتا تھا اور پھر اسے تو ویسے بھی دھو آپی اور ان کے گھر والوں کی تزلیل کا کوئی نہ کوئی موقع چاہیے ہوتا تھا۔ اور یہاں تو ایک تیر سے دوشکار ہو رہے تھے۔ تزلیل کی تزلیل ہو جاتی اور معاوضے میں اسکوڑ کا مطالبہ بھی دہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن غیاث چچا کی ایک ہی کھڑی بات نے اُسے انگاروں پر لوٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ظفر کے شور شراب سے سامنے کے مکان سے اُس کے ہم سائے کا ٹھیں صاحب بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے بھی ظفر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظفر کا خون تو اپال کھار ہاتھا۔ ایک مجبور باب کی یہ مجال کرائے طعنے والے..... غیاث چچا بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے لہذا انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر کنڑوں کر کے دوبارہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی بیٹی اب ظفر کی بیوی ہے لہذا اس کے کردار پر کچھ راجھانا خود ظفر کی اپنی بے عرقی کے مترادف ہے لیکن ظفر کی شعلے اگلتی زبان کو اب لگام دینا ممکن تھا۔ وہ چلا کر بولا۔

<http://kitaabghar.com> ”خوب جانتا ہوں میں کہ کس کا کردار کیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ اپنی لاؤڈی کو اب اپنے گھر میں ہی رکھیں۔ میں اس بدنامی کا بوجھ مزید نہیں سہہ سکتا۔ اس گلی محلے میں میری بھی کوئی عزت ہے۔ لیکن جب بھی آس پاس والے اُسے بڑی بڑی گاڑیوں میں صاحب لوگوں کے ساتھ آتے جاتے دیکھیں گے تو میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“

کتاب گھر کی پیشکش

پیشکش

غیاث چچا ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور دھیرے سے بولے۔

<http://kitaabghar.com> ”میاں اس کا آسان حل تو بھی ہے کہ تم اپنی بیوی کو گھر میں بیٹھنے کا کہو اور کل سے خود روزگار دھونڈنے کے لیے نکل پڑو۔ نہ وہ گھر سے باہر نکلے گی نہ تھا ری عزت پر کوئی حرفاً آئے گا۔“

ظفر غز ایسا۔ ”خوب..... ایک تو چوری..... اوپر سے سینہ زوری..... گویا آپ تمام الزام پھر مجھی کو دے رہے ہیں..... بڑا گھمنڈ ہے نا آپ کو اپنی لائق فاقع بیٹی کی کمائی پر، تو پھر مجھک ہے۔ رکھیں اپنی اس کمائی بیٹی کو اپنے گھر پر۔ نہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کمائی کی، میری طرف سے آج سے وہ فارغ ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چچا نے اُس کی زبان روکنے کی کوشش کی اور وہ سر ایسہ ہو کر چلا۔

”ظفر..... اپنی زبان پر قابو کھو..... میرا مطلب وہ نہیں جو تم..... لیکن ظفر کی زبان سے جو نکالتا تھا وہ نکل کر ہی رہا۔.....“

”میں نے اسے طلاق دی..... طلاق دی..... طلاق دی.....“

غیاث چچا وہیں کھڑے کھڑے زور سے چکرائے اور زمین پر آگرے، ظفر نہ جانے کب کا دروازہ بند کر کے اندر جا چکا تھا۔ کامی صاحب نے چلا کر اس پاس کے محلے داروں کو اکھا کیا اور غیاث چچا کو فوراً رکھنے میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دل کا دورہ تفتیش کیا اور رات بھر غیاث چچا انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پڑے رہے۔ سینہ خالہ اور دھو آپی کو گھر پر ختمی تو وہ ہسپتال دوڑی چلی آئیں۔ صبح کے پچھلے پہر جب

غیاث پچا کو کچھ ہوش آیا تو غنوڈگی کے عالم میں بھی وہ بیہی بڑی راتے رہے..... نہیں نہیں..... خدا کے لیے ایسا نہ کرو..... اسے طلاق نہ دو..... ”تب ساتھ آئے کاظمی صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی سکینہ خالہ اور ہوآپی کو تھائی میں لے جا کر وہ روح فرساخ برنا ہی وی جو غیاث پچا کی اس حالت کی ذمہ داری تھی۔ کہتے ہیں انسان کو شدید صدمے کی حالت میں اگر کوئی دوسرا اور اس سے بھی بڑی صدمے کی خبر سنائی جائے تو پہلا صدمہ بھی کبھی دوسرا صدمے کے جھٹکے اور شاک کو برواشت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ وجوہ آپی اور سکینہ خالہ پہلے ہی غیاث پچا کی ڈومنی سانسوں کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس گناہ کے تھے لہذا یہ دوسرا بڑا صدمہ انہیں مزید گم سُم کرنے کا باعث تو بنا لیکن فی الحال انہیں اپنی خبر بھی نہیں تھی لہذا ان کے ذہن یہ صدمہ وقت طور پر توجیل گئے کیونکہ وہ پہلے ہی ایک بڑے صدمے سے گزر رہے تھے۔ البتہ اس دوسرا صدمے کے اثرات دیر پاتھے اور یہ غم اور یہ کرب دھیرے اور قظرہ قطرہ زہر بن کر ان کی رگوں میں اترنا بھی باقی تھا۔

جس وقت راجہ مجھے یہ المناک داستان سن رہا تھا اس وقت بھی غیاث پچا دل کے وارڈ میں ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر سید ہے، ہپتال ہی چلے گئے۔ وارڈ میں شور شراب سے بچتے کی غرض سے ایک وقت میں صرف دو فرد ہی مریض کو دیکھنے اندر جاسکتے تھے لہذا باقی سب راہداری میں ہی رُک گئے اور راجہ اندر گئے۔ سکینہ خالہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وجوہاں نہیں تھیں، شائد گھر گئی ہوں کچھ دیر کے لیے غیاث پچا کو ہوش آچکا تھا لیکن وہ برسوں کے پیار دکھائی دے رہے تھے اور چب چاپ پڑے چھت کو گھوڑے جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کا ہاتھ تھام لیا، انہوں نے چونکہ کرمجھے دیکھا اور دھیرے سے دوسرا ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت اور اس سہارے کے طور پر قبول کیا ہے جو ایسے میں کوئی بھی ٹوٹا ہوا شخص کی اپنے سے امید کر سکتا ہے۔

”میں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیگزری تھی کہ پکن عمر کا ایک باوقار اور سبجدید ساخت پھولوں کا گلدستہ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے بہترین تراش خراش کا سوت پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر خوبصورت سے ہلکے شہری فریم کی عینک تھی جو اس کے وجہ سے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ راجہ نے آہستہ سے میرے کان میں بتایا کہ بھی ریحان صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ شاف زس بھی غیاث پچا کے پردوں سے الگ کر کے بنائے گئے کیبین میں داخل ہوئی۔ کیبین میں اتنے لوگوں کی سمجھائش نہیں تھی لہذا میں اور راجہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر راہداری میں ریحان صاحب کا باور دی ڈرائیور بھی ایک جانب کھڑا نظر آیا اور راجہ سے انتباہی پر تپاک طریقے سے ملا۔ راجہ نے بتایا کہ گزشتہ تین چاروں دن سے ریحان صاحب کا ڈرائیور روزانہ انہیں ہوآپی کے گھر اور ہپتال لاتا رہا ہے لہذا محلے میں اور پھر یہاں ہپتال میں روزانہ ہی راجہ سے ملاقات کی وجہ سے دونوں میں اچھی خاصی جان پچان ہو چکی ہے۔ بالے اور نخود غیرہ بھی راہداری میں پڑے بیچوں پر ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتمیں کر رہے تھے۔ چند لمحے میں غور سے اپنے بچپن کے ان ساتھیوں کو دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیوں اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے بچپن کے چلے جانے کا احساس۔ وہ سب بھی اب نوجوانی میں قدم رکھ پکے تھے۔ باقاعدہ شیوونا نے گئے تھے اور ان کے جسم بھی میرے جسم کی طرح سخت اور جھوٹ سانچے میں ڈھل پکے تھے۔ ہاں..... اگر کچھ نہیں بدی تھی تو وہ تھی ان کے چہروں کی معصومیت۔ شاید ہماری عمر تھی ہی کیوں نہ بڑھ جائے اور ہم کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں لیکن اپنے والدین کے لیے اور اپنے بچپن کے دوستوں کے لیے ہم ہمیشہ عمر کے اسی حصے میں رہتے ہیں، جسے بچپن کہتے ہیں۔ ایسے رشتہوں

کے درمیان بچپن کا یہ دسمبر کسی بھی ختم نہیں ہوتا..... جوانی کی دھوپ کے مصائب انہیں کبھی چھو بھی نہیں پاتے۔

غیاث پچا کو مزید ایک ہفتہ و ہیں انتہائی ٹمداشت کے شعبے میں رکھا گیا اور پھر بہت سی احتیاطیں تاکر انہیں اگلے ہفتے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ گھروپس آگئے لیکن ان کی زبان کو لوگی چپ نٹوٹ سکی۔ سینہ خالہ اور وجہے اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ وہ ان کے سامنے ایسی کوئی بات یا اپنی اداہی اور ذکر کا اظہار نہ کریں جو غیاث پچا کو مزید بھی کرنے کا سبب بن سکے۔ لیکن کیا ان کے اس طرح چھپانے سے ان دونوں کا کوئی غیاث پچا سے چھپ سکتا تھا.....؟

آن کی بیٹی دوسال بعد ہی طلاق کا یہدیہ کر گھروپس آپ بھی تھی اور اس سب کا ذمہ دار وہ کہیں نہ کہیں خود اپنے آپ کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ہر وقت بس ایک اسی ”کاش“ کی گردان ہوتی رہتی کہ کاش وہ اس رات ظفر کے سامنے نہ بولتے، کاش وہ اپنی تلخی پر قابو پالیتے، کاش وہ چند لمحے مزید خون کے گھوٹ پیتے رہتے اور ظفر کو اس کی شرطوں پر گھر منلاتے، کاش وہ اس کم ظرف انسان کو خود اسی کے سامنے، آئینہ دکھا کر کھڑا نہ کر دیتے۔ کاش..... کاش لیکن یہ کاش کی گردان اب سوائے آن کے خون کے ڈشار کو بڑھانے کے، مزید اور کچھ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

بہت دن تک میں خود بھی وجہ سے، جانے کیوں نظر ملانہیں پایا۔ جب بھی وہ ہستاں میں یا پھر بعد میں، اپنے گھر میں میرے سامنے آ جاتیں تو میں نظریں جھکایتا تھا۔ شاید میرے اندر کہیں نہ کہیں یہ شرمندگی بھی پل رہی تھی کہ میں کبھی ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی ہمیشہ ہی سے جانے کتے طفانوں کا سامنا ا کیلئے ہی کرتی آئی تھی۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔؟ مجھ سے صرف سات آٹھ برس ہی تو بڑی تھیں وہ..... میں جب بکھری عمر کے اس فرق کو ہٹا کر یا پھر انہیں اپنی جگہ رکھ کر سات برس کا یہ میزان کرتا تو حوصلے، صبر اور طاقت میں میں انہیں اپنے آپ سے کہیں آگے پاتا تھا۔ یا پھر شاید کسی کا کہا بھی نہیں ہی تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ کم از کم وہ آپ کی حد تک تو یہ بات بالکل اور سو فیصد درست تھی۔ پہلے اٹو کا معاملہ، پھر طاہر بھائی کی موت، پھر پڑھائی اور ہوری رہ جانا، پھر اس کم ظرف سے شادی اور اب یہ طلاق..... کیا کچھ نہیں سہا تھا انہوں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں.....

اُس دن بھی میں ان کے گھن میں پڑی آرام کری پر بیٹھا انہیں دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں غیاث پچا کو ٹھلانے کے لیے باہر لے کر گیا تھا اور چند لمحے پہلے ہماری واپسی ہوئی تو انہوں نے وجہ سے قہوہ پینے کی فرمائش کی تھی۔ وجہ سامنے باور پی خانے میں سے قہوے کی پیالیاں ترے میں اٹھائے میری طرف ہی آرہی تھیں، غیاث پچا شاید کچھ لمحے ستانے کے لیے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ وجہ اب بہت کم بولتی تھیں یا پھر بالکل ہی خاموش رہتی تھیں۔ ہم دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی شام کو غیاث پچا کو کچھ دور تک ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹھلانے کے لیے لے جاتا تھا۔ ریحان صاحب نے بھی اس موقعے پر اپنا بڑا اپن دکھایا تھا اور وہ بھی تقریباً ہر دوسرے روز غیاث پچا کو دیکھنے کے لیے آ جاتے تھے، وجہ سے انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بچے اب کسی بھی دوسری شخص سے ٹیوشن لینے کے لیے تیار نہیں ہیں لہذا چاہے مہینہ بھر کے بعد ہی کیوں نہ کہی، وہ وجہ ہی سے دوبارہ ٹیوشن جاری رکھنے کی استدعا کریں گے۔ مجھے اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوئے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور دو چاروں

میں میرا رزلت بھی نکلنے والا تھا۔ اتنے بہت سے دنوں میں اگر وجوہ نے مجھ سے کوئی بات کی تھی تو یہی کہ میرے پرچے کیسے ہوئے ہیں؟ اور میرا رزلت کب تک آئے گا؟ یا یہ کہ اب آگے میرا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ وہ جانتی تھیں کہ مجھ سے ڈسپلن اور ظلم و ضبط کچھ کم ہی برداشت ہوتا ہے لہذا میں فوج تو قطعی جوان نہیں کروں گا۔ اس لیے انہیں میرے مستقبل کے شعبے کی ہمیشہ ہی فکرگی رہتی تھی۔ خود میرے ذہن میں بھی ابھی تک اس بارے میں کوئی حقی خاکہ تکمیل نہیں پاس کا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس دن بھی ہونے بیٹھتے ہی مجھ سے یہی سوال کیا کہ اب تو رزلت بھی ہفتے بھر میں آئی جائے گا تو اب تک میں کوئی حقیقی فیصلہ کیوں نہیں کر سکا؟ میں ابھی انہیں جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہتا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک نے میری توجہ بنا دی، میں انھوں کر دروازہ کھولنے کے لیے چلا گیا۔ ہوندر برآمدے کوڑھانکتی جافری کی اوٹ میں چل گئیں۔ باہر ریحان صاحب کھڑے تھے لیکن ان سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے سارے جسم کا خون لجھر میں میری کن پیوں کی جانب سمت آیا اور میرے چہرے پر نفرت کے کچھ ایسے آثار پیدا ہوئے کہ لمحہ بھر کو ریحان صاحب بھی سپٹا سے گئے۔ وہ ظفر ہی تو تھا۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہوکی رخصتی کے موقع پر دو سال پہلے اُسے دیکھا تھا لیکن میں اس کی صورت بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ریحان صاحب صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ گئے اور انہوں نے آہستہ سے کھنکا کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ میرا نام جانتے تھے۔

”عبدالمیاں..... ہو سکے تو اندر کسی طرح وجہہ کی امی کو خبر کروادیجھے کہ ظفر ان سے مانا چاہتا ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ غیاث صاحب کو اس کی خبر نہ ہو۔ میں اسے یہاں بھی لے کر نہ آتا لیکن یہ میرے گھر پر آ کر بہت گزر گزرا اور بہت معافی مانگی ہے اس نے اپنی غلطی اور اپنے بُرے سلوک کی، اسی لیے یا پانی غلطی کے ازالے کی خاطر وجہہ اور ان کی امی سے مانا چاہتا ہے۔“

میں نے حیرت سے ریحان صاحب کی طرف دیکھا۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے عقل والے اور سمجھدار لگتے تھے۔ پھر آج وہ کس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ظفر نے ہو کو آخر کار طلاق ہی دے دی تھی تو پھر اب بھلا کیسا ازالہ اور کون سامر ہم؟؟..... اب تو قصہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ شاید ریحان صاحب نے بھی میری آنکھوں میں سے جھانکتی حیرت اور چہرے پر لکھے سوالوں کو پڑھ لیا تھا، تبھی انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ اس رات ظفر سے غصے کے عالم میں جو کچھ بھی ہوا، صبح تک اپنی اس غلطی پر وہ بے حد ناوم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی اس نے غیاث پچا کو بقول اس کے، جو بھی کہا تھا، وہ غصے میں کہا تھا اور غصہ تو ہے ہی ایسی لعنت کہ انسان کو حیوان بنانے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کرتا۔ لہذا وہ دوڑا ہوا اپنی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا اور ان سے گول مول ساز کر کیا کہ اُس نے اپنے سُسر کے سامنے اپنی بیوی کو فارغ کیے جانے کے الفاظ غصے میں کہہ دیے ہیں لہذا وہ بتا کیس کہ اس کا کیا حل ہے۔ پیش امام صاحب نے اس سے کہا کہ طلاق تو وہی غصے کی حالت میں جاتی ہے، لہذا اگر اس نے اپنی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہا ہے تو طلاق واقع ہو چکی۔ ہاں البتہ اس نے غصے میں صرف ایک مرتبہ کہا ہے کہ وہ میری جانب سے فارغ ہے اور نیت اس کی تب بھی طلاق ہی کی تھی تو پھر تین طلاقوں میں سے ایک طلاق تو ہو گئی لیکن اب بھی وہ اپنی بیوی کو گھر لا سکتا ہے۔ لیکن یہ دھیان میں رہے کہ اب اس کے پاس صرف دو طلاق ہی کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ لہذا ظفر کا دعویٰ اب یہ تھا کہ اس نے ہو کو صرف ایک ہی طلاق دی تھی اور وہ بھی لفظ طلاق سے نہیں۔ بلکہ اس جملے

سے کہ ”اب وہ میری طرف سے فارغ ہے.....“

ریحان صاحب صاف دل انسان تھے، انہوں نے ظفر کی یہ فریاد سنی اور اسے بظاہر اپنے کئے پر شرمندہ دیکھا تو وہ اسے یہاں لے آئے تھے۔ ظفر اسی طرح ڈور سر جھکائے اور مسکین سا بنا کھڑا تھا۔ مجھے ظفر کی کسی بات کا ازتی بھروسہ نہیں تھا لیکن چونکہ ریحان صاحب خود کافی دیر سے دروازے پر کھڑے تھے لہذا میں نے کسی طور اندر یہ اطلاع پہنچا دی کہ ریحان صاحب کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے فی الحال غیاث پچا کی موجودگی، ان کی ابتوحیت کی وجہ سے کچھ مناسب نہیں ہو گی۔ میں نے جان بوجھ کر سکینہ خالہ کو ظفر کی باہر موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ خوبی بھی سوچ میں پڑ گئیں کہ اس وقت غیاث پچا کی موجودگی میں بھلا دہ کیونکہ اور کیسے ریحان صاحب کی بات سن سکتی تھیں، میں نے انہیں تجویز دی کہ میں جا کر راجہ لوگوں کی بیٹھ کھلاو دیتا ہوں وہ چاہیں تو وہاں جا کر بات کر لیں کیونکہ اگر وہ اتنی دیر دروازے پر کھڑی ہو کر بھی ریحان صاحب کی بات سن لیں گی تو غیاث پچا کو تک تو ضرور ہو جائے گا۔ ہم ابھی اسی کش مش میں تھے کہ قدرت نے ہمارا مسئلہ خود حل کر دیا۔ تو نے غیاث پچا کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دھیرے سے آ کر میں آہستہ بات کرنے کا کہا کیونکہ غیاث پچا کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ کوابھی تک اس سارے ماجرے کا یکسر پتہ نہ تھا۔ سکینہ خالہ نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں یہیں ان کے مہماںوں کے کمرے میں لے آؤں۔ باہر آ کر میں نے ریحان صاحب سے کہا کہ انہیں سکینہ خالہ نے اندر آنے کا کہا ہے لیکن فی الحال وہ اکیلے ہی بات کر آئیں تو بہتر ہو گا۔ ریحان صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے اور انہوں نے ظفر کو ان کی گاڑی میں ہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا اور خود اندر چلے گئے۔ میں وہیں دروازے پر جما کھڑا رہا کیونکہ مجھے ظفر سے کوئی اچھی امید بالکل بھی نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب واپس باہر آگئے اور میں نے ان کے چہرے پر لکھی تحریر سے ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ سکینہ خالہ نے ان سے کیا کہا ہو گا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئے، چند قدم ڈور جا کر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ واپس میری جانب پلٹ آئے۔ میں نے چونکہ کرانیں دیکھا، وہ قریب آ کر بولے۔

”عبدالمیاں..... میں نہیں جانتا کہ یہ شخص حق بول رہا ہے یا جھوٹ، کیونکہ اس واقعے کے عینی گواہ خود غیاث صاحب ہیں اور وہی بہتر جانتے ہیں کہ حق کیا ہے لیکن اس وقت ہماری مجبوری یہ ہے کہ تم ان سے بھی یہ حقیقت جان نہیں سکتے۔ میں اسے یہاں صرف اس خیال سے لے کر آیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح میری کسی بھی کوشش سے اس دُکھی گھرانے اور اس مظلوم لڑکی کے غموں کا کچھ مداوا ہو سکے، تو کرگزروں..... لیکن وہ جیسہ کی اسی بھی تھیک ہی کہ تھی ہیں کہ یہ وقت اس سارے قصہ کو جھیلنے کا ہے ہی نہیں..... ابھی بمشکل غیاث صاحب کی ذرا سی طبیعت سنبھلی ہے۔ ان کے سامنے اس وقت ایسی کوئی بات نہیں ہوئی چاہیے جو انہیں ہٹنی یادی اذیت دینے کا باعث بن سکتی ہو۔ میں اس شخص کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فی الحال چند دنختے اس بات کو بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ لیکن جانے اسے میری بات سمجھ بھی آئے یا نہیں.....؟ لہذا اب تم کو یہاں بہت ہوشیار اور بیدار رہنا ہو گا تا کہ یہ موقع پا کر کوئی نیا قتنہ کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے.....“

میں نے ریحان صاحب کی بات توجہ سے سنی اور انہیںطمینان دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں۔ سکینہ خالہ کی مرضی کے بغیر ظفر ان کے

دروازے پر تو کیا اس محلے کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ریحان صاحب میرا کندھا تھپٹھا کراپی گاڑی کی جانب بڑھ گئے جہاں ظفر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ریحان صاحب نے اس سے کچھ بات کی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ان کی بات سے پوری طرح متفق نہیں ہے لیکن ریحان صاحب نے پھر بھی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

دراصل ظفر کو اسی رات اپنی اس گھناؤنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس میں بھی اس کی طرف سے کسی نیک نیتی کا عمل خل نہیں تھا، نہ ہی اسے اپنے کے پر کوئی پیشیاں تھی۔ اسے تو صرف ایک بات کی ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس نے وقت جوش اور غصے میں آکر فوکو طلاق تو دے دی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی مستقل آدمی کا ایک ذریعہ بھی ختم کر بیٹھا تھا اور پھر ایک اچھی خاصی گھر کی نوکرانی سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے، تو کرانی بھی کیسی؟ جو صحیح سے لے کر رات تک نہ صرف اس کے گھر کے کام کا ج اور بنانے سنوارنے میں بھی رہتی تھی بلکہ شام کو دوسروں کے گھر جا کر ان کے بچے پڑھا کرتی کہاں بھی کرلاتی تھی، جس سے ظفر کے پیٹ کا غار بھر جائے..... لہذا اگلے ایک بیٹھتے میں ہی ظفر کو اپنی حمایت کا شدید احساس ہونا شروع ہو گیا۔ پچھلے دو سالوں میں تو اس نے انہ کرا ایک گلاں پانی تک خود نہیں پیا تھا۔ اب جو گھر کے مختلف کام اور کھانے پینے کی مجبوری نے اس کے سامنے منہ کھولا اور اسے اپنی عیاشی اور ہوئے کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو اسے دخوبی طرح یاد آئیں۔ اس کا شاطر ڈھن پہلے دس بارہ دن تو مختلف قسم کے منصوبے بنتا اور انہیں زد کرتا رہا، لیکن پھر جب اسے کسی دوست نے کسی عالم سے مشورہ کرنے کی صلح دی اور وہ محلے کی مسجد کے امام کے پاس زندگی میں پہلی مرتبہ، اپنی اس مجبوری کی وجہ سے مسجد کی سرحد پار کر گیا اب مولوی صاحب کی بالتوں نے اسے یہ راست سمجھا دیا کہ وہ مکمل طلاق دینے سے ہی مکسر انکار کر دے گا۔ دوسرا منصوبہ اس نے یہ بنا یا کہ براؤ راست غیاث چچا کے گھر جانے کے بجائے وہ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بڑے افسر تھے اور وہ کوئے خیر خواہوں میں سے ایک تھے، اور وہ کوئی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ انہیں بیشہ وجوہی احساسات کی پڑھی لکھی لڑکی کا ایسے جنگلی اور اچھ شخص سے رشتہ ہونے پر بھی دل ہی دل میں بہت افسوس ہوتا تھا لیکن ظاہر ہے یہ قدرت کے کھیل تھے اور اس میں بھلاری حان صاحب کیا کر سکتے تھے۔ لہذا وہ ظفر کی بالتوں پر اعتبار کر بیٹھتے تھے، صرف اس لیے کہ اگر ظفر بچ بول رہا ہوگا تو وہ کو گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ دراصل وہ خود کو بھی وہ کے ساتھ ہوئے اس ظلم کا کہیں نہ کہیں ذمہ دار تھا تے تھے نہ اس شام ان کا ڈرائیور وہ کو چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر جاتا، نہ وہ لیٹ ہوتی اور نہ ہی انہیں آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ ڈرائیور کو تو انہوں نے اگلے دن ہی نوکری سے فارغ کر دیا تھا لیکن وہ بے چارہ روتا دھوتا کچھ دن بعد وہ کوئے گھر آن پہنچا کر اس سے جو بھی غلطی ہوئی انجانتے میں ہوئی اور اس کی بے روزگاری سے بچ گھر میں فالتوں پر مجبور ہیں۔ لہذا وہ نے خود ہی ریحان صاحب سے کہہ کر اسے دوبارہ نوکری پر لگوادیا تھا۔ وہ بے چارہ اس بات پر وہ کا اس قدر احسان مند تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں دعا میں دیتا رہتا تھا، لیکن شاید اسے بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کچھ لوگوں پر قدرت دعاوں کے ڈر بھی بند کر دیتی ہے۔ شاید وہ بد قسمت بہت خاص لوگ ہوتے ہوں گے کہ جن کے لیے اتنا کڑا نصیب لکھ کر انہیں زمین پر بھیجا جاتا ہوگا۔

وہ بھی انہی میں سے ایک تھیں کہ جن کے مقدار کی کنجیاں قدرت تالا لگا کرنے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی؟ ظفر نے دوچار دن تو ریحان صاحب یا وجہ کے گھر والوں کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا اور پھر کوئی پیش رفت ہوتی نہ دیکھ کر اس نے پھر غیاث چچا کے گھر کا رخ کیا، لیکن اس بارہ وہ اکیلا تھا۔ میں پہلے ہی راجہ اور بائے کو بتا چکا تھا کہ اب ہمیں چوپیں گھنٹے اس بات کا دھیان رکھنا ہوگا کہ ظفر کسی بھی طرح غیاث چچا کے گھر

تک نہ پہنچ پائے، ہم میں سے کوئی نہ کوئی وہاں آس پاس موجود ہی رہتا تھا لیکن یہ ظفر کی بد قسمتی تھی کہ جس شام وہ ہمارے محلے میں گھسا، اس وقت ہم سارے ہی دوست بڑے میدان میں موجود تھے۔

راجہ نے مجھے کہنی مار کر ظفر کی جانب متوجہ کیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے ”گزشتہ سرال“ کی جانب جا رہا تھا۔ بالے نے نیٹی بجا کر آئے آواز دی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”میں نے کہا ظفر یا بو..... جاتے کہاں ہو..... دو گھنی ہماری بات تو سن او۔“

ظفر ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر کچھ ٹھکا، مجھے تو وہ پہلے بھی وجہ کے دروازے پر اس دن دیکھی ہی چکا تھا لہذا اسے ہمارا مقصد سمجھنے میں ذرا درینہ لگی۔ ہم نے آگے بڑھ کر ظفر کے گرد یوں گھیرا بنا لیا کہ اس کے آگے بڑھنے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنی ذات کا ایک ہی کائیا شخص تھا۔ اس نے اپنے حواسِ مجنح کے اور اکڑ کر بولا ”تم لوگ یوں میرا راستہ نہیں روک سکتے..... مجھے غیاث پچا سے ملا ہے۔ میں اپنی بیوی کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے بہت مشکل سے اسے تیز سے جواب دیا۔

”غیاث پچا کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ کچھ دن بعد تشریف لا کیں۔“

ظفر کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔

”نہیں..... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا..... اور خود ارجوم میں سے کسی نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو..... تم لوگ ابھی ظفر سے واقف نہیں ہو۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ظفر نے قدم آگے بڑھائے۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے۔ ظفر نے اسی فتح جانتے ہوئے ظفر سے سراونچا کیا لیکن دوسرا ہی لمحے بالے کی اڑائی ہوئی ناگ کے چھٹکے سے وہ زمین بوس ہوتے ہوتے بچا۔ ظفر غزر اکر ہماری جانب پلتا، اب راجہ اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ راجہ نے ظفر کی کلائی پکڑ لی اور جھٹکا دے کر بولا۔

”یہ مت سمجھنا کہ یہ باقی سارے تم سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ تم اس محلے سے باہر جا کر لوگوں سے یہ کہتے پھر وہ کہ یہاں تمہارے ایک کے مقابلے میں پانچ پانچ آگئے تھے لہذا تم کچھ کرنے پائے۔ تمہارے لیے صرف میں ہی کافی ہوں..... بلوکیا ارادہ ہے پیارے؟“

ظفر نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے دوچار بار زور لگایا لیکن میں راجہ کی گرفت کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، بچپن میں جب ہم زور کا مقابلہ کرتے تو راجہ کی پکڑ کو ہم تین مل کر بھی نہیں کھول پاتے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں ظفر بھی پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم سب کو کسی طرح کچاہی بجا جائے۔ اس نے آخری حرہ آزمایا۔

”ٹھیک ہے..... تو تم لوگ اس غنڈہ گردی سے باز نہیں آؤ گے۔ میں ابھی واپس جا کر پولیس کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ پھر دیکھنا پولیس تم لوگوں کا کیا حشر کرتی ہے۔“

بالے نے اُس کی بات سنی تو زور سے بُش کر بولا۔

”یہ تکلیف کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے ظفر بابو..... پولیس کو ہم خود بیٹا لیتے ہیں۔ سُنا ہے اپنا پرانا علاقہ تھانیہ ارملک ریشم ترقی پا کر دی۔ ایس۔ پی ہو گیا ہے اور آج کل اس کی ڈیلوئی بھی دوبارہ سینیں ہمارے علاقے میں لگادی گئی ہے۔ براطالم افسر ہے۔ جھوٹے کو تو قبر تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ ابے اونھو۔ جا جا کر ملک صاحب کو سینیں بلا کر لے آ۔۔۔ تب تک ہم ظفر بابو کی سینیں خاطر مدارات کرتے ہیں۔“

تحوونے جلدی سے دانت نکالے اور ظفر کی جانب دیکھ کر بولا۔

”قسم خدا کی..... بلا لا وں کیا.....؟؟؟“

ظفر کو اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی کہ ہماری موجودگی میں اس کا مقصد محل ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں لہذا وہ پلٹ کر کتے جھکتے ہوئے محل سے واپس چلا گیا۔ میں نے احتیاطاً اسی وقت محل کے باہر بنے پی۔ سی۔ اوسے ریحان صاحب کے نمبر پر انہیں فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ہمارے علاقے کا ایس۔ پی ان کا کورس میٹ ہے لہذا ایس۔ اسچ۔ اوسی کوئی بھی دوسرے اپولیس افسر ظفر کی سی بھی شکایت پر ایس۔ پی کو اطلاع کئے بنا تو کوئی کاغذی کارروائی کرے گا اور نہ ہی ظفر کے ساتھ کہیں جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ ظفر بیک کر بیٹھنے والی بُدھی نہیں ہے لہذا ہم لوگوں نے تو کے گھر کے گرد پھرہ مزید بحث کر دیا۔ ظفر نے ایک آدھ بار اور کوشش کی لیکن محلے کے باہر سے ہی نہیں دیکھ کر اٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔ ہم نے رات والے محلے کے چوکیدار کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ باہر کا پھانک بند ہونے کے بعد کسی بھی باہر کے آدمی کو اندر داخل ہونے نہ دے، اور اگر کوئی اُسے مجبور کرے بھی تو ہم دوستوں میں سے کسی بھی ایک کو آکر اس بات کی اطلاع دے دے۔ لیکن ظفر نے رات کے اندر ہیرے میں محلے میں گھسنے کی جرأت نہیں کی۔ شاید اسے اس شام ہماری آنکھوں میں چھپے غصے سے ہمارے ارادوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم رات کی تہائی میں اسے اپنے سامنے پا کر اس کی کیا گست بنا سکتے ہیں۔

لیکن ان تمام احتیاطی مدداء کے باوجود میرے اندر کوئی چیز ایسی تھی، جو ہر لمحے مجھے بے چین کئے رکھتی تھی۔ اور پھر مجھے میری بے چینی کا جواب بھی مل ہی گیا۔ تیسرے ہفتے کے آخر کی بات ہے، ڈاکیہ ایک رجڑی لے کر محلے میں داخل ہوا اور اس نے سیدھے جا کر غیاث چچا کا دروازہ کھنکھٹایا۔ فضلو بابا نے رجڑی وصول کر کے دستخط کر دیئے۔ اور چند لمحوں بعد ہی میرے اندر کی بے چینی اور وہاںوں نے باہر نکل کر حقیقت کا رُخ اختیار کر لیا۔ ظفر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کو اس کی مرضی کے بغیر اس کے گھروالوں نے حصہ بے جا میں رکھا ہوا ہے لہذا اس نے عدالت سے شنوائی کی درخواست کی تھی۔ تو آپی کے خاندان پر ایک اور ڈکھ اور مصیبت کا پہاڑنوت پڑا پہلے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ غیاث چچا کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے۔ تو آپی نے مجھے ریحان صاحب سے بات کرنے کا کہا۔ ریحان صاحب نے کہیں سے کہلو اکر ایک کیلئی کا انتظام کر کر دیا جو ایسے معاملات میں مہارت کی شہرت رکھتی تھی۔ وہ گھر پر سکینہ خالہ کی دور کی جان پہنچان والی بن کر آتی رہی اور معلومات حاصل کر کے کیس آگے بڑھاتی رہی۔ ایک بار تو کامیابی ان بھی عدالت میں ہوا اور انہوں نے گھل کر جنگ کو بتا دیا کہ وہ کسی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ خود اپنے گھر میں اور اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ کیونکہ درخواست گزار اب ان کا شوہر نہیں رہا اور انہیں طلاق دے چکا ہے۔ کیس نے اپنا رُخ پلٹ لیا اور اب اس بات کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا کہ آیا طلاق ہوئی بھی ہے یا نہیں.....؟ اور ایسے موڑ پر غیاث چچا کی گواتی لازمی ہو گئی تھی لہذا اس موقع پر بھی ریحان صاحب نے ہی یہ

معز کہ سرانجام دینے کا فیصلہ کیا اور ایک شام اپنی موڑ خود چلاتے ہوئے غیاث پچا کے گھر آئے اور انہیں قریبی پارک تک گھمانے کے بھانے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نہ جانے کاہاں لے گئے۔ غیاث پچا جب تین گھنٹے بعد گھر واپس لوٹے اور ریحان صاحب کی گاڑی سے اترے تو ان کے قدم ڈگ کا رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو وجہ ان میں ہی بیشیں کبتوں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے کھوئی کھوئی نظر وہ سے ہو کو دیکھتے رہے، تو ان کے اس طرح دیکھنے سے کچھ ٹھہرایی گئیں، اور جلدی سے انہکر ان کے پاس آگئیں۔

<http://kitaabghar.com>

”ابا..... کیا ہوا.....؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟؟؟“

غیاث پچا کی وہنی آنکھ سے ایک آنسو پڑا۔ ان کی لاڈلی آج بھی اپنے سارے ذکر بھلا کر صرف انہی کی وجہ سے پریشان تھی..... انہی کی تکلیف کا مدارا چاہتی تھی، انہوں نے تو کے سر پہ پاتھر کھا اور پھر جیسے ضبط کے سارے دامن چھوٹ گئے۔ وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ سارا جل تھل ہو گیا۔ تو کمی بھی پچیاں بندھ گئیں، وہ باپ کے گلے سے یوں لگیں کہاب دوبارہ کبھی عیحدہ نہیں ہوں گی، میکنے خالہ اندر سے ہڑ بڑائی ہوئی بھاگی آئیں اور باپ بیٹی کو یوں گلے ملے روئے دیکھ کر بنا کچھ پوچھتے ہی روپڑیں۔ ویسے بھی اس بقدر خاندان کے پاس رونے کی وجہات کی کبھی کمی نہیں رہی تھی۔

لیکن یہ آنسو بھی کتنی عجیب چیز ہوتے ہیں، کھل کر بہہ جائیں تو کم از کم وقتی طور پر ہی سہی، لیکن دل کا بوجھ پوچھنے کچھ بہا ضرور کر دیتے ہیں۔

پتہ نہیں یہ کیسی کمال کی تاثیر ہوتی ہے اس بے ضرر سے ماخ کے اندر.....؟

ریحان صاحب نے اپنے مخصوص دھنیے انداز سے غیاث پچا کو دھیرے ظفر کے نوٹس کی تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ دنیا میں ہر بات اور ہر راز کھولنے کا ایک سلیقہ ضرور ہوتا ہے، ایک ایسا سلیقہ جو کڑوے سے کڑوے سچ کو بھی گھونٹ گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیسا کڑواز ہر اپنے اندر اتار چکا ہے۔ ریحان صاحب اس سلیقے سے بخوبی واقف دکھائی دیتے تھے، انہوں نے غیاث پچا کو پورا سچ بتا دیا تو ضرور، لیکن کچھ ایسے انداز سے کہ اس سچ کی کڑواہت نے ان کے پہلے سے زخمی اور یہاں دل کو وہ جھکانا نہیں دیا جو کسی اور صورت انہیں یہ بات پتہ چلنے کی صورت میں لگ سکتا تھا۔

کہتے ہیں تمہید بات کا اثر بڑھا سکتی ہے اور اسی ہی کوئی لمبی تمہید اپنی بات کا اثر زائل بھی کر سکتی ہے۔ لہذا ریحان صاحب نے لمبی تمہید تو باندھی لیکن اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے..... بہر حال اب غیاث پچا کو بھی آنے والے نوٹ کی مشکلات کے بارے میں اعتماد میں لیا جا چکا تھا۔ غیاث پچا نے ریحان صاحب کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے خود اپنے کانوں سے ظفر کی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سناتھا اور انہیں اس بات میں ذرہ برابر بھی تک نہیں تھا۔ لہذا صاف ظاہر تھا کہ ظفر جھوٹ بول رہا ہے ورنہ کوئی بھی باپ خود اپنے باتوں اپنی بیٹی کا گھر کیوں توڑنا چاہے گا؟..... وہ تو خود ظفر کو یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ ان کے گھر آ کر اپنی امانت کو واپس لے جائے۔ لیکن اس کم بخت نے وہیں دروازے پر ہی یہ لکھ کر ڈالا، تبھی تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ خود ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

ریحان صاحب کو تو ظفر کا سچ پتہ چل چکا تھا لیکن ابھی یہ سچ عدالت کو پتہ چلا باتی تھا اور ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ بہت سکھن مرحل تھا۔ اگلی ہی پیشی پر غیاث پچا کو بھی عدالت میں حاضری دینی پڑی اور انہوں نے اس رات جو بھی بیٹی تھی، حرف بہ حرف عدالت کے سامنے بیان کرو دی۔ لیکن

ظفر بھری عدالت میں اس بات سے مکر گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے کسی مولوی کا دیا ہوا فتویٰ بھی عدالت کے رو برو رکھ دیا کہ ایک طلاق دینے سے مکمل طلاق واقع نہیں ہوتی اور چونکہ اس نے ایک طلاق ہی دی تھی لہذا اس کا اپنی بیوی سے تعلق اب بھی برقرار تھا اس لیے اس نے عدالت سے استدعا کی کہ قانون اور مذہب کی رو سے اسے اپنی بیوی کو گھر لی جانے کی اجازت دی جائے۔ غیاث پچا کے تین طلاق کے دعوے کو اس نے یکسری کہہ کر جھوٹ قرار دے دیا کہ چونکہ اس کا سر اس رشتے سے خوش نہیں تھا لہذا اس رات وہ ظفر کو یہی دھمکا نے آیا تھا کہ اگر ظفر نے اس کی بیٹی کو طلاق نہیں دی تو وہ ظفر کا نام و نشان تک اس دنیا سے مٹا دے گا لہذا ظفر نے ذر کر ایک طلاق تدوے دی تھی لیکن اس نے منہ سے تین طلاق کا لفظ نہیں نکالا تھا۔

کیس پرچیدہ ہو گیا تھا۔ کیس کا واحد عینی گواہ خود رکی کا باپ تھا اور مذہبی نے پہلے ہی رُڑکی کے باپ پر اپنے شک و شبے کا اظہار کر دیا تھا لہذا عدالت بھی سوچ میں پڑ گئی اور اس نے مختلف مذہبی علماء سے مشورہ تک اگلی تاریخ دے دی اور اس دن کیس موخر ہو گیا۔

اگلی پیشی تک ہم سب پھر سے اسی سوچی پر بینگ چکتے تھے، جو ہمارے مقدروں نے جانے کیوں جیون کی ہر راہ پر اور ہر نئے آنے والے موز پر ہم سب کے لیے ناگزیر کی تھی۔ اگلی پیشی پر عدالت کھپا کھپا بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف نظر وہ کی برق چھیاں تھیں جو اس مدد رخ کی موم چلدے میں گزری جاتی تھیں۔ بحث بحث کی بولیاں تھیں جو اس پری روکی کو مل ساعتیں کوچھیں رہی تھیں۔ عدالت نے قاضی صاحب کو بھی معافیت کے لیے طلب کیا ہوا تھا۔ ظفر بے حد مطمئن و حکایت دیتا تھا کیونکہ اس نے اپنے تین عدالت کو شک میں ڈال کر آدمی جنگ توجیت ہی لی تھی۔ اب اس کا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا تھا۔ وہ اس معاملے کو اسی طرح کھینچتے رہنا چاہتا تھا تاکہ ہؤ اور ان کے سارے خاندان کی ہمت کچھ اس طرح نوٹے کہ وہ سب اس کے قدموں میں آگریں۔ کیس کی شناوری شروع ہوئی تو ظفر کے وکیل نے پھر وہی اعتراض کیا کہ مقدمے کا واحد اور عینی گواہ جس کا دعویٰ ہے کہ ظفر نے زبان سے تین طلاق کہا تھا، دراصل خود بھی کا رشتہ توڑنا چاہتا ہے لہذا اس کی گواہی معتبر نہیں مانی جائیگی، نہیں اس کے حل فیہ بیان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اور رُڑکی بھی اپنے گھروالوں کے دباؤ میں آکر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے ورنہ دل سے وہاب بھی اپنے گھروالپس جانا چاہتی ہے۔ عدالت نے ہماری وکیلی سے پوچھا کہ کیا اس وقوع کے بارے میں مزید کوئی شہادت اس کے پاس ہے۔ میں نے راجہ کو اشارہ کیا جو میرے ساتھ ہی عدالت کے ہاں نما کمرے میں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے پچھے پلٹ کر اپنے بالکل پچھے بیٹھے ایک عمر سیدہ شخص کے کان میں کچھ کہا اور اس شخص نے اچانک ہی بھری عدالت میں کھڑے ہو کر آواز لگادی۔

<http://kitaabghar.com>

"جی..... دوسرا شہادت میری ہے...."

یا کیا یہ عدالت میں پہلے گھمیر سنانا چھا گیا اور پھر اچانک ہی سمجھی لوگ بیک وقت بولنے لگ گئے۔ نج نے اپنے لکڑی کے ہتھوڑے کو تین بارز میں پر مارا، آہستہ آہستہ سب چپ ہو گئے۔ عدالت نے اس بوڑھے شخص کو کہرے میں آنے کے لیے کہا اور وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گواہوں کے کہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ظفر کے چہرے پر اسے دیکھ کر بے چینی کے تاثرات پیدا ہونے لگے تھے۔

بوڑھے شخص نے عدالت کو بتایا کہ اس کا نام جہانگیر کا ٹھی ہے اور وہ ظفر کا ہمسایہ ہے اور جس رات غیاث پچا ظفر کو بلا نے کے لیے اس کے گھر آئے تھے، وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھا اور اچانک اس نے گلی میں ظفر کے زور زور سے چلانے اور کسی سے لڑنے کی آوازیں نہیں۔ حالانکہ یہ ساری گلی کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ ظفر کے قرض خواہ ہر روز ہی اس کے دروازے پر آ کر کوئی نہ کوئی تماشہ کر کے جاتے تھے لیکن پھر جب بات

طول پکڑنے لگی تو وہ باہر نکل آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ غیاث پچا ظفر کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ گھر چل کر اپنی بیوی کو واپس لے آئے لیکن ظفر نے ان کی ایک نہیں سنی اور دوسرا ہی لمحے اپنے منہ سے طلاق کے تین لفظ نکال کر ہمیشہ کے لیے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ یہ سنتے ہی غیاث پچا کو دل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں ظفر کے دروازے پر ہی گر گئے، جنمیں اٹھا کروہ لوگ قریبی ہسپتال پہنچا آئے۔ کاظمی صاحب کا بیان ختم ہونے تک عدالت میں چرمیگوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جسے نج نے بڑی مشکل سے خاموش کرایا۔ عدالت نے تین مرتبہ کاظمی صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنے کانوں سے طلاق کے لفظ سنبھالے تھے اور یہ تین مرتبہ کہے گئے تھے۔ کاظمی صاحب نے ہر مرتبہ ہمیں جواب دیا کہ انہوں نے مقدس کتاب کا حلف لیا ہے الہذا وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول سکتے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے واضح طور پر یہ لفظ سنبھالے تھے۔ نج نے قاضی صاحب کی طرف دیکھا جنمیں نے کاغذ پر کچھ لکھ کر نج کی جانب بھجوادیا۔ نج نے بغور کاغذ کو دیکھا اور آدھے گھنٹے کے وقت کے بعد فیصلہ سنادیا۔

”معتبر گواہوں کی شہادت اور تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مدعا ظفر کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ خدا پری مرضی سے، اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنی بیوی وجیہہ بیت غیاث الدین کو طلاق دے چکا ہے الہذا عدالت اس کا دعویٰ خارج کرتی ہے اور وجیہہ بیت غیاث الدین کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔“

عدالت میں ایک شور سامنے گیا۔ عدالت نے ظفر کی غلط بیانی کے خلاف بھی سرکاری وکیل کو درخواست دائر کرنے کی ہدایت کی کہ کیوں نہ اس کے غلط بیان پر عدالت اس کے خلاف کارروائی کرے؟ عدالت میں ہی لوگوں نے ظفر کے خلاف نظرے لگانا شروع کر دیئے تھے الہذا وہ بڑی مشکل سے پچھے کے دروازے سے اپنی جان پچا کر بجا گا۔

اس شام بہت عرصے کے بعد میں نے غیاث پچا کے چہرے پر چھائے غبار کو بڑی حد تک ڈھلنے ہوئے دیکھا۔ انسان کے اندر غم سنبھنے کا بھی قدرت نے کچھ عجیب سانظالم جوڑ رکھا ہے۔ شاید یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا ہے۔ اور انسانی اعصاب پل پل اپنے آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، تبھی ہم ایک غم کو سہہ کر اپنا اگاہ دن پھر سے شروع کر سکتے ہیں۔ ورنہ شاید ہم سب ہی اپنے پہلے غم کے ساتھ ہی خاک ہو چکے ہوتے۔ کاظمی صاحب کو عدالت میں لانے کا ہم نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا جب عدالت نے دوسری گواہی طلب کی تھی۔ ظفر کا قصہ ختم ہوا تو زندگی دھیرے دھیرے پھر سے اپنے معمول کی جانب پلٹنے لگی۔

میرا اشٹر کارز لٹ بھی نکل چکا تھا اور حسب توقع میری پہلی پانچ پوزیشنز میں نامزدگی ہوئی تھی۔ چونکہ ہم سب کیڈیس اپنی اکیڈمی سے ہی آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی (ISSB) کلیئر کر چکے ہوتے تھے الہذا فوج میں کمیشن لینے کا راستہ بھی فی الحال میرے لیے کھلا تھا لیکن جانے کیوں میری طبیعت پھر سے اتنے لفظ و ضبط کے پھیرے میں پڑنے کی طرف مائل نہیں تھی۔ ہو مجھ سے روزانہ میری مستقبل کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتی تھیں اور میں روزانہ انہیں ایک ہی جواب دیتا کہ فی الحال مجھے کچھ سمجھنیں آ رہا کہ مزید پڑھائی کس شعبے کے لیے اختیار کروں۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے، اور پھر ایک دن قدرت نے خود ہی اس بات کا فیصلہ بھی کر لیا کہ مجھے آگے کے لیے کون ہی لکیرا اختیار کر کے چلنا ہوگا۔

کتاب گھر کی پیشکش آخری نشرت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس دن فضلو بابا نے صحیح سوریرے مجھے ایک رجسٹری لا کر دی کہ غیاث چچا نے دی ہے اور کہا ہے کہ اسے پوست بھی کر دوں اور اس کی ایک نقل کرو اکر دتی ان کے دفتر دے آؤ۔ یہ ان کی مزید چھٹی کی درخواست تھی جس کے ساتھ ان کا ڈاکٹری شٹفکیٹ بھی مسلک تھا۔ میں رجسٹری پوست کرو اکر اور اس کی نقل ان کے دفتر میں وصول کرو اکر شام کو انہیں کاغذ و اپس کرنے کے لیے گیا تو وہ چھٹ پر کبوتروں کے ڈربے کے پاس بیٹھے آس پاس ٹھیک کبوتروں کو دانہ ڈالتے ڈالتے جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے تھے کہ ان کا کبوتروں کو دانہ ڈالنے والا ہاتھ بھی ویسے ہی ہوا میں ٹھہرا رہ گیا تھا، میں نے کچھ دیران کی توجہ کا انتظار کیا اور پھر وہیں چھٹ کی منڈیر سے یہڑیوں پر کھڑے کھڑے ہلکے سے کھکار کر انہیں متوجہ کیا۔ وہ چونک سے گئے اور پھر مجھے دلکھ کر ہلکے سے مسکا۔

”ارے آدمی بیٹا..... تم کب آئے آ جاؤ..... وہاں کیوں کھڑے ہو۔۔۔“ میں نے ان کے سامنے والی کری پر بیٹھ کر کا غذات رجسٹری کی رسید سیست ان کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”چائے پیو گے۔۔۔“

”جی خالہ نے مجھے اوپر آتے دیکھ لایا تھا، وہ بھجواتی ہی ہوں گی۔۔۔ آپ کن سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔۔۔ ڈاکٹر نے آپ کو دل پر زیادہ بوجھ لینے سے منع کیا ہے۔۔۔“

وہ مسکراۓ ”ارے میاں۔۔۔ یہ ڈاکٹر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔۔۔ بوجھ لینے سے منع تو کرتے ہیں، لیکن بوجھ نہ لینے کا طریقہ نہیں بتاتے۔۔۔ اور بھلا سوچوں پر کس کا اختیار ہے، کاش یہ ڈاکٹر کوئی ایسی دو باھی ایجاد کر پاتے جس کو کھانے کے بعد یہ سوچیں اور یہ واہے ہمیشہ کے لیے ہمارے دماغوں سے نکل جاتے۔۔۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے دھیرے سے ان سے پوچھا۔

”اب آپ کوون سا وادا ہمہ پریشان کر رہا ہے۔۔۔ ہر تنخ اور ڈرائنا و اہمہ حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ جبکی چکا اور جانے کب سے اپنی کا حصہ بھی بن گیا، تو اب ان وہموں سے کیسا خوف؟۔۔۔ اور ان کی فکر کیسی؟۔۔۔“

غیاث چچا نے چونک کریمی طرف دیکھا۔ شاید انہیں میری زبان سے اسکی باتیں سن کر کچھ حیرت ہو گئی ہو کیونکہ میں نے آج تک کبھی اس طرح بیٹھ کر ان سے زندگی کے کسی فلسفے پر بات نہیں کی تھی۔

”ہاں میاں۔۔۔ کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو، ہر ڈرائنا خواب حقیقت بن کر سامنے تو آ پکا۔۔۔ اب اس سے زیادہ اور مزید کیا رہا ہو گا؟ لیکن پھر

بھی انسان اپنے ماضی کو بھی کاش کے نشتر سے بار بار کر دیتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے زخم بھی بھرنیں پاتے۔ میں بھی ایسے کئی کاش کے نشتر اپنے آپ کو بچھونے کے لیے لیے بیٹھا رہتا ہوں.....”

”مشلا کیا.....؟ یہی ناک کاش آپ قوکاظفر سے رشتہ طریقے کرنے سے پہلے مزید چھان بین کر لیتے۔ یا پھر یہ کہ رشتہ ہو ہی گیا تھا تو آپ کسی نہ کسی طرح اس رشتے کو پہنچ رہنے کا مزید اہتمام کرتے اور اسے اتنی آسانی سے نوٹنے نہ دیتے۔؟؟“

<http://kitaabghar.com>

غیاث پچانے غور سے میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

”ہمارا آدمی اب واقعی بڑا ہو گیا ہے۔ اُسے اب بولے گئے لفظوں کے پس مظکوڑ پڑھنا بھی خوب آگیا ہے۔“

میں بھی مسکرا دیا۔

”چلیں اب تو بتا دیں۔۔۔ بھی چندواں ہے گھرے رکھتے ہیں نا آپ کو۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث پچانے لیتی ہی ساس بھری۔

”ہاں میاں۔۔۔ ہر لمحہ بس بھی خیال کا ٹھاٹ رہتا ہے کہ اپنی بیٹی کی بربادی کا کہیں نہ کہیں میں خود بھی ذمہ دار ہوں۔ اگر اس رات میں ظفر سے بحث نہ کرتا تو۔۔۔“

”تو کیا ہوتا۔۔۔ سبھی کہ ڈو چند سال مزید اس جہنم میں اور گزار دیتیں۔۔۔ یونہی ان کی وفاداری اور انکا کوروزانہ پکلا جاتا اور یونہی وہ روز جیتی اور روز مرتی رہتیں، ظفر ان کو ڈھال بنا کر مزید آپ کا اور سیکنڈ خالہ کو خون کے آنسو رہا تھا، روز اسی طرح کے مزید تماشے ہوتے اور قوکی روح ہر پل مزید زخمی ہوتی رہتی۔۔۔“

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور پھر مجھے خیال آیا تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا، لیکن غیاث پچا میری بات سن کر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے سراخھایا۔

”یہ سب دلیلیں میں خود کو دیتا رہتا ہوں۔ بات صرف میری اور سیکنڈ کی ہی ہوتی تو ہم خود و جیہہ کو جا کر اس عذاب سے نکال کر لے آتے، لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرے کے ساتھ چلانا اور رکنا پڑتا ہے۔ یہاں طلاق یا فتہ لڑکی کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چاہیے وہ کتنی ہی بے قصور کیوں نہ ہو۔۔۔ الزام ہمیشہ اس کے سرہی آتا ہے میاں۔۔۔“

”اگر یہ سارا معاشرہ ایک جانب اکٹھا ہو جائے اور آپ سے یہ کہے کہ آپ دوسرا جانب کھڑی ڈو کو خود انہی کی مرضی سے کسی اندھے کنویں میں دھکیل آئیں تو کیا آپ ایسا کریں گے؟ میں مانتا ہوں کہ عام حالات میں ہمیں اسی معاشرے کے بنائے ہوئے راستوں پر چلانا پڑتا ہے، اور اسی کی پرکھی ہوئی عزت اور بے عزتی کی کسوٹی کو اپنے لیے بھی سچ ما نا پڑتا ہے، لیکن میں نے کہا۔۔۔ یہ صرف عام حالات میں ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ڈو پر بیتی اسے صرف ڈو یا آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان کے اپنے ہیں، آپ پر اس عام معاشرے کے اصول لا گوئیں ہوتے، اور پھر ان سب با توں کے باوجود، آپ نے اپنی طرف سے توہ مکن نہ جانے کی کوشش بھی تو کی۔ لیکن اگر اس کے باوجود نتیجہ اگر آپ کی توقعات کے برکس نکلا ہے تو آپ

اے قدرت کی جانب سے کوئی غمی مدد کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ جو اس ظالم اور کرم ظرف شخص کے چکل سے کھل آئیں؟ کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ ساری زندگی اس جھوٹے اور دوغلے معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کی بھینٹ چڑھتی رہیں اور ان کی باقی عمر بھی اسی دوزخ میں جل جاتی.....؟؟؟

غیاث پچاکے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، اتنے میں وجہ کے کھکارنے کی آواز آئی اور وہ چائے کی ٹرے اٹھائے آتی نظر آئیں۔ ہماری باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غیاث پچانے اٹھتے ہوئے ٹوٹے کہا۔

”چلو، بھئی تم دونوں چائے پینو۔ میں کچھ ضروری کاغذات اپنی دراز سے چھانٹ لوں۔“

غیاث پچا دو قدم بڑھے اور پھر جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری جانب پلٹے۔ اور قریب آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولے۔

”تمہارا زندگی کو دیکھنے کا نظر یہ اچھا لگا مجھے..... کوشش کروں گا کہ آئندہ میں بھی تمہارے نظر یہ سے زندگی کو دیکھ سکوں، کیونکہ مجھے تمہاری کہی ہوئی ہربات سے اتفاق ہے۔“

غیاث پچا میرے بال سہلا کر مسکراتے ہوئے سیر ہیوں سے نیچے اتر گئے۔ میری نظر خوب پڑی، وہ سادہ سے سفید بس میں ملبوس تھیں اور ان کا سو گوار سا حسن جانے کیوں مجھے اس ڈھلتی شام کی طرح لگ رہا تھا، لیکن اس وقت وہ بے حد حرمت سے اور کچھ عجیب نظر وہ سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے مخصوص انداز میں چھیڑا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں ایسے..... نظر لگائیں گی کیا.....؟؟؟“
وہ چونک کر بولیں۔

”نظر ہی لگ جانے کا خدشہ ہے آج مجھے۔ میں کافی دیر سے سیر ہیوں پر کھڑی تمہاری اور ابا کی باتیں سن رہی تھی، ایسا کرنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن تم جس طرح ابا کو سمجھا رہے تھے، اُسے سن کر مجھے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہیں لگا۔ تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں آؤی.....؟ میں تو اب تک حیران ہوں۔ لکن خوبصورتی سے تم نے ابا کو ان کے دکھوں کو برتنے کا ایک نیا نظریہ دے دیا۔ کیا یہ میرا وہی خفا منا سادوست بول رہا تھا..... مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔“

میں ان کی یہ لمبی تہبید ستارہا اور مسکراتا رہا۔

”جہاں آپ نے مجھے سمجھا تھا وہیں سے سیکھ کر آیا ہوں، اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اب میں پر ائمہ اسکوں میں منہ بسور ب سور کر جانے والا آدمی نہیں رہا، آپ کے سامنے کیڈٹ کالج کا پاس شدہ کیڈٹ عباد بیٹھا ہوا ہے۔ جو اس کے بقول اپنے ابا سے بھی قد میں آ گئے نکل گیا ہے.....“

فُوز ور سے نہیں۔ جل تر گک سے بچ گئے۔

”ہاں بھئی..... یہ تو میں بھول ہی گئی کہ ہمارا آدمی اب کیڈٹ عباد بن کر واپس لوٹ آیا ہے، سوری سر کیڈٹ عباد۔“

فونے ہستے ہوئے سلیوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھادیا۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آگیا اور وہ تاراضی سے بولیں۔

”ارے ہاں..... یاد آیا..... یہ تم ابا کے سامنے مجھے صرف تو کہہ کر کیوں پکار رہے تھے، پورا تو آپی کیوں نہیں کہا.....“

”تو آپی کہنے سے ایسا لگتا ہے، جیسے میں شکورن بواء کی عمر کی کسی بڑھیا کا ذکر کر رہا ہوں، اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ ابھی سے آپ کی عمر کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔“

<http://kitaabghar.com>

اس وقت توبات بھی میں مل گئی اور تو چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن جب یہی تھا کہ جب سے میں اکیدی سے واپس آیا تھا، چاہے انجانے میں ہی سہی، لیکن جانے کیوں میرے بیوی سے ان کے لیے وجوہ آپی کی جگہ صرف تو ہی لکھتا تھا۔

اُس شام کے بعد سے میری اور ہوکی ازی دوستی نے ایک نیا رخ پلن۔ وہ اب مجھے اپنی ہروہ بات بھی با منظہ لگ پڑی تھیں جو پہلے وہ مجھے چھوٹا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر جایا کرتی تھیں۔ موسموں کی باتیں، شاعری کی باتیں، خزان میں گرتے چتوں کی باتیں، نیلے گلگن کے آوارہ بادلوں کی باتیں، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ زیادہ تر بلکہ تقریباً سبھی معاملوں میں ہماری پسند یکساں ہی تھیں، انہیں بھی میری طرح برستی بوندیں بارش اور سب کچھ دودھیا کر دینے والی بر夫 باری پسند تھی۔ وہ بھی خزان کے چتوں کے گرنے کی آہٹ کو خوب محسوس کرتی تھیں اور انہیں بھی آسمان پر بکھرے بادلوں کو کسی رنگیں نہیں شیشے سے دیکھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ ہماری پسند کے سبھی موسم ایک جیسے ہی تھے۔ وہ بھی غالب کی دیوانی تھیں اور میر اور خیام ان کے شیلیف میں بجے رہتے تھے۔ وہ بھی میری طرح ہر منظر کو ایک الگ نظر اور نظریے سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ سخت سردیوں میں لوگ جب آگ کے گرد ٹھیکرہ ہوتے تھے، ہم دونوں گولہ گنڈہ میا بر夫 ملائی کی قلبیاں کھارہ ہوتے تھے۔ انہیں بھی میری طرح پیانا اور واکن پر بجائی گئی ڈھنیں بے حد پسند تھیں۔ اور میں بھی ان کی طرح گھر سے سیاہ اور شفاف سفید رنگ کا دیوانہ تھا۔ اردو ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مضمون تھا اور دونوں کو ہی ریاضی سے شدید پڑھتی۔ دونوں کو ہی ذرا سی مرچ کھاتے ہی بچکیاں لگ جاتی تھیں اور دونوں کو تاریں پانی اور انناس کا رس بہت مزے کا لگتا تھا۔ ڈھنلی دھوپ کے زاویوں کو تکنا اور آسمان پر بکھرے بادلوں سے مختلف خاکے جوڑنا اور ذہن میں ان کی تصویریں بنانا ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مشغله تھا۔ غرض کون سی ایسی بات تھی، جس میں مماثلت نہ ہو؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے بچپن کا دسمبر کا میابی حاصل کرو گے۔

”آدمی..... تم مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے..... میں جانتی ہوں تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔“

بس وہی دن تھا، جب میں نے آخر کار طے کر لیا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ غیاث چچا کی بیوی شے خواہش تھی کہ ہو مقابلے کے امتحان میں پیشیں اور سوں آفیسر بنیں۔ قسمت نے پلانا کھایا اور ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی، اب وہی ذمہ داری فونے میرے کا نہ ہوں پر ڈال دی تھی، اور میں جانتا تھا کہ مجھے ہر حال میں فوکا یہ ٹوٹا خواب پھر سے جوڑنا ہے اور مجھے سوں آفیسر بننا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

پہلی نظر

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے چھ ماہ سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا راہدہ تھا کہ پرائیوریٹ بی۔ اے کا امتحان دیتے ہی مقابلے کے امتحان کے فارم بھی بھروسوں گاتا کہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کئے بنا امتحان میں شریک ہو سکوں۔ تو کی مدد سے میں نے مضامین بھی وہی منتخب کئے تھے، جو بیک وقت بی۔ اے اور رسول سروں کے امتحان میں مشترک تھے اور ظاہر ہے کہ اردو ان میں سرفہرست مضمون تھا۔ یہ سارے مضامین وہی تھے، جن میں تو پہلے ہی گرجیوں کوچکی تھیں اس لیے میری رہنمائی کرنے میں انہیں کوئی مشکل نہیں ہوتی اور ان کی آنکھوں کا سپنا میری پکلوں تک منتقل ہو گیا۔ کبھی کبھی تو غیاث پچاہم دونوں کی گھنٹوں کی بحث اور مضامین کے متعلق خیالات کی کھینچاتانی دیکھ کر مسکرا دیتے کہ ”یوں لگتا ہے کہ جیسے مقابلے کے امتحان میں آدمی نہیں، تو نے بیٹھنا ہے۔“ اور سچ یہی تھا کہ وجوہے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑ رکھی تھی ہر مضمون کو گھول کر مجھے پلانے میں۔ ویسے بھی وہ زندگی کے اس معاملے میں کاملیت پسند (Perfectionist) تھیں اور وہ کوئی بھی وجہ یا بہانہ قسمت یا مقدار کے لیے ایسا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، جس کی بنا پر کل ہمیں یہ کہنا پڑتا کہ کاش یوں کر لیتے..... کاش وہ کتاب بھی دیکھی ہی لیتے..... کاش یہ باب بھی زیر بحث لے ہی آتے..... وغیرہ وغیرہ، لہذا ہم دونوں ہی اس امتحان کی تیاری کے لیے یوں بخوبی ہوئے رہتے جیسے کل ہی ہمارا پہلا پرچ ہو۔

لیکن اس طوفانی تیاری کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو پورا وقت نہیں دے پاتا تھا جس پر راجہ کی ہر وقت کی بک بک اور باقیوں کی نان اش اپ کمشتری جاری ہی رہتی تھی۔ آخر کار بے حد لمبی بحث اور درجنوں جھگڑوں کے بعد طے ہوا کہ باقی پورا ہفتہ چاہے میں کچھ بھی کروں کہیں بھی غائب رہوں لیکن جمعرات کی شام سے لے کر رات دیر گئے تک میرا وقت میر انہیں بلکہ ان سب ”لوفروں“ کا ہو گا۔ ایسے میں ہماری ابتدائی بیٹھ کہیں شاہزادے کے گیراں پر ہوتی تھی۔ باالے نے میڑک کے بعد اسکوں چھوڑ دیا تھا اور پرائیوریٹ ایف۔ اے کیا تھا کیونکہ میڑک کے بعد اس کے ابانے اسے گھر کے حالات کی وجہ سے ایک چھوٹا سا گیراچ کھلوادیا تھا، جس میں ان کی تمام جنیش اور گرجیوں کی رقم صرف تو ہو چکی تھی لیکن کم از کم ایک مستقل آمدی کا ذریعہ بھی نہ سرا آگیا تھا۔ باالے کو اسکوں کے ذور سے ہی موڑ گاڑیوں اور اس کی مشینی میں بے حد چھپی تھی۔ پانچ یوں میں آنے سک وہ آدھے گھنٹے میں ہمارے دینیات کے ماسٹر حافظ صاحب کی ٹرانس موزر سائکل کھوں کر پر زہ پر زہ کر دیتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اسے دوبارہ جوڑنے میں اسے ہفتہ لگ جاتا تھا اور تب تک حافظ صاحب پیدل آتے جاتے اس لگڑی کو کوئے رہتے کہ انہوں نے باالے کو موزر سائکل کی خرابی دیکھنے کا کہا ہی کیوں تھا۔ لیکن اب بالا گاڑیوں کے کام کا ایسا ماہر تھا، جو نجمن کی آواز سن کر ہی اس کی بیماری کوں بھر کے فاسطے سے بتا دیتا تھا۔

راجہ اور نجمن کی ”تعلیم“ جاری تھی اور دونوں ہی تیسری مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ مُشی اور گذو نے انٹرمیڈیٹ

تو جیسے تیسے کہی لیا تھا لیکن وہ بھی اب پرائیوریتی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ دونوں ہی کسی سرکاری ملکے میں با بوجہتی ہو چکے تھے۔ لیکن ان سب باتوں نے ہماری ازی بچپن کی دوستی پر ذرا بہتر فرق بھی نہیں ڈالا تھا۔ جب ہم سب ملتے تھے تب صرف ہم ہی ہوتے تھے اور ہمارے ساتھ صرف ہمارے بچپن کا دسمبر.....

یقین ہے کہ سچی دوستی ایسے کسی بھی تجدید بحاذہ یا ہمیشہ استطاعت کے فرق سے بہت بلند ہوتی ہے۔ ہمارے قیفے آج بھی روز اول کی طرح خالص تھے اور ہماری ایک دوسرے کے لیے فکر اور پریشانی کا وہی عالم تھا، جو پہلی دوسری جماعت کے وقت ہوتا تھا۔

ہم جمعرات کی شام سب کچھ بھول کر مناتے تھے۔ ایسے میں زیادہ تر پروگرام راجہ کے ترتیب دیے ہوئے ہوتے تھے۔ بھی وہ میں کوئی نئی فلم دکھانے کے لیے لے جاتا، اس کے نکٹ لینے کے طریقے بھی تک وہی بچپن والے تھے۔ اور کوئی نہ کوئی ”شاہ صاحب“ قسم کی شخصیت یا بہانہ اس کوں ہی جاتا تھا۔ حالانکہ اب ہم بھی اپنے تمام دوستوں کے لیے سب سے مہنگا نکٹ خرید کر فلم دیکھ سکتے تھے لیکن ایسی فلم کا مزہ کیا.....؟ لہذا فلم کا موضوع ہم نے راجہ کے ہی پرداز کر رکھا تھا، بھی ہم شہر سے باہر جیل پر پنک کے لیے چلے جاتے اور خوب بلہ گہ کرتے۔ جیل کے کنارے کلڑی کے وہ پرانے خستہ حال بیٹھنے اور تنفس بھی تک موجود تھے، جن پر ہمارے بچپن کے گھدے ہوئے نشان آج بھی باقی تھے۔ بھی گیرا ج ہی میں رات کی دعوت کا پروگرام بن جاتا اور ہم سب گیرا ج کے ہی چھوٹے سے باورپی خانے میں مل کر مختلف تجربے کرتے رات بتا دیتے۔

جمعرات کی اس شام کی بھٹی مجھے خصوصی طور پر ہو کی طرف سے بھی تھی۔ میں انہیں اکثر اپنے دوستوں کی شرارتیوں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور وہ یہ سن کر مسکراتی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن جب میں نے انہیں تفصیل سے راجہ، بالے، نخوا اور گدہ و کی ان باتوں اور کوششوں کے بارے میں بتایا جو وہ میری غیر موجودگی میں ہو کی حفاظت کی غرض سے اپنے طور پر ہی کرتے رہے تھے اور جن مخصوصانہ کوششوں اور منصوبوں کا ہو کوئی بھی پتہ ہی نہیں چل پایا تھا، تو وہ سب سن کر بہت دیر تک ہو کی آنکھیں نمرہ رہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس جمعرات کی شام کو میں اپنے سارے دوستوں کو ان کے گھر ان کی طرف سے چائے کی دعوت پر بلالا دوں۔ جب ان سب نے میری زبانی یہ خبر سنی تو سارے کے سارے ہم کا بکارہ گئے۔ کیونکہ ان سب کے ذہن میں کہیں نہ بات موجود تھی کہ ہو انہیں نکلا اور آوارہ بھتھی تھیں، اور میں جانتا تھا کہ بچپن میں کسی حد تک یہ تھیک بھی خاکیونکہ ہو جب مجھے سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ محلے کے بڑے میدان میں وھاچوکڑی چاہتے ہوئے دیکھتی تھیں تو مجھے ان سے ذات بھی پرتنی تھی کہ سارا دن اپنے ”آوارہ“ دوستوں کے ساتھ ضائع نہ کیا کروں۔

ہو کی دعوت کا سُن کر پہلے تو سبھی شاک اور سکتے میں آگئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد سب کو اپنے اپنے لباس کی فکر پڑ گئی کہ انہیں کیا پہن کر و جو کے گھر جانا چاہیے۔ آخر یہ سب کی ”عزت“ کا سوال تھا۔ ہو کی نظر میں اچھا بننے کا ایک موقع قدرت نے دے ہی دیا تھا تو پھر ان میں سے کوئی بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا بھی ہو سے ایک عجیب سارش تھا، بچپن سے وہ میرے ذریعے اس رشتے سے بڑے ہوئے تھے، ہو ان سب کو عزیز تھیں کیونکہ وہ ان کے سب سے پیارے آدمی کی ہو تھیں۔ وہ سب انہیں یوں سنبھال سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے، جیسے وہ اپنے دوست آدمی کا سب سے قیمتی کھلونا سنبھال رہے ہوں جو آدمی ان کو کچھ لمحوں کے لیے بطور امانت دے کر ذرا سی دیر کے لیے کہیں گیا ہو.....

ہم سب میں بچپن سے راجہ ہی سب سے زیادہ ”خوش لباس“ تھا اور وہ ہر نیا فیش ٹرائی ضرور کرتا تھا لہذا اس موقع پر بھی اس کی الماری ہی ان سب کے کام آئی، اور کچھ ہی دیر میں وہ سب خاصے معقول نظر آنے لگے، راجہ میرے لیے بھی اپنا پسندیدہ گرے کوٹ لے کر آیا تھا لیکن میں نے ان کے ہاتھ جوڑے کے میں اسی جین شرٹ میں ٹھیک ہوں، لہذا اب وہ سب چلنے کی کریں کیونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

فون کے دروازے پر غیاث پہچانے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بتایا کہ ڈونے چھٹ پر چائے کا بندوبست کیا ہے، لہذا ہم سب بھی چھٹ پر ہی چلے جائیں۔ چھٹ پر تو ڈونے والی پوری چھوٹی موٹی دعوت کا انتظام کر کھا تھا اور میز پر چائے کے ساتھ جتنے لوازم ہو سکتے تھے وہ کبھی موجود تھے۔ اور اس میں بھی آدمی سے زیادہ چیزیں خود ڈونے کے اپنے ہاتھوں کی بھائی ہوئی تھیں۔ ڈونا چہرہ ہم سب کو آتے دیکھ کر کھل سا گیا۔ وہ میرے سارے دوستوں کو اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ ہم سب اسی محلے میں ان کے سامنے ہی تو بڑے ہوئے تھے لیکن اس شام انہوں نے سب سے فرد افراد سب سے خصوصی طور پر ہاتھ ملایا اور سب سے پوچھا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ کبھی شرما شرما کر جواب دیتے رہے اور پھر جب ڈونے تعارف کے وقت راجہ کے سر پر پیارے ہاتھ پھیرا اور بالے کے بال بکھیر دیئے تو وہ دونوں ہی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، بالے کی آنکھوں سے تو باقاعدہ پہ پہ آنسو گرنے لگ گئے۔ ڈاؤپی ”ارے ارے“ ہی کرتی رہ گئیں اور وہ بھی اپنی آنکھیں پوچھنے لگے۔ پھر ایسے میں بھلا ڈونکھاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ اگلے ہی لمحے خود وہ بھی بھل بھل رورہی تھیں کیونکہ انہیں تو ویسے بھی رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ آنسوؤں کی کسی تو کبھی نہیں رہی تھی ان کے پاس اور میں بے چارہ ان سب سے دو رچھت کی منڈپ پر اپنا سر تھامے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ دیر بعد غیاث پچا اور پر آگئے اور انہیں آتا دیکھ کر وہ سارا ”گروپ مقابلہ“ ختم ہوا اور نہ چائے کی خیالی پیا لیاں ان سب کے بیتے آنسوؤں سے ہی بھر جاتیں۔ غیاث پہچانے مجھ سے اشاروں میں پوچھا کہ ہوا کیا ہے؟ میں نے بے چارگی سے سر ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ ان سب کو اللہ ہی سمجھائے۔ غیاث پچا دیہر سے مکرا دیئے اور تمیں اطلاع دی کہ ریحان صاحب اپنے دونوں بچوں کے ساتھ یچھے آئے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ انہیں بھی میں چھٹ پر لے آئیں۔ ہم سب نے کہا ”بڑی خوشی سے“ اور کچھ لمحوں بعد ہمیں ریحان صاحب بھی اپنے بچوں سمیت ہماری ”ٹٹی پارٹی“ میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈونے میرے سارے دوستوں کا فرد افراد اخصوصی طور پر ریحان صاحب سے بھی تعارف کروایا، اور وہ مسکرا کر بھی سے ملتے رہے۔

ڈاؤپی نے بہت عرصہ پہلے ہی کیس کے ختم ہونے کے بعد ریحان صاحب کے گھر ٹیوشن کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب ان کا من کہیں آنے جانے کا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اب انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت تھی، البتہ دونوں بچے اب بھی تقریباً ہر ہفتہ ڈراموں کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اپنی کتابیں اٹھائے وجوکے پاس ضرور آ جاتے تھے اور ان سے ضروری ٹیوشن لے لیتے تھے۔ اس شام بھی ریحان صاحب نے وجو سے دوبارہ درخواست کی کہ یہ سال تو اب خاتمے پر ہے لیکن اگلے سال بچوں کو دو ماہ بعد ان کی مدد کی شدید ضرورت ہو گئی کیونکہ اب ان کی نئی کلاس شروع ہو چکی ہو گی۔ لہذا بت انہیں ان کے بچوں کا باقاعدہ ٹیوشن پڑھانا ہی ہو گی۔ وہ جو نہ انہیں تسلی دی کہ فی الحال نئی کلاس شروع ہونے میں کافی دیر ہے وہ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وجوئے صرف میری پڑھائی کی وجہ سے خود کو اس مصروفیت سے باز رکھا ہوا ہے، کیونکہ وہ اپنی

پوری توجہ میرے مقابلے کے امتحان کی تیاری پر دینا چاہتی تھیں۔

رات کو جب ہم گیراج واپس آئے تو بھی رات گئے تک صرف قوکی ہی باقی کرتے رہے۔ سمجھی کا بس یہی کہنا تھا کہ یہ انہی کی ہمت ہے جو اتنے بڑے ڈکھوں کے ساگر سے گزر کر بھی ابھی تک اپنے آپ کو مجتمع رکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کسی بھی خوشی یا بڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ماشاء اللہ ضرور کہنا چاہیے۔ ورنہ جس کاذکر کیا جا رہا ہو اسے نظر لگ جاتی ہے۔ لیکن شاید اس روز ہم سب ہو آپ کے ذکر پر ماشاء اللہ کہنا بھول گئے تھے۔ لہذا شاید اس بارہماری ہی نظر قوکی خدا خدا کر کے پُرسکون ہوتی زندگی کو لوگ گئی۔ لیکن ہم کیا جانتے تھے کہ اس کا نجع کی شہزادی کی قسمت کا پیرا ہے، بھی اتنے ہی تازک کا نجع کا بنا ہو گا کہ ہماری ایک ذرا سی ماشاء اللہ نہ کہنے کی بھول بھی اسے ٹھیس لگانے کا سبب بن جائے گی۔

کتاب گھر کی پیشکش

چور بازار

بعض لوگ سیاست کا سہارا لے کر کس طرح ایک دوسرے کو بچاؤ کھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، **چور بازار** پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ جرم و سراغرانی کی دلچسپ کہانی۔ ایک سپر مارکیٹ میں ہونے والی عجیب و غریب چوریوں کا احوال جہاں دکانوں کا ساز و سامان تالا توڑے اور نقاب لگائے بغیر غائب ہو رہا تھا۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرسان ندیم اختر کا کارنامہ۔ **چور بازار** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

ہیرے کے آنسو

<http://kitaabghar.com>

ہیرے کے آنسو ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچاک اس کی زندگی میں ایک موڑ آگیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کوئی کی کافی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لائق اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے بھی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرسان ندیم اختر کا کارنامہ۔ **ہیرے کے آنسو** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

آخری کفارہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن جمعت اور راجہ مجھے کے کریمی نماز پڑھنے کے لیے بالے کے محلے چلا گیا کیونکہ اسے بالے کو اپنے ابا کی فوکسی کار دکھانا تھی جس کی عمر راجہ کی عمر سے دو چار سال زیادہ ہی ہو گئی البتہ راجہ کے ابا نے یہ مصیبت بھی پچھلے سال ہی خریدی تھی۔ ہم سب دوستوں نے اس فوکسی کا نام بایلہ رکھ چکوڑا تھا اور بایلہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی سڑک پر کھانستی ہوئی کھڑی ملئی تھی۔

بالے نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہم جمعت کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے باہر ہی اس کا انتظار کریں پھر ہم ایک ساتھ ہی گیراج چلیں گے۔ میں اور راجہ مسجد کے باہر کھڑے بالے کا انتظار کر رہے تھے، راجہ نے اکتا کہا۔

”یا رآ دی..... لگتا ہے اس بالے کے بچے نے بھی آج تھی اپنے سارے گناہ بخشنوانے کی نہان رکھی ہے۔ اب تو ساری مسجد خالی ہو گئی ہے۔ جانے وہ کہاں رہ گیا ہے۔“ میں نے راجہ کو تسلی دی اور خود مسجد کی طرف بالے کو دھونڈنے کی غرض سے چل پڑا۔ مسجد کا صحن تقریباً خالی پڑا ہوا تھا اور وسیع صحن میں دور ایک باریش شخص سر پر سفید روپی رکھے ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتہ میں نے محبوس کیا کہ وہ شخص دعا مانگتے ہوئے چکیاں لے لے کر رورہا ہے اور اس کا چہرہ دوسرے بھی آنسوؤں کی چمک سے دھلا ہوا محبوس ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور شانوں تک تھے اور داڑھی بھی شرعی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک میری توجہ بالے کی جانب مبذول ہو گئی جو اندر سے مولوی صاحب کے ساتھ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ بالے نے مجھے دیکھا تو جلدی سے مولوی سے رخصت ہو کر میری جانب چلا آیا۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر کہاں لگا دی۔ بالے نے بتایا کہ وہ نکل ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے روک لیا اور صحن کی پچھلی جانب مسجد کی پانی کی موڑ دکھانے کے لیے لے گئے جو پچھلے چند دنوں سے گز ہڑ کر رہی تھی اور آج تو بالکل رُک ہی گئی تھی۔ اسی موڑ کو چلانے میں کچھ دریگ لگ گئی تھی اسے۔ بالا آگے بڑھنے لگا تو میں نے اسے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا اور اسے صحن میں بیٹھے باریش شخص کی جانب متوجہ کیا کہ جانے اسے کیا مسئلہ کیا تکلیف ہے؟ میں نے بالے سے کہا کہ جا کر اس شخص سے پوچھا آئے کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ بالے نے میری جانب حرمت سے دیکھا۔ ”ارے یار..... تو نے آنہیں پہچانا نہیں..... یا اٹو بھائی ہیں۔“

”اٹو،“..... میرے ذہن میں بیک وقت کی جھما کے ہوئے۔ اٹو کی صحت تو قابلِ رشک تھی لیکن یہ شخص توہینوں کا پنجرو دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر اس کا حلیہ تو بالکل ملنکوں جیسا تھا جبکہ اٹو تو ہمیشہ بہترین کپڑے پہنتا تھا جا ہے اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو..... اور پھر اس شخص کا چہرہ..... مجھے یہ بات خود اٹو کے سے بھائی کے منہ سے نہ پہنچلتی تو میں کہیں اس بات پر اعتبار نہ کرتا، بالے نے مجھے بتایا کہ اب اٹو کا ہر نماز کے بعد

دعا مانگنے کا بھی طریقہ ہے، اور وہ گھنٹوں اسی جذب کے عالم میں مسجد میں بیٹھا اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہے۔ گزبر کے لیے اُٹونے کرائے پر ایک نیکی لے رکھی تھی اور وہ صبح سے رات تک وہ نیکی چلاتا تھا، اور اس پرانی نیکی سے دن بھر جو بھی کماتا تھا، وہ سیدھے رات کو اپنی ماں کے قدموں لے جا کر ڈال دیتا تھا۔ اسی نے اپنے سیٹھ سے کھلا کر اپنی بہن گذی کے لیے سیٹھ کے فشی کے بیٹے کا رشتہ بھی طے کر دایا تھا۔ لڑکا کسی سرکاری مکھے میں پر نہ نہ نہ نہ بھرتی تھا اور اچھے شریف لوگ تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی انسان کی اتنی بڑی کاپلٹ ہوتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور جو تو یہ ہے کہ اُٹو کا حیلہ بھی اس قدر بدل چکا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے سے بھی گزرتا تو شاید میں بالے کے بتائے بناؤ سے پچان نہ پاتا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ چند روز بعد جب خداور سینکنہ خالہ فضلو بابا کے ساتھ محلے سے بر گدا لے پیر بابا کے مزار پر منٹ کا چڑھاوا چڑھانے لکھیں اور فضلو بابا نے ایک پرانی نیکی کو ہاتھ دے کر روکا تو ان تینوں میں سے کوئی بھی اُٹو کو نہیں پچان سکا۔ ایک تو ویسے بھی شام کے جھٹ پے کا وقت تھا اور مغرب قریب تھی اور دوسرا یوں بھی عورتوں کی نظر جھکی ہوئی تھی۔ رہے فضلو بابا تو اب تو وہ ہم کو بھی بمشکل پچان پاتے تھے۔ وجوہ غیاث پچا کی محنت یا بی کے لیے جانے کب سے نذر کی منت مانگ رکھتی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کا جانا موخر ہو ہی جاتا تھا۔ وجوہ مجھے بھی میری پڑھائی کا وقت ضائع ہونے کے خدشے سے نہیں بتایا تھا کہ وہ مزار جائیں گی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ سڑک سے نیکی لے کر اسی نیکی میں مزار کے احاطے کے باہر اُٹر کر اسے رکنے کا کہہ دیں گی اور چند لمحوں میں ہی چادر چڑھا کر اور نیاز بانٹ کر اسی نیکی میں واپس آ جائیں گی۔ نیاز کا وقت بھی مغرب کی نماز کے بعد کا مقرر ہوتا تھا اور مزار کے احاطے میں بھی کبھی نیازی مغرب کے بعد ہی نیاز بانتے تھے۔ **گھر کی پیشکش**

ان تینوں میں سے تو کوئی بھی اُٹو کو نہیں پچان پایا لیکن اُٹو بھلا و جو گا اور سینکنہ خالہ کی صورت کو کیسے بھلا سکتا تھا؟ ان سب کی زندگی اُٹو کے جرم کی وجہ سے بر باد ہو گئی تھی۔ اُٹو نظریں سڑک پر جائے نیکی چلاتا رہا اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلتی رہیں۔ بالے کی زبانی اُسے وجوہی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اور ہر بار وہ خود کو اسی شرمندگی اور احساسِ خرم کے گڑھے میں گر جھوس کرتا تھا، جس کی پیش سے بچے کے لیے اُس نے خود اپنا آپ بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

اُٹو کی نیکی مزار کے قریب بچی چکی تھی لیکن اُٹو یا ان تینوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نوٹ نہیں کی تھی کہ ان کے محلے سے نکلتے ہی ایک اور پرانی فیاث کار ان کی نیکی کے پیچھے ہی فور اروانہ ہو گئی تھی اور اب تک لگاتار ان کا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھی۔ اُٹو نے اپنی نیکی مزار کے احاطے کے باہر روک دی اور فضلو بابا دونوں عورتوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ اُٹو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سینکنہ خالہ اور ہو کے پاؤں پکڑ لے اور تب تک اپناءں اُن دونوں کے قدموں میں پیختا رہے جب تک وہ اسے دل سے معاف نہ کر دیں۔

اُٹو بھی نیکی سے باہر نکل آیا اور اس نے مغرب کی نمازوں میں احاطے کے باہر ہی کپڑا ڈال کر پڑھلی۔ اتنے میں اندر سے ھولوگ بھی باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ اُٹو نے جلدی سے عورتوں کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا اور خود انتظار کرنے لگا کہ وہ بیٹھ جائیں تو دروازہ بند کر کے گاڑی اشارٹ کرے۔ سینکنہ خالہ ایک طرف سے اور ہدوسری طرف سے نیکی میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھیں، اسی اشنا میں اچانک اُٹو کی نیکی سے کچھ فاصلے پر کھڑی اُسی فیاث کار میں سے ایک شخص، خود کو کالی چادر میں لپیٹی، تیزی سے نکلا اور ہو کی طرف پکا، اس کے ہاتھ میں کوئی شیشے کی بوتل تھی،

جس کاڑھکنا اس نے پہلے ہی سے گھول رکھا تھا، تو اس کے سراپے سے سراہمہ سی ہو کر پیچھے کوہشیں لیکن پیچھے ٹیکی تھی۔ دوسرا ہی لمحے میں اس شخص کے چادر سے جھلکتے آدھے چہرے کو پہچان لیا۔ وہ ظفر تھا جو اپنے ہاتھ میں تمیزاب کی بوتل لئے ان کی جانب لپکا تھا۔ تو آپی گھبرا کر چلا گئیں۔ اگو بوكھلا کر پلٹا اور اس نے کسی چادر بردار شخص کو وجہ کی جانب کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا، اس شخص کا ہاتھ ابھی پوری طرح ہوا میں ہی تھا کہ اٹھونے ایک ٹانیے کی تاخیر کئے بنا جھپٹ کر اس شخص کا ہاتھ دبوچ لینا چاہا، لیکن تباہ تباہ سیال بوتل سے پوری طرح چھلک چکا تھا، لیکن تباہ تباہ اگو، وجہ اور اس سیال مادے کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ اگو کے منہ سے کرب کے مارے ایک زور دار کراہ نکل گئی اور اسے ایسا محض ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ اور سینے پر انگارے ڈال دیئے ہوں۔ گردن کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا اور تمیزاب کے چھینٹے اس کے چہرے تک آئے تھے لیکن شدید تکلیف نے اسے آنکھیں بیچ لینے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اس کی آنکھیں ان چھینٹوں سے بیچ گئیں۔ لمحہ بھر میں ہی مزار کے باہر بھگدڑج گئی۔ ظفر اگلے ہی لمحے لپک کر بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا اور وہ پرانی فیاٹ بھی اسی لمحے پر یورس ہو کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ اگو کا تکلیف کے مارے برا حائل تھا۔ تو کو خراش تک نہیں آئی تھی اس پاس چند دوسرے رکشہ اور ٹیکسی والے بھی تھے، جن میں سے کوئی ایک آدھ شاید اگو کو جانتا بھی تھا اسی لیے وہ لپک کر بھیڑ میں سے لکلا اور زور سے چلا یا۔ ”ارے..... یہ تو اپنا اگو اُستاد ہے یار..... جلدی کرو، اسے اپنی ٹیکسی میں ڈالو۔ یہ تو مری طرح سے جل گیا ہے۔“

اگو کا نام سن کر جو اور سکینہ خالہ دونوں ہی مری طرح سے چونکے اور اب انہوں نے غور سے ٹیکسی والے کی جانب دیکھا تو بیچ میں سے اگو کے خدوخال آجھر آئے۔ لیکن اس وقت وہاں ایک ہلا چاہا ہوا تھا۔ اگو نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن پھر بھی اس نے کسی دوسرے ٹیکسی والے کو ہدایت کی کہ یہ یہیاں اس کے پرانے محلے کی سواری ہیں لہذا وہ انہیں سیدھے اور بہت حفاظت سے ان کے گھر چھوڑ آئے۔ فضلہ بابا نے اگو کے ساتھ جانے کی کوشش کی لیکن اگو نے انہیں منع کر دیا کہ اس وقت وہ جو اور خالہ کو لے کر سیدھے گھر پہنچیں۔ دوسرا ہی لمحے ایک ٹیکسی اگو کو لے کر ہسپتال کی جانب اور دوسری وجوہ لوگوں کو لے کر محلے کی جانب دوڑ پڑی۔

تو گھر میں داخل ہوئیں تو زار و قطار رورہی تھیں۔ میں جو کافی دیرے سے کتابیں لیے وہیں ان کے گھر میں غیاث چچا کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا انہیں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر مری طرح گھبرا گیا۔ غیاث پچا بھی بوكھلائے ہوئے سے انہیں تسلیاں دینے کی کوشش کرتے رہے، پھر سکینہ خالہ نے ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور سارا ما جرا اور اگو کے اس طرح جل کر رختی ہونے کا واقعہ سنایا۔ میں راجہ کو لے کر ہسپتال کی طرف دوڑا جہاں بالے اپنے ابا کے ساتھ ہم سے پہلے ہی بیٹھنے پڑا تھا۔ اگو کی چلد مری طرح سے محلہ گئی تھی اور وہ پیسوں میں جکڑا ہوا بستر پر نہایت تکلیف کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

ظفر بہت دنوں سے وجوہ کے ہاتھوں عدالت میں ملی بے عزتی اور شرمندگی کا بدلہ چکانے کی تاک میں تھا اور اسی لیے وہ پچھلے کئی ہفتوں سے محلے کے آس پاس کسی دوست کی گاڑی میں چہرہ چھپائے ٹوہ لیتا رہتا تھا کہ اگر کبھی تو باہر نکلیں تو وہ ان کے چہرے کو بیسہ کے لیے داغدار کر کے اپنے انتقام کی آگ مٹھنڈی کر سکے، وہ جانتا تھا کہ تو گھر سے اکیدے نکلنا تو ناممکن ہی ہے لیکن پھر بھی وہ اسی مستقل مراجی سے محلے کے چکر کا غمارہ کیونکہ یہ انتقام ہی اب اس کی زندگی کا واحد اور آخری مقصد رہ گیا تھا۔ تو کوئی وجہ سے شارے شہر میں اس پر ٹھوٹھوٹھو ہوئی تھی اور اب تو اس کے آوارہ اور

بدچلن ہو اری دوست بھی اسے طعنے دے دے کر ہنتے تھے کہ جس بیوی کو بھی بلی بتاتا تھا، وہ تو ایسی شیرنی لٹکی کہ بھری عدالت میں ظفر کی عزت اتنا گئی۔ اور یہ طعنے رات بھر ظفر کا خون ابالے رہتے تھے۔ اسی لیے اس نے یہ طے کر لایا تھا کہ جہاں کہیں بھی قوکھیں، وہاں کا چہرہ بگاڑ دے گا اور اسی نیت سے وہ یہ تیزاب کی بوٹی بھی بھیش اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ لیکن قدرت ایک بار پھر اس کے آڑے آئی اور تیزاب اگو کا مقدار بن گیا، ظفر نے جب قوکی طرف تیزاب اچھالا تھا تو اسے بیک وقت دوچینیں سنائی دی تھیں۔ ایک تو اس نیکی والے کی جونہ جانے بیچ میں کہاں سے بیک پڑا تھا اور دوسری قوکی۔ لہذا اسے مکمل بیقین نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے زیادہ نقصان کے ہوا ہے کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

اگو کا بیان لینے کے لیے پولیس تو گھنٹہ بھر بعد ہی ہسپتال پہنچ گئی تھی لیکن اگو کو اگلے دن ہی ہوش آیا۔ ملک ریشم جواب ہمارے علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی ہو چکا تھا اس نے اگو کا بیان تو لیا لیکن ظفر کی تلاش میں چھاپے وہ گذشتہ آڈی رات سے ہی مار رہا تھا۔ غیاث پچانے خود تھا نے جا کر اسے ساری تفصیل بتا دی تھی لیکن ان کی درخواست پر قوکا نام کیس کی تفصیل میں درج نہیں کیا گیا تھا، غیاث پچا اب مزید عدالتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے ملک ریشم خان نے صرف اگو کے بیان پر ہی انحصار کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ ایک دفعہ ظفر اس کے قابوآ جائے تو پھر عدالت کے سامنے اسے اگو سے شناخت کرو اکر اس کا کچھ بندوبست کرے گا۔ کیونکہ خوش قسمتی سے قوکو کوئی گز نہیں پہنچی تھی اور مقدمے کا مدعی خود اگو بھی بن سکتا تھا۔ لیکن ظفر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ پایا تھا۔ ملک نے اس کے ہر ممکن غمکانے پر خفیہ کے بندے بھی لگادیئے تھے اور اس کے کچھ دوستوں کو گرفتار بھی کیا تھا لیکن ان سب کا ایک ہی بیان تھا کہ ظفر گذشتہ شام سے ہی غائب تھا۔ کچھ جواریوں نے پیشاہیت بھی کی کہ کل شام ظفر انتہائی جلدی میں ان سب کے پاس آیا اور بھی سے ہزاروں روپے کی رقم دونوں کے لیے ادھار کے نام پر لے گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ظفر بے عرصے کے لیے شہر سے غائب ہونے کے ارادے سے جتنی رقم دوستوں سے اینٹھے سکتا تھا، وہ ساری سمیت کر بھاگ گیا تھا۔

اگو کو ہسپتال کے وارڈ میں پڑے 24 چوبیں گھنٹے ہونے کو آئے تھے، وہ آنکھیں بند کئے اپنے جسم پر گزرتی اس بے انہتا اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس کے روئیں روئیں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ دفعتہ اسے اپنے چہرے پر کسی قطرے جیسی چیز کے گرنے اور پھر نی کا احساس ہوا، اس نے چوک کر آنکھیں کھولیں اور پھر سکتے اور حیرت سے آنکھیں بند نہیں کر پایا، غیاث پچا اس کے سرہانے کھڑے تھے اور ان کی آنکھ سے نکلتا پانی اگو کے چہرے کو دھور رہا تھا۔ چہرے کوہنی کیا..... اگو کو تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے غیاث پچا کے آنسوؤں کے وضو سے ہی آج اس کے تن اور من پر گلی گناہوں کی ساری کا لک دھل جائے گی۔

اگو ان سے کچھ کہنے نہیں پایا اور اس مجبور باب کے آنسوؤں نے اسے بھی اپنی آنکھوں کا نیکین پانی بہانے پر مجبور کر دیا۔ کیسی عجیب بات تھی، وہ دونوں شخص آج مل کر رہے تھے، جن میں سے ایک دوسرے کی زندگی کی بر بادی کا سارا سامان کر گیا تھا۔ دوسرے اپنے سب کچھ لٹاہیا تھا اور آج اسی پہلے لیٹرے کے غم اور تکلیف میں آنسو بہار رہا تھا جس نے کل اس کی متاع حیات کو بر باد ہونے سے بچا لیا تھا۔ کیسا لیٹر اتھا اور یہ لٹ جاتے والا بھی کیا کمال تھا۔ اگو کو ہسپتال سے فارغ ہونے میں تقریباً تین ماہ سے بھی کچھ زیادہ کا عرصہ لگ گیا لیکن تیزاب کے وہ داغ اس کے جسم سے کبھی نہیں مٹ پائے۔ لیکن داغ کب تھے، یہ تو اس کے لیے وہ چمکتی مہریں تھیں، جنہیں وہ اپنے بازوؤں اور سینے پر..... کسی جگہ میں ملے تھوں کی طرح سجائے

اب ساری دنیا کے سامنے فخر یہ جا سکتا تھا کہ دیکھ لو یہ ایک گناہ گار شخص کا وہ کفارہ ہے جسے تقدیر نے اسی جہاں میں اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ ظفر کا بھی تک کچھ پتہ نہیں چل پایا تھا۔ وہ آپی کا گھر سے کہیں باہر آنا جانا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میرے بی اے کا نتیجہ نکل آیا اور میں مقابلے کے امتحان کے فارم بھی جمع کرو کر آگیا۔ جس دن میرا پہلا پر چھ تھا اس دن صحیح سوریے میں ہوئے ملنے لگا۔ وہ صحن میں ہی جائے نہماز پر بنیضیں دعا کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں چھپر نے کے لیے کہا کہ ”اگر صرف دعاوں سے مقابلے کے امتحان پاس ہونا ہوتے تو ہماری مسجد کے مولانا صاحب کے چاروں لڑکے ہی۔ ایس۔ پی آفسر ہوتے۔“ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا اور مجھے نظر و نظر وہ میں ہی گھوکر دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ہنا کچھ بولے دعا ختم کر کے مجھ پر زور سے پھونک دیا۔ لیکن میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میرے لیے تو سب سے بڑی دعا خود وہ تھیں، ان کا چھڑو تھا، جسے دیکھ کر میں اپنی زندگی کے ہر امتحان کا سامنا کرتا تھا اور اپنی اسی ”دعا“ کی بدولت ہی میں آج تک زندگی کے ہر امتحان میں سُرخ رو بھی ہوا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ دنیا کی ہر دعا اڑ دھوکتی ہے لیکن میری یہ ”دعا“ بھی نامرد اپنے نہیں آسکتی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ریشمی خطہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغرسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغرسان کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریغتہ ہو گیا تھا۔ ان کی مکانی شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنتی خیز ناول۔ سراغرسان کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطہ**.... جو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیشن میں دستیاب ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اردو مصنف اہن صفائی کے شری قلم کی کاث دار تحریروں کا منتخب۔ طنزیہ اور مزاجیہ مضامین پر مشتمل یہ امتحاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر **طنز و مزام سیشن** میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی تعبیر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ٹرین تیزی سے بل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور ایک زوردار سیٹی بجا کر دیہرے دیہرے جھکے لیتی ہوئی رُک گئی۔ ایئر کنڈی شیڈ سلپر کی بوگی کے شاپ پر ایک سپاہی حوالدار اور ایک ڈرائیور مستعد گھر سے اپنے افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر آوارہ سے لڑکوں کا ایک پورا گروہ کا گروہ ہاتھ میں موتیے، گیندے اور گلب کے ہار لیے انتظار کر رہا تھا اور انہوں نے اس قدر جھاچو گڑی چارکھی تھی کہ حوالدار نے انہیں کئی بار خشگیں لگا ہوں سے گھورا تھا لیکن مجال ہے کہ ان پر اس کی اس "دُغھوری" کا کوئی اثر ہوا ہو۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی حوالدار اور ڈرائیور مستعد ہو گئے۔ بوگی کا دروازہ کھلا اور دونوں نے کھٹ سے نئے آنے والے صاحب کو پولیس والوں کا کڑک سلیوٹ پیش کیا اور اس کی جانب بڑھے لیکن یہ کیا اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر سے ملتے، اسی لوفر لڑکوں کے گروہ نے ان کے صاحب پر بلہ بول دیا اور چھتے چلاتے ان کے صاحب کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن ان کا صاحب تو خود ہی بڑھ کر ان سے پٹ گیا تھا۔ حوالدار اور ڈرائیور دونوں ہی کو کچھ سمجھنیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا تھا۔

سب سے پہلے راجنے زوردار نعرہ لگایا تھا۔ ”وہ رہا آدمی“ پھر بالے چالیا۔ ”وہ آیا ہمارا شہزادہ“ پھر نھوکی تسلی سی آواز اُبھری۔ ”ارے یار خدا تم..... یہ تو اپنا آدمی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں وہ سارے ٹرین سے یچھے اترنے سے پہلے ہی مجھ سے شہد کی کھیوں کی طرح چک چکے تھے۔ میں سول سرسوں اکیدی میں اپنی ٹریننگ ختم کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تھا جہاں میری اندر ٹریننگ آفسر کی حیثیت سے پہلی پوسنگ ہوئی تھی۔ اچانک میری نظر اپنے اشاف کے دو جوانوں پر نظر پڑی۔ میں نے ان سب کو خاموش کرو اکران سے ہاتھ ملایا۔ دونوں نے مجھے سلیوٹ کیا، اور بتایا کہ انہیں (S.P) ایس۔ پی ملک ریشم خان صاحب نے بھیجا ہے تاکہ وہ میرا استقبال کر سکیں اور ان کے دفتر تک میری رہنمائی کر سکیں۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ میرا اپنا شہر ہے اور ایس۔ پی صاحب کے دفتر کے بارے میں میں جانتا ہوں لہذا وہ بے فکر ہو کر واپس جائیں میں کچھ دیر میں خود ہی ایس۔ پی آفس پہنچ جاؤں گا۔ وہ دونوں مجھے سلیوٹ کر کے پٹ گئے۔ بالے نے انہیں میرا سامان بھی نہیں اٹھانے دیا اور خود ہی میرا سامان اٹھائے وہ سب میرے ساتھ ہی اسٹیشن سے باہر آگئے۔

ای اور ابا سے مل کر میں دو گھنی کے لیے ہو کے گھر کی جانب دوڑا۔ وہ گھن میں ہی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں، جتنے عرصے میں اکیدی میں ٹریننگ کر رہا تھا وہ راجہ سے میری لمحے کی خبر لیتی رہتی تھیں اور راجہ کے خطوط میں ان کی جانب سے کہی ہوئی باتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ انہیں پہنچا کہ آج میں فیلڈ ٹریننگ کے لیے اپنے ہی شہر میں تعینات ہو کر آ رہا ہوں۔ اسی لیے ان کے ساتھ ساتھ کہیں خالہ اور غیاث چا

بھی میری راہ تک رہے تھے۔ ان سبھی نے میرا استقبال اسی طرح کیا جیسے کوئی اپنا کسی اپنے کا کر سکتا ہے۔ غیاث چچا مجھے بہت دریتک گلگا کر میری کمر تھپکاتے رہے اور پھر جب مجھ سے جدا ہوئے تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں ان کے احساسات سمجھ سکتا تھا۔ انہوں نے کبھی ایسی ہی کسی کامیابی کا خواب اپنی وجہہ کے لیے بھی دیکھا تھا۔ لیکن افسوس مقدر نے وہ کامیابی نہیں دیا، لیکن آج انہی کی بیٹی کا دیکھا ہوا پہنچا میں نے پورا کردکھایا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آج خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری یہ کامیابی بھی تو وہ کی محنت کے بعد ممکن ہوئی تھی۔ میں نے ان کے کامنڈھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی کہ آج یہ مان صرف میر انہیں، ان کا اور جو گما بھی تو ہے۔

اس دن میں نے وہ کے ملٹی چہرے پر ایک عرصے کے بعد مکمل سکون کی اہم دیکھی۔ ایسا سکون جو کسی ناخدا کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنی ڈوپتی کشتی کو طوفانوں سے بچا کر مسافروں سمیت خیریت سے ساحل پر لگادیتا ہے۔ سینہ خالہ اور غیاث چچا ایک طرف ہوئے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا گیں۔

”ہاں تو اے۔ ایس۔ پی عبدالخان صاحب..... کیا کہا تھا آپ نے..... اگر دعاوں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہوا کرتے تو ہماری مسجد کے مولانا کے تمام بچے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے ہاں؟۔ تو اب کیا کہتے ہو؟ میری ماں تو جاتے ہوئے مولانا صاحب سے ملتے ہوئے انہیں بھی اپنا یہ سداہمار مشورہ دیتے جانا.....“ اچھا ہے کچھ اور لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔“

وہو کی اس بات پر ہم بھی بے اختیار نہیں پڑے۔ ان کے گھر سے نکلتے نکلتے میں نے پھر ان سے کہا کہ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں لیکن شرط صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنے بچوں کے لیے وجوہ سے ہی دعا کروائیں۔ وہ مسکرا کر بولیں کہ ”بروضہشم۔ لیکن محنت انہیں بھی آدمی جیسی ہی کرنی ہوگی۔“

کچھ دیر بعد میں ایس۔ پی ملک ریشم خان کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا اپنی جوانگ رپورٹ انہیں پیش کر رہا تھا۔ میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا اور میرے سامنے ہی وہ ترقی کی میزہیاں طے کرتے ہوئے انپریز سے ایس۔ پی کے عہدے تک پہنچتے۔ جب ان کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے انہیں سلیوٹ کر کے ”اے۔ ایس۔ پی انڈر رینینگ عبدالخان رپورٹنگ سر“ کہا تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرے سلام کا جواب دیا اور اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ مجھے بھی اچھی طرح پہچانتے تھے اور وہ جو کے کیس کے دوران محلے میں آتے جاتے انہوں نے کئی بار مجھے دیکھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ بچپن میں ہم سب محلے کے بچے ان کا نام سن کر ہی بھاگ جایا کرتے تھے تو وہ بہت بہت ہے۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ وہ اوپر سے جس قدر خست گیر کھائی دیتے تھے، اندر سے اسی قدر شفیق تھے، لیکن مجرموں کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا، اور جرم کے معاملے میں وہ کوئی نری برتنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے تفصیل سے مجھے میرے زیر اختیار علاقے اور ان کیسیوں کی تفصیل بتائی، جس میں مجھے ان کی معاونت کرنا تھی، آخر میں اشتہاری ملزم کی فہرست کی باری آئی اور میں تیرے ہی نام پر اس زور سے چونکا کہ میرے ہاتھ میں پکڑے کافی گلے سے کافی چھکتے چھکتے بچی۔ وہ ظفر کا نام تھا۔ ایس۔ پی صاحب نے بھی میری اس بدلتی کیفیت کو محسوس کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس نام سے ہم سب کا پرانا تعلق ہے۔ انہوں نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی سنائی کہ ان کی مجری کے مطابق ظفر گزشتہ ایک ہفتے سے اسی شہر میں موجود ہے۔ لیکن اس نے اپناٹھکا نہ

بدل لیا ہے اور فی الحال اس کے نئے ٹھکانے کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہمارے تھرول میں بھانت بھانت کے لوگ شامل ہوتے تھے اور یتازہ تھری بھی ایک پرانے جواری نے کی تھی جو گزشتہ ہفتہ ہی ظفر کے ہاتھوں اپنی ایک لمبی رقم سے جوئے کے دوران محروم ہو چکا تھا۔

ظفر کی شہر میں آمد کی اطلاع نے جہاں ایک جانب میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھروسی تھیں، وہیں مجھے کافی متفکر بھی کر دیا تھا۔ میں نے اسی دن ایس۔ پی صاحب سے درخواست کر کے ایک دوسرا دل باس والے محلے کے اروگر و قیعنیات کروادیے تاکہ اگر ظفر اس جانب آنے کی کوشش کرے تو وہیں ڈھر لیا جائے۔

میں نے غیاث پچا کو بھی اختیار طافون کر دیا کہ وہ جو کوئی آنا جانا ہو تو وہ مجھے بتا دیا کریں۔ غیاث پچانے مجھے تفصیل نہیں پوچھی لیکن شاید وہ بھی کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ اور فلک کے یہ رنگ شام کو مجھے تب نظر آئے جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ میں نے انہیں شہر میں ظفر کی آمد کے باڑے میں تو نہیں بتایا۔ اس یونہی سرسری ساتھ کر دیا کہ یہ روز مرہ کی احتیاط ہے اور کچھ نہیں۔ پتہ نہیں میری اس بات سے ان کی تسلی ہوئی یا نہیں لیکن سینکندہ خالد کی فلک اور بڑھ گئی اور انہوں نے وہ جو کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے دل کی بات پھر غیاث پچا کے سامنے رکھ دی کہ اس طرح وہ اپنی جوان بیٹی کی پل پل حفاظت کب تک کر پائیں گے؟ انہیں یہ فلک بھی کھائے جا رہی تھی کہ وہ تو میں ۳۰ کے ہند سے کوچھ بنے گئی ہیں اور ایک آدھ سال اور گزر اتو شاید لوگ ان کے گھر کا راستہ ہی بھول جائیں۔ آج کل کنواریوں کو پلٹ کر کوئی نہیں پوچھتا اور وہ جو تو پھر.....“ لیکن غیاث پچانے سینکندہ خالد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں جھوک کر رک دیا۔ لیکن یہ بات غیاث پچا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ سینکندہ خالد کے خدشات بے جا نہیں ہیں۔ لیکن ایک بارہ وہ اپنی ایک جلد بازی کی وجہ سے اپنی بیٹی کے دامن میں انگارے بھر کر اسے ظفر جیسے خصوصی کے جنم میں جھوک کچھ تھے لہذا دوبارہ وہ اپنا ہر قدم پھوک پھوک کر اٹھانا چاہتے تھے۔ اور پھر بات صرف انہی کی مرضی اور اجازت کی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی، اب تو وہ جو سے اسی کسی بات کا تذکرہ کرنا بھی محال تھا۔ اور ان کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کے دل کو زدراہی بھی تھیں پہنچانا چاہتا ہو یا اسی کوئی بات کر کے ان کے پرانے زخم اور ہیڑنا چاہتا ہو۔ لیکن سینکندہ خالد کے اندر وہ جو کی ایک بہت گہری اور سب سے کمیں کمی بھی تو رہتی تھی، اس لیے جو بات مال کی زبان سے نہیں نکل پاتی تھی، اسے اس وقت وہ کمیں وہ جو کو منخل کر دیتی تھی، جب کبھی دونوں سہیلیاں سر جوڑ کر بیٹھا کرتیں لیکن ایسے میں وہ جو کا اپنی اس کمی کو دیا گیا جواب بھی صرف ایک لمبی چپ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو اپنی اس کمی کی ہر تشویش اور ہر خدشے سے آگاہ تھیں لیکن وہ شاید اپنے دل اور ذہن کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس موضوع پر بند کر کچھ تھیں۔ کیونکہ اس عمر میں ہی وہ یہے بعد گیرے اتنے زیادہ تلخ تجربوں سے گزر چکی تھیں کہ یہ بھی انہی کی ہمت تھی کہ وہ اپنی تک اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ ظفر کی شہر میں موجودگی کی خبر سنائیں گے مزید پریشان کروں۔ لیکن پریشانیوں سے تو ہم دونوں کا چوڑی و امن کا ساتھ تھا، ہم ایک ہڑکی بند کرتے تھے تو وہ دوسرے روشن دان سے اندر جھانکنے لگتی تھیں۔ ایک درز پر قفل لگاتے تھے تو وہ دوسری بھر ہی کھول کر ہمارے من کے اندر گلوپڑتی تھیں۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ریحان صاحب کی چھوٹی بیٹی فائزہ کی سالگرہ تھی اور دونوں بچے خود اپنے پاپا کے ساتھ خصوصی طور پر اپنی اُستادی کی ساری فیملی کو مدعو کرنے کے لیے ان کے گھر آئے تھے۔ غیاث پچانے و جوڑ کے سامنے تو ان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی نظر وہ اوجھل ہوتے ہی ریحان

صاحب کو میری ہدایت کے بارے میں بتا دیا کہ میں نے انہیں وجوئی نقل و حرکت محدود رکھنے کے لیے کہا ہے۔ ریحان صاحب نے فوراً اس کا حل بھی غیاث پچا کو بتا دیا۔ انہوں نے غیاث پچا ہی کے ہاں میرے نام کا دعوت نامہ بھی لکھ کر چھوڑ دیا کہ ”جس نے نقل و حرکت محدود کرنے کی ہدایت کی ہے، وہ خود ہی آپ سب کو لے کر ٹھیک چار بجے میرے غریب خانے پہ حاضر ہو جائیں۔“

غیاث پچا نے مجھے دفتر فون کر کے ساری تفصیل بتاوی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جمعرات کو فاری بھیا پنے آسٹریلیا والے پڑھائی کے وظیفے کے سلسلے میں دوسال کے لیے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے آسٹریلیا بذریعہ ہوائی جہاز سفر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں لہذا میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر وہاں سے سیدھا ریحان صاحب کے گھر آ جاؤں گا۔ البتہ انہیں یجاں کے لیے میں اپنی سرکاری گاڑی بھیج دیتیں تاکہ ہوائی جہاز میں بھی انہیں گھر پہنچ جائیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

جمعرات کو میں نے فاری بھیا کو بمشکل گھر سے نکلا ورنہ ان کی فلاست ہی رہ جاتی۔ امی کی دھونیاں اور عمارہ کے امام ضامن ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ امی کا بس چلتا تو وہ بھیا کے ساتھ ہی ایک مستقل دھونی ان کے گلے میں ڈال کر بھیج دیتیں تاکہ ہوائی جہاز میں بھی انہیں مناسب دھواں ملتا رہے البتہ خود بھیا کا کھانس کر رہا حال ہو چکا تھا۔ ان کا وظیفہ بائی میں ریسرچ کے لیے ہوتا تھا اور دوسال میں انہیں صرف دو مرتبہ عید پر ہی چھٹی مل سکتی تھی اس لیے ان کے گھر سے نکلتے نکلتے ماہول کافی افسر دہ سا ہو گیا تھا۔ عمارہ کی مکنی خاندان میں ہی طے ہو چکی تھی لیکن رخصتی کے لیے اس نے شرط یہیں رکھی تھی کہ فاری بھیا کی واپسی کا انتظار کیا جائے گا، وہ بھی بھیا کے نکلتے نکلتے روپڑی۔ مجھے تو ویسے بھی ایسے الوداع ہمیشہ روح کے اندر تک کاٹ دیتے تھے، میرا سارا بچپن ایسے الوداعی لمحوں اور آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ بھلا اس اذیت اور کرب کو کون محسوس کر سکتا تھا، جس سے اس وقت فاری بھیا گزر رہے تھے۔ ویسے بھی وہ بھی گھر سے اتنے عرصے کے لیے ڈونیں گئے تھے۔ وہ صرف امی کی وجہ سے خود پر قابو کئے ہوئے تھے ورنہ وہ تو عمارہ سے پہلے ہی رونے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ تو شکر ہوا ابا کا کہ ان کی ایک زوردار کھنکار نے عمارہ، بھیا اور امی میتوں کو ہی آخری ”وارنگ“ سنادی ورنہ ان لوگوں کا صحن کے دروازے سے بلنے کا کوئی پروگرام بننا دھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایئر پورٹ پر بھیا مجھ سے مل کر پلٹنے لگا تو میں نے پیچھے سے انہیں ہم دونوں کے بچپن کے انداز میں آواز دی۔ ”فاری بھیا.....“ وہ چونک کر پلٹنے۔ میرے ہاتھ میں ہم دونوں کے بچپن کی وہی پسندیدہ ٹینس بال تھی، جو انہوں نے میرے کیٹٹ کانچ جاتے ہوئے، ریلوے اسٹیشن پر میرے سامان میں رکھ دی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھیگی نمی اتر آئی۔ وہ پلٹ کرو اپس آئے اور انہوں نے مجھ سے بال لے لی اور پھر اچانک ہی زور سے مجھے گلے گالیا۔ اس مرتبہ دہا کیلے رونے والے نہیں تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بھل بھل بہرہ رہے تھے۔ ہم بھی کتنے عجیب بھائی تھے۔ جب بھی ساتھ ہوتے تو لوز کر آسان سر پر اٹھا لیتے تھے اور آج جب ایک بار پھر جد اہورہ ہے تھے تو ہمارے آنسو تھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہاز ہوا میں بلند ہو گیا اور میں بوجھل دل کے ساتھ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں تو خاصاً اہتمام نظر آ رہا تھا۔ کافی مہماں آ پکے تھے اور اب بھی مزید آمد جاری تھی۔ شارق اور فائزہ اپنے دوستوں سے اپنی پیاری ٹیچر کا تعارف کروا کر وہاں تک نہیں رہے تھے۔ میں

نے اچانک ڈو گو برآمدے میں نکلتے دیکھا تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ برآمدے میں ڈھلتی شام کے بچھے اندر ہیرے میں چھوٹی چھوٹی ٹکلین تیوں کی لڑیاں جگدگار ہی تھیں اور ان روشنیوں کے درمیان ڈو گو بھی ایک چمکدار ستارہ ہی تو دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے گھرے سبز رنگ کالباس پہن رکھا تھا اور کافی انہوں میں اسی مناسبت سے ہلکے سے فیروزی متیوں والے ناپس ڈال رکھے تھے۔ ضرور یہ سارا اہتمام ان کی سیکلی سکینہ خالانے کروایا ہو گا، ورنہ ڈو گو میں نے کبھی اتنا اہتمام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سادگی ہی اتنی دلفریب اور پر وقارتھی کہ انہیں ایسے کسی مصنوعی سہارے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہوں نے برآمدے سے ہی مجھے دیکھ کر رُور سے با تھہ ہلایا۔ وہ حبِ معمول بچوں کے ساتھ بچنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر دور ہی سے ان کے لباس کو اور ان کے ہلکے سے میک اپ کی اشارے سے تعریف کی اور بچپن کی طرح فضامیں ۱۰۰ میں سے پورے سو یعنی ۱۰۰ اسویڈ سو کا انشان بنایا۔ ڈو گھینپ سی ٹکنیں اور بہنس پڑیں۔ بہت پہلے جب میں کیڈٹ کالج بھی نہیں گیا تھا اور اپنے اردو میڈیم پر اندری اسکول میں پڑھتا تھا تو جب کبھی میں اپنی تختختی بہت اہتمام سے لکھ کر ڈو گو لے جا کر دکھاتا تو وہ یونہی فضامیں ۱۰۰ اکانشان بنا کر میری خوش خطی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ اور آج تو اگر میرا بس چلتا تو میں ہزار نمبر بھی انہیں دینے سے نہ چکتا۔

انتہے میں ریحان صاحب کی امی اپنے پوتے پوتیوں سمیت باہر برآمدے میں نکل آئیں اور انہوں نے پیارے و جو کے سر پر با تھہ پھیرا، شاید بچے آن کا دادی سے تعارف کروار ہے تھے، لیکن جب میں ان سب کے قریب پہنچا تو میرے کان میں فائزہ کا صرف آخری جملہ ہی پڑ سکا۔ وہ اپنی دادی سے پٹ کر کہہ رہی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ادو آپ سچھر سے کہتی کیوں نہیں کوہہ ہماری نبھی بن جائیں۔“ میں نے ڈو گو نے مجھے بوکھلا کر دیکھا۔

کتاب گھر کی پیشکش ہم سفر کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہم سفر..... فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر لکھی جانے والی تحریر۔ زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی، بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتماد ڈگم گا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفروں کو پھر نہ نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے..... اولاد..... **ہم سفر** کتاب گھر کے ناول سکشن میں دستیاب ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

بچپن کا دسمبر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اب جانے بچوں کے دل میں یہ بات کہیں پہلے سے ہی دبی تھی یا پھر اسی محفل کے ہنگامے میں ان کے دلوں میں یہ خواہش گھد بدالی تھی، لیکن ان کی اس بات پر ڈاؤایک دم سے ہی خاموش ہو کر اندر چل گئیں، وادی نے بچوں کو جھروکا کہ ایسا نہیں کہتے، آس پاس کچھ دریچہ مگویاں ہوئیں پھر سب لوگ بھول بھال کر اپنی خوشگپیوں میں مشغول ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن ڈاؤاپی کو پھر کسی نے محفل میں مکراتے نہیں دیکھا۔ ریحان صاحب نے بھی ان کی اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن انہیں اس چھپ کی وجہ سے بخوبی نہیں آسکی اور وہ پارٹی ختم ہونے تک کبھی غیاث چھا اور کبھی خالدے سے پوچھتے رہے کہ وجہ اتنی سمجھیدہ کیوں بیٹھی ہیں؟ لیکن کوئی بھی انہیں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کے دل سے نکلی وہ بات نہیں بتا سکا۔

پارٹی ختم ہوئی تو ریحان صاحب ہمیں گیٹ پر رخصت کرنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے وہاں آکر ان کامان بڑھایا۔ پھر انہوں نے خاص طور پر ڈاؤکی جانب مرکزان سے کہا کہ وہ خصوصی طور پر وجہ کے ممنون ہیں کیونکہ شاید ڈاؤکی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تب بھی وہ بچوں کی خوشی کے لیے یہاں تک آئیں۔ ہم سب ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر جلدی سے گاڑی ریورس کی۔ اتنے میں سڑک سے گزرتا ایک تاگلے جس نے بھی ابھی ہمیں کراس کیا تھا، آگے جا کر یک دم رکا جیسے کسی نے گھوڑے کی لگائیں اچانک ہی دوڑتے کھینچ لی ہوں۔

میں ایک دم ہوشیار ہو گیا اور ڈاؤ کے سامنے آگیا، تانگے سے کوئی شخص گلو دا اور شور مچاتا ہوا ہماری جانب بجا گا، میری ساری حسین ایک دم ہی بیدار ہو گئیں، پھر غیاث چھا کی آواز میرے پیچھے سے ابھری "ارے..... یہ تو اپنا کرمو ہے۔" غیاث چھا ہستے ہوئے آگے بڑھے اور کرموکو گلے لگایا۔ ہاں، وہ کرموباہی تھا۔ ڈاؤاپی کے بچپن سے لے کر جوانی تک انہیں اپنے تانگے میں اسکوں اور کانج تک چھوڑنے والا کرم دین۔

ہم سب کو دیکھ کر موباہی کا چھیس کھلی جا رہی تھیں اور وہ مجھے یوں ٹوٹل ٹوٹل کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ میں ہی وہ چھوٹا سا آدمی ہوں جو روزانہ اس کے تانگے کے پاسیداں پر نکل کر ڈاؤ کے گھر سے لے کر محلے کے چھانک تک بطور فیس جھوٹا لیا کرتا تھا۔ ڈاؤ بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر چھایا تمام تکہ ربالک ہی چھٹ گیا تھا۔ کرمونے ڈاؤ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بے شمار دعا کیں دیں۔ اور ڈاؤ کے بچپن کو یاد کرتا رہا کہ وہ کتنی نفاست پنڈتھیں کہ اگر تانگے کی سیٹ پر ڈرائیور بھی گرد ہوتی تھی تو وہ بیٹھنے سے یکسر انکاری ہو جاتی تھیں اور جب تک ڈاؤ کرموباہی اس گروکسی کپڑے سے صاف نہ کر دیتے تب تک وہ "میم صاحب" بنیں پیچے ہی ہٹلی رہتی تھیں۔ غیاث چھا نے کرمو سے کہا کہ کبھی بکھار گھر کا چکر لگا جایا کرے، وہ بھی اس کا اپنا ہی گھر ہے۔ کرمونے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے غیاث پچا سے کہا کہ وہ سینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں گھر پلے جائیں۔ میں اور قواؤج بچپن کی طرح کرمو کے تانگے پر گھر جائیں گے۔ سب نے حیران ہو کر میری جانب دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ ٹوکے دل پر چھائے غبار کو دھونے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کرمونے خوشی سے وہی فقرہ لگایا، جو وہ ہمارے بچپن میں تانگے کو تیز دوڑانے کے لیے لگاتا تھا۔ غیاث پچا نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور مسکراتے ہوئے سینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ٹوکو اشارة کیا اور شاہی ادب و آداب کے ساتھ بولا۔

”آئیے شہزادی صاحبہ بھی تیار ہے اور کوچوان کرمواپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ ٹوکونے مسکرا کر سر جھکا اور تانگے کی طرف چل دیں۔

”آدمی..... تم بھی نا..... یہ سب کرنے کی یا ضرورت تھی ہاں.....؟“

”ارے بھی آپ بھبھریں اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی۔ آپ کا تو سارا بچپن ہی اس شاہی بھی کی سواری میں گزرا ہے۔ جبکہ مجھ غریب کی کمرا باکی پرانی سائکل کی ٹھپوں اور آچھل کو دنے تو زکر رکھ دی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو زرا ہم بھی اس سواری کا لطف اٹھا لیں۔“ ٹوکو کچھ دیر بمحض مصنوعی غصے سے گھوکر دیکھتی رہیں اور پھر نہس کرتا تانگے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے وہی نوں سال کی ٹوکون بچپن تھیں جو اپنے کرموبابا سے سارے راستے ضد کرتی تھی کہ تانگہ اور تیز چلائے، ٹوکو سب بھول کر اب بھی کرمونے سے وہی جملہ ڈھرا کر ضد کر رہی تھیں۔

”اور تیز..... اور تیز نا کرموبابا..... بھلا کوئی ایسے تانگہ چلاتا ہے۔“

اور کرمونہ بھی وہی پرانا کرمونہ چکا تھا جو اپنی وجہ کے کہنے پر گھوڑے کو اور تیز دوڑائے جاتا تھا اور راستے میں زور زور سے ”ہو..... ہو۔“ کے نفرے بھی مارتا جاتا۔ تانگہ سڑک پر سر پت دوڑا جارہا تھا اور آس پاس کے لوگ چیرت سے تانگے اور اس میں بیٹھی سواریوں کو دیکھ رہے تھے۔ تانگہ اب شہر کی دورو یہ درختوں سے گھری خشنڈی سڑک کی جانب مڑ چکا تھا راستے میں ایک ٹھیلی پر گرم موگ پھلیاں بختتے دیکھ کر وجوہ پہلے کی طرح زور سے چلا کیں۔

”آدمی..... گرم موگ پھلی۔“

میں بھی بچپن کی طرح ان کے حکم کی قبیل میں تانگے سے کودا اور بھاگ کر اخبار کی بڑی بڑی نہماں پویوں میں گرم موگ پھلی کے ہٹھے دانے، ان کے اوپر بہت سا چاٹ پامصالیہ اور نیبیو چھپر کو اکر بجا گتا ہوا دوبارہ تانگے میں آبیٹھا، کرمونے پھر نہس کر زور دار نہرہ مارا ”ہو..... ہو۔“ پھر تو راستے میں جو بھی پھیری والا یا ٹھیلا آتا گیا، ٹوکو یونہی چلاتی رہیں۔ ”آدمی گزک والا۔“ ”آدمی..... بھٹھ.....“ ”آدمی..... قلفی.....“ اور میں ہر بار اُسی چھوٹے آدمی کی طرح بھاگ کر ان کو سب لا کر دیتا رہا۔ جانے کتنی صدیوں بعد میں نے ٹوکو یوں کھل کر ہٹھتے، تھیٹھے لگاتے سُنا تھا، ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وقت کو وہیں روک دیتا۔ زمانے کی ہر ساعت کو اپنے اور ٹوکو کے بچپن کے دسمبر میں ساکت کر دیتا۔

ہمیں یوں بچوں کی طرح ہستے کھلیتے دیکھ کر کرمونے بھی تانگے کو سڑکوں پر ڈالے رکھا، اس روز تانگے پر بیٹھے بیٹھے میں نے اور ٹوکو نے اپنے بچپن کو پھر سے جی لیا۔ ہمیں تب ہوش آیا جب دُور کسی شہر کے گھریاں نے رات کے نوبختے کا اعلان کیا۔ ٹوکونے کرمونے سے کہا کہ تانگہ گھر کی طرف موز

لے کیونکہ غیاث پچھا اور سکینہ خالہ پر بیشان ہوتے ہوں گے۔ میں نے سڑک کنارے بننے پیسی اوسے غیاث پچھا کوفون کیا اور کہا کہ ان کی لاڈی میرے ساتھ ہے، پر بیشان نہ ہوں، وہ نہ کر بولے ”میں جانتا تھام دنوں جب تاکے پر بیٹھ جاؤ تو پھر جب تک گھوڑا خود تھک کرنے گر جائے، تب تک تم لوگ نیچے اترنے کے نہیں۔“ میں نے آن سے کہا کہ ہم ذرا دیر سے لوٹیں گے۔ وہ بولے ”صح بھی ہو جائے تو کچھ پروانہیں۔“ میں نے نہ کرفون بند کرنا چاہا تو ان کی آواز کچھ بھڑکائی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو ان سے کچھ بولا نہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے بولے ”آدمی بیٹا..... شکریہ۔“ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، کیا دخو میری ذمہ داری نہیں ہے؟ اگر میں چند لمحوں کے لیے ان کے لبوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا یہ میری جیت نہیں ہوگی.....؟ جواب میں ان سے مزید کچھ نہیں کہا گیا اور انہوں نے ”جیتے ہو“ کہہ کر فون رکھ دیا۔

کتاب گھر کی بیشکش

جب میں نے تو کو بتایا کہ ہم گھر نہیں کھانا کھانے جا رہے ہیں، اور پھر کھانے کے بعد ریگل چوک سے ان کی پسندیدہ ہاتھ والی مشین سے بنی ”پولکا“ کون آنس کریم کھا کر گھر واپس جائیں گے تو وہ سر ایسہ سی ہو گئیں کہ گھر میں بھی پر بیشان ہوں گے، پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ کچھ دیر تو میں انہیں ستارہا کہ غیاث پچھا سمجھیں گے کہ میں ان کی لاڈی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہوں، یا پھر کرموکا گھوڑا ہی ہم دنوں کو اتنے سال بعد اپنے پیچھے پیٹھے پا کر کہیں روپ چکر ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ بہت زیادہ ہلاکا ہو نے لگیں تو میں نے انہیں سچائی بتا دی کہ غیاث پچھا نے پہلے ہی اجازت دے دی ہے۔ لہذا اب وہ چپ کی پیشی رہیں اور مجھے اور کرموکو فیصلہ کرنے دیں کہ نہیں کھانے کے لیے کہاں جانا چاہیے۔ کرمونے کہا کہ جگہ ہے تو کسی پر ذرا دُور ہے، لیکن دہاں پر رش اور بھیز نہیں ہو گئی اور کھانا بھی بہت عمدہ طے گا۔ میں نے کرمو سے کہا کہ تانگہ اسی جانب موڑ لے، کرمونے شہر سے باہر جانے والی اس سڑک پر اپنا تانگہ دوڑا دیا اور کچھ ہی دیر بعد ہم جھیل کی طرف جانے والی اس سڑک پر اڑے جا رہے تھے، جس کے دنوں اطراف شہرتوں کے بڑے بڑے پیڑے، آسمان پر چکتی چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ”دیکھو آج کون اُن کی مہمان ہے؟“ تو حیرت اور دلچسپی سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے تاثرات بالکل اس شہزادی جیسے تھے جسے عمر بھر کبھی اپنے محل سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی، لہذا ایک رات وہ اپنی خادمہ کے پیڑے لے کر اور ایک نوکرانی کا بھیں بدلت کر دنیادی کیمپنے کل پڑتی ہے اور صحیح تک سارا شہر گھوم کر واپس اپنے محل جا پہنچتی ہے۔

میں نے شاید دسویں کی انگریزی کی کتاب میں اس شہزادی کا یہ قصہ پڑھا تھا اور آج میں خود اس شہزادی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، کیا میری قسمت مجھ پر کبھی اتنی مہریان بھی ہو گی.....؟ ایسا تو میں نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

تحوڑی دیر میں ہم جھیل کے کنارے بننے پھوٹے سے خوبصورت گرخاموں اور پر سکون ریسورٹ تک پہنچ گئے جہاں بچپنی جانب لکڑی کے تختوں کا ایک پلیٹ فارم جھیل کے اندر تک لکڑی کے بڑے بڑے ستونوں کے ذریعے اس طرح کھڑا کر دیا گیا تھا کہ وہ دُور سے پانی پر تیرتا ایک بڑا ساشکارا اوکھائی دیتا تھا اور جھیل کے پانی کی لمبیں جب دھیرے سے اُس سے گلرا تین تو وہ آہستہ آہستہ ملکورے سے لینے لگ جاتا تھا۔ تو نے بیٹھنے کے لیے اُسی تختے کا سب سے آخری حصہ منتخب کیا تھا۔ آسمان پر چاندنی اس طرح سے چکلی ہوئی تھی کہ باہر کی فضا سے زیادہ جھیل کے پانی کے

اندر اجلا پھیلا ہوا تھا، ایک چاند آسمان پر اور دوسرا پانی کے اندر جھیل کی لہروں پر تیر رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور ان پر پھیلی سفید دوھیا برف ہمیں حرث سے تک رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ”دیکھو تو..... کون آیا ہے آج ان کی گود میں دو گھری بیٹھنے کے لیے؟“ کرمودہ وری یشور نہ میں کھلی فضا میں بار بی کیوں بناتے انساف سے جھگڑ رہا تھا کہ ”آدی صاحب“ آئے ہوئے ہیں۔ کھانا ٹھیک نہ ہوا تو کسی کی خیر نہیں، اور ریشور نہ والے بے چارے جیران ہو رہے تھے کہ یہ کون سے لاث صاحب ہیں جو اس پرانے تالگے پر اتنی رات کو شہر سے اتنی دور کھانا کھانے آئے ہیں۔ ان سے نپنچے کے بعد کرمودہ پنچ گھوڑے کو کھول کر دُور جھیل کے کنارے سے پانی پلانے کے لیے اس کی لگام تھام کر بڑھ گیا۔ ہو نے چاند کی روشنی میں دُور کرمودہ کے گھوڑے کو جھیل کے کنارے پانی پینتے دیکھا تو انہوں نے مجھے فرار اس جانب متوجہ کیا۔

”آدی..... وہ دیکھو..... Robert Frost کی اسٹاپنگ بائے ووڈ زان اے سنوئی ایونگ“

<http://kitaabghar.com>

”لیکن یہاں برف کہاں ہے؟..... صرف گھوڑا اور جنگل ہی دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ارے تو پھر کیا ہوا۔ ہم اسے اسٹاپنگ بائے کرموبابا ایٹ لیک سائٹ“

”بھی تو کہہ سکتے ہیں نا۔“ (Stoping by karmoo baba at lake side)

”خوکی اس اچانک اور بھل تشبیہ پر ہم دونوں ہی کھلکھلا کر نہ پڑے میں نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ پیشکش“

”یونہی بہتی رہا کریں..... آپ بہتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

”انہوں نے جھیل سے نظریں ہٹا کر مجھ پڑاں۔“

”جانتی ہوں..... آج میرا دوست مجھے ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے ہی شام سے لیے گھوم رہا ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے شہر سے اتنی دُور بھی لے کر آیا ہے۔“

”آپ کی خوشی اور یہ بہتی دیکھنے کے لیے مجھے اگر آپ کو چاند پر بھی لی جانا پڑے تو لے کر جاؤں گا..... پکا۔“

”لیکن..... آدی..... کیا ضروری ہے کہ دنیا کا ہر شخص خوش ہی رہے..... سداہستا ہی رہے..... آخر کسی کو تو اس غم اور یاس سے بھی دوستی کرنا ہوگی نا.....“

”مجھے باقی دنیا کا نہیں پڑتا..... مجھے صرف آپ سے غرض ہے اور میں کسی غم اور یاس کو ہمیشہ کے لیے آپ کا مقدمہ نہیں بننے دوں گا.....“

”انہوں نے اپنا چہرہ اپنی تھیلیوں پر لٹا کر مجھے چھیننے کے لیے کہا۔ پیشکش“

”اچھا جی..... تو بتاؤ بھلا آدی کیا کرے گا ایسے موقعے پر۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں جھاناکا اور عزم سے کہا۔

”اپنی جان بھی دے دوں گا..... اپنی آخری سانس تک لڑے گا آدی آپ کے لیے..... فنا ہو جائے گا.....“

”خونے ایک دم سے ”شش“، کہہ کر مجھے چپ کروادیا اور بے حد سنجیدگی سے بولیں۔“

”نہیں آدی..... ایسا نہیں کہتے..... دوبارہ اسی بات ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میں تم سے کسی بات نہیں کروں گی.....“
میں ان کا ماموڈ بد لئے کے لیے کہا۔

”اگر بات نہ کرنے کی قسم پر لوگ چپ ہونے لگتے تو آج راجہ گونگا ہوتا۔“ ٹھوکو پکھ دری تو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ پھر جب سمجھیں تو زور سے نہ پڑیں۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> ”کیوں..... کیا راجہ ہر وقت بات نہ کرنے کی قسمیں کھاتا رہتا ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ راجہ تو دوستوں میں پتھے بنتے وقت کم پتھے ملے پر بھی آئندہ ہم سے بات نہ کرنے کی قسم کا حالتا تھا۔ ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ کھانا بھی آگیا۔ کھانا واقعی بہت عمدہ اور لذتیز تھا۔ میں نے کرموکا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں وہاں جھیل کنارے کھانا کھا رہے ہیں۔

وہ کچھ پل میری زندگی کے سب سے حسین اور سب سے زیادہ یادگار لمحے تھے۔ کھانے کے بعد بھی میرا وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسی جھیل کے کنارے اسی رات میں ٹھوک کے ساتھ یونہی بیٹھے بیٹھے اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ اور شاید اگر مجھے کرموکا خیال نہ ہوتا تو میں صبح تک انہیں یونہی اپنے سامنے بٹھائے رکھتا۔

واپسی پر میں نے ٹھوک سے پوچھا کہ انہوں نے ریحان صاحب کے گھر میں بچوں کی بات کا اتنا زیادہ اثر کیوں لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بچوں کی بات کا اتنا قلق نہیں تھا، جتنا اپنے آس پاس بکھر لے لوگوں کی سوچ سے تھا۔

”آدی..... یہ لوگ آخر عورت کو صرف ایک رشتے کے ترازو پر رکھ کر ہی کیوں تو لتے ہیں؟ کیا عورت کی ذات خود اپنے اندر مکمل نہیں ہوتی؟ کیوں اس کے آس پاس ہمیشہ اس کی زندگی کے کسی مرد مالک کو ہی ڈھونڈتا جاتا ہے؟ اور اگر ایسا کوئی رشتہ ساتھ نہ ہو تو سب اس کے ساتھ عجیب سا برتابہ شروع کر دیتے ہیں۔ اسے یا تو مظلوم سمجھنے لگتے ہیں اور یا پھر طرح طرح کے الزام اس کی ذات پر منہضہ دیجے جاتے ہیں۔ کیا میری ذات خود میرے اپنے ساتھ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتی؟ کیا وجہہ صرف وجہہ نہیں ہو سکتی؟ کیا اس کے نام کے ساتھ کسی لاحقے کا ہونا اتنا ضروری ہے کہ لوگ اس کے بنا وجہہ کوہی بھول جاتے ہیں.....؟“

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> بولتے بولتے ٹھوکی آواز ہٹھ رانے لگی۔ وہ چپ ہو گئیں۔

کچھ دری تک فضا میں گھمیری خاموشی چھا گئی۔ صرف کمی سڑک پر دوڑتے تھا نگے کی ٹک ٹک اور تیزی سے چلتی ہواں کا شور سنائی دیتا رہا۔ پھر میں نے اپنے لفظی جمع کئے اور دیمرے سے بولا۔

”آج میری ایک بات غور سے سن لیں اور پھر کبھی بھی اس بات کو ڈھرا یے گا نہیں..... وجہہ اپنے اندر ہی خود ایک مکمل کائنات ہے، اسے اپنے ساتھ کسی سابقے یا لاحقے کی بھی ضرورت تھی..... اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ ہاں البتہ وہ بڑی خوش نصیب ہستی ہو گی، جس کو وجہہ کے نام کا سابقہ مل جائے کیونکہ یہ سابقہ کسی بھی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے مکمل کر سکتا ہے۔ وجہہ اپنے اندر مکمل ہے اور اس کے ساتھ جو نے والا کوئی

بھی نام، چاہے وہ سابقہ ہو چاہے لاحقہ..... ہمیشہ ناکمل ہی رہے گا....."

میں جانے کیا کچھ بولتا رہا اور قو خاموشی سے سر جھکائے میری بات سنتیں رہیں۔

"اور ایک اور بات بھی ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ آپ کے بارے میں میری یہ رائے اس لیے نہیں کیونکہ خوش قسمتی سے میں آپ کے دوستوں میں شامل ہوں۔ میری رائے آپ کے بارے میں تب بھی یہی ہوتی اگر میں آپ سے زندگی میں آج پہلی اور آخری بار ملا ہوتا..... کیونکہ آپ سے ایک ملاقات بھی انسان کو اپنے اندر مکمل کرنے کے لیے بہت ہے۔"

قو نے چوک کر میری جانب دیکھا، اتنے میں تالگے نے موڑ کاٹا اور محلے کے چھانک سے اندر داخل ہو گیا۔ کرم و خصت کرنے سے پہلے میں نے جیب میں جتنے روپے تھے وہ زبردستی اس کی واںکٹ کی اندر ونی جیب میں ڈال دیئے، جنہیں لوٹانے کے لیے وہ تین بار پلٹائیں جب و جو نے بھی اس سے کہا کہ یہ اس کے لیے نہیں بلکہ اس کی قوکی ہم عمر بیٹی رانی کے لیے ہیں تو باطل خواستہ اسے وہ رقم قبول کرنی ہی پڑی اور وہ ہم دونوں کو دعا نہیں دیتے ہوئے تاگہ موز کر چلا گیا۔ میں نے بھی قو کو دروازے تک پہنچا کر واپسی کی راہی۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ چیچے سے قو کی آواز سنائی دی۔

"آؤی....."

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

"میرے چھوٹے دوست آدمی کا شکر یہ ادا کر دینا۔"
<http://kitaabghar.com>
میں مسکرا یا۔

"شکر یہ..... کس بات کا؟"

"آج کی شام ان چند گھنٹوں میں مجھے میرا بچپن اوٹا دینے کا شکر یہ..... اور کچھ دیر کے لیے مجھے میرا اپنا آپ واپس دینے کا شکر یہ....."
کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

"اس خدمت کے لیے یہ بندہ ہمیشہ حاضر ہے....."
<http://kitaabghar.com>

قوہس پڑیں۔ میں نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر ان کے انداز میں اسے دبایا۔ اور انہیں یونہی مجھے دیکھ کر ہمیشہ چھوڑ کر، ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن ابھی میں اپنی گلی میں مژنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری سرکاری جیپ تیزی سے محلے کے چھانک سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھیک کرو ہیں رُک گیا۔ رات کی ڈیوٹی والا اشرف ڈرامیور اور دوسرا ہی بھی موجود تھے۔ پتہ چلا کہ ایس۔ پتی کا پیغام آیا ہے کہ شہر کی ایک متروکہ عمارت کے تہہ خانے میں کچھ لوگوں کے گھنٹنے کی اطلاع آگئی ہے اور آس پاس لوگوں نے دو فائروں کی آواز بھی سنی ہے۔ میں اُسی وقت ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔
<http://kitaabghar.com>

ہمارے موقع واردات پر پہنچنے سے پہلے وہاں باقی نفری بھی پہنچ چکی تھی اور انہوں نے عمارت کو گھیرے میں بھی لے رکھا تھا۔ مجریہ بیٹ

صاحب بھی تشریف لا پکھے تھے، سو ہم نے مزید وقت ضائع کئے بات ہم خانے میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ آس پاس گھنیوں سے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ جھگڑے اور فارماز کے چند لمحوں بعد ہی دو تین افراد کو انہوں نے تیزی سے عمارت سے باہر نکلتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان تھا کہ اندر کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ لیکن جیسے ہی ہم نے آدھی سیر ہیاں طے کیں، اندر تہہ خانے میں اہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے، ایسے لگتا تھا جیسے یہاں شدید وحیگا مشتی ہوئی ہو۔ اندر لاست نہیں تھی، یا کٹ پچکی تھی، اس لیے میں نے گارڈ کو نارنج روشن کرنے کا کہا۔ ایک ساتھ کئی نارچیں روشن ہو گئیں اور زمین پر اوندھے منہ پڑی میز کے پیچھے کوئی شخص الٹا گرا ہوا دکھائی دیا۔ پاہی نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا اور ہلانے جلانے کی کوشش کی، لیکن وہ بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ ساہی نے جلدی سے کہا۔

کتاب گھر کی پیشکش

میں نے دوسرے ساہی کو اس شخص کے چہرے پر روشنی مارنے کو کہا۔ طاقتور نارج کے ہالے نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے مجھے ڈمک مارا ہو۔ وہ شخص ظفر تھا، جواب لاش کی صورت میں اس تہہ خانے میں بے یار و مدد گار پڑا ہوا تھا۔ ظفر مر پڑا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش شعر تمنا

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> خواتین کی پسندیدہ مصنفوں..... **سائزہ عارف**

کا بہت خوبصورت اور چھوتا انداز تحریر..... زندگی کے تمام رنگوں سے سجا دکھوں کے بھرپکڑاں اور خوشیوں کے نکلتانوں سے آباد..... ایک دلچسپ اور طویل ناول..... **شعر تمنا**

کتاب گھر کے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> کتاب گھر کی پیشکش

ایمان کا سفر

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> محی الدین نواب کی نشر سے تیز معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ..... **ایمان کا سفر**..... خوبصورت نقابوں کے پیچھے گھاؤنے چہروں کو بے ناقاب کرتی..... ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں کی کہانیاں..... کہانیوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے معاشرتی کہانیاں/ افسانے سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش آخري ملیس

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میرے اگلے تین دن بے حد مصروف گز رے۔ شہر کی ناکہ بندی تو ہم نے اسی لمحے کروادی تھی جب ظفر کی لاش ہمیں ملی تھی، اور تیر سے دن چند مشکوک پرانے جواریوں کو پھٹپ کر مال گازی کے ذریعے شہر سے باہر جاتے ہوئے ہم نے گرفتار بھی کر لیا۔ تفتیش کے دوران ان میں سے کوئی ظفر کا قاتل تو ثابت نہ ہوا لیکن یہ پریے ضرور جل گیا کہ ظفر کا جھگڑا کن لوگوں سے ہوا تھا۔ وہ اُس کے وہی پرانے قرض خواہ تھے جن سے رقم اینٹھ کر وہ شہر سے فرار ہو گیا تھا۔ انہیں جب اطلاع ملی کہ ظفر اسی شہر میں ہے اور اس پرانی عمارت کے تھہ خانے میں چار مزید جواریوں کے ساتھ بازی جمائے بیٹھا ہے تو وہ اُس سے اپنی رقم کا تقاضا کرنے پہنچ گئے۔ ظفر نے پہلے تو بہانے تراشنے کی کوشش کی کہ اس وقت اس کا ہاتھ نہ گ ہے، الہمنی الحال وہ رقم کی ادائیگی سے معدود ہے لیکن جب اس کے پرانے ساتھیوں نے اس کی ایک نیس مانی اور اس سے بازی پر لگی رقم بھی چھیننے کی کوشش کی تو معاملہ بڑا گیا اور بات ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔ اسی اثنامیں ان میں سے کسی ایک نے ریوال اور نکال لیا اور پیسے لے کر بھاگتے ہوئے ظفر پر پیچھے سے دو فائر کر دیے۔ ظفر وہیں گرا اور تریپ کر کھنڈا ہو گیا۔ گولی مارنے والے بھی رقم اٹھا کر بھاگ گئے اور یوں ظفر کی کہانی کا عبرت ناک انجام ہوا۔

غیاث پچا کو میں نے اگلے دن اخبار کا وہ صفحہ صبح سویرے ہی بھجوادیا تھا، جس میں ظفر کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ میں خود بے پناہ ضرور لیکن اس کے بعد زخم خود ہی مندل بھی ہو جائیں گے اور اس بدنصیب خاندان کو سکون بھی مل جائے گا۔ شاید اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

قتل کے چھٹے دن ہم نے اصل قاتلوں کو بھی ایک پرانے قبرستان کے گور کن کی کوٹھڑی سے گرفتار کر لیا، جو خود بھی کہیں ان جواریوں کا ساتھی تھا اور اپنی کوٹھڑی میں ہی انہیں جوا بھی کھلاتا تھا۔ ملک صاحب نے میری زندگی کے پہلے کیس میں ہی کامیابی پر مجھے مبارکبادی لیکن مجھے اصل خوشی اس بات کی تھی کہ آخر کار غیاث پچا کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھا تر گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے لیکن اندر ظفر کی جانب سے مزید کسی انتقامی کارروائی کی فکر اور غم ہمیشہ کھائے جاتا تھا۔

بچپنی جمرات کو میں ریحان صاحب کے گھر پارٹی کی وجہ سے بالے کے گیراج نہیں جاسکتا ہے الہمنی جمرات سے پہلے ہی راجہ کا پیغام آ گیا کہ اگر اس بھتے بھی میں نے نامہ کیا تو ”وہ آئندہ بھی مجھ سے بات نہیں کرے گا.....“

الہمنی جمرات کا دن آتے ہی میں تھیک چار بجے خود گیراج کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ سارے لوفراند ہی موجود تھے اور جانے کس بات پر زوروں کی بحث چل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بالے نے خوشی سے چلا کر کہا۔

”تحا جس کا انتقام، لو آ گیا وہ شاہ کار.....“

راجہ نے گھور کر مجھے دیکھا۔

”آگئے آپ اے۔ ایس۔ پی صاحب۔ مل گئی فرصت ہم غریبوں سے ملنے کی..... ہاں بھی..... اب بھلا ہمیں کون پوچھے گا۔ اب تو تانگے کی سیر کو جانے لگے ہیں لوگ.....“ کبھی اپنے دن بھی پھریں گے پیارے.....“ اس کا مطلب تھا کہ اس چندال چوکڑی کو بھی میری خواکے ساتھ سیر کو جانے کی خبر مل چکی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ایک پرانے کشن پر قبضہ جما کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جلنے والے جلا کریں..... قست ہمارے ساتھ ہے.....“

خونے والیں سے گلزار جوڑا۔

”حرث آن“ گل، غنوں پہ ہے جوہن کھلے مرجھا گئے۔“

خونکوکی پر انی عادات تھیں کہ وہ ہر شعر میں ایک آدھ لفظ اپنی جانب سے بڑھایا گھٹا کر اس کے وزن کا یہڑہ غرق کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

راجہ نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

”کوئی بات نہیں پیارے اپنے ساتھ بھی ماں کی دعا، جنت کی ہوا ہے۔“

بہت پہلے جب ہم سب پانچوں جماعت میں تھے تو ہم نے ایک انوکھا کھیل ایجاد کیا تھا۔ ہم نے سڑک پر چلتی بسوں، ٹرکوں اور رکشوں کی پشت پر لکھے اشعار اور ”اقوال زریں“ میں بات کرنے کی شرط لگائی اور طے کیا کہ جو کوئی بھی ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کرے گا تو اسے جرمانے کے طور پر سب کو قادر ماما کی ریڑھی سے نان چھوٹے کھلانے پڑیں گے۔ لہذا ہم نے سینکڑوں ایسے اشعار اور اقوال یاد کر لیے تھے۔ یہاں سے راجہ چلا تا

”اوپر پیارنگ نہ کر، پیے لے جنگ نہ کر۔“

وہاں سے باقی کہتا۔

”ہارن دو، راستہ لو۔“

یہاں سے میں چھیڑتا۔

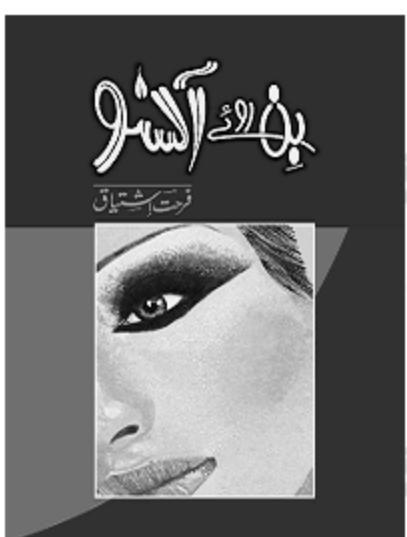
”اپنا توقت ہی خراب ہے پیارے۔“

خونکاہ بھرتا۔ تھ کہا ”وقت وقت کی بات ہے۔“

مشی وہاں سے فریاد کرتا۔ ”ماں کی دعا..... جا بینا تانگہ چلا.....“

گلڈ وہاں سے ڈمکی دیتا۔ ”وقت کا شہزادہ..... پھر لوٹ کر آئے گا۔“

غرض اسی فضولیات میں ہمارا سارا دن کث جاتا تھا۔ آج بھی جب بالے نے مجھے دیکھتے ہی مخصوص بس والا نزہہ لگایا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ بہر حال بڑی مشکل سے اور مختلف ”ترائف“ دے کر میں نے انہیں منایا۔ پھر راجہ نے ہی سب سے پہلے ایک ٹھنڈی سی آہ



بھری اور بولا۔

”یا رکوئی میری بھی ”او میرج“، کرواؤ..... میری اماں کا تو اس طرف دھیان نہیں ہے۔ ہر وقت نوکری کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔“
میں نے اسے ٹوکا کہ ”کو میرج“، کی سب سے پہلی شرط ایک عدالت کی اور دوسرا انتہائی بیانی شرط اس لڑکی سے محبت کا ہونا اشد ضروری ہے اور بد قسمتی سے راجہ کے معاملے میں یہ دونوں شرائط پوری نہیں ہوتی تھیں۔ ”ویسے بھی لو میرج کروائی نہیں جاتی، عموماً بھاگ کر کی جاتی ہے۔“
راجہ نے ہر اسمانہ بنایا۔ تھونے ڈور سے دانت نکالے۔

”خدا قسم آدمی یار..... راجہ نہ کسی پر تیرے کیس میں تو یہ دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں..... پھر تو کیوں نہیں کر لیتا شادی..... میرا

مطلوب ہے او میرج۔“
”کیا مطلب.....؟“

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

بالے اچھل کرنا کارہ جیپ کے بونٹ سے نیچے آتا۔

”مطلوب یہ کہ لڑکی بھی موجود ہے اور تو اس سے شدید محبت بھی کرتا ہے، پھر انتظار کس بات کا ہے۔“

راجہ نے وہیں گیراج کے پرانے صوفے پر لیئے لیئے آواز لگائی۔

”اسے اس بات کا انتظار ہے کہ ایک بار پھر کوئی اور اس کا ہاتھ مانگ کر لے جائے، اور یہ جناب پھر سے دیوار بنے ادھر ادھر پھرا کریں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”تم سب ہوش میں تو ہو..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

راجہ نے نیکی اٹھا کر زور سے میری طرف مارنے کے لیے پھینکا۔

”تو ٹو کیا چاہتا ہے کہ وہ یونہی بنا کسی رشتے کے تیرے انتظار میں گھر میں بیٹھی رہیں..... اور تو مینے میں ایک آدھ بار انہیں گھمانے کے لیے کہیں لے جایا کرے، اور کوئی اگلا تجھ سے پوچھنے کہ میاں، بتاؤ تو رشتہ کیا ہے تم دونوں کے درمیان، تو ٹو ہنس کر کہہ دے کہ ”صرف دوستی“.....“
”ہاں تو دوستی کے رشتے میں بُرائی کیا ہے؟ وہ میری دوست تھیں، میری دوست ہیں اور ہمیشور ہیں گی..... کسی کو اس میں کوئی شک ہے؟“
”کوئی شک نہیں..... کم از کم ہمیں یا پورے محلے کو تو تم دونوں کی دوستی پر اپنے ایمان سے بھی زیادہ یقین ہے۔ لیکن آدمی میری جان..... یہ دنیا صرف ہم یا ہمارا محلہ ہی نہیں ہے، اپنے آپ کو ان کی جگہ پر کوکر سوچ..... سب بھی میں آجائے گا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ وہ یونہی ہمیشور تیری دوست رہیں تو اس کا حل صرف اور صرف یہ رشتہ ہے۔ ورنہ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی آئے گا اور انہیں تجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ پھر وہ خود چاہیں بھی تو ان کی زندگی میں آنے والا تیرے اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اور انہیں بھی آخر کار تجھ میں اور اس نے آنے والے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی ہوگا.....“ میں نے حریت سے اپنے دوستوں کو دیکھا۔ یہ سب آج کیسی باتیں کر رہے تھے؟ بقول فضلو بابا ”یہ سب آج کون سی بُوٹی ناپ کر آئے تھے؟“ بُجھی تھا کہ میں نے آج تک اپنے اور ڈوکو کے رشتے کو سوائے دوستی کے، کسی اور نام سے پکارنے کا اپنے خواب میں بھی نہیں

سوچا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اس رشتے کو کوئی بھی اور نام دینے سے ہمارے درمیان موجود اس دوستی کے عظیم ترین رشتے پر حرف آجائے گا، جو مجھے دیگر کسی بھی رشتے سے زیادہ عزیز تھا۔ اسی لیے میں اسے محبت کا وہ نام دینے سے بھی گریز کرتا تھا، جو اج بالے نے شاید انجانے میں دے دیا تھا۔

ہاں..... مجھے ان سے محبت تو تمہی پر یہ محبت تو ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے اندر موجود پائی تھی۔ اس وقت تو بھی کسی نے اس محبت کو کسی رشتے یا کسی نام سے پکارنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تو پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آج اس معاشرے کو یہ ضرورت کیوں پڑ گئی تھی.....؟ لیکن بات تو راجہ کی بھی نٹھیک ہی تھی، کوئی دوسرا اگر وہ کوئی زندگی کا مالک بن جائے تو وہ بھلا میری اس دوستی کو کیوں قبول کرے گا۔ چاہے میرے اور وہ کے درمیان کا یہ رشتہ کتنا ہی پاک، کتنا ہی مخصوص کیوں نہ ہو، وہ تو اسے اپنے اور موجودہ زمانے کے پیانے پر ہی ناپے اور تو لے گا، اور زمانے کا ترازو تو سدا یہی صدادیتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان دوستی کا کوئی رشتہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت یا تو بہن ہو سکتی ہے، یا ماں یا بیوی یا بیٹی..... اور بس..... اس کے آگے رشتوں کی ڈکشنری میں ہمارے ہاں عورت کے نام کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرا ہر رشتہ بس ایک سوالیہ نشان ہی ہے جو اس کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے اور اس کے سوالیہ نشان سے کسی حد تک پچھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے کسی دوسرے گھر میں قدم رکھا، یہ سوالیہ نشان پوری شدت سے ہم دونوں کے درمیان آکھڑا ہو گا۔

کہتے ہیں بھی کبھی ہماری سوچ ہی حالات کی صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے سیانے ہمیشہ اچھا سوچنے کی صلاح دیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میرے دوستوں سمیت ہم میں سے شاید کوئی اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ اسی لیے اگلی ہی شام جب غیاث چچا کا پیغام آیا کہ شام کی چائے ان کے ساتھ پیوں تو میرے وہم و مگان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں صورت حال کچھ ایسا رخ اختیار کر لے گی۔

میں جب شام کو غیاث چچا کے گھر پہنچا تو ریحان صاحب کی گاڑی پہلے ہی سے باہر کھڑی نظر آئی۔ وہ بہت گرم جوٹی سے مجھ سے ملے۔ وہ تو مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیں۔ غیاث چچا نے خود ہی چائے ڈال کر مجھے بھی کپ تھما دیا اور ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھیں۔ آدی ان کے گھر کے فرد جیسا ہی ہے۔ ریحان صاحب نے کھکھا کر اپنی اس ادھوری بات کو پھر سے جوڑا جو میرے اندر آنے سے پہلے وہ آدمی مکمل کر چکے تھے۔

”جی تو میں کہہ رہا تھا کہ اسی لیے میں نے امی کو روک دیا کہ پہلے مجھے بات کر لینے دیں۔ پھر اگر آپ لوگ اور جیہہ اجازت دیں گی تو اسی باقاعدہ و جیہہ کا رشتہ مانگنے کے لیے یہاں آئیں گی....“

میرے ہاتھوں میں چائے کا کپ اس زور سے لزا کہ مجھے اس کو جلدی سے دوبارہ میز پر رکھ دینا پڑا۔ گویا راجہ کے خدشات نے چوپیں گھنٹے کے اندر ہی حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ریحان صاحب کی ای۔ جو کسی اور شہر میں رہتی تھیں اور ریحان صاحب کی بیٹی کی سال گرہ کی تقریب کے سلسلے میں چند دن کے لیے ریحان صاحب کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جب وہ کو دیکھا تو پیکھتی ہی رہ گئیں اور اسی لمحے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ وہ کو اپنی بہو بنانے کی پوری اور سروڑ کو شک کریں گی۔ لیکن ریحان صاحب نے انہیں حقیقی رشتہ لے کر جانے سے اس وقت تک کے لیے روک دیا تھا جب تک کہ وہ خود پہلے غیاث چچا کی مرضی معلوم نہ کر لیں۔

غیاث چچا نے ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملے میں فی الحال کوئی بھی قطعی رائے دینے سے قاصر ہیں کیونکہ یہ وجہہ کی زندگی کا

اپنا فیصلہ ہے اور خود کی اس سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کی مختاری ہے۔ لہذا وہ صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ریحان صاحب کا یہ رشتہ قوکے سامنے رکھ دیں۔ اب مجھے وہاں دخواں کی سینہ خالہ کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی کہ ضرور خود ریحان صاحب نے پہلے تھائی میں غیاث چھپا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہو گئی تاکہ اگر غیاث چھپا کی کوئی اعتراض ہو تو بات وہیں ختم ہو جائے۔ کچھ ہتھ دیر میں ریحان صاحب نے چائے ختم کر کے اٹھنے اور خصت لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چھپا نے مجھے انہیں گاڑی تک چھوڑنے کا اشارہ کیا اور میں ریحان صاحب کے ساتھ ہی باہر ان کی گاڑی تک چلا آیا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کروہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے اچانک رُک کر ملے اور کہا۔

”عبد..... جہاں تک میں جاتا ہوں..... وجہہ کے گھرانے کے باہر والوں میں سے، آپ ان سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور وجہہ آپ ہی پر سب سے زیادہ اعتماد بھی کرتی ہیں۔ کیا آپ انہیں میرا ایک پیغام دے دیں گے.....؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”آن سے کہیں گا کہ اس رشتے کی خواہش صرف ای کے دل میں ہی نہیں جا گی۔ خود مجھے بھی کہنی بارا یا محسوس ہوا کہ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ لیکن اپنی اور وجہہ کے عمر کے فرق کی وجہ سے یہ بات زبان پر نہیں لاسکا۔ آپ وجہہ سے یہ ضرور کہہ دیجئے گا کہ انہی کا فیصلہ اب بھی آخری اور حتمی ہو گا۔ اور خدار کبھی بھی اس پروپوزل کو ”نه“ کرنے کی صورت میں بھی وہ اسے اپنے اور میرے خاندان کے نقش میں کسی دیوار کی صورت میں محسوس نہ کریں۔ وہ ہر حال میں میرے لیے محترم تھیں اور محترم رہیں گی.....“

ریحان صاحب مجھ سے ہاتھ ملا کر جانے کے وہاں سے جا چکے تھے لیکن میں اب بھی اس ملاج کی طرح بے بس سا وہاں کھڑا تھا، جسے نیچھوں میں اس بات کا پتہ چل جائے کہ اس کی کشی میں ایک ایسا شگاف ہے، جسے بھرنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

راجہ کو جب میں نے یہ بات بتائی تو وہ غصے سے چلا اٹھا۔

”دیکھا..... میں نہ کہتا تھا..... ہو گئی مجھ تھی..... یہ ریلوے کے سارے باؤ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ چلنے میں پہنچ جیسے دھیئے..... لیکن مستقل مزاج اتنے کہ دھیرے دھیرے اور سرک سرک کراپی منزل کے پلیٹ فارم تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگزا آؤ۔ جا کر قو سے اپنے دل کا حال کھددے..... آج اور بھی..... اس سے پہلے کہ وہ ریلوے باؤ انہیں لے آئے۔“

لیکن جس بات کو راجہ اتنی آسانی سے کہدا تھا، میرے لیے وہ دنیا کی سب سے مشکل ترین کسوٹی تھی۔ میں نے ساری زندگی میں صرف یہی ایک قو کی دوستی ہی تو کہائی تھی باقی عمر بھر کے گوشوارے میں صرف اور صرف خسارہ ہی تو تھا۔ کہیں یہ دوستی، یہ رشتہ بھی مجھ سے چھوٹ گیا تو.....؟ اس سے آگے سوچنے کی نہ ممکن ہے تھی اور نہ ہی سکت۔

ساری رات میں اپنے بستر پر کرہ میں بدلتا رہا اور آخر کار صبح ہونے تک میں ایک فیصلے تک پہنچ چکا تھا۔ مجھے کوئی ایک بھرم تو دا پر لگانا ہی تھا۔ لہذا میں نے بھی یہ بازی اپنے طور پر کھینے کا فیصلہ کرایا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش آخری بھرم

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چچا میری بات سن کر بہت دریک گم سُم بیٹھے رہے، اور میں ان کے سامنے بیٹھا ہو لی پڑنا گا رہا۔ میں نے انہیں گاڑی بھیج کر اپنے ہی دفتر بلوالی تھا اور وہ اس وقت میز کی دوسری جانب بیٹھے کسی گھری سوچ میں گم تھے۔ میں لفظوں کے معاملے میں بیشہ ہی سے بہت محتاط واقع ہوا تھا اور اس روز تو میں نے اپنا معاہدہ بیان کرنے کے لیے اپنی احتیاط کی ہر حد تک پار کر لیا تھا تاکہ غیاث چچا کے آگینے دل کو ذرا سی بھی ٹھیک نہ لگنے پائے۔ لیکن یہ بھی تو ٹھیک ہی تھا کہ ہر کہی بات اپنے ایک معنی تو ضرور رکھتی ہے۔ پھر چاہے بات کو لئے ہی اچھے اور خوبصورت ڈھنگ سے کیوں نہ پیش کیا جائے، اس کا آخری اثر تو ہی ہوتا ہے جو دوسرے سُننے والے شخص تک اس بات کے وہ اصل معنی پہنچا پاتے ہیں۔ میری تشویش بھی یہی تھی کہ غیاث چچا تک کہیں میری بات، میرے کسی غلط لفظ کے استعمال سے کوئی اور معنی نہ پہنچا دے۔

بہت دریخا موش رہنے کے بعد آخر کار غیاث چچا نے سر اٹھایا اور اپنے سلک لب کھولے۔

”اگر میں تمہیں بچپن سے نہ جانتا ہوتا تو آج تمہاری اس بات کو میں ایک جذباتی فیصلہ بھی کرم دنوں کی عمر کے فرق کا احساس دلاتا یا تمہیں یہ لیصحیح کرتا کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو جو نے سے پہلے ہی بہت کچھ توڑ جاتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں آدی، اور تمہارے زندگی گزارنے کے نظریے سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ توکار شرط طلب کرنے کے پیچھے تمہارے دل میں کون ساجدہ کا رفرما ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ فیصلہ کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

میں نے غیاث چچا کو اپنے دفتر بلا کر سر جھکائے ہوئے ان سے یہی درخواست کی تھی کہ اگر بیجان صاحب نے تو کوئی مرضی معلوم کرنے کے لیے غیاث چچا کی زیان کو اپنا پایا میر بنا یا ہے اور بات آخر کار اگر تو کو اس گھر سے رخصت کر کے سر خرو ہونے پر یہ ختم ہونی ہے تو پھر انہیں تو کے سامنے ایک نہیں دونا م رکھنے ہوں گے۔ اور وہ دوسرا نام میرا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میرے گھروالے میرے اس فیصلے پر چونکیں گے تو ضرور لیکن انہیں زیادہ حرمت بھی نہیں ہوگی۔ امی تو کبھی کبھی مجھے تو کے اردو گرد چکر کا تئے دیکھ کر مجھے چھیڑنے کے لیے عمارہ کو با آواز بلند کہہ بھی دیا کرتی تھیں۔

”ارے یہ گھر میں بیک کر کیسے بیٹھے گا۔ اس کی جان جو وہاں انکی رہتی ہے..... میں تو کہتی ہوں بھائی کو گھر میں دیکھنا چاہتی ہو تو پہلے تو کو اس گھر میں لے آؤ۔“

کون جانتا تھا کہ ایک دن واقعی ایسی نوبت آ جائے گی۔

غیاث چچا واپسی کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں ان کے ساتھ دفتر کے دروازے تک آیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے میرے کاندھے پر

اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”آدمی..... میں تمہاری ایمانداری اور سچائی کی قدر کرتا ہوں آج مجھے اس بات کا پوری طرح احساس اور یقین ہو گیا ہے کہ تم زندگی کی ہر سچائی کا سامنا کرنا خوب جانتے ہو..... کاش..... کاش یہ چنان اگر میرے ہاتھ ہوتا تو میری پہلی اور آخری پسند تم ہی ہوتے۔“
وہ میرا کندھا تھپٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔ اور میں اپنی آخری بازی کھیل کر کسی ڈرے ہوئے جواری کی طرح تقدیر کے پتے پلنے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن میری قسمت کے بازیگر کا جواب بہت دیر سے آیا۔ غیاث پچا کے چلے جانے کے بعد اس روز دیر تک میں لا شعوری طور پر کسی کے بلا وے کا انتظار کرتا رہا لیکن ہر آہٹ پر چونک پڑنے کے باوجود وہ دستک میرے لیے نہیں ہوتی تھی۔ اور یوں دھیرے دھیرے پورا دن گزر گیا اور بالآخر رات بھی ڈھل گئی۔ یونہی دوسرا اور پھر تیرا دن بھی ڈھل گیا۔ اب اس انتظار نے مجھے رفتہ رفتہ اندر سے گھلانا شروع کر دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں لمحہ بھلے بھلے اندر سے گھلتا جا رہا ہوں، چوتھے دن تک تو میرا کچھ ایسا حال ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ سیدھے جا کر وہ جو کے سامنے کھڑا ہو جاؤں کہ جو فیصلہ بھی انہیں سنانا ہے، جو سزا بھی میرے لیے مقرر کرنی ہے۔ بس ابھی کر دیں لیکن اس انتظار کی صلیب پر مجھے مزید نالکا نہیں۔ لیکن بے بسی کی یہ کیسی انتہا تھی کہ میں خود چل کر ان کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی مجھے میں نہیں رہی۔
پھر یوں ہوا کہ میں نے دن، لمحے اور پلوں کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ وقت کو یاد رکھ کے کاشنا شاید دنیا کا سب سے اذیت ناک عذاب ہوتا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے نامہ بر میرا حکم سیاہ لے کر آئی گیا۔ وہ کوئی جانب سے فضلو بابا بیغام لے کر آگئے کہ مجھے شام کو طلب کیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے حواس رکھتے ہوں گے ان کے لیے تو شاید چار پانچ دن ہی گزرے ہوں گے، پرمیرے لیے تو نہ جانے لکھنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ شام تک میرے دل میں عجیب عجیب سے وسو سے آتے رہے اور چند گھنٹوں کا وہ وقت کیسے گزرا یہ میں ہی جانتا ہوں۔

شام ڈھلے جب میں وہ کوئے گھر پہنچا تو فضلو بابا جو محن میں لگے انگور کی بیلوں کی شخصیں تراش رہے تھے، نے ڈورہی سے مجھے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ چھت پر ہیں۔ سورج ڈھل چکا تھا لیکن اس کی سنبھلی گلبی روشنی ابھی کچھ فضا میں باقی تھی۔ میں دھیرے دھیرے یوں سیڑھیاں چڑھنے لگا، جیسے کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔

فہمend یہ کے قریب ہی کری پر خاموش سی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی سوچی ہوئی آنکھیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ پچھلے چند دنوں میں بس لگا تاروں ترہی ہیں۔

میں چپ چاپ خاموشی سے ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں، پھر انہوں نے سر اٹھایا اور میں نے نظریں جھکالیں۔ ان کی آواز مجھے کسی ڈور کے صحراء سے آتی محسوس ہوئی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا آدمی..... میرے پاس ایک ہی تو مان بچا تھا۔ تمہاری دوستی کامان اور تم نے میرا یہ آخری بھرم، آخری مان بھی توڑ دیا..... کیوں کیا تم نے ایسا.....؟“

میں نے یونہی بھکنی نظر سے جواب دیا۔

”میں آپ کو ایک مرتبہ پھر کھونے سے ڈرتا ہوں۔ میرے پاس بھی آپ کی اس دوستی کے مان کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا ہے..... اور کوئی بھکی غیر آ کراس بھرم کو مجھ سے چھین کر لے جائے، یہ مجھے گوارہ نہیں ہے.....“

”تم سے کس نے کہا کہ کوئی تم سے میری دوستی، میرے اختاہ، میرے خلوص کا بھرم چھین سکتا ہے؟ اور تم نے تو اس دن خود مجھ سے کہا تھا، کہ وجہہ اپنے اندر خود ایک مکمل کائنات ہے؟ پھر کیوں اُسی وجہہ کو نامکمل سمجھتے ہوئے غیروں کے ساتھ تم بھی اُسے نام کا لاحقہ پیش کرنے چلے آئے۔ تم آدمی۔ تم....؟.....“

”آپ شاید بھول رہی ہیں۔ اُسی دن میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ جس کسی بھی خوش قسمت کے نام کے ساتھ آپ کے نام کا سابقہ جڑے گا، اس کا نام، اس کی شخصیت، اس کی کائنات بھیشہ کے لیے مکمل ہو جائے گی۔ اور پھر اگر اس پوری کائنات میں کسی کو اس نام کے بخوبی سے اپنے آپ کو مکمل کرنے کا حق ہے، تو وہ پیلا حق دار میں کیوں نہیں ہو سکتا..... کیا آپ مجھے بھیشہ نامکمل ہی دیکھنا چاہتی ہیں؟..... یا پھر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کو خود یعنی کی تکوار بھیشہ میرے سر پر لٹکتی ہی رہے.....؟..... اگر آپ کو بھیشہ کے لیے اپنے پاس روک لینے کا صرف بھی ایک رشتہ ہی واحد ذریعہ ہے تو پھر یونہی سکی.....؟.....“

کتاب گھر کی پیشکش

”نہیں..... یہ نامکن ہے.....“

”کیوں..... کیا صرف اس لیے کہ آپ عمر میں مجھ سے صرف سات آٹھ سال بڑی ہیں..... یا اس لیے کہ اس رشتے سے پہلے ہی آپ کی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور اب آپ اپنے آپ کو سارے نسل والوں کو صرف ہمدردوں کی قطار میں شمار کرتی ہیں یا پھر صرف اس لیے کہ آپ کے ذہن میں بھی وہ صدیوں پرانا اور گھسا پا جملہ گردش کرتا ہے کہ ”لوگ کیا کہیں گے.....؟.....“

تو نے دُکھ کی اذیت سی ڈوبی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”نہیں نہ تو مجھے اپنی اور تھہاری عمر کے فرق کا کچھ ایسا شدید احساس ہے، نہ ہی میں ماضی کے کسی رشتے کی وجہ سے خود کو کسی ہمدردی کا شکار محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی مجھے زمانے کی پرواہ ہے..... مجھے اگر فکر ہے تو صرف اور صرف اس رشتے کی جو میرے اور تھہارے درمیان موجود ہے۔ لوگوں کی نظر کی پرواتوں میں تب کرتی جب خود اپنے آپ سے نظر ملا پاتی۔ تم نے تو خود مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا آدمی۔ میں تو اتنے دن سے خود اپنا ہی سامنا نہیں کر پا رہی۔ اتنے خوبصورت اور انمول رشتے کو تم نے دنیا کے ایک عام سے رشتے میں بدلنے کا سوچا بھی تو کیسے؟ دوستی کی سیپ میں سے موتی نکال کر اسے کچھ میں پھینک دیا..... کیوں؟.....“

کتاب گھر کی پیشکش

”مجھے ایسا کرنا پڑا، اس رشتے کی کچھ سے اس انمول رشتے کی چمک کو جان بوجھ کر دھندا تاہی پڑا کیونکہ اس کی چمک ہی لوگوں کو قول نہ تھی، اور یہی چمک آپ کو مجھ سے ایک بار پھر دو لے جانے کا باعث بن رہی تھی۔ کیونکہ وجہہ خود ایک ایسا چمکدار ہیرا ہے جس کی چمک اور جس کی کشش بار بار لوگوں کو اس کی جانب کھینچتی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایک دن کوئی نہ کوئی اس رتن کو مجھ سے پڑا لے جائے گا..... آپ ہی بتائیں..... پھر آدمی۔“

کیا کرے گا.....؟“

تو بے بسی سے روپڑیں۔

”میرے لیے یہ زندگی پہلے ہی بہت کشھن ہے آدی..... اے میرے لیے اور مشکل نہ بناؤ..... مجھے اپنے اور تمہارے رشتے سے بہت محبت ہے آدی..... خدا کے لیے اس محبت کو میرے دل میں زندہ رہنے دو..... اے کسی اور رشتے کا الزام نہ دو..... وینا کا اور کوئی بھی رشتہ اس کی حرمت کو چھو بھی نہیں سکتا..... مجھے میری محبت واپس لوٹا دو آدی..... واپس لوٹا دو.....“

”مجھے بھی اس رشتے سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو..... اور مجھے آپ سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی ہم دونوں کو اس رشتے سے..... اور یہ محبت مجھے آج یا کل سے نہیں ہے..... جس لمحے میں نے ہوش سنجا لا اور آپ کو دیکھا تھا..... تب ہی سے یہ محبت میرے خون میں شامل ہے۔ یہ حجت ہے کہ ریحان صاحب کا رشتہ آنے تک میں نے بھی بھی اس روحانی محبت کو کسی دنیاوی رشتے میں ڈھالنے کا نہیں سوچا تھا۔ مجھے بھی اس رشتے کی حرمت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا آپ کو ہے..... اور یقین مانیے کہ ہمیشہ رہے گا..... آپ میرے لیے سدا ”آپ“ ہی رہیں گی۔ مجھے اس پوری کائنات میں سے صرف آپ کا ساتھ چاہیے..... صرف یہ اعتماد چاہیے کہ آپ صرف میری ہیں اور اب کوئی آپ کو مجھ سے چھین کر دُور لیجانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کو کہیں بھی چلنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا..... حتیٰ کہ آپ کا گھر چھوڑنے تک کا بھی نہیں کہوں گا۔ آپ ہمیشہ اتنی ہی آزاد، اتنی ہی خود مختار ہیں گی جتنی آپ آج ہیں۔ بولیے..... کیا صرف اتنا سا احساس بھی آپ مجھے نہیں دے سکتیں.....؟ کیا میرا آپ پر اتنا سا بھی حق نہیں ہے.....؟ میں جانتا ہوں آج نہیں تو کل غیاث پچا اور سکینہ خالہ کے آنسو آپ کو اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی فیصلہ لینے پر مجبور کر ہی دیں گے کیونکہ آپ کی اس زندگی پر ان کا بھی آپ جتنا ہی حق ہے۔ اور ایک وقت آئے گا کہ آپ صرف ان کے حق کی خاطر ہی ہیں، لیکن ہمارا نہ ہی لیں گی۔ تو پھر میرے حق میں ہار جانے میں کیا حرج ہے.....؟ یقین کیجھے..... آپ ہار کر بھی سب جیت جائیں گی..... ہمارے درمیان کے رشتے کی حرمت سدا برقرار رہے گی..... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے.....“

بولتے بولتے میں ہاپنے سالگ گیا تھا۔ شاید میرے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ لفظ بھی تو آپ کو سانس دینے کا کام کرتے ہیں۔ لفظ بھی کبھی کبھی ہوا کی طرح آپ کی زندگی کے لیے اشد ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اچاک لفظ ختم ہو جائیں تو انسان کا دم اکھڑنے لگتا ہے۔ جیسے اس وقت میرا دم اکھڑ رہا تھا، وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے بیتے آنسو ان کے گاؤں سے ہو کر ان کے دامن کو بھگوڑ ہے تھے۔ میں واپس جانے کے لیے اٹھ کر ہوا۔

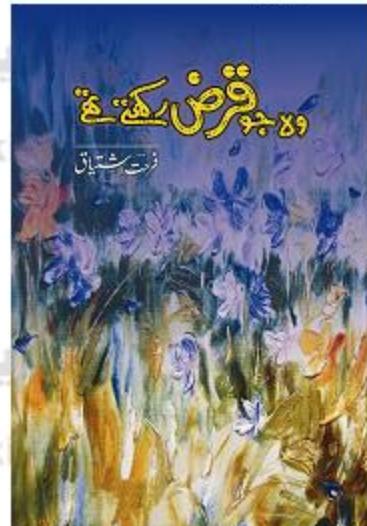
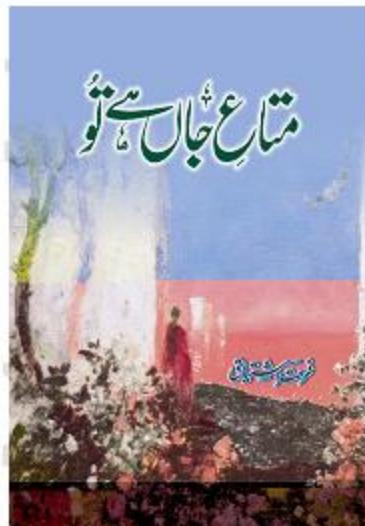
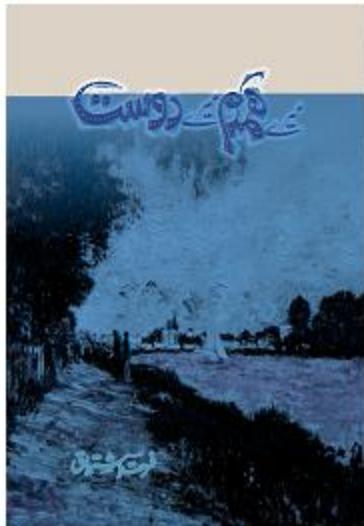
”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ اب بھی میرا آپ پر میرا کچھ حق باقی ہے..... اور اگر بھی تک آپ کی اعتماد کی دیوار میں حتیٰ شگاف نہیں پڑا اور آپ کا مجھ پر بھروسہ باقی ہے..... تو مجھے آپ کے فیلے کا انتظار رہے گا..... آپ کے آدی کی آخری امید اب آپ ہی سے بندھی ہے..... اور یہ سدا بندھی رہے گی.....“

میں وہاں سے پلاٹا اور اس اندھے تیر کی طرح وہاں سے چلا آیا ہے کمان سے چھوٹتے وقت خود اپنی منزل کا پتہ نہیں ہوتا۔ میری منزل بھی

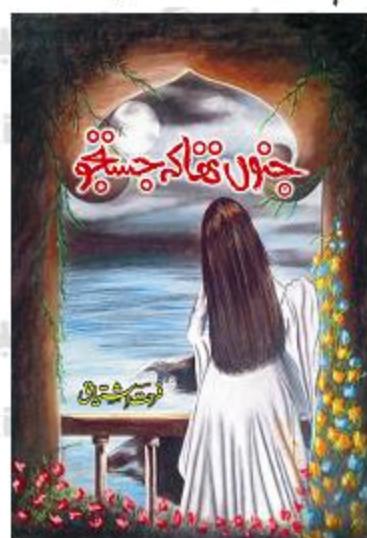
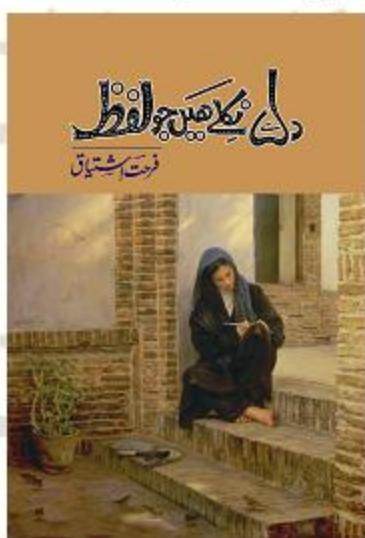
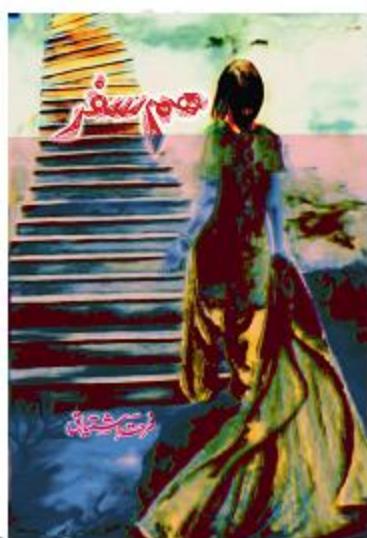
نہ جانے کہاں تھی۔ مجھے یہ بات بھی بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری زندگی کے توے فیصلے سے بھی زیادہ اور پیشتر فیصلوں پر دوسروں کا اختیار کیوں ہوتا ہے؟ ہم اتنے بے بس کیوں ہوتے ہیں کہ اپنے حصے کی سائیں بھی دوسروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟ میں بھی اس روز اپنے حصے کی تمام سائیں تو کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ صرف سانوں کی ہی کیا بات تھی، میں تو اپنی تمام ساعتیں، تمام ساعتیں اور ساری بینائی بھی وہیں گروی رکھ آیا تھا اور اب مجھے صرف ان کے فیصلے کا انتظار تھا۔

<http://kitaabghar.com>

اور پھر ٹھیک سات دن بعد تو کافی قابل بھی آئی گیا۔ تو نے ریحان صاحب کے حق میں فیصلہ نہ دیا تھا۔ اگلے ماہ تو کی ریحان صاحب کے ساتھ رخصتی تھی۔



علم و عرفان پبلیشورز پیش کرتے ہیں..... محترمہ فرحت اشتیاق کے 8 خوبصورت ناول



کتاب گھر کی پیشکش آخری دستک

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس روز جب فتر کے فون کی گھٹتی بجی تو میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگلے چند لمحوں کے بعد میری زندگی سے ہر خوشی، ہر روشنی یوں پل بھر میں غائب ہو جائے گی کہ اس کے بعد صرف اور صرف اندر ہیراہی ہمیشہ کے لیے میرا مقدر رکھہ رہے گا۔ میں نے فون اٹھایا، دوسرا جانب غیاث پچا تھے جو ایک ہلکی سی ہیلو کے بعد بالکل ہی خاموش ہو گئے تھے۔ مجبوراً مجھے ہی پوچھنا پڑا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”آپ چپ کیوں ہیں..... سب خیریت تو ہے نا.....؟“

دوسرا جانب سے ان کی لرزتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

”آؤی..... وجہہ نے اپنا فیصلہ نہادیا ہے..... وہ ریحان صاحب کے رشتے کے لیے مان گئی ہے..... مجھے بہت افسوس ہے..... میں تمہیں تھماری قوئیں دلا سکا.....؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث پچا اس کے بعد بھی نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے لیکن میرے کان سائیں سائیں کرنے لگتے تھے..... میری تمام حیات نے یک دم ہی اور بالکل جواب دے دیا تھا۔ پتے نہیں انہوں نے بات کس طرح ختم کی اور میں نے انہیں کیا جواب دے کر فون بند کیا، مجھے کچھ یاد نہیں۔

میں اُس وقت چونکا جب میرے ارد لی نے آ کر اندر کمرے کی روشنی جلانی۔ تب میری گھڑی پر نظر پڑی۔ اوه..... تو گویا ہر شام ڈھل چکی۔ غیاث پچا کافون صبح گیارہ، سو اگیارہ کے بیچ آیا تھا اور تب سے میں یہیں ساکت بیٹھا ہوا تھا۔

اس دن کے بعد مجھے ایک دم ہی یوں لگنے لگا تھا، جیسے میرے اندر سے جینے کی ہر خواہش ہی مٹ گئی ہو۔ میں جہاں بیٹھا جاتا، بس وہیں بیٹھا رہتا اور جہاں کوئی مجھے کھڑا کر جاتا، میں ساکت سا وہیں کھڑا رہ جاتا۔ فترت سے میں نے بہت سے دنوں کی چھٹی لی تھی لیکن گھر میں لکنے کے بجائے میں صبح سوریے ہی نکل جاتا اور کسی بھی سنسان سڑک کی راہ پکڑ کر پیدل چلتا رہتا، دھوپ اور سائے کا احساس بھی میرے لیے جیسے ختم ہو گیا تھا اور میرا کسی سے بھی کچھ بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے دوستوں سے بھی کتنا شروع کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ میرے لیے اذیت میں ہوں گے مگر میں ان کے سامنے آ کر ان کی اذیت مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

گھر میں آتے جاتے آس پاس سے ہی یہ خبر سننے کو ملی تھی کہ اگلے ماہ قوکی رخصتی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ عمارہ کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ خود ہونے ریحان صاحب کے آگے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ ڈولی اٹھانا چاہتے ہیں تو پھر رخصتی میں تاخیر نہ کریں۔ ریحان صاحب یا ان کی امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو خود کل کی جگہ آج کے قائل تھے اس معاملے میں۔ لہذا رخصتی کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع ہو چکی تھیں اور سکینہ

خالہ اپنی بیٹی کے نصیب ایک بار پھر سے جاگ جانے پر بے حد شاداں و فرحاں تھیں۔ اور وہ ہی کیا، پورا محلہ ہی اس رشتے سے بے حد خوش تھا۔ وہ سب اُس خاندان پر گزری تمام آفتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اب خدا کر کے ان پر قسمت نے خوشی کا ایک دروازہ کھولا تھا تو سمجھی کی یہ خواہش تھی کہ ڈوختیر سے اپنے آنکھن سے سعد حاریں اور خدا ان کے نصیب اچھے کرے۔ میں نے اپنا معمول بنار کھاتھا کر کے میں صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا تھا تاکہ راجہ یا بالے یا کسی بھی دوسرے دوست کا سامنا ہونے سے بچ سکوں۔ گھر میں امی وغیرہ کو میں نے ڈیوٹی کا کہہ کھاتھا اس لیے انہیں مجھ پر کچھ زیادہ شک نہیں ہوا کیونکہ میری ڈیوٹی کے اوقات ہمیشہ سے کچھ ایسے ہی اوٹ پلانگ تھے۔

عمارہ نے البتہ شاید میری آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھ لی تھی لیکن وہ بھی مصلحتاً خاموش ہی رہی۔ اس روز میں منہ اندھیرے گھر سے باہر نکلا تو وہ سارے کے سارے بالے کی پرانی جیپ میں گلی میں ہی میرا انتفار کر رہے تھے۔ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کی کوشش کی، ہزار بہانے کیے لیکن انہوں نے مجھے دبوچ ہی لیا اور سیدھے بالے کے گیراج لے آئے۔ میں جپ چاپ زمین پر پڑے گلشن پر بیٹھ گیا۔ نہ سو اور مُشیٰ چائے بنانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ راجہ میرے بالکل سامنے آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور میری ٹھوڑی اپنی آنکھی سے ذرا سی اٹھا کر بہت دریںک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔۔۔ میری آنکھیں جانے لگیں۔ راجہ کی آواز بھی بھرا گئی۔

”تو اپنے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے آدمی۔۔۔ کیوں اپنے آپ کو جلا کر بھرم کر رہا ہے۔۔۔ ارے یا راپا نہیں تو کچھ ہمارا ہی خیال کر لے۔۔۔“

کتاب گھر کی پیشکش

”جانتا ہے ڈوٹیری وجہ سے کس قدر پریشان ہیں۔۔۔ بچھلے تین ہفتوں سے وہ ہم میں سے ہر کسی کو، ہر روز تیری خبر لینے پہنچتی ہیں۔۔۔ لیکن تیرا تو کوئی انتہا نہیں ملتا۔۔۔ دفتر سے تو نے چھٹی لے رکھی ہے، گھر پر تو بکلا نہیں۔۔۔ ہم سے ملتا نہیں۔۔۔ تو پھر بتا ہم کیا کریں۔۔۔ تجھے ڈھونڈنے کیاں جائیں۔۔۔“

”ڈھونڈا ان کو جاتا ہے جو کہیں کھو چکے ہوں۔۔۔ میں تو یہیں ہوں۔۔۔ تمہارے سامنے۔۔۔“

کتاب گھر کی پیشکش

”نہیں۔۔۔ یہ تم نہیں ہو۔۔۔ یہ کوئی اور ہے۔۔۔ یہ ہمارا آدمی نہیں ہے۔۔۔“

”وہم ہے تمہارا۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ اور بھلا ڈو کو میرے لیے پریشان ہونے کی یا میری تلاش میں تم لوگوں کو کہیں بھیجنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔۔۔ سما ہے ان کی رخصتی ہونے والی ہے۔۔۔ ان کے پاس تو منٹانے کے اور بہت سے کام ہوں گے۔۔۔ ان سے کہنا کہ میری فکر چھوڑ دیں۔۔۔ اپنی آنے والی زندگی کی فکر کریں۔۔۔“

بالے نے جیرت سے میری جانب دیکھا۔

”آدمی۔۔۔ یہ تو بول رہا ہے۔۔۔ اپنی ڈو کے لیے۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔۔۔ اتنا ہر تو تیرے لجھے میں پہلے کبھی نہ تھا۔۔۔“

میں نے اُسی زہر خند لجھے میں اسے جواب دیا۔

”زہر نگنے والوں سے امرت انگلنے کی توقع کرنا ہی سب سے بڑی بے قوفی ہے۔“ راجنے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

”ایسا مت بول آدی..... یقین کرتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تم دونوں کا رشتہ ہم سب کی بلکہ اس پوری دنیا کی سوچ سے بھی اونچا ہے۔ تجھے میری قسم تو کوئی نیت پر کبھی شک نہ کرنا۔“

میں ان سب کی باتیں سن کر دل میں بہس دیا تو گویا بی بھی انہی کی سکھائی بولی بولنے لگ گئے ہیں۔ اس میں ان بے چاروں کا قصور بھی کیا تھا.....؟ وہ توحیح ہی ایسی..... کہ جس سے ایک بارزندگی میں مل لیں تو پھر وہ ساری عمر انہی کے گن گاتا رہے اور انہی کی زبان بولتا رہے۔ راجنے جلدی سے اپنی جب سے ایک بدل فافہ نکالا۔

”خونے دیا ہے تیرے لیے اور ہمیں سختی سے تاکید کی ہے کہ تو اسے بھیں ہمارے سامنے پڑھے گا۔ ورنہ وہ تیری ضد سے اچھی طرح واقف ہیں کہ باہر جاتے ہی اسے چھڑا دے گا۔“

راجنے لفافہ میرے حوالے کر دیا اور بالے میرے دائیں باسیں یوں بیٹھ گئے، جیسے اگر میں واقعی و جو کا خط پھاڑنے لگوں تو دونوں مجھ سے خطا ہی دوبارہ چھین لیں گے۔ مجھے ان کی اس بے اعتباری پر پیارگی بہت آیا اور غصہ بھی بہت، میں نے ان دونوں کوڈاٹ کر کر اپنے سے دور بیٹھنے کا کہا اور دھمکی دی کہ اگر وہ لوگ مجھ سے یونہی چکر ہے تو میں خط پڑھوں گا ہی۔ بڑی مشکل سے دونوں بچپن کی تمام فرمیں دے کر مجھ سے دور ہوئے کہ میں خط نہیں پھاڑوں گا۔ اتنے میں خدا اور مُثُقی چائے بھی لے آئے تھے اور وہ سب چائے پیتے مجھے خط پڑھتے ہوئے یوں دیکھتے رہے جیسے ابھی کچھ دیر میں میں انہیں کسی لاڑکی کا نتیجہ بتانے والا ہوں۔ میں نے لزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ وہی وجوہی دل میں اتر جانے والی سُبک اور رواں تحریر تھی۔

”ناراض ہو....؟..... اب کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گے؟ کبھی اپنی وجوہی صورت بھی نہیں دیکھو گے؟ شاید میں تمہاری جگہ ہوتی تو بالکل ایسا ہی سوچتی..... لیکن یقین کرو آدی..... اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا..... میں یہ فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ کرتی اور شاید کچھ عرصہ مزید ابا اور اماں کی یاس بھری صورتیں، دل پر پھر رکھ کر برداشت کریں گے اس قدر جلد لینے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل میں ریحان صاحب کے لیے بے پناہ احترام اور عزت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، لیکن تم نے شاید یہی کہ کہا تھا کہ جلد یاد رکھنے ابا اور اماں کی خوشی کے لیے سر جھکانا ہی پڑتا، تو پھر اس شخص کے لیے ہی سبی جس کے لیے میرے دل میں احترام تو ہے..... اور جو مجھے کسی حوالے سے محترم تو سمجھتا ہے۔

مجھے تمہارے جذبے کی چھائی اور تمہارے خلوص پر شاید تم سے بھی زیادہ یقین ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا دوست اپنے وعدے نبھانا بھی خوب جانتا ہے۔ لیکن کچھ جذبے آگینوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں اور کسی نئے رشتے کا صرف نام ملنے پر بھی اپنی شناخت کھو کر ہمیشہ کے لیے کرچی کر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بھی ویسے ہی جذبے سے گندھا ہوا ہے آدی..... اسے کسی دوسرے رشتے کا نام دینے سے بھی یہ نازک سارشته، جس تاریخکبوت سے بندھا ہوا ہے..... وہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا، چاہے دوسرا کوئی اسے محسوس نہ بھی کر پائے..... لیکن خود ہمارے اندر اس کے ریزے ساری عمر اک خلش کی کاٹ اور چھین پیدا کرتے رہیں گے۔ اور مجھے یہ رشتہ بہت عزیز ہے آدی..... شاید دنیا کے ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز..... اس لیے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے اس جذبے اور اپنے اس رشتے کا گلائیں گھوٹ سکتی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا، لیکن ایک بات کا یقین اپنے دل سے کبھی منہنہ دینا کہ تمہاری تو اپنے آس پاس کھرے ان دنیاوی رشتؤں میں بٹ کر اپنے

اس ازی روحاںی رشتے سے کبھی غافل نہیں ہو گی، چاہے تم سامنے رہو، چاہے نظروں سے اوچل، تمہاری دخو ہمیشہ تمہارے بچپن کے دسمبر میں تمہارے ساتھ رہے گی۔

آدمی..... دنیا میں کچھ رشتے ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جنہیں بات یا ملاقات کی مجبوری نہیں ہوتی۔ وہ انسان کی ہر بات اور اُس کی ہر ملاقات میں ہمیشہ شامل رہتے ہیں..... مانتے ہونا کہ لفظ اور تصویر یہ سب کچھ نہیں ہوتے۔ جہاں یہ سب کچھ ختم ہوتا ہے وہاں سے تصور کا رشتہ شروع ہوتا ہے۔

تمہاری دخو نے صرف اسی رشتے کو بچانے کے لیے ایک اجنبی شخص کا ساتھ ساری عمر کے لیے قبول کیا ہے، تو بولو..... اپنی دخو کا ہمیشہ کی طرح مان رکھو گے نا..... میری بارات میں آؤ گے نا..... اور کان کھول کر سن لو..... اگر تم نہیں آئے تو میں بھی بھی بقول راجہ، اُس ”ریلوے باؤ“ کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گی۔ ”پا“..... اور آدمی جانتا ہے کہ دوچھب کی بات پر پا کہہ دے تو وہ بات پھر پتھر پر کیسرا ہو جاتی ہے۔

<http://kitaabgha.com>

..... تمہاری دخو

خط ختم ہونے تک اپنے آس پاس کا مجھے کچھ احساس نہیں رہتا۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو راجہ، بالا، بخواہمشی چاروں مجھے اپنے سامنے ایک قطار میں یوں بیٹھے کھائی دیئے کہ چاروں کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو رواں تھے، میں نے حیرت سے اُن سے پوچھا کہ وہ روکیوں رہے ہیں؟ راجنے مجھے سے کہا کہ مجھے روتا دیکھ کر ان کے آنسو بھی نہیں رُک پائے۔ لیکن میں کب رو رہتا ہے؟ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے بھیگا ہوا محسوس ہوا..... اور..... میں نے جلدی سے دخو کا خط دوبارہ کھول کر دیکھا تو پورے خط پر ہی تیکین پانی کے دھبے یوں پھیل چکے تھے کہ خط کی روشنائی اور حرف دھندلے پڑ گئے تھے۔ جانے میں کب سے اور کس سطر سے اپنی آنکھیں بھگوارہ ہاتھا۔ میں نے اسی وقت بالے کے کان پر اٹکا ہوا قلم کالا اور وہیں گیراج کے جھڑ میں سے ایک صفحہ پھاڑ کر جلدی میں اس کے اوپر چند سطریں گھیث ڈالیں۔

”شاید آپ کا نظریہ ہی صحیح ہو..... یا شاید میرے اندر ہی اتنی روشنی نہ ہو کہ میں نے رشتوں کے اندر ہیرے روشن کر سکوں۔ بہر حال مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، نہ ہی کبھی ہو گی..... آپ رخصت ہو جائیں اُس ریلوے باؤ کے ساتھ اور ہمیشہ خوش رہیں، لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ ہے نہ طرف..... کہ آپ کو ان کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔ لہذا اس معاملے میں میری مقدرت قبول کر لیں۔ کہیں میری کوئی حرکت آپ کے اس نئے رشتے میں کوئی دراز نہ ڈال دے.....

اور ہاں..... ہمیشہ کی طرح آج بھی میرا بھی دعویٰ ہے کہ آپ کی ناک زیادہ چھوٹی ہے اور سردی بھی آپ ہی کو ہمیشہ زیادہ لگتی ہے لہذا آپ بھی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

..... آدمی
صفحہ پھاڑ کر میں نے راجہ کے حوالے کیا کہ اسے آج ہی دکودے آئے۔ تیسرے دن میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں نے ففتر جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بے انتہا مصروفیت میرے درد کا کچھ درماں کر دے گی لیکن یہ بھی میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ ہمارے اندر کے کچھ

درو، ہر قسم کی مصروفیت، خوشی یا صدمے سے مادر ہوتے ہیں اور ان پر ہماری اندر وہی یا بیرونی کسی بھی قسم کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر مجھے تو اب سدا اسی درد کے ساتھ جینا تھا، تو پھر اس سے فرار کیسا؟

چھٹی ختم ہونے کے بعد دفتر میں میرا وہ دوسرا ہدی وہ تھا، جب چڑی اسی نے آکر بتایا کہ کوئی ملاقاتی ملتا چاہتا ہے، میں کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا اس لیے ملاقاتی کے کارڈ پر نظر ڈالے بغیر ہی میں نے سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کسر اٹھایا اور پھر انہیں دیکھ کر ہڑا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں ریحان صاحب کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں اندر آنے کا کہا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کارڈ کا لفافہ بھی تھا۔ شاید ان کی شادی کا ہی کارڈ ہو گا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حال احوال کے بعد میری بھٹھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں کیونکہ ریحان صاحب بھی ایک دم ہی خاموش سے ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہی سکوت توڑا اور ان سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے چونک کرپا جھکا ہوا سراخھایا جیسے کسی گہری سوچ سے واپس پلٹے ہوں۔

”معافی چاہتا ہوں..... کبھی بھی کچھ سوچیں اس بڑی طرح سر پر سوار ہو جاتی ہیں کہ جا بے جا آپ کو بھٹکا دیتی ہیں۔“ <http://kitaabghar.com>

میں نے چونک کر انہیں دیکھا، سب کچھ تو حاصل کر لیا ہے انہوں نے، پھر ایک جہاں پا کر بھی ابھی تک یہ کس سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ریحان صاحب نے میرے چہرے کے سوالیہ نشان کو محسوں کر لیا اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ میز پر کھکھ بولے۔

”یہ میری اور وجہہ کی شادی کا کارڈ ہے۔ بس یہی تمہیں دینے آیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک درخواست بھی کرنی تھی۔“ کارڈ کیچھ کر میرا دل کچھ یوں ڈوبا کر میں ان سے کچھ کہنا ہی بھول گیا۔

مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ سامنے میز پر پڑا کارڈ اٹھا کر پڑھ ہی لوں۔ مبارکباد کے رسی جملے بولنا تو بہت دور کی بات تھی۔ آخر کچھ دری بحد ریحان صاحب نے خود ہی سلسلہ تکلم جوڑا۔

”یہ ایک ایسا عجیب شادی کا کارڈ ہے، جس پر ہونے والی شادی کی تاریخ ابھی تک درج نہیں کی گئی..... اس لیے تاریخ کی جگہ بھی خالی

کتاب گھر کی پیشکش

بھجھے جھنکا سا لگا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ریحان صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”وجہہ نے پوری دنیا میں سے یا اختیار صرف تمہیں دیا ہے عباد..... تم جو تاریخ اس کارڈ میں بھرو گے..... اسی تاریخ کو ہماری شادی ہو گی..... اور اگر تم چاہو تو یہ جگہ ہمیشہ خالی بھی رہ سکتی ہے..... تمہارے تاریخ نہ بھرنے کی صورت میں یہ شادی بھی نہیں ہو گی..... تم چاہو تو اس کارڈ میں لکھنام کو کاٹ کر کوئی اور نام بھی لکھ سکتے ہو۔“

بھجھے یوں لگا کہ جیسے میرا سارا کمرہ ہی گھوم رہا ہو، ریحان صاحب یہ کیا کہہ رہے تھے، تو آخر میرا اتنا بڑا امتحان کیوں لینا چاہتی تھیں.....؟ کیسی آزمائش تھی.....؟

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں..... میں بھلا کیتے.....؟ میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں کے رشتے کی تاریخ مقرر کرنے کا بھلا مجھے کیا حق ہے؟“
کتاب گھر کی پیشکش
 ریحان صاحب دھیرے مے مکرائے۔

”حق دینے والے نے دے دیا ہے، کیونکہ میں نے اس سلسلے میں ہر اختیار و جیہہ کو دے رکھا تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہو گا۔
 ہاں یا نہ..... کچھ بھی..... لیکن انہوں نے اپنی ہاں کو تمہاری ہی ہاں سے مشروط کر دیا ہے۔ ایسا اختیار تو بہت قسمت واول کو ملتا ہے عباد یہ حق اور یہ اختیار تو وجہہ نے کبھی مجھے بھی نہیں دیا.....“

”لیکن میں خود کو اس اختیار کے قبل نہیں سمجھتا..... آپ جا کر تو سے کہہ دیں کہ.....“
کتاب گھر کی پیشکش
 لیکن میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی گئی۔

”صرف تم ہی اس پوری دنیا میں اس اختیار کے حق دار ہو عباد.....“ <http://kitaabghar.com>

”وجیہہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، تمہارے اور اس کے رشتے کے بارے میں تمہارے پروپوزل کے بارے میں اور تم دونوں کے بچپن سے بخوبے اس ماورائی تعلق کے بارے میں، جسے محسوس کرنے کے لیے اگلے انسان کے پاس بھی ویسا ہی دل ہونا چاہیے جیسا تم دونوں کے سینوں میں دھڑک رہا ہے، میں نے کبھی اس قدر اعلیٰ ظرف اور صاحب دل ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا، نہ ہی مجھے ایسے کسی احساس کی پرکھ کا فخر حاصل ہے۔
 لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جس رشتے کے لیے وجیہہ جیسی لڑکی اپنا ہر اختیار، ہر حق تیاگ دے، وہ ضرور سب سے خاص ہی ہو گا۔ ورنہ اس دنیا میں تمہاری دوستی کوں ہو گی جو چند دن بعد اپنے ہونے والے شوہر کو بیٹا کر خود اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ پہلے اس شخص سے جا کر نام اور تاریخ ڈالوالائے جس کا میرے ہر ہونے والے رشتے پر سب سے زیادہ حق ہے..... وہ شخص تو ضرور دنیا میں سب سے الگ، سب سے خاص ہی ہو گا..... اور مجھے خوشی ہے کہ میں چاہے کسی طور ہی سہی..... پر دنیا کے اس سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ مضبوط رشتے کا گواہ تو بنا.....
 اب چاہے وجیہہ سے میرا رشتہ ہو یا نہ ہو..... تم اس کا رذو پر کوئی تاریخ ڈالویا سے چاہا کر اپنی روزی کی نوکری میں پھینک دو..... لیکن مجھے تم دونوں کے اس احساس کے گواہ ہونے کا فخراب کوئی نہیں چھین سکتا، اور میری دعا ہیں تم دونوں کے ساتھ سدا کے لیے رہیں گی.....“

ریحان صاحب اپنی بات ختم کر کے جانے کے لیے انٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنی گرسی پر یونہی ساکت بیٹھا رہ گیا۔ ریحان صاحب دروازے کے پاس جا کر کچھ پل کے لیے رکے۔

”تم ایک خاص لڑکے ہو عباد..... بہت خاص..... اور مجھے خوشی ہو گی اگر ہم مستقبل میں بھی دوست رہیں..... کسی بھی رشتے کسی بھی حوالے سے۔“
کتاب گھر کی پیشکش
 ریحان صاحب دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے اپنا گھومتا ہوا سر میز پر لٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میری قسمت شاید آخری بار خود چل کر میرے در پر آخری دستک دینے کے لیے آئی تھی۔
<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

آخری الوداع

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

شام ڈھلتے ہی غیاث پچا کا گھر نگین بر قی مقاموں سے جملانے لگتا۔ محل کی چھوٹی بچیوں نے اپنی ڈاؤپی کی شادی کے لیے گھروں میں جو گھی کے نئے نئے سے سینکڑوں چراغ بنائے تھے۔ وہ انہیں گھر کی دیواروں اور چھت کی منڈیر پر سجا سجا کرتے تھے۔ میں رکھ رہی تھیں، شہنائی والا سر شام ہی آگیا تھا اور غفور پچا بہر شامیانے میں ہی کری ڈالے جانے کب سے اپنی اور غیاث پچا کی پسند کے فرمائشی گیت بجوار ہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بینڈ والوں کی کوئی بھی سرخ وردیاں زیب تن کئے اور سر پر بڑی بڑی سنہری گلزاریاں سجائے آن پھنسی۔ یہ شہر کا خاص بینڈ تھا، جسے غفور پچا کی خصوصی ہدایت پر دہاں بلا یا گیا تھا۔ صدقیقی صاحب ہانپتے کا نپتے آتش بازی کے سامان کے ٹوکرے اتروار ہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ محلے کے بچوں کو بھی ڈور بھگاتے جاتے، جو صدقیقی صاحب سے نظر پچا کر ایک آدھا انار پاپا خلے کر فوچکر ہو ہی جاتے۔ کچھ ہی فاصلے پر غفور پچا قورے، زردے اور پلاو کی دیگوں کی رکھواں اور حساب پر بیٹھے، باور جیوں کو آگ تیز یاد ہی کرنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ اتنے میں کرموتاگے پر دودھ اور روح افرا سکھجیں اور شربت کی یوں تلوں کے خندے کریت لے کر آن پنچا اور لگا ”ہو ہو“ کرنے شکورون بواندر اسٹانی خالہ کے ساتھ مل کر مہندی کے تحال بجوار ہی تھیں اور ان کی آواز بہر بڑے میدان تک آ رہی تھی۔

”ارے یہ لال اور ہری ٹھی پھر کم پڑ گئی اور یہ سنہری اور چاندی کی چمچم کے ڈبے کہاں رکھ دیئے ہیں اب مہندی سوکھنی تو پھر مجھ سے نہ کہنا ہاں اور یہ ٹگور ماری مہندی لایا کون تھا ؟ آدمی مٹی آدمی مہندی“

گردھاری محل کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ چھوہا رہوں اور میوے کے ٹوکروں کو بچوں کی نظر سے کہاں پچا کر رکھتے تاکہ نکاح سے پہلے کوئی بچا ان میں ”لقب“ نہ لگا سکے۔ وہاں ماشکی قطار میں رکھتے تقریباً تمام جامام بھرپچا تھا اور اب اسے صرف پیڑھے میکس کے ڈیوؤں کا انتظار تھا تاکہ وہ گرم پانی والے حماموں کے نیچے آگ روشن کر سکے۔ غرض ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا، سبھی کو اپنی پڑی ہوئی تھی، کسی کی سینڈل گم تھی تو کسی کی شیر و اونی کے بیٹن نہیں مل رہے تھے۔ کوئی ڈلہن کے جوڑے کے دوپتے کی تلاش میں تھاتا تو کسی کو دیگر میں ڈالی جانے والی اشیوں کی تھیلی نہیں مل رہی تھی۔ کوئی کیرے میں فلم ڈالانا بھول گیا تھا تو کسی کے پاس کیرے کی فلم تو تھی پر کیرہ ندارد۔ بارات پر پھولوں کی پیتاں نچھا اور کرنے والیاں پتیوں کی کمی کی شکایت کر رہی تھیں اور غیاث پچا ایک جانب کھڑے راجہ اور بالے کو ہدایات دے رہے تھے کہ بارات آتے ہی انہیں مردانے اور زنانے کے راستے کس طرح خدا کروانے ہیں۔ غرض سبھی کسی نہ کسی تیاری میں تھے لیکن جن گھر انہیں میں بارات میں اتری ہوں گی، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ تیاریاں کبھی مکمل نہیں ہو پائیں اور بارات آ جاتی ہے۔ اُس روز بھی یہی ہوا، بارات آگئی اور سبھی اپنی آدمی اور ادھوری تیاریوں سمیت ہی بارات

کے استقبال کو دوڑ پڑے، راجہ، بالا، مُشی اور نجف باراتیوں کا استقبال کر رہے تھے، گذرا اور پودو دھا اور شربت سے ان کی خاطر تو واضح کر رہے تھے، اور کیوں نہ کرتے..... آج ان کی زندگی کا سب سے خاص دن جو تھا۔ کچھ دیر بعد ہی شور مچا کر قاضی صاحب آگئے اور گردھاری مل نے اطمینان کی لبی سانس بھری کہ اس کی جان چھو بھاروں اور میوے کی حفاظت سے چھوٹی۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے مبارک سلامت کا سوراٹھا۔ اور نکاح ہونے کی خوشی میں باراتیوں پر چھو بھارے اور بیتا شے پہلے چھوادر کئے گئے اور پھر مغل کی خوبصورت تھیلیوں میں باٹنے لگئے۔ میرے اب غیاث چچا کے ساتھ کھڑے ان کے کان میں کچھ کہر ہے تھے، غیاث چچا مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ سینہ خالہ نے میری امی کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر مردانے میں پیغام دینے چل گئیں، کچھ ہی دیر میں مجھے غیاث چچا نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زنانے میں لے آئے۔ عروتوں نے مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے مُسکرا کر سرگوشیاں کیں اور وہ کے آس پاس بیٹھی سہیلیوں نے کھلکھلا کر میرے لیے ڈوکے ساتھ والی جگہ خالی کر دی۔ اور ہر کوئی بھانست بھانت کی بولی بولنے لگی اور مجھے چھیڑنے لگی۔ ڈو جانتی تھیں کہ ایسے موقعوں پر مجھے بہت گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے، اس لیے انہوں نے گھوٹکھ کے نیچے ہی سے سہیلیوں کو گھوکر آنکھیں دکھائیں اور انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ڈو گلابی کامداني شرارے میں دہن بنی بیٹھی تھیں اور آج اگر آسان سے فرشتے بھی اتر آتے تو ان کی نظر بھی و جو کے روپ پر نہ تھہر پاتی، میں تو پھر بھی ایک انسان تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اتنی بھیڑ کے درمیان بھی میری ڈو پر چکے سے نظر پڑیں جاتی اور گھوٹکھ تلتے سے جب کبھی ان کی نظر پلٹ کر میری طرف آ جاتی تو میں جلدی سے نظریں پچر لیتا تھا۔

پھر اچانک ہی شور اٹھا کہ ”ڈولہا کو لے آئے.....“ ڈولہا میاں آگئے۔ ”وہ دیکھوڑا ولہا آگیا“ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ریحان صاحب کو آن کی امی اور خاندان کی دیگر عورتیں دوپنے کے سامنے میں نکاح کے بعد ڈو کے ساتھ دھلانے کے لیے لے کر آ رہی تھیں۔ ڈو نے نظریں نیچر کر کر ہی مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا لیکن میں ڈو کے باہمیں سے ہٹ گیا اور ریحان صاحب کو ڈو کے دامیں بھادیا گیا۔ ہر جانب ایک شور سے چھا ہوا تھا۔ رسمیں پوری کی جا رہی تھیں۔ جو تا چھپائی، منہ دکھائی، دو دھپاٹی اور جانے کیا کیا۔

میں بھیڑ میں سے نکل کر باہر آ گیا اور کسی ایسے گوشے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، جہاں مجھے کوئی دیکھنہ سکے۔ اس دن ریحان صاحب میرے دفتر میں مجھے جس آزمائش میں ڈال گئے تھے اور وہاں نے مجھے جو حق دیا تھا اس کے تقاضے میں نے اسی شام پورے کر کے کارڈ شام ہی کو غیاث چچا کے ہاں بھجوادیا تھا۔ میں نے کارڈ پر تاریخ بھی وہی ڈالی تھی، جو مجھے پہلے ہی اپنے گھر والوں اور راجہ سے ڈو کی رخصتی کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔ میں شاید دنیا کی تاریخ میں سزاۓ موت کا وہ پہلا قیدی تھا، جس نے اپنی سوئی کی تاریخ خود مقرر کی تھی۔

کچھ ہی دیر میں شامیانوں اور قاتلوں میں مہمانوں کے لیے کھانا بھی لگادیا گیا اور کھانے کے بعد رخصتی کا وقت بھی سر پر آن پہنچا۔

سینہ خالہ جواب تک جانے کس طرح خود پر قابو پائے ہوئے تھیں، ڈو کے سر پر قرآن رکھ کر انہیں نیچے سے گزارتے وقت یوں پلک پلک کر رہیں کہ انہیں چپ کرتے کرتے محلے کی ہر آنکھ اٹھک بارہو گئی، بھی رور ہے تھے۔ ان سب کی وجہہ ایک بار پھر انہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ غفور چچا کی آنکھیں یوں بھیگیں کہ ان میں تو ڈو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ہٹانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ غیاث چچا دوسری جانب سے ڈو کو تھامے یوں چل رہے تھے کہ جیسے بھی خود بھی ریزہ ہو کر گر پڑیں گے۔ امی نے ڈور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سنجا لوں، پر مجھے کون

سن جاتا؟ میں دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجہ پتھر کا ہو چکا ہو۔ اپنے آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سہارا دیا اور میرے دنوں ہاتھ دنوں جانب سے راجہ اور بالے نے زور سے تھام لی۔ شاید انہوں نے دُور سے ہی میرے لرزتے اور کان پتے وجود کو مجھوں کر لیا تھا۔ محلہ کی عورتیں ایک ایک کر کے آگے بڑھتیں اور ڈوکی بلا کیں اپنے سر لے کر پیچھے ہٹ جاتیں، لیکن شکوران بوا آگے بڑھتیں تو پھر بہت دیر تک ہٹ نہ پائیں۔ انہوں نے ڈوکے ہاتھ تھام کر ان کی پشت اپنی آنکھوں سے لگائی تو پھر دیر تک ہڑک کر روتی رہیں۔ ڈوکو پہلے ہی سے ہلاک ہوئی جا رہی تھیں۔ یا خدا..... یا ایک لڑکی اتنے سینکڑوں لوگوں سے اندر ہی اندر کیسے رشتے بنائی تھی؟ یہ کیسا الوداع تھا، جوانجنوں کو بھی اپنے کے ساتھ مل کر رُلا رہا تھا؟..... عمارہ نے دوچار بار اچک اچک کر مجھے بھیڑ میں سے اشارے کیے کہ میں بھی آگے بڑھ کر ڈوک سے رخصت ہوں، لیکن میرے تو پاؤں ہی پتھر کے ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ سے مل بھی نہ سکا ڈوکور بیحان صاحب کی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں اور ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ریحان صاحب کو آگے ٹھادا دیا گیا تھا اور ڈوکور بیحان صاحب کی امی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ میں پتھر بنا دیں دُور کھڑا انہیں رخصت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ الوداع تھا جو میری زندگی پر سب سے بھاری تھا۔ میں نہیں جانتا کہ روح کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہو گئی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری روح کے دھاگے اُدھر رہے ہوں، اس کا ریشور یہ اگ ہو رہا ہو، کاش یہ میری زندگی کا آخری الوداع ہو..... کاش اس آخری الوداع کے ساتھ ہی میں بھی مٹ جاؤں کیونکہ اب مجھ میں مزید کوئی اور الوداع جھیلنے کی اک ذرا سی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس آخری الوداع نے مجھے ریت کا بنا کر کھدیا تھا۔ خشک ریت کا..... جسے ہلکی ہی ہوا کا جھونکا بھی ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن دُجہ دروازے کے پاس پہنچ کر رُک سی گئی تھیں۔ ان کی پُٹو تسلیم کی نظریں نہ جانے کے ملاش کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مطلوبہ ہستی مطلبے نہ پا کر گھوٹک کے نیچے سے ہی نظریں اٹھائیں۔ میری نظر تو انہی پر جھی ہوئی تھی۔ ہماری نظریں نکل رہیں اور میں پل بھر میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ ان کی بھیگی آنکھ سے ایک آنسو پُٹا اور تیر کی طرح میرے دل کی زمین میں پیوست ہو گیا۔ میرے دل سے اپنی عمر بھر کی دعاؤں کے بدے لے صرف ایک ہی دعا نکلی کہ ”یارب..... اس پھلوں جیسی لڑکی کی قربانی رایگاں نہ جانے دینا..... اب اس کے ہڑکھا خاتمه کر دے.....“ میں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا..... وہ دیے ہی اپنی جگہ جھی ہوئی کھڑی رہیں اور میری جانب دیکھتی رہیں۔ سب مجھے دُور سے اشارہ کر کے اور آوازیں دے کر ڈوک کے قریب آنے کا کہر ہے تھے، راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”آدمی وہ تیری وجہ سے رُکی ہوئی ہیں۔“

ڈوکی نظراب بھی بھی پگڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی انگلی سے اپنی ٹاک دبائی، جیسے بچپن میں وہ دبائی تھیں، اور اپنی آنکھیں زور سے بچ کر کھول دیں۔ آنسوؤں کا ایک ریلہ ڈوکی آنکھوں سے تمام بند توڑ کر لکلا اور اس کے بعد وہ مزید نہ رُک پا میں۔ عورتوں نے گھیر گھار کر انہیں گاڑی میں بٹھادیا۔ سارے محلے کے ہاتھ لہراتے رہ گئے اور گاڑی دھیرے دھیرے چل پڑی۔ غیاث پچا سمیت پندرہ محلے دار بھی بے اختیاری میں گاڑی کے ساتھ ہی چل پڑے۔ گاڑی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی محلے کے چھانک تک پہنچ گئی۔ لوگ پیچھے رہ چکے تھے، میری بھتی آنکھیں اب بھی گاڑی پر ہی جھی ہوئی تھیں۔ گاڑی نے محلے سے باہر جانے والی سڑک پر اترنے کے لیے ایک لباس موڑ کا تا۔ پچھلے دروازے کی کھڑکی سے اندر بیٹھی ڈوکی اک

آخری جھلک دکھائی دی۔ مجھے اتنی دوسرے بھی یوں محسوس ہوا کہ ان کی نظریں اب بھی میری ہی جانب اٹھی ہوئی ہوں، انہوں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر اپنے محلے، اپنے میکے اور مجھے اللداع کہا اور گاڑی تیزی سے اندر ہیرے میں عاسیب ہوتی چلی گئی۔

کتاب گھر کی پیشکش

رخصت ہوا تو ہاتھ ملا کر نہیں گیا

<http://kitaabghar.com>

یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی لوٹ آئے گا

جاتے ہوئے چراغ بجا کر نہیں گیا

شاید وہ مل ہی جائے..... مگر صحتو ہے شرط

وہ اپنے نقش پا کو منا کر نہیں گیا

<http://kitaabghar.com>

ہر بار مجھ کو چھوڑ گیا اضطراب میں

لوٹے گا کب؟ کبھی وہ بتا کر نہیں گیا

ربنے دیا نہ اُس نے کسی کام کا مجھے

کتاب گھر کی پیشکش

بامشم نہیں

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

1947ء کے مظالم کی کہانی

کتاب گھر کی پیشکش

خود مظلوموں کی زبانی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ایسے خون آشام قلب و جگر کو تراپادینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر نم ہوجاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ نہادیا اور اس مملکت سے لوٹ کر پیار کیا۔

تو پھر یہی صدابند ہوتی ہے کہ..... کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش..... نوجوان نسل کی آنکھیں کے لیے کہ یہ طعن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

اس کتاب کو کتاب گھر کے تاریخ پاکستان سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ادارہ علم و عرفان پبلیشورز کی دیگر کتب

-34- اردو بازار لاہور (فون 042-7352332-7232336)

کتب کی خریداری کے وقت کتاب گھر کا حوالہ دیجئے اور خصوصی ڈسکاؤنٹ حاصل بیجئے۔

اسلامی کتب

تفصیر ابن کثیر (اعلیٰ)		اسلامی کتب	
1		علام مجدد الدین ابن ابی کثیر	2200/-
2		علام مجدد الدین ابن ابی کثیر	1800/-
3	قرآنی موضوعات	محمد شریف بقاء	600/-
4	Quranic Topics (Vol:1)	محمد شریف بقاء	600/-
5	Quranic Topics (Vol:2)	محمد شریف بقاء	600/-
6	قرآن کی 20 سورتیں	محمد شریف بقاء	70/-
7	قرآن کی 2 طیم سورتیں	محمد شریف بقاء	70/-
8	قرآن اور ہماری زندگی	مولانا الیاس قادری	300/-
9	قرآن، پائل اور سائنس	موریس بوکا کے/ مترجم: مسعود مقتنی	250/-
10	قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	160/-
11	منہاج القرآن	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	150/-
12	بیاتات القرآن	ڈاکٹر اقتدار احمد فاروقی	80/-
13	ہدایات قرآنی	مترجم: مولانا فتح محمد جاندھری	100/-
14	کعبہ پر پڑی جو پہلی نظر	پروفیسر محمد جاوید	300/-
15	قرآن حکیم اور دنکھات کے آئینے میں	مرتب: پروفیسر محمد جاوید اقبال	150/-
16	ربنا (قرآن میں نذکور اہمیاء کرام کی دعائیں)	خواجہ انصاف اقبال	60/-
17	قرآنی دعاوں کا انسائیکلو پیڈیا	محمد شریف بقاء	120/-
18	قرآنی مجرمات کا انسائیکلو پیڈیا	محمد شریف بقاء	120/-
19	سیرت البی اعلان نبوت سے پہلے	مسعود مقتنی، منصور احمد بخش	400/-
20	بخاری شریف	ترجمہ و تشریح: مولانا ظہور الباری عظیمی	1660/-
21	حیات محمد ﷺ	مترجم: ابو الحسن الجامی امام خان اوشہروی	500/-
22	سیرت البی	شیخ نمانی	850/-

600/-	مسومنتی	مجرات محمد کامل انسلکلوبیڈیا	23
500/-	قیصرہ حیات	انوار اسماء الحسنی	24
400/-	گوہر ملیانی	سمیرت ہادی برحق	25
300/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	حضرت محمد بن علی بن ابی طالب رضا مہر معاشریات	26
300/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	طیب اعلقم	27
500/-	چوہدری غلام رسول چیسہ	سیرت سیدالبشر صلی اللہ علیہ وسلم	28
550/-	چوہدری غلام رسول چیسہ	نماہب عالم کا نقائی مطالعہ	29
300/-	چوہدری غلام رسول چیسہ	اسلام کا عمرانی نظام	30
300/-	چوہدری غلام رسول چیسہ	اسلام کا سیاسی نظام	31
300/-	چوہدری غلام رسول چیسہ	اسلامی کامعائی نظام	32
150/-	اور صدقی	اسلامی ریاست کے خدوخال	33
100/-	کرٹل سید سیمان سرو گیلانی	عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	34
150/-	کرٹل سید سیمان سرو گیلانی	آخرت کا خزانہ	35
250/-		طب نبوی اور اکیسویں صدی (جلد اول)	36
250/-		طب نبوی اور اکیسویں صدی (جلد دوم)	37
100/-	احادیث میں مذکورہ نبیتات، ادوبیا اور فضائل	ڈاکٹر اقتدار احمد فاروقی	38
300/-	مولانا محمد یوسف کاندھلوی	منتخب احادیث	39
250/-	حضرت مولانا تاز کریما صاحب	شانک ترمذی	40
300/-	خواجہ محمد امین بھیروی	درود لا محدود (حضور مولانا جناب کی شان میں پیش کئے گئے درود وسلام کا انسلکلوبیڈیا)	41
130/-	منظرووارثی	لاشریک (حدیقہ کلام)	42
150/-	منظرووارثی	صاحب الائج (یا نعمتیہ مجموعہ)	43
130/-	سلیمان گیلانی	سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم (یا نعمتیہ مجموعہ)	44
150/-	میٹھا میٹھا ہے میرے محمد بن علی بن ابی اکنام (نقیۃ القاب)	عمران چوہدری	45
100/-	عبد الرزاق	صل علی کہتے کہتے	46
120/-	فرحت عباس شاہ	تاجدار حرم صلی اللہ علیہ وسلم (نقیۃ مجموعہ)	47
150/-	فرجان قادری	میرے آقا آئے جیموں	48
150/-	اویس رضا قادری	سینگنڈ کے سائے تلے	49
100/-	اویس رضا قادری	سینگنڈ کے سائے تلے (پیپر بک)	50
200/-	محمد اسلم لووہی	خلائق کائنات	51

120/-	محمد اسلم لوہی	کارگل سے واپسی کیوں	52
100/-	ساجد الرحمن اکمل	رویف پنجابی صدیق اکبر	53
250/-	محمد حسین بیکل	حضرت ابوکبر صدیق اکبر	54
330/-	محمد حسین بیکل	حضرت عمر قاروق عظیم	55
300/-	مترجم: ابویحییٰ امام خان نوشہروی	فقیر غیر	56
150/-	ابویحییٰ امام خان نوشہروی	حضرت عمرؑ کے سیاسی نظریے	57
75/-	ابویحییٰ امام خان نوشہروی	زندگی کے نونے	58
70/-	ابویحییٰ امام خان نوشہروی	مکالمات نبوی مطہر	59
200/-	علام شیخ نعیانی	القاروی (حضرت عمر قاروقؑ کی سوانح حیات)	60
150/-	سلیمان گیلانی	تہذیب اسلام	61
300/-	سلیمان گیلانی	حضرت بلال رضی اللہ عنہ	62
200/-	سید سلمان ندوی	سیرت عائشہؓ	63
300/-		خطبات ذاکرنا تیک	64
150/-	خولہ متن	غازی علم الدین شہید	65
400/-	عبد الرشید عراقی	عشرہ مشہرہ	66
100/-	مولانا عبدالرحمن	زیر دستوں کی آقا	67
350/-	ہیر لذیم	صلاح الدین ایوبی	68
250/-	متضود	سکندر عظیم	69
180/-	متضود	چنگیز خان	70
250/-	متضود	ہتل	71
120/-	علی تو اڑاہ	دہشت زده گرو (نالوں)	72
120/-	علی تو اڑاہ	فیصل (نالوں)	73
150/-	(علی تو اڑاہ)	کاکک (نالوں)	74
120/-	شیم علی خان	محباداً سلام پھپ سلطان	75
80/-	قیصر علی آغا	احمر شاہ ابدالی	76
250/-	فضل حسین اعوان	حسن پاکستان تاکرده گناہوں کا قیدی	77
300/-	عمران چہدرا	حسن پاکستان۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان	78
150/-	گورڈن کوریر امتر جم: قاضی اختر جوہا گرمی	ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال	79
250/-	فضل حسین اعوان	عزم کے کوہ گراس	80
150/-	روپیش ناز	پیپلز بوناپارت	81

300/-	امیر علی خان	اکبر بادشاہ اور بیوی مل کی داستانیں	82
300	امیر علی خان	اکبر بادشاہ کے ۹ رتن	83
200/-	مسعود مقتنی	اکبر نامہ	84
200/-	ڈاکٹر محمد اقبال بحثہ	ہنچاب کے آثار قدیمہ	85
2500/-	ڈاکٹر محمد اقبال بحثہ	لاہور اور خطاطی (5 گل آرٹ پیپر)	86
300/-	سید ارشیع علی کرمانی	جوہنے نیوں کا انعام	87
150/-	عمران چوہدری	20 صدی کی 100 اہم مسلم شخصیات	88
250/-	ابوطی عبدالوکیل	اسلام، سائنس اور مسلمان	89
100/-	ابو عبد الوکیل	داستان سرائے کامسافر (اشفاق احمد)	90
250/-	تمیر ہاشمی / اعلم انصاری	100 عہد ساز شخصیات	91
60/-	ڈاکٹر بربان احمد قاروقی	حضرت محمد والد فہرست توحید	92
120/-	اختر جازی	مولانا مودودی سے مولانا نعیانی کے اختلافات کا علمی جائزہ	93
100/-	عبدالرشید عراقی	برصیر پاک و ہند میں علماء بالحدیث کے علمی کارناتے	94
220/-	موئی خان جلال زئی	مولانا راوی کاظمیہ عشق	95
100/-	موئی خان جلال زئی	فلسفہ روح انسانی	96
400/-	ڈاکرنا یونگ (متربم سید امیاز احمد)	خطبات ڈاکٹر ڈاکرنا یونگ	97
150/-	حافظ محمد سعیدی	نحویوں کی کارستانیاں	98
280/-	حضرت علی ہجوری مجتہد	کشف الحجب	99
36/-	(حکیم سید امین الدین بلوی)	تذکرہ حضرت علی ہجوری رحمۃ اللہ علیہ	100
150/-	خالد پروین ملک	ہنچاب کے عظیم صوفی شعراء	101
200/-	خالد پروین ملک	ہنچاب اور اہل ہنچاب	102
180/-	خالد پروین ملک	ذکروارث شاہ	103
100/-	خالد پروین ملک	حیات و تعلیمات اور کلام باہو گلبلہ	104
100/-	خالد پروین ملک	حیات و تعلیمات اور کلام فرید گلبلہ	105
100/-	خالد پروین ملک	حیات و تعلیمات اور کلام وارث شاہ گلبلہ	106
100/-	خالد پروین ملک	حیات و تعلیمات اور کلام بخش شاہ گلبلہ	107
100/-	خالد پروین ملک	حیات و تعلیمات اور کلام محمد بخش گلبلہ	108
80/-	علام محمد جاوید	حقیقت تصوف اور حضرت بعلی قلندر	109
120/-	پروفیسر اولیس طفیل عبد اللہ	روحانیت کے تآجدار	110
120/-	احم مصطفیٰ صدیقی	شان اولیاء	111

200/-	حکیم لیاقت علی سہروردی	اڑھائی قلندر	112
160/-	حکیم لیاقت علی سہروردی	درویش	113
160/-	عبدالرب درویش	الشکی نیک پیام	114
280/-	شیخ مجید	حسین شمسور حلاج حیات و کلام	115
120/-	مسعود مفتی	حضرت رابعہ بصری	116
150/-	قلب حسین و زاج	آثار زندگی	117
200/-	قلب حسین و زاج	ریزہ کفر	118
200/-	قلب حسین و زاج	افکار صفات	119
250/-	قلب حسین و زاج	زندہ بھول کا احساس	120
350/-	قلب حسین و زاج	انسان اور حقیقت	121
300/-	قلب حسین و زاج	ضیر شب کاسف	122
300/-	میاں عبدالحید	نویسنچے	123
250/-	السید عبداللہ بن حفص علوان	تربیت اولاد کا اسلامی نظام	124
250/-	مولانا محمد عاشق الہی بلند شہری	تحنخ خواتین (علی)	125
120/-		نایاب ذخیرہ	126
550/-	شاہ مصین الدین ندوی	تاریخ اسلام (2 جلد مکمل سیٹ)	127
600/-	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	تاریخ اسلام (3 جلد مکمل سیٹ)	128
380/-	مولانا اشرف علی تھانوی	بہشتی زیور (محل)	129
300/-	حامد عقار مدح پوری	تاریخ انگل	130
150/-	محمد حیات خان	تاریخ ایران قدیم	131
500/-	محمد حیات خان	تاریخ امت اسلامیہ	132
250/-	مولانا محمد زکریا	فہائل اعمال	133
280/-	غذیبۃ الطالبین (حضرت شیخ عبد القادر جیلانی)	ترجمہ علماء ظہیر الدین بدالوی	134
250/-	علامہ ابن سیریس	تعجب الرؤیا	135
180/-	متاز مفتی	لبیک	136
45/-	اتیاز علوی	حج و عمرہ پاکٹ	137
126/-	جیل احمد عدیل (سفرنامہ عمرہ)	سرزمین آسمان میں چند روز	138
200/-	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	رواداری اور مغرب؟	139
200/-	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	رواداری اور پاکستان	140
200/-	مولانا حضرت عبدالکریم پاکیم	قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں	141

400/-	کے۔ ایم۔ عظیم	پاکستان کی اسلامی اساس اور جدید تقاضے	142
250/-	محمد اسلم لوڈھی	قوی ہیروز (حصہ اول)	143
250/-	محمد اسلم لوڈھی	قوی ہیروز (حصہ دوم)	144
300/-	محمد اسلم لوڈھی	افوج پاکستان	145
200/-	محمد اسلم لوڈھی	رشیت محبتوں کے	146
150/-	محمد اسلم لوڈھی	وطن کے پاسان	147
200/-	پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ اے صوفی	محترمہ مقاطعہ جتناج حیات و افکار	148
15/-	پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ اے صوفی	محترمہ مقاطعہ جتناج حیات و افکار (کارڈ)	149
150/-	مظہر علی لاشاری	بلوچ تاریخ کے آئینے میں	150
300/-	مولانا اللہ و سایا	پارلیمنٹ میں قادیانی گھست	151
100/-	مہرناگاری مصطفوی	نگاہ عشق دل زندہ	152
60/-	نور محمد قریشی ایڈوکیٹ	نزوں میں آ خر کیوں؟	153
60/-	مولانا تامقی کنایت اللہ	تحلیم الاسلام	154
24/-	مولانا محمد عمر پالنگوری	کامیابی کیا ہے؟	155
100/-	سید مسعود الرحمن شاہ	مجموعہ علم و حکمت	156
250/-	علام محمد مودودی	تحفہ الروس	157
250/-	مولانا حافظ محمد اسلم زاہد	تحفہ برائے ولہن	158
80/-	S-Hamgah Saleem Gilan	A Pound of Flesh	159
180/-	فورکلر آرٹ ہبھیر	اسائے الجھی و اسائے نبی (بڑی)	160
60/-	فورکلر آرٹ ہبھیر	اسائے النبی صلی اللہ علیہ وسلم	161
60/-	فورکلر آرٹ ہبھیر	اسائے الجھی و اسائے نبی (اکٹھی)	162
100/-	پروفیسر انور دل	کامیاب زندگی کا تصویر	163
150/-	مرجبہ: سید اقبال علی تاج	گھر بیو آزمودہ شخوں کا انسائیکلو پیڈیا	164
120/-	مولانا سعید الرحمن علوی	اسلامی حکومت کا فلاحی تصویر	165
80/-	مولانا غلام غوث ہزاروی	فیض غوث (مجموعہ افادات مولانا ہزاروی)	166
150/-	پروفیسر مولانا ہارون الرشید	انوار خطابت	167
150/-	حافظ مظفر حسن	سفر جو عمرہ من اہم فتاویٰ	168
24/-	مولانا محمد عاشق الہی صاحب	مسلمان خواتین کے بیس سبق	169
120/-	حضرت مولانا ابراہیم صاحب یاں پوری	تحفہ الشکار	160
20/-	ڈاکٹر اقبال احمد شاہ	آداب مبارشت	161

20/-	مفتی حبیب الرحمن مراد آپاوی	سجدہ سہو کے مسائل	162
100/-	مولانا محمد مختار نعمنی	خطبات بھتی	163
250/-	مولانا محمد نسین ہاشمی	روشنی	164
70/-	افتخار فریدی	مشاهیر اسلام کی صحیح (وصایا)	165
200/-	مولانا سعید الرحمن اکبر آبادی	اسلام میں غلائی کی حقیقت	166
250/-	میاں محمد شفیق	1857ء پہلی بیان آزادی	167
250/-	ڈی۔ ایچ۔ داؤن / پروفیسر افتخار احمد	ہزارہ گزٹیں	168
250/-	ڈاکٹر شیر بہادر خان پتی	تاریخ ہزارہ	169
250/-	مولانا محمد وارث الرحمن ندوی	دولت غزویہ	170
120/-	مولانا ابوالفضل فتح الرحمن قادری	نبی کریم ﷺ کی مبارک سنتیں	171
120/-	حکیم غلام محمود خاں	بہار شباب	172
150/-	صریح جوہر	قرب الہی (عبادات کی روشنی میں)	173
200/-	منصف خان حاکب	وادی کاغان	174
80/-	محمد پرویش شاہین	مشرق کا سوئزر لینڈ وادی سوات	175
80/-	محمد پرویش شاہین	کافرستان کے رسم و رواج	176
80/-	محمد پرویش شاہین	سوات کوہستان	177
100/-	محمد پرویش شاہین	دی..... کوہستان	178
100/-	محمد پرویش شاہین	وادی چترال	179
200/-		ہماری حقیقت (سائنس انسان اور کائنات)	180
300/-	محمد شفیق بلوچ	شیخ اکبر۔ عجی الدین ابن عربی	181
130/-	آسیا آرزو	پریشیں بیٹھنے	182
120/-	مولانا محمد زکریا مکتبہ	فہائل درود شریف	183
150/-	مولانا محمد جمل خاں	آداب الدعا	184
150/-	مولانا سعید الرحمن علوی	اسلامی حکومت کا قلائی تصور	185
80/-	مولانا محمد زکریا مکتبہ	فہائل رمضان	186
350/-	میاں محمد بخش / محمد قلیل ثاقب	آنینہ سلوک (یعنی شرح سیف الملوك)	187
500/-	خوش محمد عاصی	مجموعہ مسائل علم شریعت و علم تصوف	188
150/-	رسوان یوسف	قلم خدا کے لئے (ایک بھیا کم سازش)	189

مولانا محمد حنفی ندوی مفتاح کتب

200/-	☆ عقلیات ابن تیمیہ	480/-	☆ لسان القرآن (3 جلد)
150/-	☆ پھرہ نبوت قرآن کے آئینے میں	180/-	☆ مطالعہ قرآن
400/-	☆ مسلمانوں کے عقائد و افکار (مکمل سیٹ)	200/-	☆ مطالعہ حدیث
300/-	☆ تعلیمات غزالی	200/-	☆ افکار ابن خلدون
100/-	☆ سرگزشت غزالی	250/-	☆ افکار غزالی
140/-	☆ تہات افلاسفہ	200/-	☆ مسئلہ انتہاد

حکیم محمد طارق محمود چغتائی کی شہرہ آفاق کتب

150/-	☆ مشاہیر کی آپ بیتیاں	250/-	☆ 1947ء کے مظالم خود قلعہ موسوی کی زبانی
120/-	☆ پرکون زندگی کی حلش نبوی طریقے اور جدید سائنس	120/-	☆ جذبات اور خیالات کے روگ نبوی طریقے اور طریقے اور جدید سائنس
150/-	☆ نوجوانوں کی جنی ابھینیں علاج نبوی اور جدید سائنس	120/-	☆ پرکش زندگی گزارنے کے گر علاج نبوی اور جدید سائنس
800/-	☆ معالجات نبوی اور جدید سائنس (جلد اول تا چہارم)	120/-	☆ قدرتی تاک اور علاج نبوی
200/-	☆ جادو جنات، اسلام اور جدید سائنس	140/-	☆ کینسر کوکاست
80/-	☆ آسان شکیل کے حیرت انگیز فضائل (انگلش)	200/-	☆ شوگر کا سائنس اور روحانی علاج
120/-	☆ غافتہ باتیں، بکھرے صوبے، خمول یا دیس	120/-	☆ مہلک عادات نبوی طریقے اور جدید سائنس
90/-	☆ صحت مند عادات نبوی طریقے اور جدید سائنس	90/-	☆ مہلک تذاکر میں نبوی خدا کیں اور جدید سائنس
80/-	☆ مہلک دوا کیں نبوی دوا کیں اور جدید سائنس	90/-	☆ ہائی بلڈ پریشر کا سائنسی اور روحانی علاج
70/-	☆ جنید جشید گوکاری سے پرہیز گاری تاک	150/-	☆ نوجوانوں کے جنی سائل علاج نبوی اور جدید سائنس
120/-	☆ پرترن خصلتوں کا بہترین علاج	150/-	☆ شاداب زندگی کے راز
80/-	☆ شوگر کا کامیاب علاج	200/-	☆ امراض معدہ علاج نبوی اور جدید سائنس
120/-	☆ کوئی شروع کا سائنسی اور روحانی علاج	200/-	☆ روحانی پا کیزگی
120/-	☆ موڑا پے سے نجات علاج نبوی اور جدید سائنس	120/-	☆ گھر بیٹا جھنوں کا روحانی علاج
120/-	☆ کمالات اولیاء	120/-	☆ پرترن خصلتوں کا بہترین علاج
200/-	☆ خواتین کے حسن و جمال کے چیزی راز	150/-	☆ روحانی عامل کی خیزیدا ارزی
120/-	☆ شاداب زندگی کے راز	120/-	☆ آداب معرفت
		120/-	☆ ہارت انجک سے بچاؤ کی سائنسی اور روحانی ترکیب

محمد متنیں خالد کی ایمان افروز کتب

	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے (انکش)	250/-	☆ احمدی دوستو تھیں اسلام بلاتا ہے۔
250/-	☆ شہیدان ناموس رسالت ﷺ	180/-	☆ مراجیبِ ﷺ تر ہے (نقیۃ انتساب)
180/-	☆ جب حضور ﷺ آئے	150/-	☆ معرفت اسم محمد ﷺ
200/-	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے	400/-	☆ ثبوت حاضر ہیں؟
200/-	☆ قادیانیت سے اسلام تک	250/-	☆ اسلام کا سخیر (قائد اعظم محمد علی جناح ﷺ)
200/-	☆ مولانا وحید الدین خاں اسلام دشمن شخصیت	400/-	☆ علام اقبال انتقاداتیانیت
180/-	☆ قادیانیت اس بازار میں	200/-	☆ غازی عامر چیس (مکمل)

مسعود مفتی کی بصیرت افروز کتب

500/-	☆ غزوۃ الٹبی ﷺ	350/-	☆ خواتین کا مکمل اسلامی انسائیکلو پیڈیا
100/-	☆ غزوہ خندق	100/-	☆ صلح مدینیت
100/-	☆ غزوہ أحد	100/-	☆ غزوہ موت
150/-	☆ فتح کے	100/-	☆ جنگ بدر
60/-	☆ سورہ طہ سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	150/-	☆ ملٹی پیش کرنیوں کی اسلام دینی
60/-	☆ سورہ آل عمران سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورہ بقرہ سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج
150/-	☆ ہمارے بچوں کے پیارے نام	60/-	☆ سورہ قاف سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج
250/-	☆ زندگانی اقوال	300/-	☆ سیرت نبی کا انسائیکلو پیڈیا (سوال جوابی)
500/-	☆ دینی کے تمام ممالک کا انسائیکلو پیڈیا	120/-	☆ برجوں پر مکمل کتاب
60/-	☆ یہودی مجتہد کیوں کرے ا	240/-	☆ اسلامی ناموں کی ڈکشنری
150/-	☆ تاریخ کی کرپٹ ترین عورتیں	75/-	☆ صلحی علی کیتے کہتے (نقیۃ محمد)
250/-	☆ برجوں کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	150/-	☆ اسلامی ناموں کا مکمل دستہ
		100/-	☆ اسلامی ناموں کا انسائیکلو پیڈیا

روحانی کتب سید علی حسین شاہ

250/-	☆ مفہوم احتمالات و تقویمات	240/-	☆ بچوں اور بڑوں کے برکت والے نام
200/-	☆ جادو کا آسان اور شرطی علاج (حصہ اول)	200/-	☆ جادو کا آسان اور شرطی علاج (حصہ دوم)
75/-	☆ سورۃ الکافرون سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورۃ تیمین سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج
60/-	☆ سورۃ اخلاص سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ شرائط چلنے
60/-	☆ سورۃ الفلق سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ بسم اللہ سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج
80/-	☆ سورۃ الناس سے دینی و دینیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورۃ تیمین آرٹ ہیپر (مجلد)

روحانی کتب علماء محمد جاوید

80/-	حقیقت تصوف اور حضرت ابوعلی فندر <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	جنات آسیب جادو کا تجز	☆
60/-	سورہ حم اسجدہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ فاتحہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ مریم سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ الکورہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ حمزہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	آیت الکرسی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ جن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	اسماے الحسن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆
60/-	سورہ یوسف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆

روحانی کتب خواجہ انبیاء اقبال

300/-	خواجہ انبیاء اقبال	دروولا محدود	-1
60/-	خواجہ انبیاء اقبال	ربنا (قرآن میں مذکور انبیاء کرام کی دعائیں)	-2
60/-	خواجہ انبیاء اقبال	دل کے مجرے میں	-3
50/-	خواجہ انبیاء اقبال	فقیری کی دنیا	-4
60/-	خواجہ انبیاء اقبال	فقیری کی حاضری	-5
60/-	خواجہ انبیاء اقبال	دعائے سیفی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-6
60/-	خواجہ انبیاء اقبال	اللہ اللہ کرتے رہے	-7
120/-	خواجہ انبیاء اقبال	استخارہ اور پر نظری کا علاج	-8

طبی و روحانی کتب

250/-	صوفی محمد ندیم	روحانی تھوییات کی ڈائری	-1
70/-	امام احمد رضا خاں بریلوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	چیخ سورہ و تلیفہ مفتی	-2
50/-	امام احمد رضا خاں بریلوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	قرآنی دعاؤں سے روحانی علاج	-3
8/-	سورہ سیمین (معرا) بڑی چھوٹی	10/- سورہ سیمین (معرا) بڑی	-4
120/-	طیم اقبال	جو اہرات ستارے اور سی علاج	-5
80/-	ڈاکٹر آر۔ اے امتیاز	ہومیو میڈیسن اور سخت	-6
80/-	ڈاکٹر آر۔ اے امتیاز	امراض اور ہومیو ادویات	-7
250/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	طبیب عظیم	-8
40/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	بلڈ پریشر	-9
36/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	شور کا علاج خود کریں	-10

40/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	لشکر کا معلمان خود کریں	-11
50/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	بہمنائیں میں آپ تھائیں	-12
100/-	ہومیڈا اکٹر محمد اشرف قریشی	تو جوانوں کے پڑی و نفیتی مسائل (علانج مرداہ)	-13
100/-	عابد خال	اپنے پرائز بانٹ خود کا لیں	-14
300/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	دوا غذا اور شفا	-15
250/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	زلزلہ زیارت اور زندگی	16
300/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	میرج گائیڈ	17
200/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	نسوانی حسن	18
150/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	آزادی نسوان روزاں نسوان	19
300/-	الخاچ مسعود احمد خان ذرا فی	خطرناک بیماریوں کا قدرتی علاج	20
300/-	الخاچ مسعود احمد خان ذرا فی	قدرتی تداویں کا انسائیکلو پیڈیا	21
200/-	اے صدم مسافر	ماورائی علم کا خاصہ اور عمل	22
120/-	اے صدم مسافر	ڈپریشن کا جدید طریقہ علاج (یوگا مراقبہ)	23
100/-	اے صدم مسافر	سماء ہیلینگ انرجی	24
120/-	اے صدم مسافر	ویل سائز	25
170/-	حکیم کبیر الدین	مخزن المفردات	26

اقبالیات پر بہترین کتب

40/-	☆ کامیابی کے سات اصول (مکار اسلام علام اقبال کی تحقیقات کی روشنی میں) حسن رازی	
150/-	☆ اسلامی فکر کی نئی تکھیل (خطبات اقبال) مترجم: شہزاد احمد	
150/-	(علام اقبال کے 7 مشہور و معروف خطبات)	The Reconstruction of Religious thought In Islam
300/-	☆ اقبال کا نور بصیرت ازعلام اقبال۔ شرح: محمد شریف بقاء (اقبال کی تین طویل تلیفیں سچد قربہ، ایمیس کی مجلس شوریٰ، یونیورسٹی)	
300/-	☆ کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ) 700/-	☆ کلیات اقبال (کائن)
150/-	☆ بائگ درا 200/-	☆ کلیات اقبال (پاک)
120/-	☆ بال جریل 120/-	☆ ضرب کلیم
180/-	☆ ٹکوہ جواب ٹکوہ (فرہنگ اور شرح کے ساتھ) ازعلام اقبال۔ شرح: محمد شریف بقاء	☆ ٹکوہ جواب ٹکوہ
200/-	☆ کلیات اقبال (عوامی ایڈیشن)	☆ ٹکوہ جواب ٹکوہ
40/-	☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ اول)	☆ ذکر حسین اور اقبال (محمد شریف بقاء)
40/-	☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ دوم)	☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ دوم) از: حسن رازی

نشر، شاعری، افسانہ

150/-	علویہ قیصل	گلاب سے ہونٹ (آرٹ پیپر + فورکلر)	-1
150/-	علویہ قیصل	دل جسے اپنا کہتا ہے	-2
150/-	علویہ قیصل	کا جل تیری آنکھوں کا	-3
150/-	علویہ قیصل	پیار کا پہلا سال (فورکلر)	-4
150/-	علویہ قیصل	خوشبو داس کرتی ہے	-5
140/-	علویہ قیصل	ہونٹ غزل کے دمترے	6
250/-	وصی شاہ	میرے ہو کر رہو	7
300/-	وصی شاہ	میرے ہو کر رہو (اعلیٰ)	8
150/-	حاشیہ	چاہتوں کی بارش	9
150/-	غالدین حامد	اہمی یہ خواب مت دیکھو (شعری مجموعہ)	10
150/-	حاشیہ	رنگ حنا (شعری مجموعہ)	11
150/-	غالدہ رشید	نق رہا ایسا ہو جائے	12
130/-	ضیاء اللہ قریشی	پہلی سماں محبت کی	13
250/-	ناصر و بلوی	شرح دیوان غالب	14
200/-	مرزا اسداللہ خاں غالب	دیوان غالب	15
100/-	مرزا اسداللہ خاں غالب	دیوان غالب (پاکٹ)	16
250/-	ساغر صدیقی	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	17
180/-	ساغر صدیقی	کلیات ساغر صدیقی	18
220/-	ساحر لدھیانوی	کلیات ساحر لدھیانوی	19
150/-	انتخاب: نندمیر رضا	شیم کو صندل کرو	20
150/-	بیش بردر	انتمت چاہو اے	21
300/-	معاذ حسن	ٹاپ 10 شاعر	22
300/-	معاذ حسن	ٹاپ 10 شاعرات (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)	23
200/-	مسعود مقتی	ٹاپ 20 کلاسک شاعر	24
150/-	معاذ حسن	100 مشہور و معروف غزلیں	25
120/-	علم اقبال	شاہکار شاعری (لٹیشن، غزلیں، گیت)	26
120/-	ایمان علی	تیرے پیار کا موسم (انتخاب غزلیات)	27
150.-	انتخاب شہباز اشرف	کھو تو اک شام چالوں	28
150/-	ائیم - قیم	دو چاروں کا ساتھ	29

120/-	عاصمہ مشتاق	ٹیکسوس صدی کی مشقی غزلیں	30
75/-	علام اقبال	دیوان میر قیمیر	31
150/-	شاور اسحاق	القص	32
160/-	محمد جیل پرواز	جلہ ہاتھ	33
150/-	افخرا راحم عاطر	موس ایر آ لودھ تھا (غزلیات)	34
180/-	افخرا راحم عاطر	پکھد دیر پہلے سحر سے (غزلیات)	35
	افخرا راحم عاطر	گلاب آ غوش	36
	افخرا راحم عاطر	تیرے وجود کی شندی چھاؤں	37
250/-	ڈیل کارنگی	مشے بول میں جادو	38
130/-	فیصل محمود	تلیوں کے شہر میں	39
250/-	صابر ظفر	پل دوپل کی چاہت میں	40
120/-	سلیمان احمد صدیقی	پھول میرے گلشن کا	41
150/-	شہزاد اختاب گلزار احمد	محبت جب سے وہ کرنے لگے ہیں	42
130/-	اختر شمار	آپ سانپیں کوئی (شعری مجموعہ)	43
120/-	منظرووارثی	دیکھا جو تیر کھا کے (شعری مجموعہ)	44
200/-	ڈاکٹر محمد عالم خان	اردو افسانے میں رومانی رجحانات	45
200/-	ڈاکٹر محمد اقبال	مقالات اجمل	46
400/-	دیوان سکھ مفتون	ناقابل فراموش	47
300/-	مرتبہ: شیما محبیب	مقالات محمد حسن منکری (حساول)	48
300/-	مرتبہ: شیما محبیب	مقالات محمد حسن منکری (حسدوم)	49
90/-	ڈپنی نذری احمد	مراۃ الاعروض	50
180/-	میرا من دہلوی	پائی وہیار (فرہنگ کے ساتھ)	51
80/-	عبدالحکیم شریر	فردوسی برس	52
100/-	مولانا الطاف حسین حالی	مسدس حالی (جدید ایڈیشن)	53
250/-	مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال	مظاہین شورش	54
80/-		وحدت ملی	55
250/-	صاحبزادہ خورشید گلانی	خون بھگرنے تک	56
200/-	پروفیسر جعفر بلوج / رفاقت علی شاہد	محاکمہ دیوان غالب نظر لا ہو مرودتہ	57
150/-	توصیف احمد خان	آج کی بات	58
200/-	جیل احمد عدیل	بر جستہ (کالم)	59

200/-	عمران نقطی	حرف ملاقات (نامور ایڈیوں کے انٹریویو)	60
150/-	جوائز جغرافی	اک ہیر جو ہم کو لاحق ہے (لاzel عشقی خطوط)	61
150.-	اشتیاق احمد نسح	اپنے چاند کے لئے	62
175/-	امیر حمزہ لون	تھما صاف	63
150	محمد زاہد نواز دھاوا	شام تہائی	64
200/-	اصغر شاہ اصغر	زمانے کی ٹھوکریں	65
120/-	حافظ مظفر محسن	جب بھی دیکھا داں دیکھا	66
180-	حافظ مظفر محسن	پیار کے بیکے دوپل	67
140/-	ندیم گیلانی	محبت مرثیں کتی	68
200/-	حسن ساصل	میرے لفظ	69
200/-	عبدالرشید عراقی	تذکرہ الشراء	70

پاکستان کے نامور کالمکار جاوید چوہدری کی کتب

350/-	زیر و پوائنٹ نمبر 4	350/-	زیر و پوائنٹ نمبر 3	☆
-------	---------------------	-------	---------------------	---

نوجوان نسل کے شاعر سعید واقع کی کتب

150/-	دل میں تم مہکتے ہو (نیا شعری مجموعہ) - 150	☆
-------	--	---

منفرد لمحے کے شاعر اعتبار ساجد کی کتب

150/-	☆ روز یاد کرتے ہیں	بھیساں قدر نہ جا ہو (نیا شعری مجموعہ) - 180	☆
120/-	☆ اک عشق ضروری ہے	سرخ گلابیوں کا موسم	☆
600/-	☆ ترے انتظار کے شہر میں (کلیات)	محبت ہوتا ایسی	☆
150/-	☆ تھیں کتنا چاہتے ہیں	یہ موسم یونہی بیت گیا	☆
150/-	☆ کوئی یاہت کرنی ہے چاند سے	یہ شام تہارے نام	☆
180/-	☆ یہ تھائی بھجے دے دو	وہی اک رُخْمَ گلاب سا	☆
150/-	☆ دل کی دلپڑی	محبکوئی شامِ اُدھار دو	☆
150/-	محبت پھول جیسی ہے	وہ شہری دھوپ کپاں گئی	☆
150/-	اہمی آگ سر ثوبیں ہوئی	گلوب پر اجھی	☆
150/-	شاعری کیسے کریں؟	مرے خط بھجے واپس کر دو	☆

پاکستان کے مقبول ترین شاعر منان قدری کی کتب

150/-	تم اداں مت ہونا	150/-	بھم نہ ملتے تو اچھا تھا	☆
150/-	بھت تم سے محبت ہے	180/-	کب آؤ گے	☆
180/-	میری آنکھیں نیند سے بھر دو	150/-	تم اکثر آتے ہو	☆
200/-	کیا ہے پیار پھر سے	150/-	چھپیں کیسے ہاؤں؟	☆

طفر و مزاح

150/-	اتقیار ساجد	واہ، بھتی واہ	1
150/-	اتقیار ساجد	ہاؤں قل	2
200/-	ڈاکٹر مختار احمد خر	اور لوکی درمیانی کتاب	3
60/-	پھرس بخاری	پھرس کے مفہامیں	4
150/-	انتخاب: گل فراز احمد	چکن فالودہ (بہترین مزاحیہ شاعری کا انتخاب)	5
150/-	گل فراز احمد	لطیف A (دنیا بھر کے انعام یافت لیئے)	6
250/-	گل فراز احمد	ٹاپ 10 مزاح گوشاعر	7
250/-	معاذ حسن	مکمل مزاحیات	8
250/-	پروفیسر جیل احمد عدیل	مزاح نگار حاضر ہوں	9
200/-	اسیم۔ ایم۔ خالد	شرطیہ میٹھے (دنیا بھر کے انعام یافت لیئے)	10
80/-	ستار طاہر	خوبصورت لٹائنف	11
80/-	ستار طاہر	مختب لٹائنف	12
150/-	ائتمان انصار	دل کے آس یاس (طفر و مزاح)	13
70/-	محمد قیصر چوہان	خوبصورت مکرانیں (لٹائنف)	14
120/-	اشفاق احمدورک	قلمی دشمنی (طفر و مزاح)	15
150/-	عارف نصیح خان	مابدولت (طفر و مزاح)	16
120/-	عارف نصیح خان	شٹ آپ (طفر و مزاح)	17
120/-	عارف نصیح خان	کر کرے کردار (طفر و مزاح)	18
300/-	عارف نصیح خان	تجھاں عارفانہ	19
120/-	حافظ مظفر محسن	بوٹا مائی فریبڑ	20
150/-	حافظ مظفر محسن	ہمسف لفاف اور سیاسی آلو دگی	21
100/-	محذب بھتی	چیلیا گھر (مزاحیہ شاعری)	22

معلومات عامہ، اقوال زریں

200/-	Ch. Mushtaq Ahmad (بیلک کے امتحان لیے رہنا کتاب)	Management & People in Banking	1
150/-	Prof. Muhammad Akram Tahir	(اگرچہ تھریر) PLEASING VOICES	2
180/-	منصور احمد بخشی	علم الاعداد کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	3
250/-	محمد زاہد گوئی	دست شناختی کا انسائیکلو پیڈیا	4
120/-		بہترین انعامی تقریبیں	5
100/-	خان اکبر علی خان	اپنا اثر و یو خود کیجئے!	6
100/-	خان اکبر علی خان	اقوال محبت کا انسائیکلو پیڈیا	7
200/-	ملک زاہد محمد داعویان	اسرارِ انجوم	8
200/-	پروفیسر محمد نصیر خان	حقیقتوں کا سفر (اقوال زریں)	9
200/-	فیصل بٹ	عالمی معلومات کا انسائیکلو پیڈیا	10
600/-	شاہدہ طیف	دنیا کے 70 ٹوبے (4 کلر)	11
300/-	قیصر پورہ جہاں	عقلیّہ مہات	12
40/-	کامران احمد	شارز (12 کتب کا سیٹ برجم)	13
300/-	ظہی دنیا پر حکمرانی کرنے والے خوبصورت چہرے	زاہد گوئی	14
400/-	اعظم شمس	تیسیوں صدی کا انسائیکلو پیڈیا	15
200/-	احمد سعید پارچہ	ناٹا پرہب کے حضور (سفر نامہ)	16
400/-	مترجم: اعظم شمس	گنریک آف ولڈریکارڈ 2002 (ఆردو)	17
150/-	قیصر علی آغا	کون، کب اور کیا؟	18
40/-	یاں فراز	کون بنے گا کروڑتی!	19
200/-	مترجم: مقصود شمس	عقلوں کا نچوڑ	20
100/-	اور انگریز تحریر سہروردی	انسانی و قدرتی وسائل کا استعمال	21
150/-	عمران چوہدری	علمی تقریبیں	22
120/-	نجمہ منصور	فن خطابت	23
90/-	حافظ مظفر عجمی	ستارے ایتی ایتی قسمت کے	24
120/-	فرحت عباس، نجمہ منصور	بیت بازی	25
130/-	حافظ مظفر عجمی	ضرب اشل اشعار	26
120/-	اشتیاق الرحمن چوہدری	جدید تقریبیں	27
300/-	ابوالی عبد الوکیل	عقل و اول کے لیے حکایات	28

عالمی شہرت یافتہ پا سٹ ایم۔ اے ملک کی کتب

350/-	اکیم۔ اے ملک	اسراد دست شناسی
150/-	اکیم۔ اے ملک	بیسوی صدی کی پیشین گوئی

سعادت حسن منشو کی کتب

600/-	سعادت حسن منشو	کلیات منتو-1۔ (افسانے)	-1
600/-	سعادت حسن منشو	کلیات منتو-2۔ (افسانے)	-2
600/-	سعادت حسن منشو	کلیات منتو-3۔ (کہانیاں)	-3
600/-	سعادت حسن منشو	کلیات منتو-4۔ (ڈرائے)	-4
600/-	سعادت حسن منشو	کلیات منتو-5۔ (ڈرائے)	-5
50/-	سعادت حسن منشو	خشندا گوشت	-6
15/-	سعادت حسن منشو	لور جہاں سرو رجاں	-7
100/-	سعادت حسن منشو	گنے فرشتے	-8
200/-	سعادت حسن منشو	منتو کے 10 بہترین افسانے	-9

تاریخی و رومانوی ناول

250/-	الماں ایم۔ اے	حجاج بن یوسف	1
200/-	الماں ایم۔ اے	سلطان شہاب الدین غوری	2
140/-	الماں ایم۔ اے	چنگاپ کی رومانوی داستانیں	3
150/-	شیکھیز	رومی یورلیٹ	4
250/-	میمین رشید	سلطان محمود غزنوی	5
200/-	ضیاء الدین لاہوری	بہادر شاہ ظفر کے شب و روز	6
120/-	ضیاء الدین لاہور	1857ء کے چند اہم کروار	7
250/-	محمد فیاض مای	تاوان عشق	8
250/-	محمد فیاض مای	کاغذ کی کشی	9
400/-	شاہزادی چوبڑی	شہر دل کے دروازے	10
150/-	آمندر یاپ	تم آخری جزیرہ ہو	11
150/-	محمد عرفان رائے	خداؤر جیس ہے	12
300/-	ڈاکٹر کرم حسین شاہ رائے	راج ہماری	13
225/-	خشونت ٹگھ، مترجم: عرفان احمد خان	دلی	14
100/-	عرفان احمد خان	مدھوش	15

120/-	شہزادہ راقی کوہل		اصل کاروپ	16
300/-	مقصود بخش		سکندر عظیم	17
150/-	ایم۔ اسلام		خواب جوانی	18
150/-	ایم۔ اسلام		تیرنگاہ	19
120/-	ایم۔ اسلام		ائج نہادت	20
250/-	غلام سرور		امر جیت	21
200/-	اے۔ زینب سید		کاشانہ نور	22
100/-	اکرم خان نیازی	کائچ کلیاں اور بخورے		23
100/-	عمران چوہدری	تیرے پاس ہے اک حصہ		24
60/-	عرفان نوید		سایہ	25
120/-	شیخ الیاس		شیطانوں کی جنت	26
80/-	ایم۔ انور صدیقی		عشق اور آزادی	27
120/-	ایم۔ انور صدیقی		خزاں کے بعد	28
400/-	بڑی رحلی		بے ساختہ	29
100/-	ٹکلیل شرارت		شہزاد	30

مشہور ناول نگاریم الحق حقی کے ناول

250/-	دو بوندیں ساون کی	180/-	عشق کائین	1
120/-	سماں	500/-	عشق کائین	2
120/-	تل کی آگ	400/-	عشق کائین پارت ॥	3
100/-	شب احتساب	250/-	(دجال (اول)	4
200/-	ستگ حیات	250/-	(دجال (حصدوم)	5
150/-	سلطانی جمہور	250/-	(دجال (حصہ سوم)	6
150/-	اماوس کا دیا	120/-	قصہ ایک داما دکا	7
250/-	بساط	150/-	پاتال کی بلا کیس	8
120/-	ضمیر کے اسیر	150/-	ضمیر کے اسیر	9
120/-	زندگی 40 کلو میٹر	120/-	ملک برائے فروخت	10
140/-	دوسرا فصل	150/-	مٹی سے عشق	11

پاکستان کی نامور ناول زنگار عسیرہ احمد کی بہترین کتب

من و سلوی	عنیرہ احمد	600/-
امریل	عنیرہ احمد	600/-
تحوڑا سآسائیں	عنیرہ احمد	700/-
حشاد و حسن آراء	عنیرہ احمد	250/-
در بارول	عنیرہ احمد	250/-
ہم کھاں کے پے تھے	عنیرہ احمد	250/-
میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	عنیرہ احمد	250/-
حرکاں استخارہ ہے	عنیرہ احمد	250/-
میری ذات ذرہ بے نشان	عنیرہ احمد	250/-
لا حاصل	عنیرہ احمد	250/-
زندگی گزار رہے	عنیرہ احمد	250/-
واپسی	عنیرہ احمد	300/-
میرے پچاس پسندیدہ میں	عنیرہ احمد	150/-
حرف سے لفظاتک	عنیرہ احمد	100/-
حاصل	عنیرہ احمد	200/-
ایمان، امید اور محبت	عنیرہ احمد	200/-

نگہت عبداللہ کے منئے ناول

محبت کا حصار	نگہت عبداللہ	200/-
محبتوں کے ہی درمیاں	نگہت عبداللہ	250/-
دول پھولوں کی بستی	نگہت عبداللہ	400/-
انتظارِ فصلِ گل	نگہت عبداللہ	150/-
مجھے روٹھے نہ دینا	نگہت عبداللہ	250/-
بس تم لوٹ آتا	نگہت عبداللہ	200/-
کوئی لمحگاہ بہو	نگہت عبداللہ	400/-

شاہدہ طیف کی خوبصورت کتب

7 قدمی عشق (ناول)	شاہدہ طیف	350/-
محبت نہ ہو جائے	شاہدہ طیف	200/-
دنیا کے 70 بجوبے	شاہدہ طیف	600/-

قیصرہ حیات کی خوبصورت کتب

500/-	قیصرہ حیات	انوار اسائے الہی (تفصیلی شرح)	1
200/-	قیصرہ حیات	ذات کا سفر (نالوں)	2
300/-	قیصرہ حیات	ساید یوا رہی ٹیکس (نالوں)	3
220/-	قیصرہ حیات	گلاب چاہیں	4
200/-	قیصرہ حیات	وقت جو نصفہ گیا	5

رفعت سراج کی خوبصورت کتب

250/-	رفعت سراج	رشتوں کے ریشم	1
200/-	رفعت سراج	اکیل گلاب	2

ملک کی مشہور نالوں نگار ماہا ملک کی کتب

150/-	ماہا ملک	جو چلے تو جاں سے گزر گئے	1
250/-	ماہا ملک	پہ بُلیلیں یہ تھیں	2
350/-	ماہا ملک	اک دیا جلانے رکھنا	3
350/-	ماہا ملک	میرے خواب ریزہ دریزہ	4

خواتین کی مقبول ترین رائٹرز رخسانہ نگار

200/-	رخسانہ نگار عدنان	دل آئیں کا شہر	1
180/-	رخسانہ نگار عدنان	خوبیوں کا گھر کوئی نہیں	2
200/-	رخسانہ نگار عدنان	دیوار سگ سے آگے	3
300/-	رخسانہ نگار عدنان	میرے چارہ گھر	4
250/-	رخسانہ نگار عدنان	پارس (نیا نالوں)	5
500/-	رخسانہ نگار عدنان	زندگی اک روشنی	6
200/-	رخسانہ نگار عدنان	گرجھ سے محبت ہے	7

تزلیل ریاض کی مشہور کتب

200/-	تزلیل ریاض	خوب گھروندہ ٹوٹنے جائے	1
200/-	تزلیل ریاض	احمد نا الصراط امتیزم	2

عصمت چھتاںی کی کتب

200/-	عصمت چھتاںی	ایک قطرہ خون (واحد کر بلایا ایک شاہکار تحریر)	1
100/-	عصمت چھتاںی	ضدی	2
80/-	عصمت چھتاںی	لائف	3

گھبٹ سیما کے بہترین ناول

250/-	گھبٹ سیما	رخمن سفر ہے محترم	1
250/-	گھبٹ سیما	روشنی کے عذاب	2
200/-	گھبٹ سیما	کتنا سہل جانا تھا	3
200/-	گھبٹ سیما	محبت ایرگی صورت	4
	گھبٹ سیما	راوی چنون	5

نازیہ کنوں نازی کی بہترین کتب

600/-	نازیہ کنوں نازی	جو ریگ دشت فراق ہے (ناول)	1
250/-	نازیہ کنوں نازی	خواب گرگی مسافریں (ناول)	2
170/-	نازیہ کنوں نازی	اے مرگان محبت	3
150/-	نازیہ کنوں نازی	تپاچاند (شاعری)	4

میمونہ خورشید علی کے مشہور ناول

250/-	میمونہ خورشید	اے جنوں دشت ہے کہ منزل ہے	1
180/-	میمونہ خورشید	تیری راہ میں زل گئی وے	2

سباس گل کے نئے ناول

200/-	سباس گل	میں محبت اور تم	1
250/-	سباس گل	تم ایسی شرارت مت کرنا	2

عائشہ سحر مرقصی کے نئے ناول

200/-	عائشہ سحر مرقصی	مجھے بکھرنے مت دینا	1
250/-	عائشہ سحر مرقصی	تیری چاہ میں	2

نازیہ فرحت مایہ کے ناول

150/-	نازیہ فرحت مایہ	مجھ پھر کر تیری آنکھیں	1
200/-	نازیہ فرحت مایہ	ہوں در عشق سے جہاں بالب	2

روشا نے سبھیں کے نئے ناول

200/-	روشا نے سبھیں	کیسی یہ رسم دنیا.....!	1
-------	---------------	------------------------	---

مقبول ترین رائٹر امجد جاوید کی کتب

200/-	امجد جاوید	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	1
150/-	امجد جاوید	چکرو	2

400/-	اجمدادیہ	عشق کائین (حصہ دوم)	3
400/-	اجمدادیہ	عشق کائین (حصہ سوم)	4
250/-	اجمدادیہ	عشق کا قاف	5
200/-	اجمدادیہ	جب عشق سمندر اور ھلیا	6
250/-	اجمدادیہ	تاریخ محل	7
120/-	اجمدادیہ	لکھاری کیسے بتا ہے	8
150/-	انتخاب: احمد جاوید	انتقلابی شاعری	9
150/-	اجمدادیہ	چھپیں چاہوں گا شدت سے (نیا شعری مجموعہ)	10
150/-	مترجم: احمد جاوید	کامیابی 30 دنوں میں (ترجمہ)	11

صحبت و تسلی درستی

250/-	مترجم: مقصود شیخ	دل تو انار کھنے کے 50 طریقے	1
150/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	چیلی بیلٹھ	2
200/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	ٹین اسچ گائیڈ (اردو)	3
200/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	TEENAGE TINGLING	4
150/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	زیارت، زخم اور زندگی	5
250/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	زیارت، زیارت اور زندگی	6
300/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	دوام، غذا اور شفا	7
120/-	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	دانتوں کی حفاظت و علاج	8
100/-	خواجہ سلطان عارف	قیامِ حل سے پورش تک	9
150/-	عظم شیخ	لبی زندگی اور آسان یوگا	10
100/-	مادر رسول طاہر	بیٹھن گائیڈ	11
120/-	حنا شیخ	کامیاب گھر یلو نکون کا انسائیکلو پیڈیا	12

کھانا رکھنا

400/-	زیب النساء	اوون کے کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا	1
600/-	ساجد حسین قریشی	کھانے پکانے کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	2
250/-	ساجد حسین قریشی	آرٹ آف مغل کریم (بہترین کھانے)	3
200/-	ساجد حسین قریشی	آرٹ آف سب کا میکنیک (بہترین کھانے)	4
250/-	ساجد حسین قریشی	Art of Mughal Cuisine (بہترین کھانے)	5
200/-	ساجد حسین قریشی	Art of sub continental	6

100/-	ساجد حسین قریشی	سینے یا اور کچل کا انسائیکلو پیڈیا	7
300/-	ساجد حسین قریشی	انسانیکلو پیڈیا آف پاست (ماگنیکرو بیوایا وادون کے کھانے)	8
220/-	شفیف ذاکر	شفیف ذاکر کا دستر خوان	9
300/-	راحت نیجم	راحت کا دستر خوان	10
600/-		ڈالڈا کھاتوں کا انسائیکلو پیڈیا	11
130/-	شمینہ سہیل نذر	منفرد چائیز کھانے	12
150/-	سحدیہ عابد	ڈالڈا کا نعمت خوان	13
380/-	(چن کے خوبصورت ڈیرائن)	پچن بک	14
150/-	تمل مسعود	چھل کے پکوان	15
150/-	جو یہ کامران	شوگر فری کھاتوں کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	16
150/-	تمل مسعود	ٹکے کیا بچانپیں کوئے، پندے	17
150/-	روپینہ شاہ	منفرد کھاتوں کی منفرد ترکیبیں	18
150/-	روپینہ شاہ	بیکری کا انسائیکلو پیڈیا	19
150/-	روپینہ شاہ	200 زالقوں میں چھل لپکا نیں معد چائیز کھانے	20
120/-	پیغمبر سید	نئے چائیز کھانے	21
150/-	شمینہ شاہ	سینے یوں کے پکوان	22
80/-	شمینہ شاہ	چاول کے پکوان	23
150/-	اعجاز شیخ	بیکری گائیز (اردو انگلش)	24

فرحت عباس شاہ

165/-	☆ شام کے بعد (جلد اول)	☆ شام کے بعد (جلد دوم)	☆
120/-	☆ یاداؤں اگرداہی میں	☆ 165/-	☆ شام کے بعد (جلد سوم)
150/-	☆ محبت خوبصورت ہے	☆ 120/-	☆ ہم اکیلے ہیں بہت
120/-	☆ مرنا انتقالِ قدیم ہے	☆ 300/-	☆ تم اوس مت ہوتا
150/-	☆ ڈکھ بولتے ہیں	☆ 150/-	☆ آوارہ مزاج
120/-	☆ کہاں ہوتم	☆ 120/-	☆ جم گیا صبر مری آنکھوں میں
120/-	☆ میرے دیران کمرے میں	☆ 120/-	☆ خطلوں میں دلقایا ہوا جیون
350/-	☆	☆ 120/-	☆ ملوہم سے
120/-	☆ اُداس شامیں اچاڑتے	☆ 120/-	☆ محبت کی آخری ادھوری لائم
120/-	☆ مت بول پیا کے لجھ میں	☆ 120/-	☆
120/-	☆ اُک بار کہوتم میری ہو	☆ 120/-	☆ آکسی روز کسی وکھد کیجے پا کشٹے رہیں

120/-	اکیسویں صدی کی پہلی لمحہ	☆	300/-	Sarabi	☆
300/-	Love	☆	150/-	After Evening	☆
110/-	الوداع پاکستان	☆	150/-	America My Friend	☆
90/-	تیرے دکھنے رستہ بنا دیا	☆	110/-	موت زدہ	☆
120/-	بارشوں کے موسم میں	☆	90/-	بانگی شاعر	☆
100/-	میرے ساتھ چل	☆	120/-	اور تم آؤ	☆
120/-	من پنچھی بے چین	☆	150/-	روگ	☆
120/-	آنکھ جگل درود یار سے	☆	200/-	محبت ذات ہوتی ہے	☆
120/-	ساتھ دینا ہے تو دے	☆	120/-	چاند پر زور نہیں	☆
150/-	سرابی	☆	120/-	روز ہوں گی ملاقاتیں	☆
120/-	آنکھوں کے پار چاند	☆	120/-	محبت گشیدہ میری	☆
120/-	ایمی خواب ہے	☆	120/-	اے عشق ہمیں آزا کرو	☆
150/-	دن لکھا نہیں	☆	200/-	سوال در دکا ہے	☆
450/-	یہ عجیب میری محبتیں	☆	200/-	ہم جیسے آوارہ دل	☆

کمپیوٹر و درسی کتب

240/-	اجازہ احمد	جاوا2 (سٹیلیشن گائیڈ)	-1
180/-	ارشد محمد	انفارمیشن ٹیکنالوژی	-2
300/-	ارشد محمد	Ver.6 C++ اور ووٹیول	-3
300/-	ارشد محمد	A+ پلس مکمل ہداؤ ہیرگائیڈ	-4
180/-	محمد تین خالد۔ محمد ارشاد عرضی	پریکٹیکل نوٹ بک (23 نوٹوں میں ICS)	-5
60/-	محمد تین خالد۔ رضوان احمد شاہ	پر سہار آف کمپیوٹر سائنس (21 نوٹوں میں ICS)	-6
70/-	محمد تین خالد۔ ارشاد محمد شاہ	کمپیوٹر واریس	-7
100/-	محمد تین خالد	کمپیوٹر خود سیکھیں	-8
150/-	محمد تین خالد۔ مقصود شیخ	کمپیوٹر کے مسائل اور ان کا حل	-9
60/-	ارشد محمد شاہ	ماہیکرو سافٹ ویئرو زانٹائیش گائیڈ	-10
60/-	ارشد محمد شاہ	ماہیکرو سافٹ ویئرو زیمیٹ ورگنگ	-11
60/-	ارشد محمد شاہ	فرماز آسان و فتوڑ 98	-12
140/-	ارشد محمد شاہ	فرماز آ فر 4-2003	-13
60/-	ارشد محمد شاہ	فرماز آ تو کینے 4-2004	-14
60/-	ارشد محمد شاہ	فرماز ایکسل 4-2003	-15

75/-	ارشد مجموعہ	عائی اٹرنیٹ ڈائریکٹری	-16
100/-	اعظم شیخ	اٹرنیٹ گائیڈ میج دیب ڈائیکٹری	-17
130/-	اعظم شیخ - محمد سین خالد	اٹرنیٹ ڈائریکٹری (بڑی)	-18
60/-	اعظم شیخ - محمد سین خالد	اٹرنیٹ ڈائریکٹری (پاکٹ سائز)	-19
120/-	محمد سین خالد	اسلام اٹرنیٹ پر	-20
120/-	اعظم شیخ - محمد سین خالد	پاکستان اٹرنیٹ پر	-21
100/-	اعظم شیخ - محمد سین خالد	SCIENCE ON NET	-22
180/-	مقصود شیخ	ای کامرس (مکمل گائیڈ)	-23
100/-	فرحان ڈار	ان بی 2000	-24
120/-	اعظم شیخ	فلیش 5	-25
300/-	محمد سین خالد - مقصود شیخ	اٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی جدید ڈاکشنری (ఆردو اور انگریزی میں)	-26
180/-	رائے احمد شاہ - ڈاکٹر بشیر احمد شاہ	فونوشپ 7	-27
150/-	ارشد مجموعہ	کورل ڈرائی 11 مکمل گائیڈ	-28
150/-	ارشد مجموعہ	کورل ڈرائی 12 مکمل گائیڈ	-29
160/-	ارشد مجموعہ	فراز آسان کمپیوٹر گائیڈ	-30
60/-	ارشد مجموعہ	ماگیکرو سافٹ ورڈ XP	-31
130/-	ارشد مجموعہ	ماگیکرو میڈیا ڈاکٹر میڈیا 2004	-32
150/-	رضوان احمد شاہ - نعمان احمد شاہ	ماگیکرو سافٹ ایکس ڈنیا میں	-33
120/-	مقصود خالد	اٹرین اٹرنیٹ ڈائریکٹری	-34
120/-	مقصود خالد	آٹو بیکنیشن	-35
150/-	سیفرا شاہ	اپنا موبائل فون خود مرمت کریں	-36
120/-	سیفرا شاہ	سٹوڈیو میش 6 3/D	-37
60/-	سیفرا شاہ	ڈاکس مکمل گائیڈ	-38
150/-	M.MATEEN KHALID	ENCYCLOPEDIA OF FAQ COMPUTER / INTERNET PROBLEMS & SOLUTIONS	-39
130/-	Noman A. Shah,Rizwan A.Shah	Visual Basic 6.0	-40
150/-	Noman A. Shah,Rizwan A.Shah	Window XP Professional	-41
120/-	(For B.A, B.Com, B.Sc, BCS)	نویسنل British English Grammar & Composition	-42

210/-	اعجاز احمد	(M.C.S.L) S.Q.L	-43
225/-	اعجاز احمد	PL/S.Q.L (Oracle 6i)	-44
210/-	M.Rizwan Jameel Qureshi	Introduction to Information Technology (C,C++, Java, ASP)	-45
210/-	Khalid Mahmood Mughal	Self Paced Training	-46
80/-	ڈاکٹر سکندر حیات خیات	Introduction to Numerical Analysis	-47
150/-	محمد سعید	اویل اردو (مکمل سلیسیس اے بیچر)	-48
120/-	میاں عصمت اللہ	مطالعہ معاشیات (برائے ڈی کام ڈی بل اے)	-49

سیاسی کتب

250/-	چوہدری غلام رسول چیمہ	تل جمہوریت	1
250/-	رائے نواز کمرل	اور زنجیر ٹوٹ گئی	2
300/-	چوہدری غلام رسول چیمہ	ذوالقدر علی بھٹو (ایمپی پاکستان کا بانی)	3
600/-	مقدار اقبال	سقوط بغداد	4
500/-	مقدار اقبال	طالبان کی واپسی	5
200/-	فضل حسین اعوان	شہید جمہوریت کا قاتل کون	6
200/-	ستار چوہدری	لندن پلان	7
500/-	پاکستان کی کہانی (حضور پاک کے سپاہی کی زبانی)	پاکستان کی کہانی (حضور پاک کے سپاہی کی زبانی)	8
200/-	مبین رشید	اگر ایران پر حملہ ہوا.....؟	9
250/-	کامران راجپت	پارلیمنٹ کے خوبصورت پڑھے	10
200/-	اعظیم شمس	ذینا کی نامور شخصیات کے معماں	11
400/-	قصر چوہان	پاکستان لوٹنے والے ہاتھ	12
200/-	قصر چوہان	ناموں کا گلڈستہ	13
40/-	قصر چوہان	SMS بڑا سائز (6 ناٹل)	14
300/-	قصر چوہان	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارت ۱	15
300/-	قصر چوہان	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارت ۲	16
250/-	عارف شمع خان	اماں حواسے اماں کو سلسلیک	17
200/-	حافظ شفیق الرحمن	نواز شریف جیتی بازی ہار گیا	18
250/-	ٹیکسٹر احمد بابر	پاکستان میں جمہوری حکومتیں قیام سے آج ہم تک	19

200/-	مرتضی احمد	میسوی صدی کے فوجی حکمران	20
300/-	محمد نواز کھل	متازع ترین شخصیت پروفیسر طاہر القادری کی شخصیت کا تحفیدی جائزہ	21
200/-	محمد جاوید	پاک امریکہ تعلقات	22
200/-	مرتضی احمد	سیاست آئین اور عدالت	23
200/-	زاہد گوئی	ادیبوں اور دانشوروں کے معاشرے	24
150/-	طاہر احمد	یہ بیس ہمارے حکمران؟	25
120/-	طاہر احمد	پاکستان جاہی کے دہانے پر	26
200/-	غالد چہدری	سیاستدانوں کے معاشرے	27
250/-	مقبول ارشد	خفیر پورٹش	28
100/-	منظرنی چہدری	جنی لذت	29
150/-	نوائز کھل	شرافت کا ستون (میاں محمد شریف)	30
180/-	میاں علاؤ الدین	چجی تو کری؟	31
350/-	بل کلشن (مترجم: زاہد گوئی)	میری زندگی	32
150/-	لتیق احمد	ماں کل جیکن پاپ یا پانپی گلوکار	33
220/-	سیدنا صریح	بدمحاش امریکہ	34
220/-	سیدنا صریح	پاکستان میں امریکی سازشیں	35
160/-	ڈاکٹر ندیم احمد	صدام حسین	36
160/-	ڈاکٹر ندیم احمد	چیف جسٹس کی محفلی	37
150/-	انتخاب: امجد جاوید	انقلابی شاعری	38

ملک کے نامور قانون دان ایم۔ ایم۔ ظفر کی بہترین کتب

650/-	ایم۔ ایم۔ ظفر	میرے مشہور مقدمے	1
150/-	ایم۔ ایم۔ ظفر	پاکستان بنام کرپشن عوام کی عدالت میں	2
200/-	ایم۔ ایم۔ ظفر	ڈاکٹر کیرون	3
250/-	ایم۔ ایم۔ ظفر	عوام پارلیمنٹ اسلام	4
175/-	ایم۔ ایم۔ ظفر	عدالت میں سیاست	5

اگریزی کتب

500/-	Muhammad Sharif Baqa	Quranic Topics(Vol:1)	-1
500/-	Muhammad Sharif Baqa	Quranic Topics (Vol:2)	-2
60/-	Fateh Muhammed Jallendhri	Quranic Advices	-3
80/-	S-Hamgah Saleem Gilani	A Pound of Flesh	-4
150/-	Allama Muhammad Iqbal (کے ۷ مشہور و معروف خطبات)	The Reconstruction of Religious thought In Islam	-5
220/-	Zia-ud-Din Lahori	Hijra of Christian Calendars	-6
200/-	Ch. Mushtaq Ahmad (بنگ کے امتحان کیلئے رہنمائی کتاب)	Management & People in Banking	-7
120/-	Dr. Asif Mahmood Jafri	TEENAGE TINGLING	-8
120/-	Naveed Abdullah Khan Sumbal (For B.A, B.Com, B.Sc, BCS)	British English Grammar & Composition	-9

مکتبہ جمال

250/-	مولانا عبدالرازق طیب آپادی	ذکر آزاد (مولانا ابوالکلام کی رفاقت میں ۳۸ سال)	1
100/-	مرتیب:ڈاکٹر سید عبدالطیف	تصورات قرآن (مولانا ابوالکلام آزاد)	2
100/-	مرزا اسدالدین خاں غالب	دیوان غالب (پاک)	3
250/-	مرزا اسدالدین خاں غالب	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	4
700/-	علام محمد اقبال	کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ)	5
200/-	پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید عالم قاسم	عصر حاضر میں اسوہ رسول اکرمؐ کی محتویات	6
100/-	مولانا محمد مختار جعفی	خطبات بیہقی	7
200/-	مولانا سعید احمد اکبری آپادی	اسلام میں غالی کی حقیقت	8
200/-	محمد مظہر الدین صدیقی	اسلام کا نظریہ تاریخ	9
250/-	میاں محمد شفیعی	1857ء کی پہلی جنگ آزادی (واقعات حقائق)	10
300/-	ڈی۔ اچ۔ واشن/ پروفیسر فخر راجح	ہزارہ گزٹیخیر	11
250/-	ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنڈی	تاریخ ہزارہ	12
200/-	مولانا محمود ارجمند ندوی	دولت غزنویہ (سلطان محمود غزنوی اور ان کے جانشین)	13
200/-	پروفیسر محمد عارف	کشمیر تاریخ کے آئینے میں	14

250/-	پروفیسر محمد عارف	پاکستان سے اقبالان تک	15
120/-	مولانا ابوالمنظر ظفر احمد قادری	نئی کریم ملٹی کمپنی مبارک سنسنیں	16
100/-	مولانا محمد زکریا	فضل آن درود شریف	17
60/-	مولانا محمد زکریا	فضل رمضان	18
150/-	مولانا محمد اجمل خان	آداب الدعا	19
100/-	پروفیسر انور دل	کامیاب زندگی کا تصور	20
100/-	ایمان رحیم ہارڈ/بشیری سہیل	اسلام کی دنیا	21
150/-	گھر بیل آزمودہ فخوں کا انسائیکلو پیڈیا (قدیم حکماء سید امیاز علی الحاج)	کی تحقیقات کا نچوڑ	22
130/-	آسی آزاد	پروفسنل یونیورسٹیشن بنیجے	23
120/-	حکیم قلام محمود خان	بہار شباب	24
200/-	منصب خان سحاب	وادی کاغان (تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت)	25
80/-	محمد پرویز شاہین	مشرق کا سویغز ریزند (وادی سوات)	26
80/-	محمد پرویز شاہین	کافرستان کے رسم و رواج	27
80/-	محمد پرویز شاہین	سوات (کوہستان)	28
100/-	محمد پرویز شاہین	وادی دیر..... کوہستان (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	29
100/-	محمد پرویز شاہین	وادی چڑال (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	30
500/-	ای ایف نائب/ظفر حیات یال	جهان تین سلسلتیں ہیں	31
300/-	سید محمد بیگی شاہ احسانی	بر و شوق آن اور بروشاں	32
200/-	محمد آفتاب	ہماری حقیقت (سائنس انسان اور کائنات)	33
250/-	محمد صدیق تقی	چهل بلے	34
100/-	ڈاکٹر سارہ مجوب	پہلا قدم	35

كتب مولانا ابوالكلام آزاد

120/-	مسلمان عورت	☆ 250/-	☆ تذکرہ
100/-	قرآن کا قانون عروج و وزوال	☆ 120/-	☆ قول فیصل
90/-	صدائے حق	☆ 120/-	☆ انسانیت موت کے دروازے پر
180/-	اُمِ الکتاب	☆ 70/-	☆ رسول اکرمؐ اور خلافتے راشدینؐ کے آخری لمحات
80/-	حقیقت اصلہ	☆ 250/-	☆ غبار خاطر
120/-	شہادت حسین رضی اللہ عنہ	☆ 70/-	☆ فیضان آزاد (تحقیقات ابوالكلام آزاد)

300/-	آزادی ہند	☆ 100/-	مولانا آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا
90/-	ولادت نبوی ﷺ	☆ 140/-	سلسلہ خلافت
50/-	فاسدہ بھروسال	☆ 70/-	مقام دعوت
100/-	اسلام میں آزادی کا تصور (المیہ شفی اللہ علیہ وسلم)	☆ 70/-	قرآن حکیم کی تین سورتیں (ترجمہ و تفسیر)
120/-	اصحاب کہف اور یا جوڑ ماجنوج	☆ 250/-	ارکان اسلام

کلاسیک شعراء کے دیوان

50/-	☆ دیوان سودا (مرزا محمد رفع سودا)	50/-	☆ دیوان حضرت (حضرت موبہنی)
50/-	☆ دیوان آتش (خواجہ حیدر علی آتش)	50/-	☆ دیوان غالب (میرزا سداللہ خاں غالب)
50/-	☆ دیوان ذوق (شیخ محمد ابراہیم ذوق)	50/-	☆ دیوان صحتی (غلام صدیقی صحتی)
75/-	☆ دیوان میر (میر قیچی میر)	50/-	☆ دیوان جوش (لیخ آبادی)
50/-	☆ دیوان حسن خان موسین (حلوی)	50/-	☆ دیوان حکیم موسین خان موسین (حلوی)
50/-	☆ تنجیاں (صحیح الملک نواب مرزا داعی و حلوی)	50/-	☆ دیوان داعی (صحیح الملک نواب مرزا داعی و حلوی)

صفہ فاؤنڈیشن

20/-	عمر حیات قادری	مسلمان خواتین کے نام اہم پیشام	-1
35/-	مفتی محمد اقبال سعیدی	جرائم توپین رسالت (فقہ حنفی کی روشنی میں)	-2
18/-	جیہۃ الاسلام امام محمد غزالی	قرآن اور روحانی علوم (فقہ حنفی خان قادری)	-3
25/-	تصنیف: شیخ عبدالرشاد سراج الدین شاہی ترجمہ: مفتی محمد خان قادری	وسعۃ علم نبوی	-4
35/-	تصنیف: شیخ رئیس دھلان شاہ فیضی	مسائل توسل و زیارت	-5
25/-	ترجمہ: مولانا ناصر اختر مصباحی	خواب میں دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی بہاریں قیامت تک جاری ہیں	-6

متفرقہ کتب

150/-	الحجاج سراج احمد عادل	قصص الانبیاء مجلد	1
150/-		قصص الانبیاء مجلد	2
24/-	(مصنف: سیسل ٹونسل) (مترجم: آغا اشرف)	شہد صن و صحت کیلئے	3
24/-	ڈاکٹر اقبال کاروار	شہد سے علاج	4
25/-	حافظ اکرم الدین صاحب واعظ	طب نبوی	5

28/-	حجان الہند حضرت مولانا احمد سعید بلوی	رسول ملائکہؐ کے تین سو بھروسات	6
200/-	محمد حبیب قادری	خزینہ مشکل کشا	7
60/-	سید آفاق حسین	چہار قلی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	8
60/-	سید آفاق حسین	کلمہ طیبہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	9
60/-	سید آفاق حسین	آیت کریمہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	10
100/-	خواجہ محمد اسلام	موت کا منظر	11
120/-	مولانا احتیاز احمد علوی	الصلوٰۃ الرسول	12
60/-	مسعود منتی	کتاب الشنا	13
150/-	روہینہ شاہ	منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں	14
150/-	روہینہ شاہ	بکری کا انسائیکلوپیڈیا	15
180/-	روہینہ شاہ	200 آنکھوں میں پھلی لپکیں معد جانشز کھانے	16
130/-	شہید شاہ	گھر بیٹوں کے	17
120/-	شہید شاہ	بیوی کی ریکش	18
90/-	ارشت ہمکنگوہ مشہور عالم ناول	بڑھا اور سمندر (ناول)	19
90/-	ڈاکٹر فراز احمد	جادو اور سحر کا قرآنی علاج	20
120/-	مولفین: یحییٰ سید	نئے چائیز کھانے	21
150/-	شہید شاہ	بزریوں کے پکوان	22
80/-	شہید شاہ	چاول کے پکوان	23
100/-	حافظ مظفر حسن	ستارے اپنے اپنی قسمت کے	24
120/-	علی نواز شاہ	دہشت زدہ گرو (ناول)	25
120/-	علی نواز شاہ	فیکیل (ناول)	26
100/-	کاشف فراز احمد	خونگوار زندگی کے اصول	27
120/-	کاشف فراز احمد	انہا علاج خود کریں	28
150/-	کاشف فراز احمد	کامیاب مستقبل کے راز	29
120/-	ثاثارا کبر آبادی	شر او فن شر	30
150/-	حیر قصیر دیساں	وارث لیکھا	31
250/-	ذوالحقار ارشاد گیلانی	تاریخ کاسفر	32
300/-	منصور بیٹ	حکایات کا انسائیکلوپیڈیا	33
120/-	ڈاکٹر اکتا بیک مترجم: سعیل بابریگ	اسلام میں ہورت کا مقام	34
200/-	حکیم محمد طارق محمود چھاتی	خواتین کی اسلامی زندگی کے سائنسی حقائق	35

300/-	عبدالحیم شریر	تاریخ سندھ	36
200/-	کے آر کپلانی	مہاتما گاندھی	37
180/-	غیاث الدین اکسل	قدیم تاریخ	38
180/-	ڈاکٹر میر ولی الدین	قرآن اور تصور	39
180/-	کرنل مسلم	شہنشاہ اکبر	40
150/-	کریم جے اچ پیئر ان ترجمہ: سید علاؤ الدین	تساوی کے آدم خور	41
200/-	آصف حسن	خدادور سائنس	42
200/-	ائس اچ علوی	روحانیت اور علم الاعداد	43
130/-	حسن اسحاق ورک	بہترین مراجعہ شاعری	44
200/-	ائچ رائیڈ ریگن ترجمہ: سید علاؤ الدین	حضرت سلیمان کا خزانہ	45
200/-	ائس اچ علوی	روح کا سفر	46
250/-	ڈاکٹر حشمت جاہ	قرآن اور جدید سائنس	47
300/-	رجی کانپوری	ذکر جب چھپ را گیا	48
300/-	مقتی شوکت علی ہنی	ہندوستان پر مغلیہ حکومت	49
120/-	اقبال احمد	اولیاء سندھ	50
300/-	مقتی شوکت علی ہنی	ہندوستان پر اسلامی حکومت	51
300/-	مرزا محمد علی	ارواج الجزر	52
180/-	نزید کرشن نہہا ترجمہ: کیلاش چند چوہدری	مہاراجہ رنجیت سنگھ	53
300/-	شفیع عقلی	سرخ سفید سیاہ	54
450/-	ڈاکٹر محمد اسماعیل دشتی البیہری	بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب	55
200/-	قرقری	محمد شاہ رنگیلا	56
300/-	رجی کانپوری	داستان کہتے کہتے	57
250/-	ہنر ہو لفس ولائی لاہور ترجمہ: سید علاؤ الدین	خوش رہنے کافن	58
350/-	ڈاکٹر اکنامیک ترجمہ: سکیل پا بریگ	خطبات (ولیم ۱) ڈاکنامیک	59
150/-	علی نواز شاہ	کالک (ناول)	60

مکتبہ داستان کے تاریخی ناول

840/-	عنایت اللہ	داستان ایمان فروشوں کی (تین جلد)	1
440/-	عنایت اللہ	ششیر بے نیام (دو جلد)	2
280/-	عنایت اللہ	ایک اور بست ٹکن پیدا ہوا (اول)	3
200/-	عنایت اللہ	ایک اور بست ٹکن پیدا ہوا (ادوم)	4

220/-	عنایت اللہ	ستارہ جلوٹ گیا	5
250/-	عنایت اللہ	چارکی آنگی	6
150/-	عنایت اللہ	چارڈیواری کی دینیا	7
150/-	عنایت اللہ	کشمیر کے حملہ اور اور پنڈی سازش کیس	8
200/-	عنایت اللہ	دشمن کے قید خانے میں	9
170/-	احمیدیارخان	کار، ٹلواڑ اور دوپٹہ	10
170/-	احمیدیارخان	ایک رات کی شادی	11
170/-	احمیدیارخان	داستان ایک داماد کی	12
160/-	عنایت اللہ	لبوگرم رکھنے کا ہے اک بہانہ	13
150/-	عنایت اللہ	لبوجوہم بہا کے آئے	14
180/-	عنایت اللہ	استانی اور ٹکسی دیکھو	15
170/-	عنایت اللہ	جب میں تھنڈی	16
170/-	عنایت اللہ	دولپوکی کہانی	17
180/-	عنایت اللہ	ہماری تھکست کی کہانی	18
170/-	عنایت اللہ	لاہور کی دلیز پر	19
120/-	شیر حسین	روحانی مسرت جسمانی قوت	20
120/-	کینٹن ڈاکٹرنیسیر۔ اے۔ ٹھ۔	زندہ رہ جوان رہو	21
180/-	عنایت اللہ	میں کسی کی بیٹی نہیں	22
170/-	عنایت اللہ	بہرے کا جگر	23
170/-	عنایت اللہ	الجھراتے	24
200/-	عنایت اللہ	ظاہرہ	25
150/-	عنایت اللہ	خاکی و روی لال ایو (اول)	26
150/-	عنایت اللہ	خاکی و روی لال ایو (دوم)	27
180/-	عنایت اللہ	پی آرپی بھتی رہے گی	28
270/-	عنایت اللہ	ڈوب ڈوب کے الجھری ناؤ	29
180/-	عنایت اللہ	پچھے اڑتا رہا	30

طارق اسماعیل ساگر

250/-	☆ بے نامی عقیدت	☆	300/-	☆ میں ایک جاسوس تھا
250/-	☆ چناروں کے آنسو	☆	300/-	☆ وطن کی مٹی گواہ رہنا
250/-	☆ کریک ڈاؤن	☆	250/-	☆ کمائٹو

200/-	فائلن کون تھا	☆	250/-	کفارہ	☆
250/-	گرفت	☆	250/-	ڈبل کراس	☆
250/-	سازش	☆	250/-	را	☆
200/-	دھویں کی دیوار	☆	180/-	آپریشن بلیوٹار	☆
100/-	جب دھمن نے الکارا	☆	200/-	ریل ارٹ	☆
200/-	میں کچھ	☆	250/-	ٹارگٹ پاکستان تھا	☆
250/-	کورٹ مارشل	☆	200/-	شیری کانت	☆
200/-	الاؤ	☆	250/-	محاصرہ	☆
250/-	مسافت	☆	300/-	اے راہ تھی کے شہیدوں	☆
200/-	اسامہ بن لادن	☆	300/-	جاسوس کیسے بنتا ہے	☆
300/-	حمدواز حسن کیشن رپورٹ	☆	250/-	وادی لاہور گنگ	☆
200/-	کٹ آؤٹ	☆	250/-	کارگل کرائس	☆
250/-	ڈرگ مافیا	☆	250/-	کراس فائر	☆
250/-	وادی لاہور گنگ	☆	200/-	بھارت نوٹ جائے گا	☆
200/-	پکنڈہ	☆	200/-	ٹارگٹ کھوٹ	☆
250/-	بھٹکا ہواراہی	☆	250/-	اور حصار نوٹ گیا	☆
250/-	کنجھ	☆	250/-	وہشت گرو	☆
300/-	پاکستان عالمی سازش کے نفع میں	☆	120/-	دیوتا کی موت	☆

نامور ناول لٹگاریم۔ اے۔ راحت

	اے۔ اے۔ راحت	گرین فورس	1
	اے۔ اے۔ راحت	بھید	2
	اے۔ اے۔ راحت	آئش زدہ	3
	اے۔ اے۔ راحت	دیوتا کی واپسی	4
250/-	اے۔ اے۔ راحت	تشیب	5
	اے۔ اے۔ راحت	زہر	6

مطبوعات SKY 7 پبلی کیشن

350/-	بل کنٹن (زادگوی)	میری زندگی	1
250/-	بیبا گروناک (تکلیمات، کلام اور حالات زندگی)	سردار جی ٹگھ (مترجم: امیر علی خان)	2
250/-	کامران احمد۔ اور گزیرب	مشہور عالمی شخصیات	3

150/-	تمل مسعود	کتاب پندے چاپ	4
150/-	نجمہ مسعود	بہت یاد آنے لگے ہو	5
120/-	گرواؤشو	روحانیت اور جنگی لذت	6
200/-	نجمہ منصور	تمہارے اداس ہونے کے دن نہیں	7
250/-	خواجہ حسن نقائی	تاریخ فرعون	8
25/-	محمد قیصر چوبان	SMS پاکٹ سائز (12 ٹائل)	9
130/-	حاجی سراج احمد عادل	قصص الانبیاء	10
80/-	شیخ محمد حسین آزادی اجمیری	صحیح خواب نامہ	11
120/-	علامہ سلیمان ندوی پشاوری	سیرت عائشہ	12
200/-	مسعود مفتی	پاکستان ٹریول گائیڈ	13
150/-	نادیہ عامر	منفرد و بیرون شاکل	14
200/-	محمد قیصر چوبان	ناموں کا گلدستہ	15
40/-	محمد قیصر چوبان	SMS بڑا سائز (6 ٹائل)	16
150/-	حضرت شیخ فرید الدین عطاء	تذکرہ الاولیاء	17
150/-	الخان اوس عمر	کتاب انچ و عمرہ	18
	علامہ فلک شیر	عورت کی حکمرانی اسلام کے آئینہ میں	19
200/-	ستار طاہر	لندن پلان	20
40/-	علام امیاز احمد علوی	حج و عمرہ پاکٹ سائز	21
300/-	نجمہ منصور۔ مسعود مفتی	انسائیکلو پیڈیا آف اسلام	22
120/-	صالحہ خالد	یوپی کیمیر	23
160/-	خشوت شکر زاہد گوئی	عورت اور مرد میری زندگی میں	24
120/-	متاز مفتی	لبک	25
70/-	مولانا شرف علی تھانوی	مسائل پہنچی زیر	26
60/-	نجمہ منصور	سلام قائد اعظم (سوال جواب)	27
180/-	علام محمود مہدی استنبولی	تحفہ الحروف	28
250/-	متصود شیخ	ہندر	29
150/-	نقیشہ نجم	پاکستانی کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا	30
200/-	مسعود مفتی	قدیم ترین، بھجو صرہ وہنی تحویلات	31
20/-	ادارہ	ایس۔ ایم۔ ایس (چار بکس)	32

کتب ایلان چپلشرز

350/-		سیرت ابن ہشام	1
200/-		بزرگ شہری	2
150/-		دیوان غالب	3
150/-		چادر صحراء	4
350/-		جلال و جمال	5

علمی شہرت یافتہ کتب کے مترجم

250/-	کامیابی اور روحانی مسرت (ڈورس پوزی)	مترجم: حافظ مظفر حسن
250/-	الفاظ کا جادو (ججے۔ دی۔ سرفی)	مترجم: حافظ مظفر حسن
200/-	ٹال مٹول کی عادات سے نجات (ریٹائم سٹ)	مترجم: حافظ مظفر حسن
150/-	ہندو مت (شنتلا جلن باتھ)	مترجم: حافظ مظفر حسن
300/-	چاری چیزوں کی آپ بینی	قیصر چہاں
250/-	باصول لیڈر شپ (سٹینن آر کووے)	مترجم: حافظ مظفر حسن
200/-	اعتمادی قوت (سٹینن آر کووے)	مترجم: حافظ مظفر حسن
250/-	اہم کام آہلے (سٹینن آر کووے)	مترجم: حافظ مظفر حسن
190/-	اپنے گھر کا جم خانہ	مترجم: حافظ مظفر حسن
150/-	بینار کی پکار	کینٹھ گریگ مترجم: مسعود منتی
	اسلامی معاشروں کی تاریخ	مترجم: مسعود منتی
	راہوں ڈریوڈ (آپ بینی)	مترجم: قیصر چہاں
150/-	کامیابی 30 دنوں میں بیج	ای۔ پی۔ پیرا مترجم: احمد چاویدہ
300/-	شیما مجید	
300/-	مشائی کو چنگ	مترجم: حافظ مظفر حسن
300/-	گذہ بڑس	مترجم: حافظ مظفر حسن
	انسانی تخلیق	ہارون میجی